مرزا رجب علی بیگ سرور

فسانۂ عجائب

ترتیب .. اطہر پرویز

بتوفیق خلاق جان عالم و مدد انجمن آرائی انجمن انجم

فسانۂ عجائب

تصنیف

مرزا رجب علی بیگ سرور لکھنوی

ترتیب

اطہر پرویز

سنگم پبلشرز • الٰہ آباد

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی کے نام

ترتیب

تعارف

آزادی کے بعد ہماری یونیورسٹیوں میں تحقیق و تنقید پر سنجیدگی سے توجہ ہوئی ہے۔ ادب کے مطالعہ میں ادب العالیہ کے صحیح متن کی خاص اہمیت ہے اور تنقید کے سارے نظریئے اس وقت تک وقیع نہیں ہوتے جب تک ان کی بنیاد فن پاروں کے صحیح متن پر نہ ہو۔ اس لئے آج اپنے شاعروں اور ادیبوں کی تصانیف کے صحیح اور مستند ایڈیشن تیار کرنے پر بجا طور سے زور دیا جاتا ہے۔ منشی نول کشور کا اُردو ادب پر بڑا احسان ہے کہ انھوں نے ہمارے ادبی سرمایہ کا بڑا حصہ چھاپ کر محفوظ کر دیا مگر افسوس ہے کہ ان کے مطبع نے متن کی صحت پر خاطر خواہ توجہ نہیں کی۔ چنانچہ اب بیشتر تصانیف کو تدوین کے جدید اصولوں کے مطابق پھر سے شایع کرنے کی ضرورت ہے۔ فسانۂ عجائب جیسی مشہور و معروف تصنیف کے بھی جو نسخے عام طور پر بازار میں ملتے ہیں ان میں بہت غلطیاں ہیں اور چونکہ اعراب و اوقاف کا خیال بہت کم رکھا گیا ہے اس لئے آج کل کے طلبا کو جو فارسی سے نابلد ہیں اس کے پڑھنے میں بہت دقت پیش آتی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ اطہر پرویز صاحب نے فسانۂ عجائب کا ایک صحیح اور مستند ایڈیشن تیار کیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ خواص اور عوام دونوں میں مقبول ہوگا۔

اطہر پرویز نے اس سلسلے میں فسانۂ عجائب کے جتنے نسخے مل سکے، سب کو دیکھا ہے۔ انھوں نے اس کی تصنیف اور اس میں حک و اصلاح کی پوری داستان مرتب کی ہے اور ایک سیر حاصل مقدمے میں، فسانۂ عجائب کی اہمیت، مصنف کے اسلوب، قصے کی خوبیوں، کردار نگاری اور تہذیب و معاشرت کی عکاسی سبھی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ قدرتی طور پر انھیں اپنے ہیرو سے ہمدردی ہے اور اس پر

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

عرضِ مرتّب

تحقیق و تدوین کا کام انفرادی بھی ہوتا ہے اور جماعتی بھی۔ میں نے "فسانۂ عجائب" کی ترتیب کا کام اکیلے ہی شروع کیا تھا، لیکن لوگ مدد کرتے گئے اور آہستہ آہستہ اس کام میں بہت سے لوگ شریک ہو گئے۔ اس کام میں بزرگوں نے میری حوصلہ افزائی کی، رفیقوں نے قدم قدم پر ساتھ دیا، اور خوردوں نے بہ وقت ہاتھ بٹایا۔ اگر میں ان سب کے نام گنوانا چاہوں تو گنوا نہیں سکتا۔ اس لئے کہ یہ لوگ اَن گنت ہیں۔

ڈھائی سال پہلے جب میں نے اس کا خاکہ بنایا تھا تو میرے استاد اور صدر شعبۂ اُردو، پروفیسر آل احمد سرور نے مجھے بہت قیمتی مشورے دیئے۔ اس کے بعد کام کے دوران میں جب کبھی کوئی مشکل پیش آئی تو میں نے سرور صاحب سے مدد لی۔ میں اُن کا شکریہ ادا کرنا اپنا خوشگوار فرض سمجھتا ہوں۔

جب میں نے یہ کام شروع کیا تو پروفیسر مجنوں گورکھپوری نے نہ صرف میری حوصلہ افزائی کی بلکہ بعض نئی باتیں بھی بتائیں۔ مجنوں صاحب کی عالمانہ گفتگو شعبہ اردو میں برسوں گونجتی رہے گی۔ میں نے اس سلسلے میں جب بھی اُن سے رجوع کیا، انھوں نے

اپنے مخصوص انداز میں گفتگو شروع کر دی۔ اس قسم کی بات چیت کا عکس جا بجا میرے مقدمے میں نظر آتا ہے۔

اس درمیان میں مجھے ڈاکٹر خورشید الاسلام صاحب، ریڈر شعبہ اُردو کے مشورے بھی وقتاً فوقتاً ملتے رہے۔ میرے انہماک کو دیکھ کر انھوں نے میری غیر معمولی حوصلہ افزائی کی۔ مجھے افسوس ہے کہ جب یہ کتاب اپنی آخری منزل پر پہنچنے والی تھی تو اُن کو انگلستان جانا پڑا اور میں اُن کے مزید مشوروں سے محروم رہ گیا۔

ڈاکٹر معین احسن جذبی اپنی تمام تر شاعرانہ صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ داستانوں سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ انھوں نے وقتاً فوقتاً میری رہنمائی بھی کی۔

ایک روز خواجہ مسعود علی صاحب ذوقی میرے یہاں تشریف لائے۔ انھوں نے میرا مقالہ پڑھا اور جا بجا اپنے مشورے دیئے۔ ذوقی صاحب لکھنؤ سے محبت کرتے ہیں اس لئے اس سلسلے میں اُن کی رائے میرے لئے بہت کار آمد ثابت ہوئی۔

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی، ریڈر شعبہ اُردو نے اپنی معروفیات کے باوجود میرے مقالے کی ایک ایک سطر پڑھی اور بعض بے حد قیمتی مشورے دیئے، جس کا عکس میرے مقالے میں جا بجا نظر آتا ہے۔

جناب نسیم قریشی، لکچرر شعبہ اُردو، داستانوں سے غیر معمولی دلچسپی رکھتے ہیں۔ مجھے کئی بار اُن سے تبادلۂ خیال کا موقع ملا۔ نسیم صاحب، رجب علی بیگ سرور کے سلسلے میں بڑی حد تک میرے ہم خیال ہیں اور میں بھی اُن کی بیشتر رایوں کی تائید کرتا ہوں۔ مجھے نسیم صاحب سے بڑی تقویت ملی۔

ڈاکٹر سید نور الحسن نقوی، ڈاکٹر نعیم احمد، ڈاکٹر سید ناصر حسین نقوی اور ڈاکٹر حنیف نقوی سے میری ملاقات بہت پرانی نہیں ہے لیکن اُن کے خلوص اور مشوروں نے مجھے اور اس کتاب کو بے حد متاثر کیا۔

ڈاکٹر منظر عباس نقوی، شہریار صاحب، لکچرر شعبہ اردو بھی میرے مشوروں میں برابر شریک رہے اور ان حضرات کو جب کبھی کوئی نئی بات معلوم ہوئی، انھوں نے مجھ سے اس کا ذکر ضرور کیا۔ ان کی علم دوستی نے مجھے بہت متاثر کیا۔

آزاد لائبریری کے اراکین نے میری بڑی مدد کی - جن میں محمد یونس صاحب، مہرالہی صاحب، اور فرخ جلالی خاص طور پر قابل ذکر ہیں - فرخ جلالی صاحب نے بعض کتابوں کی نشاندہی کی - اُن کی تحریک سے ہی میں نے ہنرمندان لکھنؤ کے بارے میں معلومات فراہم کیں -

چند روز ہوئے میں نے شعبہ اُردو کے ریسرچ ایسوسی ایشن کے ایک جلسے میں اپنے مقالے کا ایک حصّہ پڑھا - یہاں اس مقالے پر اساتذۂ شعبہ اردو کی مجموعی رائے میرے سامنے آئی اور میں نے اس روشنی میں مقالے پر نظر ثانی کی - میں ان سب حضرات کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں -

یہ تو علی گڑھ کے حضرات تھے لیکن علی گڑھ کے باہر کے لوگ بھی تھے جنھوں نے میرے ساتھ تعاون کیا - گزشتہ سال چھٹیوں میں مجھے پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا - موصوف نے میرے کام کو بغور دیکھا - اس کی ترتیب کے سلسلے میں مجھے بعض قیمتی مشورے دیئے اور مجھے چند اچھے نسخے دکھائے اور اس کی اجازت بھی دی کہ فسانۂ عجائب کے اس اڈیشن کو اُن کے نام نامی سے معنون کروں - اُسی روز اُن کے ہونہار صاحبزادے ڈاکٹر نیر مسعود سے بھی ملاقات ہوئی - اسی زمانے میں رجب علی بیگ سرور پر اُن کا تحقیقی مقالہ بھی چھپ رہا تھا - گویا وہ ان تمام مراحل سے گذر چکے تھے جن سے میں گذر رہا تھا - جب میں علی گڈھ واپس آیا تو مقالہ کے جتنے اوراق چھپ چکے تھے انھوں نے بذریعہ ڈاک میرے پاس ارسال کردیئے جن کا حوالہ جا بجا میرے مقدمے میں ملتا ہے - ان کی کتاب "رجب علی بیگ سرور - حیات اور کارنامہ" ایک اہم تحقیقی مطالعہ ہے جس کے لئے ڈاکٹر نیر مسعود یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں - اس کے علاوہ میرے پاس افضل المطابع کا جو نسخہ ہے اس میں چار صفحے موجود نہ تھے - ڈاکٹر نیر مسعود نے میرے لئے اپنے نسخے سے یہ اوراق نقل کر کے بھیجے -

پچھلے سال چھٹیوں میں، میں الہ آباد گیا - وہاں اپنے عزیز دوست جرار حیدر صاحب کے توسط سے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی سے ملا - موصوف کے پاس مراۃ الاخبار کلکتہ کا ایک نسخہ دیکھنے کو ملا، جو نستعلیق ٹائپ میں ۱۲۶۲ھ میں چھپا تھا اس اخبار سے مجھے کافی فائدہ پہنچا -

پچھلے دنوں ڈاکٹر عابد رضا بیدار (رام پور) علی گڈھ تشریف لائے، دوران گفتگو

اُن سے فسانۂ عجائب کا ذکر آیا۔ انھوں نے میرے مسودات دیکھ کر چند اہم باتوں کی طرف توجہ دلائی۔

رام پور ہی سے اکبر علی خاں صاحب تشریف لائے، ان سے بھی فسانۂ عجائب کے بارے میں چند باتیں معلوم ہوئیں۔ رضا لائبریری میں فسانۂ عجائب کے سات آٹھ اڈیشن موجود ہیں جن میں سے دو بہت قیمتی ہیں۔ ایک تو مطبع حسینی کا ۱۲۵۹ھ کا اڈیشن[1] اور دوسرا مطبع مراۃ الاخبار کا ۱۲۶۲ھ کا اڈیشن جس کی ایک کاپی ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے کتب خانے میں بھی موجود ہے۔

خط و کتابت کے ذریعہ جن مخلصین اور احباب سے میں نے معلومات فراہم کیں ان میں ڈاکٹر حکم چند نیّر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ انھوں نے ایک فارسی نسخے کے بارے میں اطلاع دی۔

جولائی ۱۹۶۸ء میں کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں الہ آباد گیا وہاں کتابستان کے مالک اور میرے عزیز دوست انور اللہ خاں صاحب کے توسط سے حاجی حرمین شریف محمد حسین کے مطبع کا چھپا ہوا نسخہ ملا جو میرے لئے نہایت اہم ثابت ہوا۔

جب میں نے اپنا یہ کام شروع کیا تو سب سے پہلے جس کتاب نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا وہ تھی سید ضمیر حسن دہلوی کی کتاب "فسانۂ عجائب کا تنقیدی مطالعہ"۔ مجھے اس کتاب میں ایک نیا لب و لہجہ اور ایک انداز فکر نظر آیا۔ جب میں دلّی گیا تو میرے بھائی عزیزی محمد قاسم صدیقی نے اُن سے ملاقات کرائی۔ اس مفصل ملاقات میں بعض کام کی باتیں سامنے آئیں اُن کی باتوں سے میرے حوصلے بڑھے اور میں نے اُن کی کتاب سے بہت فائدہ اٹھایا۔ ضمیر حسن دہلوی کی یہ کتاب اُردو داں طبقے کی مزید توجہ کی مستحق ہے۔

میرے بزرگ جناب منظور حسن فاروقی اُن گنتی کے چند لوگوں میں سے ہیں جو فن تاریخ گوئی میں مہارت رکھتے ہیں۔ انھوں نے "فسانۂ عجائب" کے اس نسخے کی تاریخ لکھی جو اس کتاب میں شامل ہے۔

آخری مرحلہ کاپیوں کی تصحیح کا تھا۔ اس سلسلے میں بہت سے لوگوں نے میرا ہاتھ بٹایا۔

---

[1] اس کی قلمی نقل آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بھی ہے۔ یہ مخطوطہ ناقص الاول ہے۔

ان میں میرے ایک بزرگ چودھری عثمان علی خاں صاحب اور میرے چچا جناب محمد ادریس صاحب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان بزرگوں نے بعض بہت قیمتی مشورے دیئے۔

جناب سردار علی زیدی۔ عزیزی جاوید اقبال، عزیزی کلیم شبیر، عزیزی محمد آفاق کرہ، عزیزہ سیما سلمہا نے بھی کاپیوں کی تصحیح میں میری بڑی مدد کی، ورنہ ان کی تصحیح تن تنہا میرے بس کی بات نہ تھی۔

میری بیوی صدیقہ بیگم نے گزشتہ دو سال میں وقتاً فوقتاً میرے اس کام میں مجھے بڑا سہارا دیا۔ لکھنؤ کی زبان اور شادی بیاہ کی رسموں کے سلسلے میں ان کی نظر اور معلومات بہت اچھی ہیں بالخصوص بیگماتی محاوروں اور رسموں وغیرہ کے سلسلے میں ان سے مجھے بہت زیادہ مدد ملی۔

ان کے علاوہ جن حضرات نے وقتاً فوقتاً مشورے دیئے اور میری مدد کی، ان میں ڈاکٹر عشرت حسین انور، ڈاکٹر وحید اختر، مولوی حفیظ الدین احمد نائب معتمد انجمن ترقی اردو (ہند) محمد حبیب خاں۔ لائبریرین انجمن ترقی اردو (ہند) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مولوی حفیظ الدین صاحب نے فرہنگ پر نظر ثانی بھی کی۔

میں آخر میں ڈاکٹر انصار اللہ نظر، استاد شعبہ اردو کا خاص طور پر ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ تحقیق کے کاموں سے ان کی دلچسپی غیر معمولی ہے اور انھوں نے اس کام میں میرا قدم قدم پر ہاتھ بٹایا۔ میں نے ہر ہر موقع پر اُن سے مدد لی اور انھوں نے کبھی بخل سے کام نہ لیا۔ یہانتک کہ اس کتاب کی ایک اک سطر بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ پڑھی اور بے حد مفید مشورے دیے۔ وہ اگر میری اعانت نہ کرتے تو میں شاید ہمت ہار چکا ہوتا۔ انھوں نے میری خاطر بعض حوالوں کو تلاش کیا۔ تحقیقی اور علمی کاموں سے ان کی لگن نے میری بہت سی مشکلوں کو آسان کر دیا۔ میں اُن کا شکر گذار ہوں۔

فسانہ عجائب کے ترتیب و تدوین کے سلسلے میں یہ پہلی کوشش ہے اور نقش اوّل کی حیثیت رکھتی ہے۔ مجھے یہ معلوم ہو کر خوشی ہوئی کہ یہ کام اور لوگ بھی کر رہے ہیں۔ دلّی میں محترم رشید حسن خاں اور ڈاکٹر فضل الحق صاحب اور لکھنؤ میں جناب سید سلیمان صاحب فسانہ عجائب کو مرتب کر رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان حضرات کا کام مجھ سے بہت بہتر ہوگا اور یہ حضرات اس کا پورا حق ادا کر سکیں گے اور اردو داں حضرات سرور کی فسانہ عجائب سے صحیح طریقے

... لطف اندوز ہو سکیں گے ... [illegible]

[illegible]

... کے لطف اندوز ہوں ...

اطہر پرویز

... علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

مرزا رجب علی بیگ سرورؔ

(حیات)

مرزا رجب علی بیگ سرورؔ، اُردو کے صاحبِ طرز انشا پرداز ہیں۔ ان کے والد کا نام مرزا اصغر علی بیگ تھا۔ ان کے سنِ پیدائش کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ مصنف "تاریخ ادب اردو"[1] لکھتے ہیں :۔

"سنہ ۱۲۰۱ھ یا ۱۲۰۲ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔"

حامد حسن قادری لکھتے ہیں :۔

"غالباً[2] ۱۲۰۲ھ / ۱۷۸۷ء (مرزا غالب سے دس برس پہلے)"

ڈاکٹر نیر مسعود نے کمزور آواز میں اس امر پر بحث کرتے ہوئے ان کی تاریخ پیدائش کے بارے میں سنہ ۱۲۰۰ھ / ۱۷۸۶ء کا اندازہ لگایا ہے۔ ان کا یہ قیاس اس بنا پر ہے کہ "فسانۂ عجائب" کے دیباچے میں سرورؔ نے لکھا ہے کہ :

"چالیس سال جہاں کی دیکھ بھال کی، ایسا شہر، یہ لوگ نظر سے نہ گزرے۔"

چونکہ "فسانۂ عجائب" کا نقشِ اول ۱۲۴۰ھ میں تیار ہوا اس لئے ڈاکٹر نیر مسعود اس نتیجے پر پہونچے کہ چالیس سال پہلے یعنی ۱۲۰۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ان تمام بحثوں کا ماحصل یہ ہے کہ سرورؔ تیرھویں صدی ہجری کے عشرہ اول کے اوائل میں پیدا ہوئے ہوں گے۔

سرورؔ کے وطن کے متعلق محمود اکبرآبادی نے لکھا ہے :۔

---

[1] تاریخ ادب اُردو۔ رام بابو سکسینہ د مرزا محمد عسکری ص ۲۱

[2] داستان تاریخ اردو ص ۱۵۸

"زیادہ تر لوگوں کا فیصلہ تو یہی ہے کہ سرورؔ لکھنو کے باشندے تھے[1]
مگر واقعہ اس کے خلاف ہے۔ سرورؔ کی تصانیف میں اس قسم کی شہادت
موجود ہے کہ وہ لکھنؤ کے باشندے نہیں تھے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ ان کا آبائی
وطن اکبرآباد تھا۔ چونکہ یہ مقام اس بحث کے لئے مناسب نہیں ہے اس لئے
صرف یہ بتاکر کہ سرورؔ کا وطن آگرہ تھا۔ یہ بات ختم کی جاتی ہے۔"

لیکن مخمورؔ اکبرآبادی نے اپنے اس دعوے کے لئے دلیل نہیں پیش کی۔ موجودہ مواد کی روشنی میں سرورؔ کا اکبرآباد سے تعلق ثابت کرنا مشکل ہے۔ یہ بات سرورؔ کی کسی تحریر سے ثابت نہیں ہوتی۔ اس لئے لکھنو ہی کو ان کا وطن تسلیم کرنا چاہئے، جس سے سرورؔ کو وہی والہانہ تعلق ہے جو کسی حساس اور خوددار شخص کو اپنے وطن سے ہوا کرتا ہے۔ مثلاً "گلزار سرور" (ترجمہ حدائق العشاق) میں اپنے اور لکھنو کے متعلق جو بیان ہے، سرورؔ نے اس کا عنوان اس طرح قائم کیا ہے۔

"مذکورۂ[2] آوارۂ وطن، خزاں دیدۂ چمن مترجم حدائق العشاق رجب علی بیگ
سرورؔ عفی عنہ"

یہ عنوان اس خیال کی توثیق کرتا ہے کہ لکھنؤ ہی سرورؔ کا وطن تھا۔
یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں معلوم ہوتا کہ لکھنؤ کی محبت ہی نے سرورؔ کو صاحب طرز نثرنگار بنایا۔

انھوں نے لکھنو کی تہذیب و معاشرت کو اپنی شخصیت میں سمو لیا تھا اور اس کا اظہار جب ادب کی شکل میں ہوا تو وہی اُن کا اسلوب ٹھہرا۔ یہی وجہ ہے کہ سرورؔ کی نثر کو لکھنؤ سے الگ کرکے دیکھنا اس کے ساتھ ظلم ہے۔ انھوں نے فارسی اور عربی کی تحصیل بھی کی تھی۔ جیسا کہ اُن کی تصانیف کو دیکھ کر بھی اندازہ ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے زمانے کے فارسی اور عربی کے معیار کو نہ پہنچ سکے ہوں یا محض از راہِ انکساری "شگوفۂ محبت" کے دیباچے میں یہ لکھتے ہوں:۔

---

[1] فسانۂ عجائب۔ دیباچہ مخمور اکبرآبادی ص۲
[2] گلزار سرور مطبوعہ افضل المطابع ۱۸۷۰ء ص۶

"ناسازگاری بخت اور نیرنگیٔ زمانہ سے نہ عربی میں دخل ہوا، نہ فارسی میں کامل ہوا۔ دونوں سے نا آشنا رہا۔ ایک کا بھی علم نہ حاصل ہوا۔ پست ہمتی سے اُردو میں لکھنے میں اوقات بسر کی ۔۔ کچھ دن نظم کا اہتمام رہا۔ شعر کہنے کا خیالِ خام رہا، جب وہ بھی نہ ہوسکا، نثر کی طرف خیال آیا ۔۔"

فارسی سے سرورؔ کی واقفیت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ انھوں نے اُردو میں بعض فارسی کتب کے ترجمے بھی کیے۔

سرورؔ بیشتر فنونِ لطیفہ میں کاملیت کی حد تک دخل رکھتے تھے۔ بہت اعلیٰ درجے کے خطاط تھے اور اس فن میں انھوں نے مشہور خطاط حافظ محمد ابراہیم سے تعلیم حاصل کی۔ رام بابو سکسینہ کا خیال ہے کہ "موسیقی سے بھی علمی اور عملی دونوں طور پر بخوبی واقف تھے"[2] اس کا اندازہ ان کی ان تحریروں سے بھی ہوتا ہے جہاں انھوں نے اس فن کی اصطلاحات کا ذکر کیا ہے۔

شعر و شاعری کا بھی شوق تھا۔ چنانچہ انھوں نے اسی رعایت سے سرورؔ تخلص اختیار کیا تھا اور آغا نوازش حسین خاں نوازشؔ کے شاگرد ہوئے[3]۔

آغا نوازش، خود بھی اچھے شاعر نہ تھے۔ سرورؔ کا کلام بھی معمولی درجہ کا ہے۔

---

[1] شگوفہ محبت مطبع محمدی، لکھنؤ ۱۲۷۲ھ ص۴،

[2] تاریخ ادب اُردو۔ ترجمہ عسکری ص۲۱

[3] نوازش مرزا خانی کے نام سے مشہور تھے۔ ان کے والد حسین علی خاں تھے۔ ان کا ذکر سرورؔ، بیان لکھنؤ میں مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتے ہیں ۔۔

"امیروں میں حسین علی خاں، بلبل ہزار داستاں، خوش الحاں"

مصحفی نے ریاض الفصحا میں مرزا خانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :-

"نوازش حسین خاں نوازشؔ عرف مرزا خانی ولد حسین علی خاں، ابن نواب نامر خاں صوبہ دار کابل و پشاور و غزنی، قوم مغل چگتی وطن بزرگانش۔۔ خود در اکبر آباد تولد شدہ و در لکھنؤ نشو و نما یافتہ۔ جوان مہذب الاخلاق و خوش اختلاط است، دیوان اول بطور ایشاں (سوز) گفتہ و حالا یک دیوانِ دیگر ہم جمع نمودہ"

اس کا خود سرورؔ کو بھی احساس تھا۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ "شعر کہنے کا خیالِ خام رہا، جب وہ بھی نہ ہو سکا، نثر کی طرف خیال آیا۔"

سرورؔ کو علم و شعر سے غیر معمولی شغف تھا۔ "فسانہ عجائب" میں اشعار کے برمحل اور بے محل استعمال سے اس کا پتہ چلتا ہے۔ لکھنؤ کی ادبی و تہذیبی صحبتوں سے سرورؔ نے بہت کچھ حاصل کیا۔ تیرھویں صدی ہجری کے وسط میں فتح الدولہ، مرزا محمد رضا برقؔ کے دولت کدے پر ہر شبِ ماہ ایک مشاعرے کا اہتمام ہوتا تھا۔ سرورؔ نے جس انداز سے اس کا ذکر کیا ہے اس سے خیال ہے کہ شاید وہ خود بھی ان جلسوں میں شرکت کرتے ہوں گے۔ سرورؔ کا ادبی مذاق تربیت یافتہ ہے۔ لکھنؤ میں سرورؔ نے جو زندگی گزاری وہ یقیناً بھرپور ہوگی۔ "بیان لکھنؤ" میں انھوں نے جس طرح لکھنؤ کے گلی کوچوں کی تصویر کشی کی ہے، سیر و تفریح کا ذکر کیا ہے، وہ ایک ایسے آدمی کا بیان معلوم ہوتا ہے جو خود تماشا بھی رہا ہے اور تماشائی بھی۔ اتنی بھرپور زندگی گزارنے کے بعد اگر انھیں تقریباً ۴۰ سال کی عمر میں لکھنؤ چھوڑنا پڑا تھا تو یہ حقیقتاً تکلیف دہ بات تھی۔

جب ترکِ لکھنؤ کا ذکر آتا ہے تو عام طور پر وہی بات کہی جاتی ہے جو رام بابو سکسینہ کی "تاریخ اردو ادب"[1] میں مذکور ہے کہ:

> "۱۲۴۰ھ میں سرورؔ کانپور گئے اور کہا جاتا ہے کہ غازی الدین حیدر کے "حکم" سے لکھنؤ سے جلا وطن کر دیئے گئے تھے۔ وہ کانپور سے نہایت بیزار ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ 'ربیع الثانی کے مہینے میں کہ سنہ ہجری نبوی صلعم بارہ سو چالیس تھے، آنے کا اتفاق مجبوراً کو رِدہ کانپور میں ہوا۔ بسکہ یہ بستی پوچ و لچر ہے۔ اشراف یہاں عنقا صفت نابید ہیں۔"

لیکن اس بات کی تصدیق کسی ذریعہ سے نہیں ہوتی کہ وہ غازی الدین حیدر کے "حکم" سے جلاوطن کئے گئے۔ یہ سچ ہے کہ اس زمانے میں کانپور کی حیثیت کالے پانی کی تھی اور بقول ڈاکٹر نیر مسعود کے

> "اکثر[2] شاہی معتوبین اور مجرموں کو جلاوطنی کی سزا دے کر دریائے گنگا پار

---

[1] تاریخ ادب اردو۔ رام بابو سکسینہ و مرزا محمد عسکری

[2] رجب علی بیگ سرور۔ حیات اور کارنامے ص۸۶

اُتار دیا جاتا تھا۔"

ایسا ہرگز نہیں کہ ہر وہ شخص جو کانپور میں جاکر رہا شاہی معتوب یا مجرم ہی ہو۔ یہ بات کہ رجب علی بیگ سرورؔ کی جلاوطنی "بحکم غازی الدین حیدر" عمل میں آئی تھی، بہرحال محتاج ثبوت ہے۔ اِس بات میں اگر کچھ بھی صداقت ہوتی تو سرورؔ کسی نہ کسی عنوان سے اس کا ذکر کرسکتے تھے۔

اس کے برخلاف سرورؔ نے کانپور آنے کے بارے میں لکھا ہے کہ

"آخرالامر[1] بمقتضائے عادت تلاش معاش کے حیلے میں فلک تفرقہ پرداز گردوں عربدہ ساز نے صورت مفارقت دکھائی، مہاجرت استقبال کو آئی۔"

اس میں کانپور آنے کا سبب "تلاش معاش" کو بتایا ہے۔ سرورؔ یہ تحریر خود غازی الدین حیدر کے سامنے پیش کرنے کے خواہش مند تھے۔ اگر وہ واقعی جلاوطن کئے گئے ہوتے تو ان کو اتنی جرات ہرگز نہیں ہوسکتی کہ اسی بادشاہ کے سامنے غلط بیانی سے کام لیتے کہ یہ صورت تو بادشاہ کی مزید ناراضگی کا سبب ہوسکتی تھی۔ سرورؔ اپنے عہد کے نمایاں فرد تھے۔ تذکروں میں ان کا ذکر ملتا ہے اگر جلاوطنی بحکم بادشاہ اودھ ہوتی تو اس معاملے پر معاصر تذکرے خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ خود لکھنو والوں سے تو کم از کم سرورؔ کے حالات چھپے ہوئے نہ تھے اور فسانہ عجائب مطبوعہ افضل المطابع کے خاتمۃ الطبع سے صاف طور پر یہ بات ثابت ہے کہ ان کے زمانے میں ان کے مخالفوں کا ایک گروہ موجود تھا۔

"اور[2] حاسد کی بات نرالی ہے لاأبالی ہے۔ خدا رسول کو ان کی زبان سے نجات نہ ملی تو دوسرا کب بچتا ہے۔ ان لوگوں کو بھونکنے کی عادت ہے کھی نہیں پچتا ہے۔"

ان کے مخالفین میں سید محمد فخرالدین حسین خاں متخلص بہ سخنؔ دہلوی مصنف "سروش سخن" نے خاصی شہرت حاصل کی۔ اگر سرورؔ فی الواقع جلاوطن کئے گئے ہوتے تو دوسرے مخالفین کے علاوہ سخنؔ دہلوی "سروش سخن" کے دیباچے میں اس کا ذکر ضرور کرتے۔ "جلاوطنی" والی بات محض زیب داستان کے لئے کسی نے کہہ دی ہوگی جس کی بظاہر

---

[1] فسانہ عجائب۔ مطبوعہ نولکشور ۳۹ واں اڈیشن۔ ص۱۵

[2] فسانہ عجائب۔ مطبوعہ افضل المطابع کانپور ص۱۲۶

کوئی حقیقت نہیں لیکن تلاش معاش میں سرور کا کانپور جانا بھی تحقیق طلب ہے۔ بڑھاپے میں جب وہ تلاشِ معاش کے چیلے سے بنارس گئے تھے تو انھیں بنارس سے کوئی شکایت نہیں تھی اور اس زمانے کے ان کے خطوط میں کانپور کا ذکر بھی اکثر آیا ہے لیکن ان خطوں میں بھی انھوں نے اس بستی (کانپور) کی تذلیل نہیں کی۔ اس بات کا بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ کانپور میں سرور کو کوئی روزگار مل گیا تھا بلکہ "فسانہ عجائب" کے دیباچے میں سرور نے لکھا ہے "بیکار مباش کچھ کیا کر"۔ اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ سرور وہاں بھی بیکار ہی رہے۔

"انشائے سرور" میں سرور کا ایک خط ہے جو انھوں نے اپنے متبنّیٰ بیٹے سید احمد علی کو لکھا ہے، اس میں وہ اپنے بارے میں ایک اہم انکشاف کرتے ہیں:۔

"اگر[1] ہنگام سرور بحال خود نماند۔ زمانہ رنج و غم ہم بسر خواہد شد۔ حالم شمارا یاد خواہد بود کہ بعلّتِ خون گرفتار شدم۔ تمام عالم می گفت کہ ازیں مخمصہ جاں بر نہ خواہد شد۔ لیکن بفضل ایزدی آسیبے بمن نہ رسید۔[2] تاحال زندہ و سلامت ہستم"

ڈاکٹر نیّر مسعود کو شک ہے کہ ممکن ہے کہ اسی کے نتیجے میں انھیں کانپور جانا پڑا۔ میرا قیاس کہتا ہے کہ ۱۲۴۰ھ میں جب وہ کانپور گئے تو اس وقت وہ قتل سے بری ہو چکے تھے۔ (ورنہ بظاہر "فسانہ عجائب" کے مقدمے میں اس کا ذکر کسی بھی عنوان سے نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں) البتہ بری ہونے کے بعد مقتول کے متعلقین کی دشمنی کی وجہ سے ان کے لئے لکھنؤ کا قیام خطرے سے خالی نہ ہوگا[2]۔ غالباً اسی لئے کانپور کے قیام کا زمانہ انھوں نے گوشہ نشینی میں گذارا۔ لیکن ان کی یہی گوشہ نشینی ادب کے حق میں فال نیک ثابت ہوئی کیونکہ اس زمانے میں انھوں نے اپنی لازوال تصنیف "فسانہ عجائب" لکھی اور بادشاہ اول غازی الدین حیدر کی خدمت میں پیش کی۔ بادشاہ دوم نصیر الدین حیدر کے عہد میں سرور اپنے وطن لکھنؤ واپس آئے۔ سرور لکھتے ہیں:

---

[1] انشائے سرور۔ نولکشور جون ۱۹۱۶ء۔ [1]

[2] اس قسم کی دشمنی کی مثالیں اس عہد میں ملتی ہیں مثلاً دیکھو (مجموعہ)

"۱۲۵۳ھ[۵۱] کو نصیر الدین حیدر داخل فردوس بریں ہوئے اور محمد علی شاہ بادشاہ بعد ہنگامے منّا جان کے تخت نشین ہوئے۔ زمانے کا رنگ بدلا۔ ہر شخص بر سر حساب ہوا، مسدود فتنہ و فساد کا باب ہوا۔"

اور آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"بندہ[۵۲] بھی خوش طالعی سے ملازمت کا شرف اندوز ہوا۔ ہر شب شبِ برات ہوئی، روز نوروز ہوا۔"

۱۲۵۹ھ میں فسانۂ عجائب کی پہلی بار اشاعت ہوئی جیسا کہ ان کی مندرجہ ذیل تحریر سے معلوم ہوتا ہے:۔

"لله[۵۳] الحمد والمنتہ کہ نسخہ، قصہ جانعالم شہزادہ بہ زبان اردو مسمی فسانۂ عجائب از مصنفات مرزا رجب علی بیگ متخلص بہ سرور کہ بیک واسطہ سلسلہ تلمذ را بجرأت می رسانند درماہ جمادی الثانیہ روز شنبہ تاریخ نہم ۱۲۵۹ھ در عہد دولت مہد امجد علی شاہ خلد اللہ ملکہ و سلطانہ در مطبع حسینی میر حسن رضوی ولد میر حسین عرف میر کامل در بیت السلطنت لکھنو بمحلہ محمود نگر طبع نمود۔"

امجد علی شاہ کا زمانہ سرور کے لئے خوش آیند بھی ثابت ہوا اور تکلیف دہ بھی۔ اس زمانے میں 'فسانۂ عجائب' کی مقبولیت میں روز افزوں اضافہ ہوا، اس کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ چند سال کے اندر متعدد اڈیشن شائع ہوئے لیکن اس زمانے سرور کو پھر بے روزگاری کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ منصب وزارت میں تبدیلی ہوئی۔ شرف الدولہ سے بادشاہ خوش نہ تھے۔ اس لئے وہ گوشہ نشین ہوگئے اور ان کی جگہ امین الدولہ وزیر ہوئے۔ سرور بھی اس لپیٹ میں آگئے۔

امجد علی شاہ کا زمانہ چار سال دس مہینے پر مشتمل تھا اور یہ زمانہ سرور نے بڑی پریشانیوں میں گذارا۔

۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ء میں امجد علی شاہ کا سرطان کے موذی مرض میں انتقال ہوگیا

۵۱۔ فسانۂ عجائب مطبع مصطفائی لکھنؤ۔ ۱۲۶۲ھ ص ۱۹۳

۵۲۔ فسانۂ عجائب مطبع مصطفائی لکھنؤ۔ ۱۲۶۲ھ ص ۱۹۴

۵۳۔ فسانۂ عجائب، قلمی نسخہ آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ص ___، نقل پہلا اڈیشن۔

اور اسی سال واجد علی شاہ المعروف بہ جانِ عالم کی تخت نشینی عمل میں آئی۔ سرورؔ نے واجد علی شاہ کی خدمت میں ایک قطعہ تاریخ پیش کیا۔

بہار جوش میں ہے اور نئی ہے کیفیت   سرورؔ سب کو ہی کہتے ہیں متقی و رند
جو زیبِ تخت ہوا شب کو شاہِ نیک اختر   ہوا ہے سالِ جلوس اس لئے "چراغ ہند"
۱۲۶۳

اس کے بارے میں خود لکھتے ہیں :-

"جلوس[1] کی تاریخ کہہ کے گزرانی اس کے جلدو میں پچاس روپیہ ہر مہینے خزانے سے پاتا تھا جو کسی کتاب کے ترجمے کا ارشاد ہوا بجالاتا تھا چنانچہ "شمشیر خانی" کو اُردو میں لکھ کر "سرور سلطانی" نام رکھا اور بہت صاف اُردو میں لکھا ہے۔ الغرض بوڑھاپے کے دن نکمّے ہوتے ہیں۔ گھر میں بیٹھا تمام کرتا تھا، بیری کی صبح کو شام کرتا تھا۔"

اس کے ساتھ ہی سرورؔ نے ایک عرضداشت بھی لکھی۔ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا جیسا کہ "احوالِ واجد علی شاہ" کے تذکرے میں سرورؔ خود لکھتے ہیں :-

"یہ[2] رنگ دیکھ کے سرورِؔ محزوں کو بھی ملازمت کی تمنا ہوئی۔ عرضداشت پیش کی۔ یاوریِ تقدیر سے تاریخ جلوس میمنت مانوس پسند آئی۔ عرض داشت مزین بہ دستخط فرمائی۔ زمرۂ ملازمین میں شمول ہوا۔ ترقی خواہِ قدیم کو جدید اعزاز حصول ہوا۔"

۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ء سے ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۱ء تک سرورؔ نے کئی کتابیں لکھیں، جن میں "شرر عشق" بہت مشہور ہوئی۔ ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء میں امجد علی خاں رئیس سندیلہ کی فرمائش پہ "شگوفۂ محبت" لکھی۔ اسی دوران میں ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ء میں سرورؔ دلّی بھی گئے، جہاں ان کی ملاقات مرزا غالب سے ہوئی۔ اس کا حال "تذکرہ غوثیہ" میں مندرج ہے :-

"ایک[3] روز کا ذکر ہے کہ مرزا رجب علی بیگ سرورؔ مصنف 'فسانہ عجائب'

---

[1] انشائے سرور۔ رقعہ نمبر ۹۔ ص ۱۱

[2]۔ فسانہ عبرت۔ رجب علی بیگ سرورؔ مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ص ۴۷

[3]۔ تذکرۂ غوثیہ۔ شاہ گل حسن قادری خلیفہ خاص مطبوعہ ۱۳۲۹ھ۔ ص ۱۰۱-۱۰۲

لکھنؤ سے آئے۔ مرزا نوشہ سے ملے۔ اثنائے گفتگو میں پوچھا کہ "مرزا صاحب اردو زبان کس کتاب کی عمدہ ہے"۔ کہا "چہار درویش کی"۔ میاں رجب علی بولے "اور فسانہ عجائب کیسی ہے"؟ مرزا بے ساختہ کہہ اٹھے۔ "اجی لاحول ولاقوۃ، اس میں لطف زبان کہاں۔ ایک تُک بندی اور بھٹیار خانہ جمع ہے"۔ اس وقت تک مرزا نوشہ کو یہ خبر نہ تھی کہ یہی میاں سرور ہیں۔ جب چلے گئے تو حال معلوم ہوا۔ بہت افسوس کیا اور کہا کہ "ظالمو! پہلے سے کیوں نہ کہا۔"

"دوسرے دن مرزا نوشہ ہمارے (سیّد غوث علی شاہ قلندر قادری رحمۃ اللہ علیہ) پاس آئے۔ یہ قصہ سنایا اور کہا کہ "حضرت! یہ امر مجھ سے نادانستگی میں ہو گیا۔ آیئے آج اُن کے مکان پر چلیں اور کل کی مکافات کرآئیں"۔ ہم اُن کے ہمراہ ہو لئے اور میاں سرور کی فرودگاہ پر پہنچے، مزاج پرسی کے بعد مرزا صاحب نے عبارت آرائی کا ذکر چھیڑا اور ہماری طرف مخاطب ہو کر بولے کہ "جناب مولوی صاحب! رات میں نے فسانۂ عجائب کو جو بغور دیکھا تو اس کی خوبیٔ عبارت اور رنگینی کا کیا بیان کروں، نہایت ہی فصیح و بلیغ عبارت ہے۔ میرے قیاس میں تو ایسی عمدہ نثر نہ پہلے ہوئی اور نہ آگے ہو گی اور کیونکر ہو۔ اس کا مصنف اپنا جواب نہیں رکھتا"۔ غرض اس قسم کی بہت سی باتیں بنائیں۔ اپنی خاکساری اور ان کی تعریف کر کے میاں سرور کو نہایت مسرور کیا۔ دوسرے دن ان کی دعوت کی اور ہم کو بھی بلایا۔ اس وقت بھی میاں سرور کی بہت تعریف کی۔ مرزا صاحب کا مذہب یہ تھا کہ دل آزاری بڑا گناہ ہے اور درحقیقت یہ خیال بہت درست تھا"۔

اس واقعہ کی صداقت میں ذرا شبہ ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ خود مرزا غالب اس اسلوب کو پسند کرتے تھے کیونکہ بعد میں انھوں نے "گلزارِ سرور" کی تقریظ بھی لکھی۔ ظاہر ہے کہ اس تقریظ کو غالب نے کسی مجبوری کے تحت تو لکھا نہیں ہوگا اور غالب بے جا تعریف کے قائل نہ تھے۔ منشی ہرگوپال تفتہ نے اپنی کسی کتاب کی تقریظ کے متعلق مرزا غالب کو شکایتاً لکھا کہ "آپ نے تقریظ کچھ بھی نہ لکھی یعنی جو طریقہ

فرسودہ اس وقت ابنائے روزگار کا تھا۔ آپ نے اس کی تقلید نہیں کی، تو مرزا صاحب جواب میں لکھتے ہیں :۔

"واللہ باللہ[1] اگر کسی شاہزادے یا امیرزادے کے دیوان کا دیباچہ لکھتا تو اس کی مدح اتنی نہ کرتا کہ جتنی مدح تمہاری کی ہے۔ ہم کو اور ہماری روش کو اگر پہچانتے تو اتنی مدح کو بہت جانتے۔ قصہ مختصر تمہاری خاطر کی اور ایک فقرہ تمہارے نام کا بدل کر اس کے عوض ایک فقرہ اور لکھ دیا ہے۔ اس سے زیادہ بھی میری روش نہیں"۔

اس کے پیش نظر اب "گلزار سرور" کی تقریظ میں مرزا غالب[2] لکھتے ہیں :۔

"مجھ[2] کو دعویٰ تھا کہ اندازِ بیان و شوخیٔ تقریر میں فسانہ عجائب بے نظیر ہے جس نے میرے دعوے کو اور فسانۂ عجائب کی یکتائی کو مٹایا وہ یہ تحریر ہے"۔

فسانہ عجائب نے سرور کی شہرت میں چار چاند لگا دیے۔ وہ اپنے آپ کو فخریہ "مولف[3] فسانہ عجائب قصہ جانِ عالم" لکھتے تھے۔ یہ قصہ قبول عام کی سند حاصل کرتا رہا۔ لیکن جس طرح چڑھتی دھوپ کو زوال آتا ہے سرور کو بھی جلد ہی برے دن دیکھنے پڑے۔ جب انگریزوں کی دخل اندازی سے تنگ آکر واجد علی شاہ نے انتظامِ سلطنت سے علیحدگی اختیار کی اور سلطنت کا کام نواب علی نقی خاں کے سپرد ہوا تو قطب الدولہ جن کے توسط سے سرور کو ملازمتِ شاہی ملی تھی، وہ جلا وطن کر دیے گئے۔ چنانچہ سرور پر اس کا اثر پڑا۔ اُن کی تنخواہ بھی مہینوں نہ ملتی تھی۔ سرور نے تنگ آکر ایک عرضی نواب علی قلی خاں وزیر کی خدمت میں پیش کی، جس میں بڑی جرأت کے ساتھ اپنے معاملے کو پیش کیا۔ اس کا اقتباس درج ذیل ہے :۔

"نیاز[4] مند نو برس بیکاری میں مثل جرس نالاں، بے سروساماں، مبتلائے

---

[1] خطوط غالب۔

[2] گلزار سرور، تقریظ مرزا غالب۔ ٹائٹل کی پشت پر۔

[3] فسانہ عبرت۔ مصنفہ رجب علی بیگ سرور مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ص۱۱۱

[4] ایضاً ایضاً ایضاً ص۱۲۴

بلائے روزگار رہا۔ قافلے کے قافلے منزلِ مقصد کو پہنچے، مگر یہ گم کردہ راہِ سرگشتۂ بادیہ ادبار رہا۔ عجب گردش سے فلکِ کج رفتار لیل و نہار پھرتا تھا کہ یہ شامت زدہ شام و پگاہ بے جرم و گناہ حلقۂ غم و دائرہ الم میں بسان نقطۂ پرکار ہر بار گھرتا تھا۔ نہ سامان مفر ہوتا تھا، نہ ملال سے مفر ہوتا تھا۔ جس کوچے میں بیکاری کو ٹالتا تھا، جو راہ بصد اکراہ نکالتا تھا، اُس مرحلے میں اُلجھ کے منہ کی کھاتا تھا گتھی نہ سلجھتی تھی، اُلجھن بڑھتی تھی۔ اس پیچ میں یہ بل پڑتا کہ دم گھبراتا۔ کچھ بن نہ آتا تھا۔

یہ عرضی اردو ادب میں خاصے کی چیز ہے۔ سرور نے اپنے مخصوص انداز میں جذبات کے سہارے تخیلی پیکر بنائے ہیں اور دل کی بات اس طرح کہی ہے کہ زبان و بیان کے تصنع کے باوجود اثر کرتی ہے اور آخیر میں سرور نے لکھا ہے کہ :-

"حضور عالم قدرداں ادنیٰ و اعلیٰ کے ہیں اس وجہ سے عرض حال ہے کہ کس و ناکس سے التجا کا سخت ملال ہے۔ کسی سخی داتا کے ذمے تنخواہ کا اہتمام ہو کہ شکایت بخت کی کہانی کا قصہ تمام ہو۔"

سرور کی اس تحریر کو ڈاکٹر نیر مسعود نے جراُت رندانہ سے تعبیر کیا ہے۔ سرور نے سخت زندگی گزاری، مصائب کا مقابلہ کیا، لیکن ان کی شخصیت میں خم نہ پیدا ہوا۔ "انشائے سرور" میں ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"تین دن میں یہ خط لکھا ہے، طبیعت کیا کیا رکتی ہے، کمر جھک گئی ہے مگر گردن نہیں جھکتی ہے۔"

۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء میں سلطنت اودھ ختم ہوگئی اور بادشاہ معزول کر کے کلکتہ بھیج دیئے گئے۔ وہ اس بربادی سے تباہ حال ہو گئے۔ کچھ دنوں کے بعد سرور کو مہاراجہ ایشوری پرشاد نرائن سنگھ نے بنارس بلالیا۔ جہاں انکی بڑی قدر و منزلت ہوئی۔

۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ء میں غدر ہو گیا۔ سرور اس سانحے کی تاب نہ لاسکے اور افتاں و خیزاں لکھنؤ پہنچے جہاں "ایک عالم کو تہلکہ عظیم میں مبتلا پایا، شہر میں سناٹا، چھوٹا بڑا آفت میں مبتلا، ہر گلی کوچے میں انگریزی بندوبست، اپنے اپنے حال میں ہر ایک پست۔"

سرور پر اس کا بہت اثر ہوا اور انھوں نے جا بجا اس کا اظہار کیا۔ سرور کی مالی پریشانیاں بہت بڑھ گئی تھیں۔ اس زمانے میں انھوں نے بیگمات اودھ کی طرف سے بھی کچھ خطوط واجد علی شاہ کے نام لکھے۔ یہ رقعات نمبری ۲۶ تا ۳۲ (ص۳۴۷ سے ص۳۵۴ تک)

---

[۱] فسانہ عبرت۔ رجب علی بیگ سرور۔ مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ص۱۲۸

انشائے سرور میں ملتے ہیں۔

لکھنؤ کے حالات خراب سے خراب تر ہوتے چلے گئے۔ سرورؔ کا بھی لکھنؤ میں دم گھٹنے لگا اور بقول خود "شہر کاٹے کھانے لگا"۔[1]

جب مہاراجہ بنارس کو ان کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے بلا بھیجا اور سرورؔ ۱۶ ذیقعدہ ۱۲۷۵ھ مطابق ۱۸ جون ۱۸۵۹ء کو بنارس گئے۔ جہاں اُن کی تنخواہ سو روپیہ ماہوار ہوگئی لیکن یہ تنخواہ کبھی پابندی سے نہیں ملی۔

بنارس میں سرورؔ نے گیارہ سال قیام کیا۔

سرورؔ کی بقیہ زندگی پریشان حالی میں گزری۔ کچھ ضعیفی، کچھ بیماری اور کچھ تنگ دستی نے سرورؔ کو کہیں کا نہ رکھا۔ وہ آنکھ کے علاج کے سلسلے میں کلکتہ بھی گئے (۱۲۸۰ھ) جہاں ان کی ملاقات واجد علی شاہ سے بھی ہوئی۔ انھوں نے ایک ڈاکٹر کو آنکھ دکھائی، لیکن فائدہ تو کیا ہوتا، رہی سہی آنکھ اور بھی خراب ہوگئی۔ وہاں سے بے نیل و مرام واپس آئے ایک خط میں اپنے بیٹے کو لکھتے ہیں۔

"میرا دم گھبراتا ہے، کلیجہ منھ کو آتا ہے، کوئی پرسان حال نہیں کہ روتے کیوں ہو، جان کھوتے کیوں ہو، باہر جاتے ہیں تو پاؤں لڑکھڑاتے ہیں، ایسے وقت میں تم سے جدائی ہے، دیکھئے کیا مرضی الٰہی ہے ــــ ہمارا حال قابلِ دید ہے، بلکہ دید ہے نہ شنید ہے جس قدر رنج و الم سے بھاگتا ہوں۔ بے سبب اس کا سامنا ہوتا ہے۔ تین چیزیں دنیا میں سخت تر ہیں، وہ یہاں موجود ہیں، ضعیفی میں تنہائی، غربت میں بیماری، مفلسی میں قرضداری ــــ کیا کہوں لکھ نہیں سکتا"۔[2]

آخر ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ء کو اس مصیبتوں سے بھری ہوئی زندگی کا خاتمہ ہوا اور سرورؔ لکھنؤ سے دور بنارس میں دفن ہوئے، گویا ع دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں۔

اس طرح ایک بڑا انشا پرداز زندگی کی مصیبتیں جھیلتا ہوا ختم ہوگیا۔

ڈاکٹر نیرؔ مسعود نے سرورؔ کی زندگی پہ تبصرہ کرتے ہوئے صحیح لکھا ہے:۔

"سرورؔ کا زمانہ وہ تھا کہ رئیسوں اور بادشاہوں کے وابستگانِ دولت

---

[1] انشائے سرور۔ ص۸۰ [2] رجب علی بیگ سرور۔ حیات اور کارنامے۔ ڈاکٹر نیرؔ مسعود ص۱۲۵

محض چکنی چپڑی باتوں اور معمولی سی اداکاری کے بل پر اپنے گھر بھر لیتے تھے۔ سرورؔ کی جگہ اگر کوئی موقع پرست شخص ہوتا تو اپنے اتنے قدر دانوں سے فائدہ اُٹھاکر خود رئیس بن سکتا تھا لیکن ان زرّیں موقعوں کے ہوتے ہوئے بھی سرورؔ کی تنگ دستی شہادت دیتی ہے کہ وہ آن بان سے زندگی گزارنا چاہتے تھے۔ تیرہ بختی عموماً خودداری کے دامن سے لپٹ جایا کرتی ہے، سرورؔ کی پریشان حالی کے معمے کا بنیادی حل اُن کے کردار کا یہی پہلو ہے۔"

فسانۂ عجائب

مختلف اڈیشنوں کا جائزہ

میں نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں "فسانۂ عجائب" پڑھی تھی لیکن اس کے نقوش دھندلے پڑ چکے تھے۔ پچیس سال بعد جب میں نے اسے دوبارہ پڑھا تو مجھے کسی اچھے اڈیشن کی تلاش ہوئی۔ لیکن جتنے بھی اڈیشن ملے وہ ایسے تھے کہ ان کا پڑھنا مشکل کام تھا۔ اس لئے کہ نہ تو ان میں پیراگراف تھے، اور نہ اضافتیں۔ اشعار بھی مسلسل لکھے ہوئے تھے۔ میں نے کلاس میں پڑھاتے ہوئے محسوس کیا کہ طالب علموں کے لئے اس کی عبارت کا پڑھنا اور زیادہ دقت طلب تھا۔

اس کے علاوہ 'فسانۂ عجائب' کے جو اڈیشن بازار میں ملتے ہیں، ان میں نولکشور کا مطبوعہ نسخہ عام طور پر قابل ذکر ہے۔ اس وقت جو نولکشور کا آخری اڈیشن پیش نظر ہے، یہ چالیسواں اڈیشن ہے۔ نولکشور کے اڈیشنوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے پہلے اڈیشنوں کو بنیاد بنایا۔ نولکشور مالک مطبع اودھ اخبار کو حق تالیف 'فسانۂ عجائب' کا مصنف نے ہبہ کیا ہے اور حسب منشا، دفعہ ۱۸ ایکٹ ۲۵، ۱۸۶۷ء یہ کتاب رجسٹر نمبر ۲۶۶ میں بہ صیغہ رجسٹری سے درج ہوئی۔ اس کا پہلا اڈیشن "بڑی آب وتاب اور خاص اہتمام سے شائع ہوا۔"

اس کے بعد اس مطبع سے یہ کتاب مسلسل چھپ رہی ہے۔ مختلف نسخوں میں جو

اختلاف ہے وہ مصنف کی تصحیح کی بنا پر نہیں ہے بلکہ یہ اغلاط ہیں جو مختلف ایڈیشنوں میں اپنے طور پر ہوتی رہی ہیں۔ کہیں کاتب کی تصحیح ہے تو کہیں کاپیاں پڑھنے والے کا سہو ہے۔ اس کے بعد دوسرے مطبعوں میں جو ایڈیشن چھپے وہ عام طور پر نولکشور کے ایڈیشنوں سے ماخوذ تھے اس لئے اُن میں بھی وہ اغلاط داخل ہوگئیں۔

تین سال پہلے طالب علموں کی مجبوری کو دیکھتے ہوئے مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ اس کو اِڈٹ کیا جائے۔ اگر کچھ اور بھی نہ ہو سکے تو کم از کم یہ تو ہو جائے کہ پیراگراف قائم کر کے، ضروری اعراب کے ساتھ اسے شائع کیا جائے۔ میں نے اپنے کاموں کو چھوڑ کر اس کا بیڑا اٹھایا اور سوچا کہ دو مہینے کے اندر یہ کام ہو جائیگا۔ لیکن جب یہ کام شروع کیا تو احباب نے رائے دی کہ مندرجہ ذیل کام اور بھی کر دیئے جائیں۔

- اس وقت ایک مفصل فرہنگ کا اضافہ کر دیا جائے تاکہ فسانہ عجائب کے مشکل الفاظ اور متروکات کے سمجھنے میں سہولت ہو جائے۔ خاص طور پر طالب علموں کے لئے یہ فرہنگ اور بھی ضروری ہے۔
- 'فسانہ عجائب' میں 'بیان لکھنؤ' میں جن ہنرمندوں اور فن کاروں کا ذکر آیا ہے، ان کے بارے میں کچھ معلومات اکٹھا کر دی جائیں تاکہ پڑھنے والے ان لوگوں سے کسی حد تک واقف ہو جائیں۔ جن اشخاص کے نام اس میں آئے ہیں، ان کے حالات تحریر کر دیے جائیں۔ یہ بات اس لئے زیادہ اہم ہے کہ خود بقول سرور "خامۂ مؤلف اختصار رقم ہے"۔
- مرزا رجب علی بیگ سرور کے یہاں لکھنو کے محاورات کا جگہ بہ جگہ استعمال ملتا ہے ان محاوروں کی تشریح کر دی جائے تو کتاب کی افادیت بڑھ جاتی ہے۔
- انھوں نے جا بجا عربی کے فقرے اور آیتیں بھی تحریر کی ہیں، جن کو سمجھنے میں آج کے طالب علم کو دقت محسوس ہوتی ہے۔ ان کو علیحدہ مع ترجمے کے مرتب کر دیا جائے۔
- فسانہ عجائب میں رسومات لکھنؤ کا ذکر بھی ہے۔ ہر چند یہ رسمیں کسی نہ کسی شکل میں آج بھی موجود ہیں۔ پھر بھی عام قاری کے لئے اُن کی تفصیل

اور تشریح ضروری معلوم ہوئی۔

● فسانۂ عجائب کو مصنف نے خود اپنی زندگی میں بارہا بہ نظر اصلاح دیکھا اور "جو فقرہ سست پایا، اسے چست کیا"۔ یہ تصحیح شدہ نسخے مختلف مطبعوں سے شایع ہوتے رہے۔ یہ مطبعے چونکہ سب کے سب بالآخر نیرنگیٔ چرخ دوراں کا شکار ہوئے، اس لئے ان تصحیح شدہ نسخوں کے دوبارہ چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ صرف نولکشور کا مطبع ایسا تھا جو باقی رہ گیا۔ چنانچہ پچھلے ستّر اسی سال میں فسانۂ عجائب جہاں سے بھی چھپی اس کا متن نولکشوری ایڈیشن سے ماخوذ تھے۔ اس لئے ضرورت تھی کہ مختلف نسخوں کی مدد سے "فسانۂ عجائب" کا صحیح متن تیار کیا جائے۔

اس طرح یہ کام رفتہ رفتہ پھیلتا چلا گیا۔ جب میں نے فسانۂ عجائب کے مختلف ایڈیشنوں کو اکٹھا کرنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ اس کی تدوین کا کام کس قدر دشوار ہے۔ لیکن دوستوں اور بزرگوں نے میرا حوصلہ بڑھایا اور مجھے ان مشکلات پر قابو پانے میں مدد کی۔ اس کام میں مجھے دو سال سے زاید ضرور لگے۔ لیکن اس سے فائدہ یہ ہوا کہ مجھے اس عظیم کتاب کو اچھی طرح سمجھنے اور اس کے مسائل سے واقفیت حاصل کرنے میں سہولت پیدا ہوگئی اور ہر مرتبہ مجھ پر جو کچھ نئی حقیقتیں منکشف ہوتی تھیں، وہ نئے مسائل میرے سامنے پیش کرتی تھیں۔

'فسانۂ عجائب' نے اپنے زمانے میں تہلکہ مچایا۔ اس کے مصنف کے دو تین جملے اردو نثر کی تاریخ میں بڑے ہنگامہ خیز اور معرکہ آرا ثابت ہوئے۔ سید فخرالدین سخن دہلوی نے جو خود کو غالبؔ دہلوی کا شاگرد بتاتے ہیں برافروختہ ہو کر 'فسانۂ عجائب' کا جواب پیش کیا۔ اس میں انھوں نے لکھا:۔

"مگر[1] صاحب موصوف نے جو اپنی تالیف میں بیچارے میر امن دہلوی کو بنایا ہے۔ اپنی زبان کی تیزی سے اس صاف گو کو ایک آدھ کڑا فقرہ سنایا ہے تو ہم بھی اب کہتے ہیں کہ سرورؔ لکھنوی نے اٹھارہ مرتبہ فسانۂ عجائب کو درست کیا جو فقرہ سست پایا، اُسے چست کیا، مگر غلطی نظر نہ آئی۔ کئی مرتبہ کتاب چھپی

---

[1] سروش سخن۔ سخن دہلوی۔ نولکشور ص۵

مگر وہ بات نہ چھپی۔"

سخنؔ دہلوی کے اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرورؔ نے اس کی تصحیح اٹھارہ بار کی۔ یہ فقرہ یونہی نہیں لکھا ہے بلکہ مختلف ایڈیشنوں کو دیکھنے کے بعد اس کی واقعیت پر یقین سا آنے لگتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جن تصحیحات کا ذکر سخنؔ نے کیا ہے وہ کتاب کے چھپنے کے بعد عمل میں آئی ہونگی اور سخنؔ دہلوی نے پہلے ایڈیشن (۱۲۵۹) کے بعد کے ایڈیشنوں کو سامنے رکھ کر یہ بات کہی ہوگی۔ جو مصنف کتاب چھپ جانے کے بعد بھی اسے بہتر سے بہتر کرنے میں لگا رہے، چھپنے سے پہلے اس نے کتنی بار درست کیا ہوگا۔ اس کا اندازہ کچھ بہت مشکل نہیں۔

سرورؔ نے "باعث تحریر اجزائے پریشاں" میں اس کے بارے میں جو بیان دیا ہے اور بعض نسخوں کے خاتمۃ الطبع میں جو کچھ لکھا ہے اس سے میں جس نتیجے پر پہونچا ہوں مجملاً درج ذیل ہیں۔

سرورؔ لکھتے ہیں:۔

"—— ربیع الثانی کے مہینے میں سن ہجری نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وصحابہ وسلم بارہ سے چالیس تھے، آنے کا اتفاق مجبور کو دہ کانپور میں ہوا۔ لبسکہ یہ بستی پوچ و لچر ہے، اشراف یہاں عنقاصفت ناپید ہیں اور جو ہوں گے تو گوشہ نشین، عزلت گزیں۔ مگر چھوٹی امت کی بڑی کثرت دیکھی۔ یہ طور جو نظر آیا، دلِ وحشت منزل سخت گھبرایا، کلیجہ منہ کو آیا۔ قریب تھا جنوں ہو جائے، تیرہ بختی سے روزِ سیاہ پیش آئے، لیکن یہ شربتِ عنایت و معجون شفقت ارسطو فطرت بقراط حکمت حکیم سید اسد علی صاحب شیر بیشۂ علم و کمال، سخن فہم ظریف خوش خصال طبع سود اخیز اور سر جنوں انگیز کو آرام و تسکین حاصل ہوئی وہ حالِ فقیر دلگیر پہ الطاف و کرم فرماتے تھے۔ تدبیریں نیک و احسن دافع رنج و محن بتاتے تھے؛ ایک روز ان سے بعد اظہار مکلف فسانہ و دستانہ یہ بھی کہا کہ "ایک کہانی لکھا چاہتا ہوں۔" سن کے فرمایا بیکار مباش کچھ کیا کر۔ میر[۱]

میرؔ نہیں پیر تم کاہلی اللہ رے   نام خدا ہو جوان کچھ تو کیا چاہیے

---

[۱] فسانۂ عجائب۔ نولکشور ص ۱۵

اس وقت یہ کلمہ توسنِ طبع کو تازیانہ ہوا......... نیاز مند کو اس تحریر سے نمود نظم و نثر جودت طبع کا خیال نہ تھا، شاعری کا احتمال نہ تھا بلکہ نظرِثانی۔ جو لفظ دقّت طلب، غیر مستعمل، عربی فارسی کا مشکل تھا اپنے نزدیک اُسے دور کیا ــــ"

اس عبارت سے یہ ہرگز واضح نہیں ہوتا کہ فسانہ عجائب ۱۲۴۰ھ میں مکمل ہو گئی بلکہ صاف ظاہر ہے کہ اس سال سرور کو اس فسانے کے لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ غلط فہمی کی بُنیاد وہ تاریخی قطعے ہیں جو مصنف کے علاوہ اور لوگوں نے بھی لکھے ہے

جس نے سُنا اس کو جی میں یہ لگا کہنے　　یارب یہ فسانہ ہے یا سحر ہے بابل کا
تاریخ سرور اس کی منظور ہوئی جس دم　　بے ساختہ جی بولا نشتر ہے رگ دل کا
۱۲۴۰ھ

یا مدہوش کا شعر ہے

ہوئی جو مدہوش کو یہ خواہش کہ سال تاریخ اس کا لکھیے
تو کھینچ کر آہ، دل سے نکلا، خزاں سے رنگ بہار دیکھا
۱۲۴۰

"فسانہ عجائب" کے زمانہ تالیف کے تعین کے سلسلے میں سرور کا یہ بیان اہم ہے :-

"یہ[۲] فسانہ بہ عہد دولت شاہ غازی الدین حیدر شروع ہوا تھا اور تمام بہ عصر سلطان بن سلطان ابوالنصر نصیر الدین حیدر دام ملکہٗ ہوا۔"

اگرچہ عام طور پر بعض محققوں نے سرور کے اس بیان کی صداقت پر شک و شبہ کا اظہار بھی کیا مثلاً" حامد حسن قادری یہ لکھنے کے بعد کہ " فسانہ عجائب کے آغاز و اختتام تصنیف کے صحیح سنہ دریافت نہیں ہوئے" لکھتے ہیں :-

"یہ[۳] بیانات نہایت غیر مطابق اور غیر ذمہ دارانہ ہیں۔ اگر ان سنوں کو صحیح مان لیا جائے تو سرور جس سال کانپور گئے اس سال کے اندر یہ کتاب لکھ لی اور آخر میں اسی سال کے قطعات تاریخ شامل کر دیئے۔ یہ بالکل قرینِ قیاس ہے لیکن ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۴ء) غازی الدین حیدر کے زمانے

۱؎ فسانہ عجائب نولکشور ص۱۸۵

۲؎ " " ص۱۱

۳؎ داستان تاریخ اردو۔ حامد حسن قادری ص۱۶۲

کا سال ہے۔ نصیر الدین حیدر کا عہد حکومت اس سے تین سال بعد ۱۲۴۳ھ/ ۱۸۲۷ء میں شروع ہوتا ہے، پھر اس کے لکھنے کے کیا معنی کہ "نصیر الدین حیدر کے عہد میں تمام ہوئی"۔

ڈاکٹر نیر مسعود کا خیال ہے کہ :-

"اصل[1] فسانہ ۱۲۴۰ھ میں مکمل ہو چکا تھا لیکن نصیر الدین حیدر کی تخت نشینی کے بعد سرور نے فسانہ عجائب کا وسیلہ بنا کر یہ چاہا کہ نیا بادشاہ ان کو لکھنو آنے کی اجازت دے دے۔ اپنی کوششوں میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے سرور نے ضروری سمجھا کہ کسی طرح "فسانہ عجائب" کی تالیف کو عہد نصیر الدین حیدر کا کارنامہ قرار دیا جائے"۔

یہ حقیقت ہے کہ فسانہ عجائب اپنی ابتدائی شکل میں ۱۲۴۰ھ میں ہی مکمل ہو چکا تھا لیکن اس میں ترمیم و اضافہ کا سلسلہ بہت بعد تک جاری رہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرور نے ۱۲۴۰ھ میں یہ فسانہ لکھ کر بادشاہ اول غازی الدین حیدر کی مدح میں قصیدہ شامل کیا اور ان کی خدمت میں اس کے ساتھ پیش کیا کہ یہ مقبول ہو اور انھیں لکھنو آنے کی اجازت مل جائے یا اس کے صلے میں بادشاہ انھیں لکھنو آنے کی دعوت دے دیں۔ غالباً اُن کی یہ توقع پوری نہ ہو سکی۔ نصیر الدین حیدر کی وفات (۱۲۴۳ھ) کے بعد سرور نے فسانہ عجائب پر نظر ثانی کی، متن میں اضافہ[2] و ترمیم کی اور نصیر الدین حیدر کی مدح میں قصیدہ شامل کیا اور دیباچہ میں کچھ اضافہ کیا اور خود اُن کی خدمت میں اسے پیش کیا۔ غالباً اس مرتبہ بھی سرور کو مایوسی کا منھ دیکھنا پڑا۔ یہ بات یقین سے کہنا مشکل ہے کہ سرور نے تیسرے بادشاہ محمد علی شاہ کے عہد میں بھی قسمت آزمائی کے لئے فسانہ کو پیش کیا یا نہیں لیکن یہ بات کہ بادشاہ چہارم امجد علی شاہ کے زمانے میں انھوں نے پھر اس فسانہ کو پیش کر کے اپنی قسمت آزمائی تھی، اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ غالباً تیسرے بادشاہ کے زمانے میں بھی انھوں نے یہی عمل کیا ہوگا۔ بادشاہ چہارم کے عہد میں سرور نے اپنے فسانے میں بہت اہم اضافے کئے۔ فسانہ عجائب میں "بندر کی تقریر" زندگی اور موت اور

---

[1] رجب علی بیگ سرور۔ حیات اور کارنامے۔ ڈاکٹر نیر مسعود ص ۱۲۹

[2] "عطر سہاگ، مہک پری، ایجاد نصیر الدین حیدری ارگجہ محمد شاہی" فسانہ عجائب نولکشور ص ۵

جبر و اختیار جیسے مسائل پر سرورؔ نے بڑی عالمانہ تقریر کی ہے۔ بے ثباتیٔ دنیا پر سرور کا بیان قابلِ غور ہے :-

"انجامؔ شاہ و گدا، دو گز کفن اور تختہ تابوت سے سوا نہیں، کسی نے ادھی یا محمودی کا دیا یا بہ تحریہ کربلا کسی کو گزی، گاڑھا، میسر ہوا، بصد کرب و بلا، اس نے صندل کا تختہ لگایا۔ اس نے بیر کے چیلوں میں چھپایا کسی نے بعد مرگ سنگ مرمر کا مقبرہ بنایا، کسی نے مر مر کے گور گڑھا پایا، کسی کا مزار مطلا منقش رنگا رنگ ہے۔ کسی کی مانند سینہ جاہل گور تنگ ہے، حسرتِ دنیا سے کفن چاک ہوا، بستر دونوں کا فرش خاک ہوا، نہ امیر سمور و قاقم کا فرش بچھا سکا، نہ فقیر پھٹی شطرنجی اور ٹوٹا بوریا لا سکا۔ بعد چندے جب گردش چرخ نے گنبد گرایا۔ اینٹ سے اینٹ کو بجایا تو ایک نے نہ پایا کہ دونوں میں یہ گور شاہ ہے، یہ لحد فقیر ہے۔ اس کو مرگ جوانی نصیب ہوئی۔ یہ استخواں بوسیدہ پیر ہے، سو یہ بھی خوش نصیب ہے۔ نیک کمائی والے گور گڑھا کفن پاتے ہیں۔ نہیں تو سینکڑوں ہاتھ رکھ کر مر جاتے ہیں۔ لوگ در گور چلے آتے ہیں۔ کتے بلی چیل، کوّے بوٹیاں نوچ نوچ کر کھاتے ہیں۔ دامن دشت عریاں کفن گور بے چراغ، صحرا کا صحن ہوتا ہے۔ یاس و حسرت کے سوا کوئی نہ سرہانے روتا ہے، تمنا چھٹ کوئی پائینتی نہ ہوتا ہے۔ سالہا مقبروں کی عمارات عالی اور ساز و سامان کی دیکھا بھالی میں سریع السیر رہے۔ ہزاروں رنج، گور بے چراغ غریباں کی دید میں بیٹھے بٹھائے، سہے، طرفہ نقل ہے کہ والی وارث ان کے سریر سلطنت، مسند حکومت پر شب و روز جلوہ افروز رہے۔ مگر تنبیہ غافلوں کو قدرت حق سے گنبدوں میں آشیانہ زاغ و زغن، میناروں پر مسکن بوم شوم، قبروں پر کتے لوٹتے دیکھے"۔ الخ[1]

بندر کی تقریر کا پورا حصہ غور سے پڑھنے کے بعد "احوال محمد علی شاہ" کا وہ حصہ اگر پڑھا جائے جہاں محمد علی شاہ کے جنازے کے جلوس کا ذکر ہے۔ یہ بیان تقریباً اسی لب و لہجہ میں ہے جس میں سرورؔ نے بندر کی تقریر لکھی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فسانہ عجائب

---

[1] فسانہ عجائب رجب علی بیگ سرور ص ۱۲۴ - ص ۱۲۵

سے منقول نہ ہوگا بلکہ یہاں فسانہ عبرت میں لکھنے کے بعد سرور کو اپنے فلسفیانہ خیالات کو پیش کرنے کا خیال آیا کہ کیوں نہ اسے فسانہ عجائب جیسی شہرہ آفاق کتاب میں استعمال کیا جائے۔ یہ تقریر یوں بھی اس قصے میں کچھ اضافی سی معلوم ہوتی ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

"طلسم[۱] خانہ عجیب جا، جو غبار طبع بار خاطر سمجھے۔ دل صفا منزل مکدر ہوئے وہی منزل اول میں ہزاروں من مٹی کے تلے سوئے۔ کبھی مالکِ تخت صاحب دیہیم و تاج ہو، طرفۃ العین میں زیر خاک فاتحے کا محتاج ہو۔ کبھی پہلو میں مشیر، دست بستہ رو برو و زیر، جڑاؤ چھپر کھٹ، مطلا مسہری، بالیں قاقم بالش پر ہو۔ کبھی یار نہ غم گسار، قبر تیرہ و تار، مسہری پھولوں کی اوپر، آپ خاک کے تلے، خشتِ لحد زیر سر ہو۔ جیتے جی لطف تخت و سریر ہے، تمیز پلاس و حریر ہے۔ بعد مرگ جب گردش گنبد بے ستون نے مقبرہ ڈھایا، اینٹ سے اینٹ کو بجایا، تو اتنا بھی کوئی بتانے کو نہ آیا کہ یہ صاحبِ تاج تھا، یا مفلس محتاج تھا اور اتنی تمیز نہ کر سکا کہ گورِ شاہ یا مزار فقیر ہے، مدفن نوجوان یا پیر ہے۔ دنیا میں گاہ صاحب نقارہ و کوس ہے، کبھی یہ نوبت آئی کہ مبتلائے حسرت و افسوس ہے۔ تاج مرصع ٹیڑھے تاروں کے سبب جو کج رہتا تھا کجا، پُرزر کلاہ کہاں —— الخ"

اس کے علاوہ "بیان لکھنؤ" میں بادشاہ کی مدح بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ حقیقت کو پیش کرنے کی دُھن میں، ان کا قلم غیر شعوری طور پر ہجو ملیح کی سرحد میں داخل ہو جاتا ہے۔ نصیر الدین حیدر کے بارے میں لکھتے ہیں :—

"عیش[۲] و نشاط کی طرف طبیعت جو آئی، ایک ایک ادنیٰ کنجڑان، ہفت ہزاریوں سے اعلیٰ بنائی۔ محمد شاہ کی گور پر تھرائی۔ شہزادیوں کو کہاریوں پر رشک آیا۔ خواصوں کو صاحبِ نوبت کیا، چنڈول سکھپال میں چڑھایا۔"

۱؎ فسانہ عبرت۔ رجب علی بیگ سرور مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب ص ۵۶-۵۷

۲؎ فسانہ عجائب۔ رجب علی بیگ سرور۔ نولکشور ص ۱۱

"قدسیہ[1] محل پر طبیعت جو آئی۔ معاً رفعت و شان فلک ہفتم پر پہنچائی۔
کئی کروڑ روپئے اس منظور نظر نے صرف کئے۔ خزانے خالی کر محتاجوں کے
گھر بھر دیئے۔ ہر وقت راجا اندر کا جلسہ رہا۔"

مذکورۂ بالا بیان اس لئے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ اس سے ہمیں اس کی تحریر کی تاریخ کا تعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔

محمد انصار اللہ نظر لکھتے ہیں :-

"قدسیہ[2] محل کا عقد بادشاہ کی تخت نشینی کے تقریباً دو سال بعد ہوا' اغلب ہے کہ "خواصوں" سے ان کی طرف اور "کنجڑان" سے ملکہ زمانیہ کی طرف اشارہ ہو کیونکہ ملکہ زمانیہ فی الاصل کسی "کوری" کی لڑکی تھیں (بیگمات اودھ[2]) قیاس کیا جاتا ہے کہ ان دونوں کے حالات ان کے زوال بلکہ انتقال کے بعد لکھے ہوں کیونکہ ان کے عروج و اقبال میں اس طور پر اشارہ کرنا بھی قیاس کم تھا۔ ملکہ زمانیہ کا انتقال ۱۸۴۳ء مطابق ۱۲۵۹ھ) اور قدسیہ محل کا ۱۲۵۰ھ میں ہوا۔ اس طرح بھی ان تحریروں کا زمانہ امجد علی شاہ کی بادشاہت اور جان عالم کی ولی عہدی کا معلوم ہوتا ہے۔ فسانہ عجائب کے کچھ اور مندرجات سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے لیکن یہاں اس پر تفصیلی بحث کا موقع نہیں مثلاً محمد رضا برق کے مشاعرے کا تذکرہ ہے جو تقریباً ۱۲۵۰ھ یا اس کے کچھ بعد کی بات ہے۔"

غرض "فسانہ عجائب" تقریباً ۱۹ سال تک بنیادی ترمیم و تنسیخ کی منزلوں سے گزرتی رہی۔ یہاں تک امجد علی شاہ کے عہد میں سرور کی مراد بر آئی اور ان کے فسانے کو چھپنا نصیب ہوا، خود سرور[3] کے مندرجہ ذیل بیان سے یہ بات واضح ہوتی ہے :-

"للہ الحمد والمنة کہ نسخہ قصہ جانعالم شاہزادہ بہ زبان اردو مسمی بہ فسانہ عجائب از مصنفات مرزا رجب علی بیگ متخلص بہ سرور کہ بہ یک واسطہ

---

[1] فسانہ عجائب۔ رجب علی بیگ سرور۔ نولکشور ص۱۱
[2] نواب امین الدولہ مہر۔ محمد انصار اللہ نظر اردو ادب شمارہ نمبر ۱۔ ۱۹۶۲ء ص۱۰
[3] منقول از نسخہ قلمی راقم سردار خاں، نقل مطبع حسنی اڈیشن۔

سلسلہ تلمذ را بہ جرأت می رسانند در ماہ جمادی الثانیہ روز شنبہ تاریخ نہم ۱۲۵۹ھ در عہد دولت مہد امجد علی شاہ بادشاہ خلد اللہ ملکہٗ و سلطانہ در مطبع حسنی میر حسن رضوی ولد میر حسین عرف میر کامل در بیت السلطنت لکھنؤ بمحلہ محمود نگر طبع نمود۔ قطعہ تاریخ از شیخ کرامت علی اظہر[1]

این کتاب جان عالم چون حسن فرمود طبع — معنیٔ نوراً علی نور از وی آمد در ظہور
خامۂ اظہر پئے تاریخ وقت انطباع — زد رقم از طبع باشد جان عالم پر سرور
۱۲۵۹

اظہر کے قطعہ سے بھی یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہی "فسانۂ عجائب" کا پہلا اڈیشن ہے۔ اس کا دوسرا اڈیشن اسی مطبع حسنی سے جب چھپا تو اس کے لئے پھر شیخ کرامت علی اظہر نے تاریخ لکھی[2]

فرمود دو بار طبع در مطبع خود — مطبوع حسن چو گشت جان عالم
بنوشت وقت انطباعش اظہر — این ست سرور طبع جان عالم
۱۲۶۳

اس اڈیشن میں خاتمۃ الطبع کے طور پر سرور نے مندرجہ ذیل عبارت لکھی ہے، جس پر سرور کی مہر بھی ثبت ہے۔[3]

"للہ الحمد و المنہ کہ یہ فسانۂ رنگین بصد زیب و تزئین لسان قند مکرر پسند خاطر سراپا قصور اعنی سرور کے چھپا اور جناب میر حسن صاحب نے بفضل رب ذو المنن کوئی احتیاط کا دقیقہ اٹھا نہ رکھا اور ابتدا سے انتہا تک نظر مولف سے گذرا۔ نسبت فسانہ سابق اکثر جا راقم نے محل اور موقع جو پایا اس کو بڑھایا، ملاحظۂ ناظرین پر تمکین میں جو آئے گا یقین ہے کہ

---

[1] جہاں تک شیخ کرامت علی اظہر کا تعلق ہے۔ ان کے متعلق طبقات الشعرا ص۲۹ پر درج ہے "اظہر تخلص شیخ کرامت علی رہنے والا لکھنؤ کا ہے اس کا حال اور ہم کو کچھ ظاہر نہیں ہوا مگر ایک قطعہ تاریخ فسانۂ عجائب کا جو تصنیف مرزا رجب علی سرور کا ہے، اس کی تاریخ طبع کی، جو اس نے لکھی ہے اس سے معلوم ہوا کہ شاعر ہے۔"

[2] فسانہ عجائب مطبع حسنی ۱۲۶۳ھ ص۲۰۶

[3] ایضاً ایضاً ص۲۰۷

لطف دکھائے گا۔ یہ نسخہ اور بزرگوں نے بھی طبع کیا الاّ بطرز زمانہ کہ ایک حال پر نہیں رہتا۔ کم و بیش ہوگیا جو فقرہ نہ پڑھا گیا وہ اپنے طور پہ گڑھا گیا۔ اس نشیب و فراز کو امتیاز شرط ہے۔ لہذا بپاس خاطر جناب میر صاحب ممدوح کہ بندے کے محسن ہیں اور صفحہ دہر پہ انتخاب ہیں۔ ہر ایک سے میرا سوال ہے کہ لاجواب ہے۔ اس کی صحت و غلطی میں بہت کد ہوئی کوشش از حد ہوئی اور جو بعض جا سہو بشریت سے ہوا اسکا صحیح نامہ لکھا۔ غرضکہ اس شفائی سے اکبر علی خاں نے لکھا کہ گو خط سات ہیں ہفت قلم کاتبوں کو کہتے ہیں مگر اس کا حسن خط نو خطوں سے گوئی سبقت لے گیا دیکھنے والے حیران رہتے ہیں اگر زنگ حسد طبیعت سے دور ہو تو آنکھ پڑتے ہی دل مسرور ہو، ہر سطر زلف مسلسل عنبریں مویاں ہے اور بین السطور سے صفائی عارض مہرویاں جلوہ کناں ہے۔ ہر ایک صفحہ آئینہ حلب ہے صاف باطنوں سے داد طلب ہے دگرنہ بمجبوری یہ حرف زبان پہ آجائے گا کہ جیسا نہ ہوگا ویسا نظر آئے گا۔ گواہ اس فقرے کی مہر فقیر ہے خدا شاہد ہے یہ مطبع بے نظیر ہے"

اس عبارت سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فسانۂ عجائب میر حسن کے مطبع ہی سے نہیں شایع ہوتی تھی بلکہ دوسرے مطبعوں سے بھی یہ کتاب چھپتی رہی تھی۔ چنانچہ مطبع حسنی کے دوسرے اڈیشن سے پہلے ۱۲۶۲ھ میں مطبع مصطفائی سے یہ کتاب چھپی[1] مصنف نے اس کی بھی تصحیح کی اور اس میں بھی بعض اضافے کیے چنانچہ خاتمۃ الطبع کی عبارت میں ہے :-

"یہ فسانہ کئی بار چھپا مگر اب تک لوگ اس کی تلاش میں ہیں۔ نظر آتا نہیں، کوئی پاتا نہیں ـــ بالفعل اس کے چھاپنے کا خیال دلِ صفا منزل میں جناب حاجی حرمین مولوی محمد حسین دام اللہ وصلہم کے آیا۔ انھوں نے مولف فسانہ سے تابع فرمان بہ دل و جان ہے، ارشاد کیا کہ پھر بہ نظر غور ابتدا سے انتہا تک اس کو دیکھ جائے خدشہ رہنے نہ پائے۔ حسب ارشاد

---

[1] فسانہ عجائب مطبع مصطفائی ۱۲۶۲ھ ص ۱۳۶-۱۳۷ ڈاکٹر نیر مسعود نے اس کا سن طباعت ۱۲۶۱ھ دیا ہے۔ مجھے یہ سہو کتابت معلوم ہوتا ہے ـــ اطہر پرویز)

اس خجستہ نہاد کے نیازمند قدیم نے کوشش عظیم سے جہاں موقع پایا کچھ بڑھایا۔ خوشنودی طبع کے بعد امیدوار دعا ہوں کہ اب بہ سر منزل آپہونچا ہوں، شائق اس کو جب پڑھیں گے، دنیا میں بڑھیں گے، کم نہ ہوں گے، یہ فسانہ رہ جائے گا اور چندے مگر ہم نہ ہوں گے۔ جس تکلف سے اب کی بار چھپا ایسا کبھی نہ تھا۔ فقط"

۱۲۶۲ھ میں ہی مطبع "مرآۃ الاخبار" کلکتہ سے منشی عنایت علی کے اہتمام سے نستعلیق ٹائپ میں طابع منشی محمد تقی، ناشر مرزا عنایت علی۔ بہ تصحیح مولوی محمد عبداللہ کابلی اور حافظ[۱] لکھنوی۔

اس درمیان میں "فسانہ عجائب" کا ایک خاص اڈیشن مطبع رفاہ عام دہلی سے منشی کریم الدین پانی پتی نے ۱۳۔ شوال ۱۲۶۱ھ میں شائع کیا۔ یہ پہلا دہلوی اڈیشن ہے اس اڈیشن کے بارے میں منشی کریم الدین "طبقات شعرائے ہند" میں لکھتے ہیں۔

"ایک[۲] قصہ فسانہ عجائب زبان اردو میں اس کی تصنیف سے بہت مشہور ہے جو کہ دو دفعہ لکھنؤ میں چھپا اور ایک دفعہ میرے اہتمام سے دہلی درمیان مطبع بندہ کے ۱۲۶۱ھ میں چھپا۔"

لیکن اس کے چھپنے کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۲۶۷ھ "مولوی محمد حسین[۳] کی فرمائش پر انھوں نے (رجب علی بیگ سرور) فسانہ عجائب پر نظر ثانی بھی کی ہے اور جہاں موقع پایا کچھ اور بڑھایا ہے۔ یہ مطبع محمدی کانپور سے چھپا تھا۔

ڈاکٹر نیر مسعود لکھتے ہیں:—

"فسانہ[۴] عجائب کا پہلا اڈیشن شایع ہونے کے بعد سے سرور گویا "فسانہ عجائب" کے درمیان سے غائب تھے۔ مطبع محمدی کے اڈیشن میں ہماری ملاقات پھر سرور سے ہوئی ہے۔ اس کا خاتمۃ الطبع سرور نے خود لکھا ہے

۱؎ یہ نسخہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے۔

۲؎ طبقات الشعرائے ہند ص ۳۴۹

۳؎ فسانہ عجائب۔ رجب علی بیگ۔ مطبع محمدی کانپور۔

۴؎ رجب علی بیگ سرور۔ حیات اور کارنامے ص ۱۳۵

اور یہ بتایا ہے کہ محمد حسین کی فرمائش پر انھوں نے 'فسانہ عجائب' پر نظر ثانی کی ہے اور جہاں موقع پایا کچھ اور بڑھایا ہے۔ سرورؔ کی ان تبدیلیوں اور اضافہ کی وجہ سے فسانہ عجائب کا یہ اڈیشن دوسرے اڈیشنوں سے قدرے مختلف ہوگیا ہے۔"

ڈاکٹر نیر مسعود کے اس بیان سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سرورؔ نے ۱۲۵۹ھ سے ۱۲۶۷ھ تک "فسانہ عجائب" پر نظر نہیں ڈالی تھی۔ حالانکہ خود مطبع میر حسن سے جو دوسرا اڈیشن ۱۲۶۳ھ میں اور ۱۲۶۲ھ میں مطبع مصطفائی سے جو اڈیشن چھپے، ان پر بھی سرورؔ کی تحریر کردہ عبارت ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے نظر ثانی کی۔ اس کا ذکر اور تفصیل سے آ بھی چکا ہے۔

فسانہ عجائب کے پچھلے نسخوں میں کچھ نمایاں فرق نہ تھا سوائے دیباچے کے جس میں سرورؔ ہر بار کوئی نمایاں تبدیلی کر دیتے تھے۔ اس نسخے میں غیر معمولی تبدیلیاں ہیں۔ شاید ہی کوئی جملہ ہو جس کو سرورؔ نے جوں کا توں رہنے دیا ہو۔ یہانتک کہ عنوانات میں بھی تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ جہاں تک دیباچے کا تعلق ہے اس میں بھی زیادہ ترمیم و تنسیخ ہے۔ "بیان لکھنؤ" کے لئے مندرجہ ذیل عنوان ہے۔

"تقریر مورخ دل پذیر کیفیت شہر اور ذی کمال بے مثال ہر علم و فن کے کچھ اہل حرفہ دکاندار یادگار"۔

اس میں فقروں کی تبدیلی کے علاوہ ایک نمایاں تبدیلی اور بھی ہے۔ عام طور پر اس کے دوسرے نسخوں میں جب لکھنو کے مطبعوں کا ذکر کیا گیا ہے تو مطبع میر حسن کا خصوصیت سے ذکر ہے۔ لیکن اس نسخے میں مطبعوں کا ذکر سرے سے نہیں ہے اور لکھنو کے بارے میں دعائیہ اشعار کے بعد اکدم سے اپنے استادِ محترم کا ذکر کرنے کے بعد اس کو ختم کر دیتے ہیں۔

۱۲۷۱ھ میں "فسانہ عجائب" کا ایک اڈیشن بہ سعی مولوی فضل حسین عرف محمد فیض لکھنوی متخلص فضل، مطبع جمنا داس اور بلدیو سہائے پر چھپا۔ اس کا قطعہ تاریخ فضل حسین نے لکھا ہے ؎

ہر اک کہانی ہے دل لگی کی ہر ایک قصہ ہے ایک دفتر
بہ وقت چھاپہ یہ دل میں آیا لکھوں میں سالِ مسیح کو بھی
سر جمال جمیل سے لی سنِ مسیحی تو نفضل خوش تر
یہی حکایت ہے جان عالم جہاں میں شہرہ مچا ہے گھر گھر

اس کے ساتھ ہی محمد عبد البصیر متخلص بہ حضور بلگرامی[2] کا قطعہ بھی شامل ہے جس میں آخری مصرعہ سرور سینہ عشاق جان عالم باد (۱۲۷۱ھ)

اس کے خاتمے[3] پر مندرجہ ذیل عبارت ہے۔

'خاتمہ طبع طبع زاد مصنف کتاب ہے، اس کا بھی ایک فقرہ لاجواب ہے، بہ مثل زبان زد خاص و عام ہے، محقق کا کلام ہے کہ قبول خاطر و لطف سخن داد ہے۔ چنانچہ فسانہ عجائب کئی بار چھپا مگر اب تک لوگ اس کی تلاش میں ہیں نظر آتا نہیں کوئی پاتا نہیں۔ کس قصے کو اس سے ہمسری ہے۔ اس کی تمنا آج تک قدر دانوں کے سینے میں بھری ہے۔ یہ فقط عنایت پروردگار ہے۔ اس کا رشک و حسد بیکار ہے۔ بالفعل اس کے چھاپنے کا خیال دل صفا منزل میں لالہ جمنا داس دام اللہ فضائلہم کے آیا۔ بسکہ لالہ صاحب موصوف بصفات پسندیدہ معروف ہیں۔ تحریر فقیر اس مقدمے میں بیکار ہے۔ کالشمس نصف النہار عالم آشکار ہے جو کتاب اس کارخانے کی ہے، انتخاب ہے۔ کار پرداز ہوشیار کار فرما لاجواب جو جو سرگرم کاروبار ہیں۔ انھوں نے مولف فسانہ سے کہ تاریخ فرمان بدل و جان ہے ارشاد کیا کہ پھر بہ نظر غور ابتدا سے انتہا تک اس کو دیکھ جاتے، خدشہ رہنے نہ پائے۔ جب ارشاد اس خجستہ نہاد کے نیاز مند قدیم نے کوشش عظیم سے ملاحظہ کر کے جہاں موقع پایا کچھ اور بڑھایا۔ یقین کامل ہے کہ اب جس کی نظر سے یہ گذر جائے گا تازہ لطف نظر آئے گا۔ اگر جا، دل کو جو لگا یا ہے۔ تازہ فقرہ ہاتھ آیا ہے۔ اوقات کو بے کار نہیں کھویا ہے در شوار

---

[1] فسانہ عجائب ـ مطبع لالہ جمنا داس ـ کانپور ۱۲۷۱ھ ص ۱۳۷
[2] ایضاً ایضاً ایضاً ص ۱۳۷
[3] ایضاً ایضاً ایضاً اشاعت ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۵ء

سلک تقریر میں پرو دیا ہے منصفوں سے داد طلب ہوں
کہ کیا کیا خون دل پیا، لخت جگر کھایا ہے
جب اس طرح کا مضمون ہاتھ آیا ہے۔ دو
فقرے پسندیدہ لکھنا دشوار ہے۔ یہ تو ایک قصۂ
طول بڑا طومار ہے۔ خوشنودی طبع کے بعد امیدوار
دعا ہوں کہ اب بہ سر منزل آ پہنچا ہوں، شائق اس کو
جب پڑھیں گے دنیا میں ۔۔ کم نہ ہوں گے۔ جس تکلف سے اب کی
بار چھپا، ایسا کبھی نہ تھا جس جس طرح سے یہ مشہور ہوا سرورؔ
کو سرور ہوا فقط"

اس اڈیشن کی ایک دلچسپ خصوصیت یہ ہے کہ یہ محض اس اڈیشن کی نقل ہے جو ۱۲۶۷ھ میں حاجی حرمین شریفین محمد حسین کے مطبع محمدی میں شائع ہوا تھا۔ اس میں اگر کوئی فرق ہے تو یہی کہ اس کے خاتمۃ الطبع کی عبارت میں جہاں حاجی حرمین محمد حسین کا ذکر ہے وہاں پر لالہ جمنا داس کا نام لکھ دیا ہے۔ اسی طرح تمت کی عبارت بھی وہی ہے۔ گویا یہ نسخہ ۱۲۶۷ھ کے نسخے کی ہو بہو نقل ہے۔ اس میں سرور نے کوئی ترمیم تنسیخ نہیں کی۔

اب دو نسخوں کا خاص طور پر ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ ایک نسخہ وہ جو کانپور سے مطبع افضل المطابع محمدی سے مولوی محمد یعقوب انصاری نے شائع کیا۔ یہ نسخہ ۱۲۷۶ھ میں چھپا اور اس کی کتابت وطباعت بڑی اعلیٰ درجے کی ہے کہ شبہ ہوتا ہے کہ آفسٹ یا بلاک سے چھاپی گئی ہے۔ اس کا خاتمۃ الطبع بھی سرورؔ نے بطور خاص لکھا ہے:-

"فسانۂ عجائب[1] کہ اسم با مسمیٰ اور لاجواب ہے۔ کتب خانۂ کائنات میں انتخاب ہے۔ دوستوں کی تحریک سے باوجود مکروہات زمانۂ ناہنجار اور فکر معاش کے انتشار میں جناب مولوی محمد یعقوب صاحب نے افضل المطابع شہر کانپور میں چھاپا اور مصنف سے نظر ثانی کو ارشاد فرمایا۔ وہ ان کا حکم بجا لانا موجب مسرت جانتا ہے پھر اس کی دیکھا بھالی ہوئی صرف نازک خیالی ہوئی۔ یہ فقط کارخانۂ قدرت

---

[1] فسانۂ عجائب مطبوعہ افضل المطابع ص ۱۳۰

ہے عقل اس میں عاری ہے۔ برسوں سے اس کے چھپنے کا دور تسلسل جاری ہے۔ دوسری بار پھر جناب مولوی صاحب کا ارادہ ہے اور مصنف بھی بشرط فرصت نیا کر دینے کا آمادہ ہے۔"

مولوی محمد یعقوب انصاری فرنگی محل کے رہنے والے تھے۔ رجب علی بیگ سرور کے خاص دوستوں میں سے تھے اور سرور نے اپنے بیٹے کے خطوط میں متعدد بار ان کا ذکر بھی کیا ہے۔ وہ ایک اخبار طلسم بھی نکالتے تھے۔" بلکہ اس دور کے مقفیٰ اور مسجع عبارت آرائی کے بھی مرد میداں تھے۔ واجدی عہد میں سرور کی رنگینی بیان لکھنؤ کی روزمرہ بول چال میں بھی داخل ہونا شروع ہو گئی تھی۔ اگر انقلاب ۱۸۵۷ء نہ ہو گیا ہوتا تو کیا عجب تھا کہ یہ رنگ عرصے تک لکھنو کے مزاج پر غالب رہتا۔ اس مخصوص طرز انشا کے لکھنے والوں میں مولوی محمد یعقوب کا تیسرا درجہ تھا۔"[1]

مولوی محمد یعقوب انصاری کا انتقال ۱۹۰۸ء میں ہوا۔

سرور کو مولوی محمد یعقوب انصاری سے خصوصی تعلق تھا۔ اس کا اندازہ خاتمۃ الطبع کی عبارت سے بھی ہوتا ہے اور اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ بیان لکھنو میں سرور نے مطبع میر حسن کے ذکر کے بجائے مولوی صاحب کے مطبع کا ذکر کیا ہے:-

"مطبع[2] اس شہر میں اکثر سنگ کے ہیں۔ نمونے نیرنگ کے ہیں۔ مگر ہمارے شفیق و مہربان یک رنگ حاضر و غائب یکساں جناب مولوی محمد یعقوب صاحب مدظلہ عزیز دلہا ہمہ صفت موصوف ہیں۔ دور دور مشہور و معروف ہیں۔ سابق ازیں فرنگی محل میں چھاپہ خانہ تھا۔"

سرور نے بڑے ذوق و شوق سے اس کا ذکر کیا ہے۔ اس نسخے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ جب چھپا تو سرور بنارس میں تھے اور اس پر نظر ثانی کا کام بھی وہیں ہوا۔ یہ نسخہ غیر معمولی محنت سے تیار کیا گیا اس میں مولوی محمد یعقوب انصاری کی دلچسپی اور اصرار کو بے حد دخل تھا۔ سرور لکھتے ہیں:-

---

[1] "انیسویں صدی میں لکھنو کی اردو صحافت از نادم سیتاپوری مطبوعہ نیا دور۔ لکھنو ص۱۱

[2] فسانہ عجائب مطبوعہ افضل المطابع ص۱۰

" دفعتہً فلک نے یہ چکر کھایا حرف غلط کی طرح رگڑ کر شہر کو مٹایا۔ پردیں سے بنات النعش کی صورت نظر آئی۔ ایسا تفرقہ پڑا کہ پھر نہ کسی کی خبر پائی۔ فقیر حسب اطلب مہاراج ایشری پرشاد نرائن سنگھ بہادر راج بنارس دام حشمتہم بنارس میں آیا۔ شکر صد شکر کہ رئیس والا جاہ رعیت پناہ غریب نواز غربا پرور، باریک بیں، قدر شناس، سخی شجاع سخن فہم عدل گستر پایا۔ دو نوالا دوستوں کی تحریک سے مولوی صاحب کو شغل پارینہ منظور ہوا۔ پہلے عزم فسانہ سرور ہوا۔ اس کی صحت کی خاطر بندہ کو لکھا بجز اقرار چارہ نہوا انکار گوارا نہ ہوا۔ ہرچند یہ فسانہ بطرز زمانہ ہر ایک چھاپہ خانہ میں نیا نیا رنگ لایا جس نے چاہا، جس فقرے پر پانی پھرا، صفحہ کتاب سے بہایا۔ بقول فقیر جو مضمون سمجھ میں آیا یا نہ پڑھا گیا وہ کُند بسولے سے گڑھا گیا، جودتِ قلم نثاروں کی ہوئی، اصلاحِ خط یاروں کی ہوئی ــــ فقیر نے اس کے دیکھنے میں عرق ریزی از حد کی، حضرت کے خوف سے انتہا کی کد کی، جس جگہ محل اور موقع پایا ہے کیا کیا جملہ بڑھاپے میں بڑھایا ہے۔ ایسی متاعِ گراں بہا کس گنجینے میں ہے، جس کی جگہ ذی فہم قدر شناسوں کے سینے میں ہے۔"[1]

اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ سرور اس کی طباعت سے مطمئن نہ تھے اور یہ کتاب فی الواقع ایسی ہی چھپی جیسی کہ انھیں توقع تھی۔

ایک دوسرا نسخہ وہ ہے جو اس کے تین سال بعد مطبع احمدی شاہدرہ دلہائی ضلع میرٹھ سے محمد حسین صاحب مہتمم سابق مطبع مصطفائی دہلی نے ۲۸ جمادی الثانی ۱۲۷۹ھ کو شایع کیا۔ یہ ایڈیشن بھی بے حد احتیاط سے چھپا ہے۔ اس کا خاتمۃ الطبع محمد حسین خاں نے خود لکھا ہے:-

" شکر خدا کا کہ داستان دلکش تیسری بار چھپ کر اختتام کو پہنچی ــــ نہایت زیب و زینت سے انجام کو پہنچی۔ حسن صورت آشکار ہے ہمیں اس میں مبالغہ بیکار ہے۔ صفحہ صفحہ آئینہ سے دیکھ لیا چاہئے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا[2]

---

[1] فسانۂ عجائب۔ افضل المطابع ۱۲۷۶ھ۔ ص۱۰-۱۱

[2] فسانۂ عجائب۔ مطبع احمدی ۱۲۷۹ھ۔ ص۱۳۰

چاہئے۔ پہلے نقل اس نسخۂ مطبوع سے لی ہے جس پہ مصنف نے اپنی مہر کی ہے۔ پھر ان کے دستخطی نسخے سے مقابلہ کیا۔ ہر چند یہ کتاب جا بجا لکھنؤ چھپی مگر اس تہذیب کے ساتھ کم تر چھپی ـــــ غرض حسن صورت و معنی ایسا پسند ہوا کہ ایک زمانہ اس کا خواہش مند ہوا۔ اس کثرت سے خریداری ہوئی کہ تین بار شہر لکھنؤ میں چھپ کر دوبارہ صفحہ بصفحہ سطر بسطر مطبوعہ لکھنؤ سے نقل کر کے مطبع احمدی کے کہ شاہ درہ دلہائی ضلع میرٹھ میں واقع ہے، ساتھ اہتمام من ہیچ مدان کج مج زبان امیدوار مغفرت یزداں ـــــ یہ شاہد معنی زیور طبع محلی ہو کر منظور طابع شائقین ہوا۔"

اس نسخے میں مطبعوں کے ذکر میں پھر مطبع میر حسن[۵۱] کا ذکر ملتا ہے۔

میں نے اپنے نسخے کی بنیاد ان دونسخوں پر رکھی ہے اور میرا خیال ہے کہ ان سے بہتر نسخے ہیں بھی نہیں۔ مطبع احمدی کا نسخہ سرورؔ کے انتقال سے چھ سال پہلے چھپا۔

اس کے بعد ہمیں ایک اہم اڈیشن اور ملتا ہے۔ یہ ۱۲۸۴ھ/۱۸۶۸ء کا چھپا ہے۔

اس اڈیشن کو گورنمنٹ ہند صیغہ ہوم ڈیپارٹمنٹ کے حکم سے باہتمام میجر ڈبلیو ناسو لیس صاحب بہادر، سکریٹری بورڈ آف اکزامینرز۔ کالج پریس۔ کلکتہ، سے ٹائپ میں چھاپا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں نے اسے نصاب میں شامل کیا۔ اس کے ٹائیٹل پر لکھا ہے کہ "صاحبانِ عالیشان کی ڈگری کے امتحان کے لئے مقرر ہے۔"

یہ اڈیشن بہت صاف ستھرا ہے اور اس کی تصحیح بھی بڑی احتیاط سے کی گئی ہے۔

ایک ٹائٹل انگریزی میں بھی ہے، جس میں لکھا ہے "A new and revised edition" ـــــ گمان غالب کہ یہ اڈیشن سرورؔ کی زندگی میں ہی چھپا تھا لیکن اس میں خاتمۃ الطبع کی عبارت نہ ہونے کی وجہ سے مزید تفصیل نہیں معلوم ہوتی۔

اس اڈیشن سے کئی مسئلوں پر روشنی پڑتی ہے۔

ڈاکٹر نیرؔ مسعود لکھتے ہیں :-

> ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۷ء میں منشی نولکشور نے سرورؔ سے فسانۂ عجائب کا حق تالیف خرید کر رجسٹری کرا لیا۔ ۱۸۶۷ء میں فسانہ عجائب کا نولکشوری اڈیشن

---

۵۱ فسانہ عجائب مطبع احمدی ص۱۰۱

بڑی آب و تاب اور خاص اہتمام سے شائع ہوا۔[1]

ڈاکٹر نیرؔ نے اس ضمن میں ایک غیر قانونی اڈیشن کا ذکر کیا ہے جو وکٹوریہ پریس لاہور سے میاں چراغ دین اور میاں سراج الدین نے شائع کیا۔ وہ لکھتے ہیں :-

"مطبع[2] نولکشور نے "فسانۂ عجائب" کے نسخوں سے بازار کو پٹ کر رکھا تھا۔ لیکن "فسانۂ عجائب" کے کاپی رائٹ کی مدت (پچاس سال) ختم ہونے کے بعد دوسرے ناشروں نے بھی آزادانہ اس کتاب کو چھاپنا شروع کر دیا۔"

ڈاکٹر نیرؔ مسعود کی نظر سے غالباً یہ کالج پریس۔ کلکتہ کا ایڈیشن نہیں گزرا۔ جو واضح طور پر ۱۸۶۸ء کا چھپا ہوا ہے یعنی معاہدۂ نولکشور سے ایک سال بعد —— اس کے غیر قانونی ہونے کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ انگریزی ٹائیٹل کے مطابق "Published under the orders of the Govt. of India in the Home Deptt" ہے۔

اس سے یہ قیاس آرائی بھی کی جا سکتی ہے کہ نولکشور سے معاملہ ہونے سے پہلے ہی سرورؔ نے کالج پریس کو اس اڈیشن کی اجازت دے دی تھی۔ چونکہ اس کا مقصد محدود تھا اس لئے منشی نولکشور کو اعتراض بھی نہ ہوا۔

یہ نسخہ بہت اچھا چھپا ہے لیکن یہ طلباء کے لئے تیار کیا گیا ہے اس لئے اس میں کچھ جملے جو وصل سے متعلق ہیں، حذف کر دیئے گئے ہیں۔ باقی اور کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہے جو اور دوسرے ایڈیشنوں میں نہ ہو۔

اس کے بعد تو "فسانۂ عجائب" نولکشور دور میں داخل ہوئی اور پھر برس ہا برس نولکشور پریس سے چھپتی رہی اور اس کا سلسلہ تاحال جاری ہے۔ نولکشور نے ایک جدت یہ کی کہ اس کے مصور اڈیشن بھی چھاپے۔ ایک مصور اڈیشن پر پنڈت رتن ناتھ سرشار نے تقریظ بھی لکھی۔ اس وقت جو نولکشوری اڈیشن بازار میں ملتا ہے اس میں بھی تصویریں ہیں۔ بعض تصویریں بہت اچھی ہیں لیکن یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان تصویروں کے بنانے میں نولکشور پریس کے خوشنویسوں ہی کا ہاتھ ہے۔ ۱۸۷۵ء/۱۲۹۲ھ کا جو اڈیشن ہے

---

[1] رجب علی بیگ سرور۔ حیات اور کارنامے ڈاکٹر نیرؔ مسعود ص ۱۳۶

[2] ایضاً ایضاً ڈاکٹر نیرؔ مسعود ص ۱۳۷

اس کی کتابت شیخ امیر اللہ تسلیم نے کی اور اس اڈیشن کا قطعہ[۱] بھی لکھا۔ جس کا آخری مصرعہ ہے۔ ع

چھپا کیا بے مثال افسانۂ عشق
۱۲۹۲

جیسا کہ ان مختلف نسخوں کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرور نے اپنی اس اہم کتاب پر بار بار نظر ثانی کی لیکن اس کے باوجود وہ اپنی تصحیح سے خود مطمئن نہیں ہوئے اور خوب سے خوب تر بنانے کی فکر میں لگے رہے یہاں تک کہ نظر ثانی کرنے کے بعد پھر اس کو ٹھیک کرنے کا خیال رکھتے تھے جیسا کہ افضل المطابع کے اڈیشن سے معلوم ہوتا ہے۔

"دوسری بار[۲] پھر جناب مولوی صاحب کا ارادہ ہے اور مصنف بھی بشرط فرصت نیا کر دینے کا آمادہ ہے۔"

تاہم جب ہم بہ نظر غور دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سرور نے متن قصے میں بھی کچھ تبدیلیاں کی ہیں۔ خیال یہ ہے کہ پسر مجسٹن کا قصہ عہد نصیر الدین حیدر میں لکھ کر شامل کیا ہوگا۔ لکھنؤ میں ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء میں انگریزوں کا کوئی خاص اثر نہ تھا، خیال ہے کہ انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار نے غیر شعوری طور پر سرور کو متاثر کیا ہو، اس کے علاوہ انجمن آرا کے جہیز کے سامان میں "عطر سہاگ، مہک پری، ایجاد نصیر الدین حیدری ارگجہ محمد شاہی" اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اس کا اضافہ عہد نصیر الدین حیدر میں کیا گیا ہوگا۔ یہ اضافہ ایک آدھ جگہ اور بھی محسوس ہوتا ہے۔ سرور نے بندر کی تقریر میں زندگی اور موت کے فلسفے پر جو نثر لکھی ہے اس نثر سے بہت ملتی جلتی ہے جو محمد علی شاہ کے جنازے کے موقع پر "احوال محمد علی شاہ" میں 'فسانہ عبرت' میں لکھی ہے۔ اس سلسلے میں گذشتہ اوراق میں بحث کی جا چکی ہے۔ متن قصے کے علاوہ سرور نے فقروں اور ترکیبوں میں بھی تبدیلیاں کی ہیں۔ "بیان لکھنؤ" میں یہ تبدیلیاں بہت نمایاں ہیں۔ میری نظر سے ایک بہت خوبصورت قلمی نسخہ گذرا ہے۔ افسوس کہ اس پر نہ کاتب کا نام درج ہے اور نہ سن تحریر موجود ہے، جس سے اس نسخے کے بارے میں زیادہ معلومات

---

[۱] فسانۂ عجائب نولکشور۔ ۱۲ واں اڈیشن ص ۲۲۲

[۲] 〃 افضل المطابع ۱۲۷۶ھ ص ۱۳۰

حاصل ہو سکیں۔ یہ نسخہ کبھی کسی مرتضیٰ حسین صاحب کی ملکیت تھا، جس پر اُن کی دستخط ہے اور پتہ مرتضیٰ حسین روڈ لکھنو درج ہے۔ اب یہ نسخہ آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں موجود ہے۔ اس نسخے میں بعض قابلِ توجہ تبدیلیاں ہیں۔ میں نے اسے اپنے نسخے میں شامل کیا ہے۔ اس میں تقریباً پانچ چھے صفحے زیادہ ہیں جو کسی مطبوعہ نسخے میں نہیں ملتے۔ اس میں لکھنو کا ذکر ذرا تفصیل سے ہے لیکن چونکہ بقول خود سرور "بسکہ خامہ مولف اختصار رقم ہے" اس حصے کو بعد کے نسخوں سے نکال دیا۔ یہ صفحات لکھنو کے بارے میں مزید روشنی ڈالتے ہیں اس لیے میں نے اسے خاص طور پر شامل کر دیا ہے۔

بیان لکھنو کی تحریک کے سلسلے میں ڈاکٹر نیر مسعود کا خیال ہے کہ:

"سرور کے ذہن میں لکھنو کا حال لکھنے کا خیال پیدا کرنے کے ذمہ دار بظاہر میر حسین عطا خاں تحسین ہیں۔ تحسین نے "نوطرز مرصع" کے دیباچے میں اپنے دار السلطنت اودھ فیض آباد کا تعریفی بیان کیا ہے۔ یہ بیان اگرچہ مختصر ہے اور اس میں محض عبارت آرائی کی گئی ہے۔ لیکن سرور کے "بیان لکھنو" کی تحریک غالباً اسی سے ہوئی۔ تحسین اور سرور کے بیانات کی ابتدا میں ہلکی سی مماثلت بھی ملتی ہے۔ تحسین لکھتے ہیں:۔

"سبحان اللہ! ہر صفحہ اس صحیفہ فیض کا — ایک گلشن ہے — اور ہر کوچہ — اس کا علحدہ علحدہ ایک گلبن ہے"

سرور لکھتے ہیں:۔

"سبحان اللہ وبحمدہ! عجب شہر گلزار ہے۔ ہر گلی کوچہ دلچسپ باغ و بہار ہے"

"تحسین کے علاوہ سرور میر حسن سے بھی متاثر معلوم ہوتے ہیں"[۱]

لیکن مجھے یہ دور کی کوڑی معلوم ہوتی ہے۔ محض چند جملوں کی مماثلت بہت اہم نہیں۔ معاملہ غالباً یہ تھا کہ سرور شاہی ملازمت حاصل کر کے لکھنو آنا چاہتے تھے تاکہ وقعت اور اعزاز زیادہ ہو اور وہ حاسدین پر غالب آسکیں اس لئے انھوں نے بادشاہ اور اس کے مستقر کی مدح سرائی کی — غازی الدین حیدر نے دہلی کے

---

[۱] رجب علی بیگ سرور۔ حیات اور کارنامے۔ ڈاکٹر نیر مسعود ص ۱۲۶

بادشاہ سے علیحدگی اختیار کرکے بادشاہت کا اعلان کیا۔ اہل لکھنو نے زندگی کے کم و بیش ہر شعبے میں آزادی اختیار کی تھی۔ چنانچہ سرورؔ نے بھی لکھنو کی تعریف اور کانپور کی مذمت کی (کانپور انگریزی عملداری میں تھا) ناسخؔ نے بھی لکھنو کی تعریف کی ہے۔ ناسخ کے شاگردوں میں آغا علی خاں مہرؔ نے بھی بادشاہ کی خوشنودی کی خاطر غزلوں میں دہلی اور اصفہان کی مذمت اور لکھنو کی تعریف کی ہے۔ یہ جذبہ اہل لکھنؤ میں اس وقت بھی موجود تھا اور اب بھی ہے۔

سرورؔ نے جو غزل لکھنو پر لکھی ہے اس میں بادشاہ وقت کی مدح بھی سموئی ہوئی ہے اور لکھنو جانے کا جذبہ بہ شدت تمام منظوم ہے ؎

رشک کھا کھا کو فلک مجھ سے چھڑائے لکھنؤ | تب میں جانوں دل سے جب میرے بھلائے لکھنؤ
یا تو ہم پھرتے تھے ان میں یا ہوا یہ انقلاب | پھرتے ہیں آنکھوں میں ہر دم کوچہ ہائے لکھنؤ

سرورؔ لکھنو کی تہذیب سے ہر طرح متاثر تھے۔ انھیں لکھنؤ نے محبت بھی دی تھی اور سزا بھی دی۔ یہ سزا ان کے لئے اور بھی زیادہ اس لئے تھی کہ وہ لکھنؤ کے شباب کا زمانہ تھا۔ لکھنؤ اپنی دولت لٹا رہا تھا لیکن سرورؔ کے حصے میں اس دولت کے پھول نہیں کانٹے ہی آئے۔ اس لئے انھیں قلق بھی زیادہ ہے۔ اس کے بعد جب وہ واپس آئے تو لکھنؤ کی یہ چاندنی چند روزہ تھی۔ ۱۸۵۶ء میں سلطنت اودھ ختم ہوگئی، بادشاہ معزول ہوگئے اور پھر ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ء میں غدر کی تباہی آئی۔ سرورؔ پریشان حال رہے اور ۱۸۵۹ء مہاراجہ بنارس کی دعوت پر بنارس چلے گئے۔ بنارس سے انھوں نے اپنے بیٹے کے نام متعدد خطوط لکھے جو انشائے[ل] سرور کے نام سے بعد میں چھپے لیکن ان میں لکھنؤ کا ذکر کسی خصوصیت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔

سرورؔ حقیقت پسند ہیں۔ وہ مبالغہ کے اسی حد تک قائل ہیں جتنا ادب کے لئے ضروری ہے۔ ان کا دیباچہ دو حصوں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ پہلا حصہ جو روایتی طریقے سے حمد، نعت، منقبت اور بادشاہ وقت کی مدح پر مشتمل ہے۔ دوسرا حصہ وہ جو بیان لکھنو سے تعلق رکھتا ہے۔

سرورؔ نے اپنے عہد کے مزاج کو اپنی شخصیت میں سمو لیا تھا اور انھوں نے ان

لہ انشائے سرورؔ کی اشاعت مرزا رجب علی بیگ سرورؔ کے انتقال کے بعد مطبع نولکشور سے ہوئی اس کی ان کے صاحبزادے احمد علی نے ترتیب دیا۔ سن طباعت ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۲ء

تمام روایات کو برقرار رکھا جسے اُن کے عہد نے سینے سے لگایا تھا۔ بادشاہِ وقت کی مدح بھی ایک جانب روایت کی تائید میں اور دوسری جانب اپنے مقصد کے حصول کی جدوجہد میں لکھی گئی ہے۔ سرورؔ خود دار تھے۔ وہ خود بھی لکھتے ہیں:-

"تین[1] دن میں یہ خط لکھا ہے۔ طبیعت کیا کیا رُکتی ہے، کمر جھک گئی مگر گردن نہیں جھکتی ہے۔"

---

[1] انشائے سرور، ص ۲۲

فسانۂ عجائب

ایک تنقیدی مطالعہ

"فسانہ عجائب" اردو کی اہم ترین داستانوں میں سے ہے اور اس کا شمار انیسویں صدی کی اُن کتابوں میں ہوتا ہے، جنھوں نے اپنے زمانے کے ادب کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا اور قبول عام کی سند حاصل کی۔ یہ اپنے عہد کی اُن چند کتابوں میں گنی جاتی ہے جنھیں آج بھی اردو داں طبقہ نقادوں کی رایوں سے متاثر ہوئے بغیر بڑے ذوق و شوق سے پڑھتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ فسانہ عجائب کے بغیر اردو نثر کا مطالعہ نامکمل ہے تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔

ادب کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس میں اپنے عہد کی روح چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ جب ہم عہد کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ ہر عہد اپنے ماضی کی بنیادوں پر کھڑا رہتا ہے اور یہ ماضی دکھائی نہیں دیتا، لیکن بنیادیں بھی تو دکھائی نہیں دیتیں۔ ماضی حال میں اس طرح گھل مل جاتا ہے جیسے دو دریاؤں کے پانی سنگم پر آکر ایسے بہتے ہیں کہ اُن کا فرق کرنا مشکل ہوتا ہے۔ زمانہ حال اس لحاظ سے دلچسپ ہوتا ہے جہاں اس کی آغوش میں ماضی ہوتا ہے وہاں اس کے بطن میں مستقبل پرورش پاتا ہے۔ گویا ہر حال اپنی جگہ پر ایک اکائی ہوتے ہوئے بھی ماضی اور مستقبل کے

سروں کو جوڑتا ہے۔

رجب علی بیگ کا قصہ جان عالم اور انجمن آرا کا —— اپنے عہد کی روح کو بڑی کامیابی سے اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اس میں ہمیں داستان، قصہ اور ناول کا ایک امتزاج نظر آتا ہے۔ یہ اس عہد کی تصنیف ہے، جب صدیوں کے ہندستانی سماج میں اُتھل پتھل کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ ہم ادب میں داستانوں کے دور سے آگے بڑھ چکے تھے، لیکن داستانیں ہمارا ساتھ چھوڑنے کو تیار نہ تھیں۔ وہ روپ بدل بدل کر ہمیں لبھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ داستانوں کی اپنی تہذیب ہوتی ہے اس کے اپنے آداب ہوتے ہیں۔ یہ مافوق الفطرت عناصر سے آراستہ ہوتی ہے لیکن اپنے عہد کی معاشرت اور اس کی روح کی غماز بھی۔ آپ داستانوں کے آئینہ خانے میں ماضی کی جھلکیاں دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں آپ کو انسانیت کے بچپن کی کلکاریاں نظر آئیں گی۔ ممتاز حسین نے صحیح لکھا ہے:—

"داستانوں[1] سے لطف اندوز ہونے کی ہماری صلاحیت کم نہیں ہوئی ہے بلکہ اس کے برعکس کچھ زیادہ بڑھی ہے کیونکہ اب ہم داستانوں کی جذباتی اور داخلی گرفت سے آزاد ہو گئے ہیں۔ آج ان کا تجزیہ ہم خارجی انداز سے کرنے پر قادر ہیں۔"

داستانیں ایک ایسے عہد کی پیداوار ہیں جو فطری عہد کی کشش بھی رکھتا ہے۔ یہ جاگیرداری تمدن کی روایات کو ادب اور تہذیب کی شکل میں محفوظ بھی رکھنا چاہتا تھا۔ یہاں خواب وخیال کی دنیا بھی تھی، اور انسانی تخیل کی اُڑان بھی، جو کبھی ستاروں کو چھو لینا چاہتا تھا تو کبھی پاتال پر بھی اپنے نقشِ قدم چھوڑنا چاہتا تھا۔ یہ انسانی تہذیب کے اوائل کے تحیر کی بہترین مثال ہے۔ انسان اپنے تخیل کی بنا پر بڑی امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اپنے تخیل کی مدد سے وہاں تک پرواز کرنا چاہتا ہے، جہاں خود اس کے پَر جلتے ہیں۔ وہ اپنی خواہشوں اور آرزوؤں کو تصویروں میں ڈھال لیتا ہے اور زندگی میں جو کچھ حاصل نہیں کر سکتا، انھیں خواب وخیال کی دنیا میں حاصل کرنا چاہتا ہے خوابوں کی نفسیات کے جواز میں یہ بات کہی گئی ہے کہ وہ آرزوئیں جنھیں ہم دن کی روشنی میں حاصل نہیں کر سکتے، انھیں خوابوں کے دھندلکے میں حاصل کرتے ہیں۔ گویا انسان اپنے مقاصد کے حصول میں کسی طرح مایوس

---

[1] دیباچہ باغ وبہار سے اقتباس۔

نہیں ہوتا۔ وہ اگر اپنی ناتوانی کی بنا پر دشمن پر قابو نہیں پا سکتا تو پھر کسی درویش کی لوح یا حضرت سلیمان کے تعویذ یا کسی رشی کا بتایا ہوا عمل اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ اسی لئے ہمیں داستانوں کو پرکھتے ہوئے حقیقت پسندی اور صداقت کے نئے معیاروں کو نظر انداز کرنا ہوگا بلکہ یہ سمجھنا ہوگا کہ داستان زندگی کے ارتقا کا استعارہ ہے۔ یہاں زندگی کا راز امید پر ہے نہ کہ ناامیدی پر۔ اس کا انجام ارتقاء کے اصولوں کی طرح ہمیشہ رجائی ہوتا ہے۔ یہاں انسان کی شکست نہیں ہوتی۔ یہاں انسان ہارتا نہیں، ورنہ اس کے خواب چکنا چور ہو جائیں۔ یہاں اگر وہ بندر بھی بن جاتا ہے تو پھر اس کو اپنی شکل مل جاتی ہے۔ اگر وہ مارا جاتا ہے تو ایک نئی جدوجہد کر کے اس کا سر دوبارہ جوڑ لیا جاتا ہے۔ وہ بوٹیاں تلاش کی جاتی ہیں جو اسے نئی زندگی عطا کریں۔ کبھی انسانوں کی غلطی سے یہ سر غلط جڑ جاتے ہیں لیکن داستان لکھنے والا غیر انسانوں سے انسانوں کا مذاق نہیں اڑوانا چاہتا، اس لئے اس سر کو دوبارہ کاٹ کر جوڑ لیا جاتا ہے اور پھر یہ انسان اپنے دشمنوں پر فتح پاتا ہے۔ کوئی داستان المیہ پر ختم نہیں ہوتی۔

داستانوں میں وہ معصومیت ہوتی ہے جو ابتدائی انسان کا خاصہ تھی۔ یہاں زندگی دو خانوں میں بٹی ہوئی ہے، نیک و بد میں۔ ہماری موجودہ تہذیب اس طرح دو خانوں میں نہیں بانٹی جا سکتی۔ داستان کا ہیرو ایک خیالی دنیا میں رہتا ہے جہاں اسے نہ روٹی کا مسئلہ پریشان کرتا ہے اور نہ اس کے ذمے کوئی فرائض ہیں۔ اور بقول مارجوری بولٹیں وہ زخم سے چور چور ہو کر مر سکتا ہے لیکن کوئی بیماری اس کا خاتمہ نہیں کر سکتی۔ داستانوں میں ہمیشہ بڑے بڑے واقعات ہی پیش آتے ہیں۔

جس دور نے داستانوں کو جنم دیا، انھیں پروان چڑھایا، وہ دور جب ختم ہونے لگا تو اس وقت انسان کی فطرت کے سامنے مجبوری ختم ہو چکی تھی اور مخلوقات میں اس کی حیثیت کسی غیر اہم مخلوق کی سی نہ تھی بلکہ وہ ان معنوں میں اشرف المخلوقات تھا کہ اس نے اپنے بل بوتے پر نہ صرف یہ کہ مدافعتی طریقے اختیار کر لئے تھے موسموں کے سامنے اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے لگا تھا بلکہ اس نے اپنی ضروریات زندگی سے آگے بڑھ کر اپنی آسائش کے وسیلے تلاش کرنے شروع کر دیئے تھے اور اس کی حیرت میں بھی کمی ہو چکی تھی جو تہذیب کے بچپن کی علامت تھی۔ داستانیں انسانوں کے سینے کے اندر نہیں اترتیں،

وہاں داخلی اور باطنی دنیا کی پیچیدگی نہیں، خارجی دنیا کے صاف و شفاف مناظر ہیں جنھیں تخیل کی مدد سے مبالغے کی صورت دی گئی ہے۔ ناول میں زندگی کی حقیقی تصویریں اپنی بدلی ہوئی شکل میں ملتی ہیں۔ یہاں آپ کو جو کردار نظر آتے ہیں وہ بڑے عظیم الشان ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں عظمت اور صلابت ہوتی ہے لیکن ذہن کا عنصر نہیں ملتا۔

داستانوں میں احساسِ عزت اس بات میں ہے کہ جنگ و جدل برپا کیا جائے۔ بات بات پر تلواریں سونت لی جائیں۔ بہادری اس میں ہے کہ ہر چلینج کو قبول کر لیا جائے۔ یہاں موت کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے گویا اس کا زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہاں محبت اس لئے نہیں کی جاتی کہ اس کا کوئی انعام ملے گا بلکہ اس کے لئے کہ محبت اپنا انجام خود ہے اور اصل محبت وہ ہے جس کے لئے تکلیفیں اٹھائی جائیں، جہاں محبت کے لئے ناممکن کو ممکن کر دیا جائے۔ داستان گو عقیدے کے اعتبار سے عینیت پرست یا آدرش وادی ہوتا ہے۔

ہمارے عہد کے ناولوں میں زندگی کا حقیقت پسندانہ اظہار ملتا ہے۔ ناول کے لئے زندگی کی ترجمانی بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ یہاں اگر زندگی سے کوئی انحراف ہے تو صرف اتنا کہ زندگی کا دریا آزادانہ بہتا ہے، اسے فن کے سانچے میں ڈھال کر ایک مخصوص ہیئت دے دی جاتی ہے۔ داستانوں میں آرزومندی ملتی ہے جب کہ ناول میں بے درد حقیقتوں کا سامنا کیا جاتا ہے۔

پروفیسر کلیم الدین احمد لکھتے ہیں[۱] :-

" ابتدائی قدیم قصے جو عموماً کسی قوم میں متداول نظر آتے ہیں، وہ مختلف دلچسپیوں کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ قصے خلا میں سانس نہیں لیتے اور نہ خلا میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی اس قوم کے شعور و تخیل سے آبیاری ہوتی ہے۔ ان میں اس قوم کے تخیل کی ابتدائی نوخیز قوت پرواز کا عکس نظر آتا ہے۔ ان میں اس قوم کے شعور کی پہلی معصوم، تتلاہٹ سنائی دیتی ہے۔ اسی آئینہ میں بہت سی وہ چیزیں نظر آتی ہیں، جن میں وہ قوم شروع میں دلچسپی لیتی تھی اور جو اس کی دماغی اور جذباتی قوتوں پر پُرزور محرکات کا کام کرتی

---

[۱] اردو زبان فن داستان گوئی ص ۱۲-۱۳

تھیں۔ اسی آئینہ میں وہ سب باتیں نظر آتی ہیں جن میں اسے یقین کامل تھا اور جنھیں وہ واقعیت اور حقیقت کا جامہ پہناتی تھی۔ اسی آئینہ میں وہ سب تصورات بھی ملتے ہیں جو محض تصورات نہ تھے بلکہ اس کے خیال میں ہونے والے واقعات سے زیادہ مضبوط اور پائدار تھے اور اسی آئینہ میں وہ مافوق العادت ہستیاں، واقعات، چیزیں وہ وہم وگمان کے مرقعے، وہ مذہبی عقائد بھی اپنی جھلک دکھلاتے ہیں، جنھیں وہ صحیح سمجھتی تھی۔ الغرض ان کہانیوں سے قوم کی ابتدائی مجموعی اور اس کے افراد کی انفرادی کاوشوں کی پہچان ممکن ہوتی ہے۔"

متذکرہ بالا تجزیے کی روشنی میں اگر ہم فسانہ عجائب کا مطالعہ کریں تو ہمارے لئے یہ مشکل ہو جائیگا، ہم اسے کس خانے میں رکھیں۔ اس میں وہ رجائیت ملتی ہے جو داستانوں کی عام خصوصیت ہے، لیکن یہاں زندگی دو خانوں میں بٹی ہوئی بھی نہیں ہے۔ یہاں ناول کی طرح بڑے بڑے واقعات سے قطع نظر چھوٹے چھوٹے واقعات بھی نہیں ملتے، جن کے سہارے زندگی چلتی ہے اور جو کرداروں کے عمل اور ردعمل کی تشکیل میں مدد کرتے ہیں۔ یہاں ایک مربوط قصہ ہے جو اپنے منطقی انجام تک پہنچتا ہے، جہاں واقعات اور حادثات کو ایک پلاٹ کے اندر ایک ڈور میں پرو دیا گیا ہے۔ یہ ڈور نہ تو کہیں ٹوٹتی ہے اور نہ کہیں سے ڈھلکتی ہے بلکہ اس میں تناؤ بھی ہے اور ہمواری بھی۔ اس کے پلاٹ میں وحدت بھی ہے اور تسلسل بھی۔ یہ اس طرح قائم رکھا گیا ہے کہ ہر کردار اور ہر واقعہ اپنے اپنے زاویے سے پلاٹ کی طرف روشنی ڈالتا ہے۔ یہ اسے داستان سے زیادہ ناول کی طرف لے جاتا ہے۔ علی عباس حسینی لکھتے ہیں:۔

"تصنع اور تکلف کے باوجود فسانہ عجائب کا بھی ناول کے ارتقاء میں خاصا حصہ ہے۔ وہ طبع زاد ہے لکھنو کی حقیقی زندگی کا مرقع ہے اور اس تہذیب و ذہنیت کا نقشہ جو اس وقت دورِ سرور میں محبوب و مقبول تھی۔"[۱]

پلاٹ کی خصوصیت کے علاوہ 'فسانہ عجائب' میں کردار نگاری کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ جو فرد کے ساتھ ساتھ معاشرت کی جھلکیاں بھی پیش کرتے ہیں۔ کرداروں کا عمل ان کے

---

[۱] ناول کی تاریخ و تنقید۔ ص ۱۴۸

اپنے مخصوص مزاج کا آئینہ دار ہے۔ سرورؔ نے جس عہد میں جنم لیا وہ زمانہ قصّوں میں کردار نگاری کا زمانہ نہیں تھا۔ کرداروں کا عمل کسی مخصوص سماجی یا نفسیاتی ردعمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اسی لئے اگر اس عہد کی داستانوں میں ہمیں کہیں کہیں کردار نگاری کی جھلکیاں مل جاتی ہیں تو وہ ایک حد تک قصہ نگار کی غیر شعوری کوشش ہے۔ عزیز احمد نے درست لکھا ہے کہ

"طلسمی داستانوں کے دور میں اور اس کی پیداوار کے طور پر ایک کتاب ایسی ظہور میں آئی جو ناول سے بہت قریب ہے۔ یہ مرزا رجب علی بیگ سرورؔ کا فسانۂ عجائب ہے"[1]

لیکن "فسانۂ عجائب" اس لحاظ سے اپنے عہد کی داستانوں سے مختلف ہے۔ گویا وہ ایک ایسے دور کی نشاندہی کرتا ہے جب کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے، کی طرح سرورؔ کے ایک طرف داستان تھی تو دوسری طرف ناول کی پیدائش کا زمانہ بہت قریب تھا۔ وہ داستان کے عہد کا اختتامیہ اور ناول کے عہد کی بشارت ہیں۔

رجب علی بیگ سرورؔ نے اپنے ماحول سے پورے طور پر فائدہ اٹھایا ہے اور اس ماحول کو اس خوبصورتی سے قصے کے پس منظر میں سمو لیا ہے کہ کبھی کبھی پڑھنے والوں کو یہ ماحول حقیقی کے بجائے تخیلی معلوم ہوتا ہے لیکن یہ فن وہی ہے، جسے فن کا چھپانا بھی کہہ سکتے ہیں۔

رجب علی بیگ اس شہر کے رہنے والے تھے جس نے کم وبیش ایک صدی تک ہندستانی تہذیب پر اپنا سایہ ڈالا ہے۔ لکھنو کو ان معنوں میں مرکزیت حاصل نہ تھی، جن معنوں میں دہلی کو حاصل تھی کہ وہ شمالی ہند کی شاہراہِ عام بنا ہوا تھا بلکہ لکھنو الگ تھلگ تھا۔ اسی لئے جب دہلی کے اجڑنے کے بعد مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا تو لکھنؤ میں ایک دربار جما۔ یہاں کی تہذیب نے بہت جلد اپنی روایتوں کی بنیادیں مضبوط کرلیں کہ یہاں کا کہا سنا بھی مستند سمجھا جانے لگا۔

ڈاکٹر نیرؔ مسعود لکھتے ہیں:۔

"آصف الدولہ نے فیض آباد کو چھوڑ کر لکھنو کو اپنا مستقر بنایا تو اچانک[2]

---

[1] اردو ناول کے خد وخال [2] رجب علی بیگ سرور۔ حیات اور کارنامے ص ۲۵-۲۶

لکھنؤ شمالی ہند کا مرکز بن گیا۔ آصف الدولہ کی دلآویز شخصیت، بے اندازہ فیاضی، علم دوستی، اور اہل ہنر کی قدر دانی نے بہت جلد لکھنؤ کو مرجع خلائق بنا دیا۔ جس وقت دہلی سلطنت کا چراغ بجھ رہا تھا لکھنؤ کے چراغ کی لو اونچی ہو رہی تھی۔ تاریخ اور ادبیات کے واقف خوب جانتے ہیں کہ اس زمانے میں لکھنؤ کے کتنے اہل ہنر، اہل علم اور شاعروں نے لکھنؤ کو آبسایا۔ گردش زمانہ نے دہلی کے چراغ کا بچا کھچا روغن لکھنؤ کے چراغ میں انڈیل دیا۔ دہلی ہی نہیں، ہندوستان بھر سے قدر دانی اور معاش کے طلب گاروں نے کھنچ کھنچ کر لکھنؤ آنا شروع کر دیا اور یوں لکھنؤ کی تہذیب کی تشکیل ہوئی۔ اس تہذیب کے پس پشت صدیوں اور قرنوں کے تجربات و حوادثات کارفرما نہیں تھے چند سال کے اندر اس تہذیب نے اپنی ارتقائی منزلیں طے کرلیں اور پھر بہت تیز رفتاری کے ساتھ ثقافت اور معاشرت کے لحاظ سے ایک واضح اور منفرد شکل اختیار کر کے اپنے عروج کی انتہائی منزل تک پہنچ گئی۔"

اگرچہ سیاسی طور پر لکھنؤ کو کوئی خصوصی اہمیت حاصل نہ تھی اور نہ لکھنؤ نے سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن تہذیب کے میدان میں لکھنؤ نے اپنا سکہ جما لیا اور شمالی ہند میں بہت دنوں تک تہذیب و شرافت لکھنؤ سے منسوب ہوتی رہی۔ تہذیب و معاشرت کے بننے میں ہمیشہ کچھ اصولوں کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے اور ان اصولوں کے لئے قوانین اور ضوابط اپنے آپ مرتب ہو جاتے ہیں۔ زندگی کا یہ انداز ہمیشہ کلاسیکی ہوتی ہے اسے اپنے ان اصولوں کی بنا پر بغاوت سے چشم پوشی بھی کرنی پڑتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طرز کہن پر اڑنا کبھی کبھی اس کا مقدر بھی بن جاتا ہے۔ یہی بات لکھنؤ کے بارے میں کہی جا سکتی ہے کہ یہاں تہذیب و معاشرت اپنے مقررہ قوانین پر برسوں قائم رہی اور اس سے انحراف خلاف تہذیب سمجھا جانے لگا۔ ان معاشرتی اور تہذیبی اصولوں کی گرفت بہت مضبوط اور زندگی کے ہر شعبے میں ان کی کارفرمائی تھی۔ چلنے، پھرنے، اٹھنے، بیٹھنے، ملنے جلنے، لکھنے پڑھنے، کھانے پینے اور سونے جاگنے کے آداب ـ غرض زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا شعبہ ہو جو ان قوانین کی گرفت سے آزاد ہو۔

جہاں معاشرتی و تہذیبی قوانین اتنے مضبوط اور منضبط، وہاں ادب اس کی گرفت

سے کیوں کر آزاد رہ سکتا تھا۔ چنانچہ اس کا پرتو ادب پر بھی پڑا۔ اگر ہم اس زمانے کے لکھنوی ادب کا مطالعہ کریں تو ہمیں لکھنو کے معاشرے کا کرتا پن صاف طور پر نظر آئے گا۔

انیسویں صدی عوام کی صدی نہیں تھی۔ یہ خواص کی صدی تھی۔ رؤسا، امرا، یا بالفاظ دیگر شرفا کی، جو شرافت اور نجابت کے امین و پاسبان سمجھے جاتے تھے۔ کسی چیز کا عوامی ہونا، اس کے گھٹیا اور پست ہونے کی دلیل سمجھی جاتی تھی۔ اعلیٰ اقدار کے پاسدار عوام نہ تھے اس لئے کہ وہ تہذیب سے کوئی سروکار نہ رکھتے تھے اور رکھتے بھی کیوں، تمدن کی ساری اجارہ داری تو خواص کے ہاتھوں میں تھی۔ اس لئے اس عہد کے ادب میں عوامی زندگی کی جھلکیاں شاذ و نادر ہی نظر آتی ہیں۔ چنانچہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ لکھنو کے ادب میں لکھنو کی زندگی جھلک رہی ہے تو اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ لکھنو کے عوام الناس کی طرف اشارہ ہے۔ اس لئے کہ انیسویں صدی میں لکھنو کی زندگی، عبارت تھی، لکھنو کے شرفا کی زندگی سے۔ اس لئے انیسویں صدی کی داستانوں میں لکھنو کی، جس زندگی کی عکاسی ملتی ہے، وہ یہی خواص کے طبقے کی زندگی ہے۔ اس کے معنی یہ بھی نہیں ہیں کہ عوام کے ذکر سے ہمارا ادب بے نیاز رہا بلکہ ضمنی طور پر کہیں کہیں ان میں عوام کی جھلکیاں بھی نظر آجاتی ہیں۔ لیکن اس کی حیثیت محض ایک جھلک کی ہے۔

اسی لئے جب ہم اس عہد کے ادب کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو پھر ہم کو آج کے معیاروں سے انیسویں صدی کی معاشرت کا تجزیہ نہیں کرنا چاہئے۔ اگر ایسا کیا جائے گا تو اس عہد کے ساتھ پورا انصاف نہ ہو سکے گا۔

فسانۂ عجائب میں ہمیں خاص طور پر عوامی کردار اور شخصیتیں نظر نہیں آتیں۔ یہاں بھی ہمیں شہزادے، شہزادیاں، وزیر زادے نظر آتے ہیں۔ اگر کچھ خادمائیں، آیائیں یا اس قبیل کے کردار نظر آتے ہیں تو ان کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہ تصویر کے رنگوں کو ابھارنے کا کام کرتے ہیں۔ یہاں اگر کوئی چڑیمار ہے تو اس کی اپنی کوئی خاص حیثیت نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ رجب علی بیگ کے جادو نگار قلم نے چڑیمار اور اس کی بیوی کے کردار کو جاندار بنا دیا ہے۔

رجب علی بیگ کا سارا زور شرفا پر ہے۔ یہ شرفا لکھنو کے ہیں، چاہے وہ دیار ملک مہرنگار ہو یا ملک زرنگار ہو ـــــ جان عالم کے شہر فسحت آباد کا ذکر کرتے ہوئے

سرورؔ لکھتے ہیں :۔

"مینو سواد[1]، بہشت نژاد، پسند خاطر محبوبانِ جہاں، قابلِ بود و باشِ خوبانِ زماں، شمیم صفت، ۔۔ زمین اس کی رشکِ چرخ بریں، گلی کوچہ خجلت دہ گلشن، گلزار بسانِ تختۂ چمن ۔۔"

جب جانِ عالم کا گذر ملک زرنگار میں ہوتا ہے۔ سرورؔ بیان کرتے ہیں :۔

"شہر[2] دیکھا، قطعدار، ہموار، قرینے سے بازار، کرسی ہر دکان کی کمر برابر، مکان ایک سے ایک بہتر و برتر، بیچ میں نہر، جا بجا فوارے ۔۔ سب عمارات شہر پناہ کے میل کی، جواہر نگار سانچے کے ڈھلے، ہاتھ کا کام معلوم نہ ہوتا تھا، نہ کہیں بلندی نہ پستی، ہموار بسی ہوئی بستی، ایک کا جواب دوسری طرف۔ ادھر بزاز تو اُدھر بھی مراٰت کے مقابل مراٰت، بازار کا صحن، نفیس شفاف۔ جوہری کے روبرو جوہری، زر و جواہر کا ہر سمت ڈھیر، نقد و جنس سے ہر شخص سیر، کوئی شے کسی طرح کا اسباب ایسا نہ تھا کہ اس بازار میں نہ تھا۔ مغرب و مشرق کی اشیائے نادرہ کا ہر جا انبار تھا۔ جنوب و شمال کا خریدار تھا، حلوائی، نانبائی، کنجڑے، قصائی، سقوں کے کٹوروں کی جھنکار، میوہ فروشوں کی پکار، دلالوں کی بول چال، جہاں کا اسباب و مال، نہر کی کیفیت جدا، قدِ آدم آبِ مصفّا، فواروں سے کیوڑہ گلاب اچھلتا، بازار مہک رہا۔ ہر طرف دھوم دھام، خلقت کا اژدہام، چلنے پھرنے والوں کے کپڑے لتے ہوئے جاتے تھے۔ وہم و گمان کشمکش سے بار پاتے تھے ۔۔ جب چوک میں آیا، پوچھا "ایوانِ جہاں پناہ دولت سرائے شاہ کدھر ہے"۔

سرورؔ کو لکھنؤ سے عشق ہے، وہ جب کسی شہر کا ذکر کرتے ہیں، تو انھیں لکھنؤ یاد آجاتا ہے اور بقول خود ان کے ۔۔

"خطۂ[3] بے نظیر، دلپذیر، رشکِ گلشنِ جناں، مسکنِ حور و غلماں، جائے

---

[1] فسانہ عجائب۔ نولکشور ۱۲ واں اڈیشن ص ۱۸

[2] فسانہ عجائب۔ نولکشور ۱۲ واں اڈیشن ص ۶۵-۶۶

[3] فسانہ عجائب۔ نولکشور ۱۲ واں اڈیشن ص ۲

مردم خیز — اگر دیدۂ انصاف و نظر غور سے اس شہر کو دیکھیے تو جہاں کی دید کی حسرت نہ رہے — سبحان اللہ بحمدہٗ عجب شہر گلزار ہے، ہر گلی کوچہ دلچسپ باغ و بہار ہے — دو رویہ بازار، کس انداز کا ہے، ہر دکان سرمایہ ناز و نیاز کا ہے۔ ہر محلے میں جہاں کا ساز و سامان ہے —"

گویا لکھنو صرف "بیان لکھنو" میں ہی نظر نہیں آتا۔ بلکہ وہ پوری داستان کے پس منظر کا کام کرتا ہے۔ وہ انجمن آرا کی شادی اور رخصتی ہو یا مہ نگار کی رسم نکاح — لکھنو کی رسومات واضح طور پر دکھائی دے رہی ہیں۔ یہ رسومات عوام کی رسومات نہیں ہیں۔ یہ خواص کے رسم و رواج ہیں جن سے لکھنوی معاشرت مراد لی جاتی ہے۔ سرور اسی طبقے کے عکاس ہیں۔ لیکن جب وہ بازار میں جاتے ہیں جہاں چہل پہل ہے، شور ہے وہاں وہ یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے خاموشی سے گزر جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سرور کا شہر، شہر خموشاں معلوم ہوتا ہے۔ پنڈت بشن نرائن در لکھتے ہیں:

"— سرور[1] آدمیوں کا حال نہیں لکھتے، صرف چیزوں کا مرقع کھینچتے ہیں، حلوائی کی دکان کے پاس سے ہم گزرتے ہیں اور ہمارے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ تنبولیوں کے ہاں کی گلوریاں دیکھ کر ہمارا جی للچاتا ہے۔ جوہری، بنئے، بقال، کبڑے سب چوکھا مال لئے بیٹھے ہیں۔ چوک اور دوسرے بازار اور سیرگاہیں جواب باقی نہیں، ہم اس کتاب میں دیکھتے ہیں اور ان کی خوب سیر کرتے ہیں۔ ہماری نگاہ ان بلند عمارتوں اور کمروں پر بھی جاتی ہے، جہاں سے کچھ حسین صورتیں اپنی جادو بھری نگاہوں سے ہم کو جھانکتی ہیں۔ ہم چوک میں ہوکر گزرتے ہیں۔ لیکن وہ ایک شہر خموشاں ایک سونی بستی معلوم ہوتی ہے راہ اور دکاندار سو رہے ہوتے ہیں۔ ہم مجمع میں چلتے ہیں مگر کھوے سے کھوا نہیں چھلتا۔ کمرے والیاں ہمارے اشاروں کا جواب نہیں دیتیں۔ تنبولنیں کرشمہ ناز میں مصروف ہیں مگر منہ سے کچھ نہیں بولتیں۔ زندگی کا کہیں پتہ نہیں۔ مشہور مشہور گویئے ہمارے سامنے آتے ہیں مگر ان کا گانا سننے میں نہیں آتا۔ شعرا، فوجی سپاہی بادشاہ وزیر سب سامنے سے فانوسی

---

[1] بحوالہ تاریخ ادب اردو رام بابو سکسینہ مترجم عسکری۔ نولکشور اڈیشن ص ۲۵

تصویروں کی طرح گذر جاتے ہیں مگر سب خاموش ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے یہ تصویریں بے ہوشی کے عالم میں کھینچی ہیں ۔ لہذا یہ کہنا بجا ہے کہ سرور کا لکھنو وہ شہر خموشاں ہے ۔"

ڈاکٹر نیر مسعود، پنڈت بشن نرائن در کے متذکرہ بالا خیالات سے متفق نہیں ہیں اسلئے کہ انھیں فسانہ عجائب کے لکھنو میں دکانداروں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

" یہ کیسا شہر خموشاں ہے جہاں تمہاری بگھارنے کی سریلی چھنکار تک سنائی دے رہی ہے، جہاں خوانچے والوں اور دکانداروں کی آوازیں گونج رہی ہیں۔ "گنڈیریاں ہیں پونڈے کی"۔ "میاں ٹکے کو ڈھیر لگایا ہے"۔ "مزہ انگور کا ہے رنگ تروں میں"۔ "مگھیے کا منہ کالا ہے"۔ "مہوبہ گرد کرڈالا ہے، عبیر ہے نہ گلال ہے، کتھے چونے سے ادھی میں لکھرا لال ہے"۔ کیا اس شہر کو شہر خموشاں کہا جاسکتا ہے جس کی گلیوں میں گجردم یہ آواز آتی ہے۔ "شیرمال ہے گھی اور دودھ کی"۔ کدھر لینے والے ہیں، متش کی قفلیاں اور کھیر کے پیالے ہیں"۔ کیا خوب بھنے بھر بھرے ہیں، چنے پرمل اور مرمرے ہیں"۔ جہاں کے بازاروں میں پھول والے چلا رہے ہیں"۔ بیلے کے ہار ہیں، شوقین البیلے کو، پہن لے چلا جا زنگی محل کے میلے کو"۔ بلکہ یہاں تو باغ میں کوئل، پپیہے اور مور کا شور" بھی سنائی دے رہا ہے۔ سرور لکھتے ہیں" سرچوک ہمیشہ شانے سے شانہ چھلا"۔ اسی چوک کے متعلق یہ کہنا کہ "ہم مجمع میں چلتے ہیں مگر کھوے سے کھوا نہیں چھلتا" اور جہاں مداریے حقوں کا تڑاقا سنائی دے رہا ہو وہاں کے راہ گیروں اور دکان داروں کو محو خواب بتانا، کہاں تک درست ہے ؟"[1]

دراصل سرور خود اس بازار میں نہیں ٹھہرتے، وہ عوام کا "دل" لیکن خواص کا "دماغ" رکھتے ہیں۔ اس لئے بازار کی یہ ہڑبونگ ان کے دل کو لبھاتی بھی ہے اور ان کے دماغ کو گراں بھی گزرتی ہے۔ سرور ان کا ذکر تفصیل سے نہیں کرتے، کیونکہ وہ عوام ہیں جو ننگے پاؤں ننگے سر پھرتے ہیں۔ ان کے یہاں مخصوص کردار نہیں ملتے یہ محض نمونے ہیں۔ سرور ان کے خدوخال پیش نہیں کرتے۔ وہ ان کی "کان پڑی آواز" سن کر آگے بڑھ

---

[1] رجب علی بیگ سرور حیات اور کارنامے ڈاکٹر نیر مسعود ص ۱۵۲

جاتے ہیں۔ اگر وہ لکھنؤ میں ہوتے تو شاید ان کا ذکر بھی نہ کرتے لیکن لکھنؤ سے باہر رہ کر لکھنؤ کے گلی کوچے، صحن و بازار، ان کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اور یہ بات فطری بھی ہے۔ دور سے ڈھول کی آواز بھی سہانی سنائی دیتی ہے۔ یادیں خوشگوار بھی تو ہوتی ہیں۔

سرورؔ جب نصیر الدین حیدر بادشاہ کا ذکر کرتے ہیں اور محل سرا کا نقشہ لکھتے ہیں تو اس بیان میں ان کی زبان بھی چٹخارہ لینے لگتی ہے اور یہاں ہم کو جیتے جاگتے انسان نظر آتے ہیں ان کے کردار اور شخصیتیں نظر آتی ہیں۔ سرورؔ نے چند سطروں میں نصیر الدین حیدر کے عہد کا چربہ بڑی خوبصورتی سے اُتارا ہے۔ کہ ہم ذرا سی دیر کو اس عہد میں پہنچ جاتے ہیں۔ ہمیں محل کا نقشہ ہی نظر نہیں آتا بلکہ اس ماحول میں سانس لینے لگتے ہیں اور اس عہد کی روح کھینچ کر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

"یہ فسانہ[1] بعہد دولت شاہ غازی الدین حیدر شروع ہوا تھا اور تمام بعصر سلطان بن سلطان ابوالنصر نصیر الدین حیدر دام ملکہٗ ہوا۔ اللہ اللہ یہ عجب شاہ جمجاہ اریکہ نشین ہوا کہ حاتم کا نام صفحۂ سخا سے، مثلِ حرفِ غلط مٹا دیا۔ فقیروں کو امیر بنا دیا۔ عیش و نشاط کی طرف طبیعت جو آئی ایک ایک ادنیٰ کنچڑن ہفت ہزاریوں سے اعلیٰ بنائی۔ شہزادیوں کو کہاریوں پہ رشک آیا۔ خواصوں کو صاحبِ نوبت کیا، چنڈول سکھپال میں چڑھایا۔ ہزار بارہ سے جلسے والی حور وش، برق صفت، کبک رفتار، نغز گفتار، از پا تا فرق، دریائے جواہر میں غرق، ہر دم دست بستہ رو برو کھڑی رہی۔ جہاں ان کی نعمت اُن کے سامنے پڑی رہی۔ اصیلوں کو کروڑوں روپیہ دیے۔ پیش خدمتوں نے بادشاہت کے چین کئے قدسیہ محل پہ طبیعت جو آئی معاذ رفعت و شان فلک ہفتم پہ پہنچائی۔ کئی کروڑ روپے اس منظور نظر نے صرف کئے، خزانے خالی کہ محتاجوں کے گھر بھر دیئے۔ ہر وقت راجا اندر کا جلسہ رہا۔ نہروں میں عطر بہا۔ مکان اس طرح بنوائے کہ فلک گردان نے صدقے ہو کر چکر کھائے۔ اندر اس گلشن ارم کہ ایسا باغ اور اس طرح کی کوٹھی، چشم و گوش عالم نے دیکھی نہ سُنی۔ دوازدہ امام کی درگاہ ایسی بنائی کہ چرخ

---

[1] فسانہ عجائب نولکشور ۱۹۵۴ء۔ ص ۱۱

گرداں کو اور خواب میں نظر نہ آئی - اندر اس میں عطر کا حوض چھلکتا رہا، تمام شہر مہکتا رہا۔ مغلانیوں نے گوٹے کناری کی کترنوں سے چاندی سونے کے محل اٹھائے۔ خاصے دالیوں نے لونگ الائچی، زعفران کے اپنے گھروں میں خاصے ڈھیر لگائے۔"

یہ قصہ رجب علی بیگ سرور کا طبع زاد ہے - ہر چند اس میں جو واقعات ملتے ہیں، وہ اس زمانے کی اکثر کتابوں میں نظر آتے ہیں، لیکن اس میں نقالی کا جذبہ نہیں بلکہ اپنے زمانے کی تہذیبی و معاشرتی روایات کو اختیار کرنے کا جذبہ ہے اور مجھے تو یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ یہ عمل بھی غیر شعوری ہوگا - اس کے پیچھے کوئی جانا بوجھا اور سوچا سمجھا رویہ نہیں معلوم ہوتا۔

'فسانۂ عجائب' کی اہم خصوصیت، جس کی طرف میں خاص طور پہ اشارہ کرنا چاہتا ہوں، اس کا ہندستانی مزاج ہے - یہ ہندستانی مزاج نہ صرف نفس قصہ میں نظر آتا ہے بلکہ پلاٹ کی بناوٹ میں بھی اس کا اثر نمایاں ہے - ہندوستانی قصوں میں توتے کی اہمیت غیر معمولی رہی ہے اور اکثر اس کی حیثیت ایک کردار کی رہی ہے - رجب علی بیگ نے بھی اس قصے کا محرک توتے ہی کو بنایا ہے - بالکل اسی طرح جیسے ملک محمد[1] جائسی نے اپنی زندہ جاوید ہندی تصنیف "پدماوت[2]" میں ہیرامن توتے سے کام لیا ہے، جس کا قصہ یوں ہے کہ :-

"گندھرپ سین جزیرہ سنگدیپ کا راجا تھا، اس کی ایک لڑکی تھی جس کا نام پدماوتی تھا - پدماوتی کے پاس ایک توتا تھا ـــ ہیرامن ـــ

---

[1] ملک محمد جائسی (۹۰۰ھ - ۱۰۴۹ھ) وطن محلہ کیخانہ کلاں قصبہ جائس ضلع رائے بریلی تھا - آپ فقیر منش بزرگ تھے - آپ کا ذریعہ معاش کھیتی باڑی تھا - کہتے ہیں کہ غلطی سے ایک بھیلئے نے رات کے اندھیرے میں جنگلی جانور سمجھ کر آپ کو مار دیا تھا - ملک صاحب کا درجہ ہندی ادب میں بہت بڑا ہے - آپ کی ۱۴ تصانیف ہیں -

[2] پدماوت کا سن تصنیف ۹۴۷ھ ہے - اس میں بادشاہوں کا تذکرہ بھی ہے - اس نظم میں پرانے زمانے کے رسم و رواج بھی ملتے ہیں - اس میں محاورے، مقولے، ضرب المثل اور پند و نصائح بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں -

پدماوتی نے ہیرامن سے شوہر تلاش کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ یہ خبر بادشاہ تک پہنچ گئی۔ اس نے اسے قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ خیر سے اس نے جان بچائی اور جنگل کو بھاگ گیا۔ وہاں سے پھر کسی شکاری کے ہاتھ لگا، جس نے چھوڑ لاکر اسے بیچ دیا۔ اس توتے کو راجا رتن سین نے خریدا۔ ایک دن رتن سین کی رانی ناگمتی سنگار کر رہی تھی۔ سنگار کے بعد وہ ہیرامن توتے کے پاس آئی اور اس سے پوچھا کہ دنیا میں اس سے زیادہ بھی کوئی خوبصورت ہے۔ توتے نے اس کے جواب میں پدماوتی کی خوبصورتی کی تعریف کی اور طنزاً کہا کہ پدماوتی اور تم میں وہ فرق ہے جو دن اور رات میں ہوتا ہے۔ یہ سن کر ناگ متی توتے پر غضبناک ہوئی۔ اس نے ہیرامن کو مار ڈالنے کے لئے نوکرانی کے سپرد کیا لیکن نوکرانی نے اُسے مارا نہیں۔ جب راجا شکار سے پلٹے اور توتے کو نہ پایا تو اسے اتنا افسوس ہوا کہ اس نے کھانا پینا تک چھوڑ دیا۔ جب راجا کے رنج میں کمی کے بجائے اضافہ ہوا تو پھر توتے کو اس کے سامنے لایا گیا۔ ہیرامن نے سارا واقعہ کہہ سنایا۔ جب راجا رتن سین نے پدماوتی کے حُسن کی تعریف سُنی تو بے دیکھے اس کا عاشق ہوگیا اور ہیرامن توتے کی رہبری میں پدماوتی کی تلاش میں نکلا۔ اور بسنت پنچمی کے دن مہادیوجی کے مندر میں پہنچا جہاں پدماوتی اس روز پوجا کرنے آیا کرتی تھی اور وہاں اس نے دونوں کی ملاقات کرائی۔ اس کے بعد ایک بڑی لڑائی کے بعد پدماوتی کو جیت کر واپس آیا اور بڑی دھوم دھام سے دونوں کی شادی ہوئی۔ اس کے بعد علاءالدین پدماوت کے حسن کی تعریف سن کر غائبانہ اس پر عاشق ہوا اور اسے حاصل کرنے کے لئے رتن سین کو قید کرلیا۔ پدماوتی نے یہ سن کر اپنے آپ کو بادشاہ کے حضور میں پیش کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ بادشاہ نے استقبال کی تیاریاں کیں۔ محافہ شاہی محل کے سامنے آکر رکا مگر پدماوتی کی جگہ راجپوت تلوار لئے ہوئے نکل آئے اور رتن سین کو آزاد کرالیا۔ اب علاءالدین خلجی نے رتن سین کے خلاف اعلان جنگ کردیا خوب گھمسان لڑائی ہوئی۔ ایک ایک راجپوت مارا گیا۔ رتن سین بھی لڑتے

ہوئے ختم ہوگیا۔ رتن سین کی موت کی خبر سن کر دونوں رانیوں ناگمتی اور پدماوتی نے راجپوتوں کی رسم کے مطابق "جوہر" کر لیا اور آگ میں جل کر خاک ہوگئیں۔"

یہ ہے "پدماوت" کا پلاٹ، جو میں نے اضافی طور پر پیش کر دیا ہے ورنہ مقصد تو یہ کہنا تھا کہ توتے سے بھی رجب علی بیگ نے وہی کام لیا ہے۔ یعنی شاہزادہ جان عالم بازار سے ایک لاکھ روپئے کا توتا خرید کر لاتے ہیں اور بار جب ماہ طلعت (جان عالم کی بیوی) بناؤ سنگار کرنے کے بعد "دیکھ آئینے کو کہتی تھی اللہ رے میں" پھر توتے سے فرمایا "ایسی صورت کبھی دیکھی ہے۔" توتے نے بے اعتنائی سے کہا "ایسا ہی ہو" ماہ طلعت برہم ہو کے بولی "میاں مٹھو جینے سے خفا ہو، جو ہمارے روبرو چبا چبا کر گفتگو کرتے ہو۔" اتنے میں جان عالم تشریف لائے، عجب صحبت دیکھی۔ شہزادے نے پوچھا۔ "خیر باشد"۔

توتا بولا "آج نزاشر ہے، اگر آپ اور گھڑی بھر دیر لگاتے تو میرا طائر روح گربۂ غضب شہزادی سے مجروح پرواز کر جاتا۔"

ماہ طلعت نے کہا "اگر میری بات کا توتا جواب نہ دے گا تو اس نگوڑے کی گردن مروڑ اپنے تلوؤں سے اس کی آنکھیں ملوں گی، جب دانا پانی کھاؤں گی۔"

شہزادے کے اصرار پر توتے نے کہا "مجھ سے سچ نہ بلوائیے، میرا منھ نہ کھلوائیے، انجام راستی حضور کے دشمنوں کو دشت نوردی، بادیہ پیمائی نصیب ہوگی۔ شمال کی راہ میں عجائب زرنگار ہے، وہاں کی شہزادی ہے انجمن آرا۔ اس کا تو کیا کہنا، اگر ان کی لونڈیوں کو شہزادی صاحبہ دیکھیں تو چلو بھر پانی میں محجوب ہو کے ڈوب جائیں۔"

جانعالم نے پنجرہ اٹھالیا اور دیوان خانے میں لے جاکر مفصل حال دریافت کرنے لگا اور نادیدہ انجمن آرا کا عاشق ہوگیا اور توتے کو رہبر بنا کر قصد ملک زرنگار کا کیا۔ اس کے بعد راستے کی دشواریاں توتے کا کھو جانا، ملکہ مہر نگار کا ملنا، انجمن آرا کا حاصل کرنا، وزیرزادے کا فریب دینا، راستے میں جادوگرنی سے معرکہ اور منزل پر پہنچتے پہنچتے گویا کمند کا ٹوٹ جانا، کشتی کا طوفان کی نذر ہونا اور پھر دردِ فراق اور صدمہ الم سہنا، بالآخر جوگی کی مدد سے بچھڑوں کا ملنا۔ اور پھر اپنے ملک "فسحت آباد" واپس آنا۔

داستان میں نجومیوں[1] اور رمالوں کا بیان — اس عہد کے عقائد کا آئینہ دار ہے۔

---

[1] دیکھئے نجومیوں اور رمالوں کا ذکر صفحہ ۱۴۱، صفحہ ۸۵، صفحہ ۱۹۸ نولکشور ۱۲واں اڈیشن

جب اپنی بے بسی کی تسکین تقدیر کے اٹل فیصلوں سے ہوتی تھی ۔ درباروں میں نجومیوں ، پنڈتوں جعفر دانوں کو خاص طور پر اہمیت حاصل تھی ۔ برہمنوں کی بھی عزت کی جاتی تھی اور ان کی بڑائی اور ہمہ دانی کا سکہ بلا امتیازِ مذہب و ملت سب کے دلوں پر تھا۔ مسلمان بھی ہندوؤں کی طرح اپنی جنم پتریاں بنواتے تھے ۔ واجد علی شاہ کے بھی زائچے بنے تھے ۔ فسانہ عجائب میں جب شہزادہ جانعالم پیدا ہوتا ہے تو یہ لوگ بلائے جاتے ہیں ۔ زائچے دیکھتے ہیں ۔ برہمنوں نے عرض کی ——

"مہاراج کا بول بالا ہو، جاہ وحشم مرتبہ دوبالا اعلیٰ رہے ۔ ہماری پوتھی[1] کہتی ہے ۔ بھگوان کی دیا سے شہزادے کا چندرماں بلی ہے ، جو گرہ ہے وہ بھلی ہے ۔ دیگ تیگ کا مالک رہے ۔ دھرم مورت یہ بالک رہے ۔ جلد راج پر براجے ، پرتھی میں دھوم مچے ، ایسی شادی رچے ، مگر پندرھویں برس مشتری بارھویں آئے گی ، سنیچر باؤں پڑے گا ۔ ایک پکھیرو سوئے کے برن میں ہاتھ آئے گا ۔ تریا کے کھٹ پٹ سے وہ بچن سنائے گا کہ راج پاٹ چھوڑ ، دیس بدیس لے جائے گا ۔ ڈگر میں شہزادہ بھٹکے ، کوئی پاس نہ پھٹکے ، ساتھی چھٹیں ، اپنے ڈیل سے ڈانواڈول ، پھر ایک منکھ ٹھاکر کا سیوک ، کرپا کرکے راہ لگائے کوئی کلنکن لوبھی ہو ، کشٹ دکھائے ، وہاں سے جب چھٹے رانی ملے ، مہاسندر ، وہ چرن پر پران وارے ، پتا اس کا گیانی ، گن کی تکھتی دے ، اس سے کئی بلچھ مارے ، دکھ میں آڑے آئے ، بڑے کام بنائے ، جب اس نگر پہنچے ، جس کے چت میں گھر چھوڑے تو لاب بہت ہو ، درب گھنے ہاتھ آئیں ۔ دور سب کلیس ہو جائے ۔ پر ایک ہتی من کا کپٹی ، استری پر دو چت ہو ، کھٹائی کرے ، جھجھ پڑیں ، نرناری لڑیں اور کچھ جل میں بھی ہل چل پڑے ، پرتھی لوگ چھٹ جائیں ، نگر نگر کھوج میں پھر آئیں ، سب بچھڑے مل جائیں ، ماتا پتا کے ڈھگ آئیں ۔ استری تین ہو ، دو کا پرمان رہے ۔ ایک کی ہین ہو ، بڑا راج کرے ، دیا دھرم کے کاج کرے ، گسیاں کی کرپا سے جان کی کھیر ہے ، بڑی بڑی دھرتی کی سیر ہے ۔"

---

[1] فسانہ عجائب ۔ نولکشور ۱۲ واں اڈیشن ۔ ص ۲۰

یہ طویل اقتباس برہمنوں اور پنڈتوں کے انداز بیان کا غماز ہے۔ "بادشاہ گو نہ ملول ہوا۔ پھر ان سب کو بقدر حال فراخور کمال مالا مال کیا، خلعت و انعام دیا۔" یہ بھی ان کی قدر و قیمت اور اہمیت کی دلیل ہے۔ قرونِ وسطیٰ کے ہندوستانی سماج میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے اندر جو اتحاد کی لہر نظر آتی ہے اس کی ایک یہی مثال نہیں ہے بلکہ اس داستان میں اس کا اظہار جا بجا ہوا ہے۔

انجمن آرا اور جانعالم کی شادی طے ہوگئی ہے۔ نکاح کے لئے ساعتِ سعید (شبھ گھڑی) دیکھنے کے لئے رمال، پنڈت، جفرداں طلب کئے گئے ہیں کہ وہ علم ہئیت اور ہندسے اور نجوم کی مدد سے طے کریں کہ اس نیک کام کے لئے کون سا وقت مناسب ہے۔

"کسی نے[۵۱] قرعہ پھینکا، زائچہ کھینچا، شکلیں لکھیں، کسی نے پوتھی کھولی، کوئی حرف مفرد لکھ کر حساب کرنے لگا کوئی تلک، برچھک، دھن، مکر، مین، میکھ، متھن، کرک، سنگھ، کنیاں گن کر بچارنے لگا۔"

اس طرح بقول سرور بموجب[۵۲] حکم "منجمانِ صدر نشین، مسند کنشت و دیر، حکم روایان خوش فال، مانجھے کا جوڑا دولھن کے گھر سے چلا" اور ان رسومات کا سلسلہ شروع ہوا جو خالصاً ہندستانی ہیں۔" بٹنا ملنے کا کنگنا، لنگی ملتان کی۔ بٹنا اور تیل بے میل جو عطر کشمیر پر خندہ زن ہو۔ عطر سہاگ مہک پر ی ایجاد، نصیرالدین حیدری ارگجۂ محمد شاہی، زعفران کا تختہ —— سکھپال اور چنڈولوں میں زنانی سواریاں۔"

اور اس خوشی کے موقع پر رنگ کھیلنا کہ بقول سرور "خلقت[۵۳] ہولی کی کیفیت بھولی شہر میں شہاب و زعفران کے سرخ و زرد نالے بہے۔ گلیوں میں عبیر و گلال کے ٹیلے ٹیکرے رہے۔"

یہی نہیں شادی کی ضیافت میں سرور نے جو اہتمام کیا ہے اس میں ہندستانی روایات کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ رواداری ہماری تہذیب کا ایک اہم جزو تھا۔ ڈاکٹر سید

---

۵۱ فسانہ عجائب نولکشور ۱۲ واں اڈیشن ص۸۵

۵۲ ایضاً ص۸۵ - ۸۶

۵۳ ایضاً ص۸۶

عابد حسین نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"معاشرتی[1] زندگی میں ہندوں اور مسلمانوں نے جو اثر ایک دوسرے پر ڈالا ہے اور اس کی وجہ سے ان کے رسم و رواج میں جو یکسانی پیدا ہوئی وہ حیرت انگیز ہے اس لئے کہ دونوں کے معاشرتی ادارے ان کے مذہبی عقیدوں سے بہت قریبی تعلق رکھتے ہیں اور ان عقیدوں میں بہت کچھ اختلاف ہے۔ ڈاکٹر تاراچند صاحب فرماتے ہیں۔ مسلمانوں نے ہندستانی زندگی کے مختلف شعبوں پر جو اثر ڈالا اس کو جس قدر اہمیت دی جائے کم ہے۔ مگر سب سے زیادہ وضاحت اور خوشنمائی کے ساتھ یہ اثر روزمرہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی چیزوں میں گانے، بجانے میں وضع اور لباس میں کھانے پکانے کے طریقوں اور شادی بیاہ کی رسموں میں میلوں اور تیوہاروں میں مرہٹہ، راجپوت اور سکھ رئیسوں کے درباروں کے آداب میں نظر آتا ہے۔"

سرور نے اس تہذیب کی بڑی خوبصورتی سے عکاسی کی ہے۔ یہاں کسی قسم کے دکھاوے اور بناوٹ کا فقدان ہے۔ اس لئے اس زمانے میں ہندو مسلمان یوں بھی میل جول سے رہتے تھے اور ایسی منفی قدریں بھی نہ تھیں، جو ان کے اندر کسی قسم کی گرہ بڑی کر سکیں۔ رواداری اس سماج کی بنیادی قدر تھی۔ سرور اپنی داستان میں دعوت کے موقع پر لکھتے ہیں:

"دن[2] رات دوکانیں کھلی رہیں، قریب قریب ناچ ہو، ان کے کھانے کا صرف تعرفی باورچی خانے میں ٹھرا۔ ہندوں کو پوری کچوری، مٹھائی، اچار۔ مسلمانوں کو پلاؤ، قلیہ، زردہ، قورمہ، ایک آبی، دوسری شیرمال، فرنی کا خوانچہ، طشتری کباب کی، بہت آب و تاب کی۔"

اور اس کے بعد شادی کی دیگر رسومات، جن میں ڈومنیوں کا سیٹھنیاں اور پاہونی گانا ـــــ رخصتی کے وقت شہنائیں، بھیروں، بھیاس الّیاللت، رام کلی کا پھونکنا نقیب اور چوبداروں کا کوئل کی طرح کوکنا ـــــ اور اُن پر مستزاد بکرا ذبح کرنا اور انگوٹھے میں لہو لگانا ـــــ خالص ہندستانی معاشرت کی دین ہے۔ اس خوشی کے موقع پر

---

[1] ہندستانی تہذیب۔ مطبوعہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۱۹۵۸ ص ۶۴-۶۵

[2] فسانۂ عجائب۔ نولکشور ۱۲واں اڈیشن ص ۸۶

کون ہے جو فیضیاب نہیں ہوا۔

اس کے بعد جب ملکہ مہر نگار سے شادی کے بعد جان عالم رخصت ہوتا ہے تو ملکہ کا باپ عمل بتاتا ہے۔ یہ عمل ہے روح کو کسی دوسرے کے قالب میں لے جانے کا — یوں تو یہ داستان میں ایک مافوق الفطرت عنصر کی حیثیت رکھتا ہے لیکن دراصل یہ تصور ہندستان میں عام معلوم ہوتا تھا۔ اس کا اندازہ تذکرہ غوثیہ مرتبہ شاہ گل قادری سے بھی ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں کہ ان کے مرشد غوث علی شاہ قلندر (معاصر رجب علی بیگ سرور) کا

"ایک روز[1] ارشاد ہوا کہ جب بہ ارادہ حج چلے تو اور کے راستے میں ایک ہندو فقیر چار چیلوں سمیت ہمارے ہم طریق ہو گئے تھے، کہنے لگے کہ رات کو ہمارے ساتھ ٹھہرنا۔ چنانچہ ہم سب ایک دھرم شالے میں جا اترے۔ انھوں نے چیلوں سے پوچھا "کیا کھاؤ گے"۔ سب نے اپنی اپنی رغبت کے موافق کہہ دیا، وہی کھانا موجود ہو گیا۔ پھر ہم سے پوچھا ہم نے کہا "جو آپ کھائیں گے" — کہا کہ "میں تو مونگ کی دال اور چپاتی کھایا کرتا ہوں"۔ غرض جب ان کا کھانا تیار ہوا تو ہم نے بھی وہی کھایا۔ بات چیت شروع ہوئی تو ایک انس پیدا ہو گیا، کچھ توجہ کا ذکر آیا۔ ہم نے استدعا کی، کہنے لگے کہ "تین روز ہمارے پاس رہو، چوتھے روز توجہ دیں گے"۔ خیر ہم ٹھہر گئے۔ انھوں نے تین روز تک ہم کو برت رکھوایا۔ پھر توجہ دی۔ واقع میں بڑے زبردست آدمی تھے ہم بہت لوگوں سے ملے اور توجہ لی مگر یہ تاثیر کسی کی توجہ میں نہ دیکھی۔ ان کی توجہ سے ہمارا قلب گلاب کے پھول کی طرح کھل گیا اور قائم ہو گیا تھا۔ ایک دن انتقال روح کے باب میں گفتگو آئی، کہا کہ "ہاں ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہو سکتی ہے کیا یہ تماشا دیکھو گے۔ ہم نے کہا "ضرور" — کہا "اچھا ایک جانور مردہ لاؤ"۔ اگلے دن ہم ایک مردہ توتا لائے۔ رات کے وقت وہ دیوار سے تکیہ لگا کر بیٹھ گئے اور توتے کو سامنے رکھ لیا۔ چراغ گل کر دیا۔ سسکی لے کر دم کھینچا، کھٹ سے ایک آواز آئی اور بجلی سی چمکی۔ توتے میں جان آگئی۔ ہم نے اس کو پکڑ لیا اور باتیں

---

[1] تذکرہ غوثیہ۔ اسم تاریخی شجرہ معرفت مطبوعہ در مطبع مجتبائی دہلی ص۱۱۰

کرنا شروع کیں۔ وہ بول تو نہ سکتا تھا مگر اشاروں سے باتیں کر سکتا تھا۔ پھر ہم نے کہا اچھا اب اپنے جسم میں آجائیے۔ تماشا دیکھ لیا۔ غرض وہ بدستور سابق اسی چمک دمک سے اپنے جسم میں آگئے۔ ہم نے کہا "یہ بات ہم کو بھی سکھلا دیجئے" کہا کہ "اچھا پندرہ دن میں سکھلا دیں گے مگر روٹی کی ممانعت کردی اور دودھ چاول کھانے کی اجازت دی اور کپالی چڑھانی بتائی۔ یہ دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک تو یہ جیتن تاڑی، جس میں حبس دم کرتے ہیں مگر ہوش و حواس قائم رہتے اس سے پہلے ناتی، دھوتی اور کنجل کر یا کرائی۔ غرض پندرہ دن میں اپنا قول پورا کر دیا۔ ہم نے چند روز کرکے یہ عمل چھوڑ دیا کیونکہ ایک بکھیڑا تھا چونکہ کپالی چڑھانا ہم کو لڑکپن سے یاد تھا۔ اس واسطے پندرہ دن میں یہ عمل پورا ہوگیا ——"

میں یہاں اس عمل کی صداقت یا عدم صداقت کو معرض بحث میں نہیں لانا چاہتا بلکہ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ تصورات ہندستان میں رائج و مقبول تھے اور فسانہ عجائب میں رجب علی بیگ نے ان کو بڑی خوبصورتی سے اصل قصے میں سمو لیا ہے۔ یہاں ہمیں تذکرۂ غوثیہ کے بیان پر مزید حاشیہ آرائی نظر آتی ہے اور اس داستان طرازی کا ان کو بحیثیت ایک قصہ گو کے پورا پورا حق پہنچتا ہے۔ تذکرہ غوثیہ کے بیان اور فسانہ عجائب میں پیر مرد کے عمل میں یہ بات نمایاں ہے کہ مسلمانوں میں بھی ایسے معتقدات کو قبول کر لینے میں تکلف نہ ہوتا تھا۔ اگرچہ رجب علی بیگ نے اس کا ذکر افسانوی حیثیت سے کیا ہے لیکن اپنے مسلمان کرداروں میں ہندوؤں کے معتقدات کو منتقل کرنا بذات خود ایک ایسا عمل ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں ایک دوسرے عقیدوں پہ انگلی اُٹھانا تو کجا، اس کو جوں کا توں مان لینے میں بھی تامل نہ تھا۔ سرور کی اس تہذیبی میل جول پر نظر تھی اور وہ متصوفانہ خیالات کو جوگی کے کردار اور اس کے ماحول کے ذریعہ پیش کرتے ہیں۔

"ایک طرف[1] درخت گنجان، گھنے پختہ مزار بیدار دلوں کے بنے اور منڈھی کا گنبد، بسانِ گنبد گردانِ بے ستون کا جواب بنا، تہ سول کرٹا،

---

[1] فسانہ عجائب نولکشور ۱۲ واں اڈیشن ص ۱۷۳ و ۱۷۴

کھاروے کی جھنڈی پھر پھر اڑتی، کلمہ شہادت بخط جلی اس پہ لکھا۔ جب اس کے نزدیک آیا، دور دور تک مکان صاف صاف صحن شفاف پایا، مٹھ کے رو برو، درخت کے تلے، چبوترے کے اوپر ایک جوگی، سو سوا سے برس کا سن وسال مگر ٹانٹھا، کمال، ڈاڑھی ناف سے بڑی، گرہ لگی، جٹا ہر ایک راکھ سے بھری، قدمبوس ہو رہی، پاؤں پہ پڑی، پلکیں دیدۂ حق بیں کا اسرار چھپانے کو چشم حاسد سے گزند بچانے کو، مونچھوں سے ملیں۔ جسم میں موج دریا کی طرح جھریاں پڑیں، کمر میں کردھنی موٹی سی، مہین مانگی، عجب آن بان کی، کھاروے کا لنگوٹ، ستر عورتیں کی اوٹ، حقہ چوگانی منھ سے لگائے۔ افیونی کی شکل بنائے شیر کی کھال بچھائے، بھبھوت رمائے، دیدوادید سے بظاہر آنکھیں بند مگر دیدۂ دل کھلا، خموشی پسند قلب گویا بولتا سوتا نہ جاگتا، آسن مارے، دنیا سے کنارے بیٹھا، پیٹ سے پیٹھ لگائے۔ تیر قد راست، مثل کمان خیدہ، گویا چلّہ کھینچ چکا ہے۔ زنّار آسا رگیں عیاں، کھال سے ہڈیوں کے جوڑ، شمع فانوس نمط نمایاں، تسبیح سلیمانی، ایمان کی نشانی ہاتھ میں ــــ ہر بھجو ہر بھجو تکیہ کلام بات بات میں، قشقہ ٹیکا ماتھے پہ ہندوں کا سا اور سجدے کا گھٹا بدر کامل کی صورت چمکتا، زرد مٹی بدن میں، ذکر حق دل و دہن میں، کہیں مصلے پہ سجہ پہ سجدہ گاہ رکھی کپڑے کی جانماز بچھی۔ کسی جا پوتھی کھلی، دھونی رمی، دونوں سے راہ رکھی۔ عجب رنگ کا انسان نہ ہندو نہ مسلمان بقول مرزا سودا ؎

کس کی ملت میں گنوں آپ کو بتلا اے شیخ
تو کہے گبر مجھے گبر مسلمان مجھ کو

ایک طرف تکیے میں دو چار کیاریاں، بیلے چنبیلی کی، بہار گلکاریاں، کہیں مرشدوں کے ڈھیر، گرد کی چھڑی بزرگوں کے مزاروں پہ، مولسری درخت سایہ دار، قطار قطار، درختوں کی ٹہنیوں میں پنجرے لٹکتے، باہم بحث کرتے، اٹکتے، فاختہ کی کوکو، قمری کی حق سرہ کو۔ کلمہ کے دم سناٹے کا عالم، کہیں مرگ چھالا بچھا، شیر چوکی دیتا، دھونی لگی، لکڑ سلگتا۔ کسی جا ببر کی کھال

کا بستر، آہوئے صحرائی اس پر بیٹھا، اودا سا تونبا، بینتا دھرا، ایک سمت بھوانی کا مٹھ، تلسی کا پیڑ ہرا بھرا، گرد چشمہ پانی کا بھرا۔ جائے دلچسپ مکان رعب دار، خود رو کی جدا بہار، ایک طرف بھنڈارا جاری، کڑھاؤ چڑھا، موہن بھوگ ملتا، کہیں پلاؤ قلیے کی تیاری، چھاندا بٹ رہا تھا، کچھ منت بال کے، کچھ مرید حال وقال کے۔ کوئی چلے میں بیٹھا۔ کوئی دنیا سے ہاتھ اٹھائے کھڑا، کسی کے خرقہ وتاج سر وتن میں کوئی چواگن میں، کہیں کتھا ہوتی کوئی وعظ کہہ رہا ایک طرف خنجری بجتی، طنبورا چھڑتا، بھجن ہوتے، ایک سمت حلقہ مراقبے کا بندھا، نوحہ پڑھ رہے، لوگ روتے، عجب وہ گرو مرشد غریب، یہ مرید چیلے، روز ایک دو کو مونڈتا، تیسرے چوتھے دن عرس، ہر ہفتے میں میلے، حاصل کلام یہ ہے کہ وہ عجیب جلسہ تھا کہ دیکھا نہ سنا۔ یہ اجتماع نقیضین آرام وچین سے شہزادے کے پاؤں کی آہٹ جو پائی مرد آگاہ دل روشن ضمیر نے پلک ہاتھ سے اٹھائی، آنکھ ملائی دیدے لال لال، رعب و جلال۔ جانعالم کو بغور دیکھا اس نے جھک کر مودب سلام کیا۔"

جوگی کے اس بیان میں سرورؔ نے اپنے زمانے پر تصوف اور بھگتی کے واضح اثرات کو صاف طور پر پیش کر دیا ہے۔ ان عقائد نے مختلف مذاہب کے پیروؤں میں روحانی ہم آہنگی کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مسلمان صوفیوں اور ہندو بھگتوں کے خیالات کا براہ راست ایک دوسرے پر اثر پڑ رہا تھا۔ اس مسلک کو ہندوں اور مسلمانوں میں یکساں طور پر ہر دلعزیز بنانے میں رامانند کے ایک شاگرد کبیر کا ہاتھ تھا۔ کبیر کی تعلیم میں ہندوں اور مسلمانوں کے گہرے روحانی جذبات سموئے ہوئے تھے۔ "اس میں عاشقانہ ذوق وشوق، سوز وساز، تسلیم ورضا کے ساتھ ساتھ مخلصانہ بلکہ مجاہدانہ جوش خروش بھی ہے۔" کبیر اور دوسرے صوفیوں کی کوششوں سے ہندوں اور مسلمانوں کی مذہبی زندگی میں ایک نئی بیداری اور حرکت، اس کے ساتھ ساتھ رواداری اور مصالحت کی ایک عام فضا پیدا کر دی۔

فسانہ عجائب میں جوگی کا کردار ایک مثبت کردار ہے، جو اگر کہیں منفی دکھائی دیتا ہے تو اسی حد تک جہاں وہ منفی قدروں کی خود نفی کر رہا ہو۔ یہ بڑا واضح علامتی کردار

ہے۔ اس کو اس کے عہد کے سماجی پس منظر میں ہی دیکھنا چاہئے ورنہ یہی اندیشہ ہے کہ ایسا نہ کیا گیا تو وہی غلطی ہوگی جو ڈاکٹر گیان چند سے ہوئی کہ انھوں نے جوگی کے کردار کو معجون مرکب سمجھا اور فرمایا کہ[۵۱]

"یہ اجتماع ضدین محال ہے۔ ہندو رسوم کی پابندی اسلام سے کافر گردانتی ہے اور اسلامی طرز اور اسلامی عبادت زمرۂ ہنود سے خارج کرتی ہے۔ ایسا شخص دونوں مذہبوں میں ولی سمجھا جانے کے بجائے دونوں مذہبوں میں مردود قرار پائے گا۔ یہ کردار نگاری اسی طرح خرافات ہے جیسے کسی انسان کا نصف بدن عورت اور نصف بدن مرد جیسا دکھایا جائے۔"

یہ ایک طرف تصوف اور بھگتی کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے دوسری طرف ادبی طریقہ کار سے بھی عدم توجہی ظاہر کرتا ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ یہ ایک علامتی کردار ہے اسے زندگی کی کھردری حقیقتوں سے ٹکرا کر نہیں پرکھنا چاہئے۔ جب ہم جوگی کے انجام کے بارے میں پڑھتے ہیں تو بہت سی حقیقتیں واضح ہوتی ہیں۔ جوگی نے تو ام بھائیوں کا قصہ سنانے کے بعد[۵۲]

"ہر گرو کا نام لیا، پھر کلمہ جو پڑھا، دنیا سے چل بسا، دم نکل گیا، جوگی مسافر عدم بیکنٹھ باسی رم گیا۔ جانعالم کا روتے روتے دم گیا۔ بیتابانہ نعرۂ الفراق مارے، مرید چیلے جمع ہو کر گرو یا ہادی کہہ کر بہت پکارے، جوگی نے صدا نہ دی، منزل مقصود کی راہ لی۔ شہزادے نے بموجب وصیت غسل دیا، کفنایا، قبر تک اُتارتے اُتارتے کچھ نہ پایا۔ آخرکار برابر کفن پھاڑ دیا۔ آدھا چیلوں نے جلایا، نصف مریدوں نے منڈھی میں گاڑ دیا۔ ہندوؤں نے راکھ پر چھتری بنائی مسلمانوں نے قبر بنا کے سبز چادر اُڑھائی۔ وہ تنت منترا سبحہ و مصلّٰے خرقہ وجبہ اس کے منظور نظر کو دے کر جانشین کیا، مرید چیلوں کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں سونپا، اسے ایک ولولہ آیا از سر نو ان سب کو تلقین کیا کہ سنو بچا جوگی ظاہر میں آنکھوں سے نہاں ہے مگر مرشد کامل کا جلوہ سائیں

---

۵۱ اُردو کی نثری داستانیں ص ۴۳۰

۵۲ فسانہ عجائب نولکشور ۱۲ واں اڈیشن ص ۱۸۷ تا ۱۸۸

کا ظہور، ہر برگ و بار، بوٹے پتے، گل و خار بلکہ در مسجد و دیوار کنشت سے دیدۂ دور بیں میں عیاں ہے۔"

درویشوں، بھگتوں اور صوفیوں کے ایسے قصے ہندستان میں عام طور پر رائج تھے اور ہندستانی عوام ان پر ایمان رکھتے تھے۔ یہ بات کبیر کے بارے میں بہت مشہور ہے کہ کس طرح اُن کی موت کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کو ان کی لاش میں کچھ بھی نہ ملا۔ چنانچہ یہی ہوا کہ کفن برابر برابر پھاڑا گیا، آدھا چیلوں نے جلایا، بقیہ نصف مریدوں نے گاڑ دیا۔ میں اس روایت پر مزید بحث نہیں کرنا چاہتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ مگھر میں کبیر کی سمادھی بھی ہے اور قبر بھی ہے اور مذکورہ بالا انداز سے بنی ہے۔ رجب علی بیگ نے اس تہذیبی روایت کا بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔ ادب کا طریق کار بھی یہی ہے کہ جہاں وہ خارجی حقیقتوں سے متاثر ہوتا ہے وہاں وہ معاشرتی عقائد کو بھی جذبے و تخیل کے توسط سے قبول کر لیتا ہے اور ان کی بنیادوں پر اپنی بالائی عمارت کو تعمیر کرتا ہے۔ سرور نے یہی کیا ہے۔

سرور کی داستان بقول ضمیر حسن دہلوی کے "کسی خاص ادبی تحریک اور سیاسی مقصد کے تحت وجود میں نہیں آئی"۔ اس لئے اس میں کسی مقصد کی پابندی نہیں ہے جیسا کہ فورٹ ولیم کالج کے زمانے کی تصانیف میں پائی جاتی ہیں۔ سرور کے سامنے کوئی مقصد تھا تو یہی وہ لکھنؤ کی تہذیب، اس کی زبان اور محاورے کو پیش کرنا چاہتے تھے اور اس کام میں وہ یقیناً بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اُن کے بیانات میں مبالغہ ہے اور بعض نقادوں نے سرور کی مبالغہ آمیزی کی بڑی مبالغہ آمیز طور پر مذمت کی ہے لیکن یہ سچ ہے کہ ان مبالغوں میں ادب کا حسن چھپا ہوا ہے۔ ادب کسی میکانکی حقیقت نگاری کا نام نہیں۔ ادیب کا کام یہ نہیں کہ خارجی حقیقتوں کی جامد تصویر پیش کرے۔ ادیب حقیقت کو متحرک اور زندہ شکل میں پیش کرتا ہے تاکہ پڑھنے والا اس کا اثر قبول کرے کیونکہ اس کی دلچسپی اس کے جذباتی اور حسیاتی ردعمل سے ہے۔ سرور نے ادبی تخلیق کے اس مفہوم کو صحیح طور پر سمجھا تھا۔ ان کے یہاں جذباتی اظہار کے لئے تخیل کی مدد لی گئی ہے اور ایسی بھرپور کیفیت پیدا ہوتی ہے جو پڑھنے والے پر اپنا اثر چھوڑتی ہے۔ ملکہ نے توتے کے ذریعے جو خط بھیجا ہے وہ اردو ادب میں ایک خاصے کی چیز ہے۔ گویا دل کی بات دل سے کہی جا رہی ہے۔ سوز و گداز ہے کہ عبارت کی رنگینی کے باوجود، الفاظ و تراکیب کے پردے میں جھانکتا ہے اور

تمام تر کیفیت کے ساتھ پڑھنے والے پر ایک غیر معمولی اثر چھوڑتا ہے۔ ملکہ لکھتی ہے:۔

"اے یار وفادار، صادق الاقرار، اللہ تجھے سلامت رکھے، شرح اشتیاق داستان فراق قصہ طول طویل ہے، زندگی کا بھروسا قلیل ہے۔ اگر ہماری زیست منظور ہے جلد آؤ صورت دکھاؤ، نہیں تو تاسف کرو گے، پچھتاؤ گے، تم نے آنے میں اگر دیر کی تو ہم نے صدمہ ہجر سے تڑپ کر جان دی، مٹی کے ڈھیر پر رو رو خاک اڑاؤ گے۔ مولف ؎

شکل اپنی ہم کو دکھلاؤ خدا کے واسطے
جان جاتی ہے ابھی آؤ خدا کے واسطے

کوئی دم کا سینے میں دم مہمان ہے، نام کو جسم میں جان ہے، فلک نے ہماری صحبت کا رشک کھایا۔ بے تفرقہ پردازی ظالم کو چین نہ آیا۔ روز و شب رنج جدائی سے جان کھوتے ہیں، اتنا کبھی کا ہے کو کسی دن ہنسے تھے جیسا بلک بلک کر فرقت کی راتوں میں روتے ہیں —— تمھاری تقریر ہر دم بر زبان ہے، بے تصور سے باتیں کئے چین کہاں ہے —— ہمارے تڑپنے سے ہمسایہ سخت تنگ ہے، دولتسرا زندان ہے، تیرہ و تنگ ہے —— میر ؎

گر یوں رہے گی بے قراری
تو ہو چکی زندگی ہماری

وحشت پیرامونِ حال ہے۔ ہر گھڑی فرقت کی ماہ ہے، جو پہر ہے وہ سال ہے۔ تمھاری صورت ہر پل رو برو ہے، جس طرف دیکھا تو ہی تو ہے، چشم فرقت دیدہ دریا بار ہے۔ آنکھ نہیں چشمۂ آبشار ہے۔ جن آنکھوں کو تم پُرنم نہ دیکھ سکتے تھے۔ اُن سے خون کے دریا بہہ گئے —— دن رات کی صحبت تمھارے ساتھ کی جب یاد آتی ہے، نیند اچٹتی ہے، بے چینی کی رات پہاڑ ہو جاتی ہے، کاٹے نہیں کاٹتی ہے۔ چارپائی تنہائی میں پلنگ بن کر کاٹے کھاتی ہے۔ خواب میں نیند کا خیال نہیں۔ کھانا ہجر میں حرام ہے حلال نہیں۔ وہ سر جو اکثر آپ کے زانو پر رہا ہے اس کو سو سو بار بالش دبالیں پر دے دے پٹکا ہے ——"

مذکورہ بالا خط مہر نگار کی محبت کا آئینہ دار ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انیسویں صدی

---

[1] فسانۂ عجائب۔ نولکشور ۱۲ واں اڈیشن ص ۲۰۰-۲۰۱

کی اُردو نثر میں ملکہ مہر نگار کا یہ خط خاصے کی چیز ہے اور "فسانہ عجائب" کا بہترین نثر پارہ ہے۔ ان کے قلم میں بے ساختگی نمایاں ہے۔ یہ خط سرورؔ نے سرشار ہو کر لکھا ہے۔ یہاں مقفیٰ عبارت بھی گراں نہیں گزرتی۔ یہاں احساسات اور جذبات کی بھرپور ترجمانی ملتی ہے اور ملکہ کا عاشق کا روپ بڑی خوبصورتی سے سامنے آتا ہے۔

اس خط کو پڑھنے کے بعد اگر ہم اُن خطوط کا مطالعہ کریں جو سرورؔ نے واجد علی شاہ[۱] کی اُن بیگمات کی طرف سے لکھے جو لکھنؤ سے کلکتہ نہ جا سکی تھیں۔ اور یہ خط بھی نہ لکھ سکتی تھیں۔ سرورؔ نے ان خطوط میں بیگمات کی قلبی کیفیات کی بڑی خوبصورتی کے ساتھ عکاسی کی ہے۔ مذکورہ بالا خط میں بھی تقریباً یہی کیفیت ہے۔ جو ان خطوط سے واضح ہوتی ہے جو بیگمات کے نام لکھے گئے ــــ مثلاً :ــ

"دن رات[۲] بسترِ غم پہ یہ قول ہمارا ہے قضا بدنام ہوگی صدمہ فراق نے مارا ہے ــــ اگر یہی لیل و نہار ہے تو ناکام کا کام تمام ہے اب ملال دوری الم مہجوری اُٹھانے کی تاب نہیں، تمام دن بیقراری گریہ و آزاری میں کٹتا ہے۔ رات کی بے تابی سے کلیجہ پھٹتا ہے۔ خیال میں خواب نہیں ہونٹوں پہ جان تڑپ کر آئی ہے۔ جانعالم کی دہائی ہے تڑپتے ہیں، بلکتے ہیں، گھٹ گھٹ کے در و دیوار سے سر ٹپکتے ہیں، جیتے ہیں نہ مرتے ہیں ــــ"

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں :ــ

"آنکھیں[۳] نہیں دو پرنالے ہیں دن رات بے برسات بہتے ہیں۔ سر کو کیونکر نہ ٹکرائیں۔ گردن میں باہنیں ڈالنے والا نہیں۔ چھاتی ہے اور غم کے بھالے ہیں، دیکھنے بھالنے والا نہیں ؎

گر یوں ہی رہے گی بیقراری   تو ہو چکی زندگی ہماری

لبوں پہ جان ہے دم کوئی دم کا سینے میں مہمان ہے"

ان خطوں کی روشنی میں اگر مہر نگار کے خط کو پڑھا جائے تو اس کیفیت کا صحیح

---

[۱] ایسے چند خطوط انشائے سرور میں ص۳۴ سے ص۴۳ تک ملتے ہیں۔
[۲] انشائے سرور۔ نولکشور ۱۹۱۶ء ص۳۸
[۳] انشائے سرور اردو مقفیٰ۔ نولکشور ۱۹۱۶ء ص۳۵

اندازہ ہو سکتا ہے ۔ مہر نگار سو فی صدی ہندستانی عاشق کی علامت ہے اور اس خط میں اپنے والہانہ جذبے کے ساتھ اظہار غم عشق کرتی ہے ۔ سرور نے وضع عشق کو اس شاہانہ محفل میں بھی نبھانے کی کوشش کی ہے ۔ جان عالم ملکہ سے خلوص برتتا ہے ۔ اس سے انسیت اور قربت بھی محسوس کرتا ہے لیکن عشق وہ انجمن آرا سے کرتا ہے ملکہ کو سامنے سے ہٹا دیا جائے تو فسانہ عجائب ایک بے جان داستان ہو کر رہ جائے گی ۔ اس لئے سرور عشق کی رسوائی نہ کرتے ہوئے ملکہ کے سینے میں ہندستانی عورت کا دل رکھ دیتے ہیں اور ملکہ عاشق کے روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے ۔ اور اسی میں ملکہ مہر نگار کی انفرادیت چھپی ہوئی ہے اور اسے اردو ادب میں ایک زندہ جاوید کردار بنا دیتا ہے ۔

'فسانہ عجائب' کا مطالعہ اس وقت تک مکمل نہیں سمجھا جا سکتا ہے جب تک کہ ہم ان تنقیدوں کا بغور مطالعہ نہ کریں جو اس داستان کا ادبی تعین کرنے میں پیش پیش رہی ہیں ۔ ۱۲۴۰ھ میں لکھی اور ۱۲۵۹ھ میں چھپنے والی یہ داستان اردو تنقید کی دنیا میں تقریباً سو سال سے موضوع بحث بنی ہوئی ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کی بنیاد سرور کے وہ چند[1] جملے ہیں، جن کا نفس داستان سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔ بظاہر یہ بے ضرر جملے اردو ادب میں ایک ایسی بحث کا آغاز کرتے ہیں جن سے نہ صرف یہ کہ اس کے مقابلے کی داستانیں وجود میں آتی ہیں بلکہ فسانہ عجائب کے بارے میں ایک ایسے خیال کی بنیاد پڑتی ہے جو برسوں کے ادبی تجزیے کے بعد بھی تعصب سے بالاتر نہ ہو سکی ۔ ایک طرح سے ان رایوں نے بیسویں صدی کی تنقید کو بھی متاثر کیا ۔ سرور کی اس تصنیف کے بارے میں یوں تو خاصا اختلاف رائے رہا ہے لیکن اس امر میں قریب قریب سب کو اتفاق ہے کہ

---

[1] "اگرچہ اس ہیچ میرز کو یہ یارا نہیں کہ دعویٰ اردو زبان پر لائے یا اس افسانے کو بہ نظر نثاری کسی کو سنائے اگر شاہجہاں آباد کہ مسکن اہل زبان کبھی بیت السلطنت ہندستان تھا وہاں چندے بود و باش کرتا، فصیحوں کو تلاش کر تا تو فصاحت کا دم بھرتا جیسا میر امن صاحب نے چار درویش کے قصے میں بکھیڑا کیا ہے کہ ہم لوگوں کے ذہن حصے میں یہ زبان آئی ہے ۔ دلی کے روڑے ہیں محاورے کے ہاتھ منھ توڑے ہیں ۔ پتھر پڑیں ایسی سمجھ پر، یہی خیال انسان کا خام ہوتا ہے مفت میں نیک بدنام ہوتا ہے ۔ الخ ۔" فسانہ عجائب نولکشور ۱۲ واں اڈیشن صـ ۱۷ ۔

فسانۂ عجائب" زبان کے اعتبار سے تصنع، آورد اور رعایت لفظی کا ایک مجموعہ ہے اور غیر فطری نثر کی بین مثال۔

سرور نے جو سخن گسترانہ بات کہہ دی تھی اس کا رُخ باغ و بہار والے میرامن کی طرف تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 'فسانۂ عجائب' کا مطالعہ کرنے کے لئے یہ شرط لازمی قرار دی گئی کہ اس کو باغ و بہار سے ٹکرا کر دیکھا جائے۔ تنقید کا ایک میکانکی انداز، جو بیسویں صدی کے ابتدائی پچیس تیس سال تک بہت مقبول تھا، 'فسانۂ عجائب کو بھی اپنے احاطے میں لے لیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معلّموں نے روایتی طریقے سے دونوں کی خوبیوں اور خامیوں کو ایک ہی چوکھٹے میں رکھ کر دیکھنے کی کوشش کی۔ اگر ان تنقیدی رایوں کو دیکھا جائے تو یہ پلڑا ہمیشہ باغ و بہار کی طرف جھکتا نظر آتا ہے اور اس کی وجہ صرف اتنی بتائی جاتی ہے کہ باغ و بہار کی زبان صاف ستھری اور بول چال کی زبان ہے۔ اس میں صنائع لفظی و معنوی کی بھرمار نہیں ہے — اس میں تصنع کا نام و نشان نہیں — اور اس کے برخلاف فسانۂ عجائب کی زبان روزمرہ کی زبان نہیں — یہ ادبی زبان ہے۔ لکھنو کی ملمع شدہ تہذیب کی زبان ہے اس زبان میں آمد نہیں آورد ہے۔ یہ فطری ہونے کے بجائے اکتسابی اور عامیانہ ہونے کے بجائے عالمانہ ہے۔

ڈاکٹر محی الدین قادری صاحب زور باغ و بہار اور فسانۂ عجائب کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"قریب [1] قریب ایک ہی زمانے کی پیداوار ہونے کے علاوہ یہ دونوں فسانے موضوع کے لحاظ سے بھی بالکل متحد ہیں لیکن اس بارے میں بھی وہ اپنی خصوصیات کے لحاظ سے اس قدر مختلف ہیں کہ اس حیثیت سے ان کا مقابلہ کرنا ایک خاص دلچسپ ادبی شغل معلوم ہوتا ہے — ایک ایسا ادبی شغل جس کے لئے کوئی صاحبِ ذوق مجبور ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

دراصل یہ خالص "ادبی شغل" تھا جس نے دونوں کتابوں کو ایک ہی زاویے سے دیکھنا شروع کیا۔

انیسویں صدی کے ادبی معیار کی ایک بڑی کمزوری یہ تھی کہ کسی ادب کی بڑائی کا

---

[1] روح تنقید حصہ دوم۔ ص ۲۴۱

اندازہ اس کی زبان ہی کی بدولت کیا جاتا تھا۔ پرکھنے والوں کی ساری توجہ زبان و بیان پر ہی ہوتی تھی اور ادبی قدر و قیمت کے سارے فیصلے اسی بنیاد پر ہو جایا کرتے تھے۔ مواد کی اہمیت ادب میں نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان دو کتابوں کا موازنہ کیا گیا تو فیصلہ کرتے وقت فنی مطالبے ہی وزن رکھتے تھے اور ان میں سب سے زیادہ اہمیت زبان کو تھی۔ نئے معیاروں نے زبان کی سلاست اور روزمرہ کی سادگی کو ان سب پر مقدم سمجھا اور نتیجے کے طور پر اس کسوٹی پر جب کھرے کھوٹے کو پرکھا گیا تو فسانہ عجائب پوری نہ اتر سکی اور اس کا ذکر ادب میں محض باغ و بہار کی برتری ثابت کرنے کے لئے ضروری قرار دیا گیا۔ گویا باغ و بہار کی اہمیت اور قدر و قیمت کو تسلیم کرانے کے لئے فسانہ عجائب کے سہارے کی ضرورت تھی تُعرَفُ الاَشیاءُ بِاَضدادِھَا۔

رجب علی بیگ کو ایسے نقاد بھی ملے جنھوں نے فسانۂ عجائب کو الگ سے دیکھنے کی کوشش کی، لیکن وہ بھی تعصب کی پرانی عینک کو اتار نہ سکے، اور انھوں نے بھی سرسری طور پر اس کا جائزہ لیا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنے ایک اہم مضمون "کچھ فسانہ عجائب کے بارے میں" کچھ اسی قسم کا انداز اختیار کیا ہے اور اپنے مخصوص انداز بیان کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، اسی قسم کی باتیں دہرائی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"اس[1] کے مصنف رجب علی بیگ سرورؔ، غازی الدین حیدر کے زمانے میں پیدا ہوئے۔ اور غالبؔ کی وفات سے ایک سال پہلے جاں بحق ہوئے۔ انھوں نے واجد علی شاہ کی امیری اور اسیری دونوں دیکھیں۔"

یہ بیان سرسری ہے اس لئے سرورؔ کا سن پیدائش ۱۲۰۰ھ کے آس پاس ہے۔ یہ زمانہ آصف الدولہ تھا۔ غازی الدین حیدر کی مسند نشینی کی تاریخ "وزیر نامے" میں ۲ رجب ۱۲۲۹ھ بمطابق ۱۸۱۴ء ہے اور ان کا انتقال ۲۷ ربیع الاول ۱۲۴۳ھ بمطابق ۱۹ اکتوبر ۱۸۲۷ء کو دیوالی کے دس کو ہوا۔ انھوں نے تیرہ سال آٹھ مہینے حکومت کی۔

رشید صاحب نے ایک فاضل اہلِ قلم کے حوالے سے تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"وہ آدمیوں کا حال نہیں لکھتے صرف چیزوں کا مرقع کھینچتے ہیں۔ حلوائی، تنبولی، کنجڑے، بالائی بیچنے والے بنئے بقال سب اپنا اپنا مال لئے بیٹھے ہیں۔ چوک

---

[1] مضمون "کچھ فسانہ عجائب کے بارے میں" مطبوعہ نقوش اکتوبر۔ نومبر ۵۳ء صفحہ ۲۰۰

بازار، سیر گاہیں، ہم اس کتاب میں دیکھتے ہیں اور ان کی خوب سیر بھی کرتے ہیں۔ ہماری نگاہ بالاخانوں پر بھی جاتی ہے جہاں سے حسین صورتیں اپنی جادو بھری نگاہوں سے ہم کو جھانکتی ہیں۔ ہم چوک سے ہو کر گزرتے ہیں مگر وہ ایک شہر خموشاں نظر آتا ہے ——"

"فسانہ عجائب کے ساتھ ایک زیادتی یہ بھی ہوئی ہے کہ اس کے دیباچے کو بھی داستان کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس میں ڈرامائی عنصر تلاش کیا گیا ہے یہ زیادتی شاید اس وجہ سے بھی ہوئی کہ سرورؔ نے "بیان لکھنو" میں اس عہد کے لکھنو کی روح کو اسیر کر لیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے نقادوں کی توقعات اور بڑھ گئیں ورنہ کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہاں ڈرامائیت کی کمی کی شکایت کی جاتی۔ لیکن ایسا نہیں کہ سرورؔ کے نقادوں کو محض "بیان لکھنو" سے شکایت ہو۔ کلیم الدین احمد لکھتے ہیں :۔

"غرض فسانہ عجائب میں ہر جگہ لکڑیاں گیلی ہیں، بہادری، جادوگری، عشق بازی، ماحول کی عکاسی، کسی چیز میں تخیل نے جان نہیں ڈال دی ہے اس وجہ سے ہر چیز بے لطف و بے اثر ہے۔ جس طرح مختلف عناصر بے لطف ہیں، اسی طرح ان کے امتزاج کی صورت تنظیم میں بھی کوئی خاص بات نہیں۔"

کلیم الدین احمد نے بار بار "فسانہ عجائب" میں لکڑیاں گیلی ہونے کا ذکر کیا ہے۔ میں اس کا مفہوم واضح طور پر نہیں سمجھ سکا ہوں لیکن ادب کو اس طرح سیہ و سپید کے خانوں میں رکھ کر جانچنا ادب کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔ میں تنقید کے اسی انداز سے اختلاف رکھتا ہوں۔ یہ اچھا ہوتا کہ ہمارے نقاد سرسری طور پر دیکھنے کے بجائے اس پر گہری نظر ڈالتے اور اس کا سنجیدگی سے تجزیہ کرتے۔

ادب کا یہ طریق کار کتنا ہی مضحکہ خیز کیوں نہ ہو لیکن سچ ہے کہ بہت عرصے تک اگر جھوٹ بھی بولا جائے تو وہ سچ بن جاتا ہے۔ بقول سرورؔ "جھوٹے کے سامنے سچا رو دیتا ہے۔"

میں چاہتا ہوں کہ "فسانہ عجائب" کا مطالعہ آزادانہ طور پر کرنے کی کوشش کی جائے اور اس کی زبان سے قطع نظر اس کے نفس مضمون میں اتر کر دیکھا جائے۔

میں روایتی نقادوں کے رویے کا ذکر کرتے وقت ایک بات اور کہنا چاہتا

ہوں کہ رجب علی بیگ سرورؔ کے یہ نقاد ہر مکتب خیال سے تعلق رکھتے ہیں۔ پروفیسر محمد حسین آزاد سے لے کر پروفیسر رشید احمد صدیقی تک ـــ وہ نقاد جو ترقی پسند نظریات کے حامل ہیں اور وہ بھی جو غیر ترقی پسند ہیں ـــ اس امر پر سب متفق ہیں کہ فسانہ عجائب کا مطالعہ کرنے کے لئے نفسِ مضمون کو دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ معنوی حیثیت سے سمجھنے کے بجائے ظاہری اور لفظی حیثیت سے دیکھ کر فیصلہ کر دینا کافی ہے کیونکہ اگر معنوی طور پر دیکھنے کی کوشش کی جائے تو چند پہلو اور بھی نظر آتے ہیں، جن کی طرف میں آگے چل کر اشارہ بھی کروں گا اور بحث بھی۔ میں چاہتا ہوں کہ اگر معروضی طور پر 'فسانہ عجائب' کو سمجھنا چاہیں تو ہمیں وقتی طور پر اس کی زبان کے اندر جھانک کر دیکھنا ہوگا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ سرورؔ نے اپنی زبان کا ایسا پردہ ڈال دیا ہے جو اتنا بوجھل ہے کہ بعض اوقات اٹھائے نہیں اٹھتا اور بالآخر پڑھنے والا اسی میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ اگر قاری زبان سے آشنا ہوا تو وہ زبان اور بیان کے چٹخارے لینے لگتا ہے اور لفظوں اور فقروں کی صناعی میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔ فسانہ عجائب کی بار بار تصحیح کے دوران میں (اور اگر سخنؔ دہلوی کے بیان کو سچ مان لیا جائے تو سرورؔ نے اٹھارہ بار تصحیح کی۔) سرور نے سارا زور زبان پر دیا۔ گویا وہ پڑھنے والے پر اپنی لیاقت کا سکہ جمانا چاہتے تھے لیکن سکہ تو کیا جمتا، بقول شخصے کہ لینے کے دینے پڑ گئے، اور ان کی یہ ریاضت کتاب کے حق میں اور مضر ثابت ہوئی۔ یہ سچ ہے کہ سرورؔ کی جیسی زبان لکھنا اور سمجھنا معمولی بات نہیں اس لئے کہ اس زبان کو سمجھنے کے لئے بھی جس مبلغ علم کی ضرورت ہے وہ سادہ زبان سمجھنے کے لئے ضروری نہیں ہے۔

میر امن نے "باغ و بہار" میں سادہ زبان کا انتخاب اس لئے نہیں کیا تھا کہ وہ اس زبان کو اردو کی مستند اور معیاری زبان کے طور پر پیش کرنا چاہتے تھے ـــ اور یہ بھی کہ وہ رنگین عبارت لکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ باغ و بہار ایک مخصوص مقصد کو سامنے رکھ کر لکھوائی گئی تھی اور یہ ضرورت تھی فورٹ ولیم کالج کے طلبار کو ہندستانی زبان سکھانے کی۔ یہ بات ہے ۱۸۰۱ء / ۱۲۱۵ھ کی ـــ اس وقت

لہ "ہم اب بھی کہتے ہیں کہ سرور لکھنوی نے اٹھارہ مرتبہ فسانہ عجائب کو درست کیا، جو فقرہ سست پایا اُسے چست کیا مگر غلطی نظر نہ آئی گئی مرتبہ کتاب چھپی مگر وہ بات نہ چھپی"۔ سروش سخن ۱۲۸۱ھ ص۵،

اُردو نثر کی کتابیں معدودے چند تھیں اور وہ بھی ایسی ادبی زبان میں تھیں کہ وہ طلباء اُن سے فیضیاب نہ ہو سکتے تھے جن کی مادری زبان اُردو نہ ہو۔ سرجان گلکرسٹ نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے :۔

" ایسی[۱] ہندستانی کتابوں کے عام فقدان نے، جن پر کچھ بھی بھروسہ کیا جا سکے مجھے فوری طور پر حسب ذیل کتابیں چھاپنے پر مجبور کر دیا ہے ...... اور کلکتہ کے تمام چھاپے خانوں کو میں نے اس کام پر لگا دیا ہے "

ایک اور خط میں لکھتے ہیں کہ :۔

" ابھی[۲] ہندستانی نثر میں ایک بھی ایسی کتاب نہیں ہے جو قدر و قیمت یا صحت کے اعتبار سے اس قابل ہو کہ میں اپنے شاگردوں کو پڑھنے کے لئے دے سکوں "

فورٹ ولیم کالج کا مقصد بھی یہی تھا اور اس کی وضاحت گورنر جنرل کے ایک خط سے ہوتی ہے جس میں اس نے صاف طور پر لکھا تھا کہ

" مسٹر[۳] گل کرسٹ کی زیر نگرانی ہندوستانی بول چال کی زبان میں (نو وارد رائیٹر) جو مہارت حاصل کریں گے، اس کی بدولت کمپنی کی ملازمت کے دوران میں اپنے منصب کے تمام فرائض بھی وہ حسن و خوبی کے ساتھ انجام دے سکیں گے "

سرجان گلکرسٹ نے اسی لئے یہ کام اپنے ذمے لیا اور چند ایسی کتابیں خود تیار کرائیں جن سے انگریز طالب علم فیضیاب ہو سکیں۔ اس لئے میر امن نے بھی اُن کی فرمائش پر " نو طرز مرصع " کو آسان اور بول چال کی زبان میں لکھا۔ ظاہر ہے کہ اس حالت میں وہ اس اصل مقصد کو کیسے نظر سے اوجھل ہونے دیتے۔

" فسانۂ عجائب " کے مصنف کے سامنے ایسا کوئی معیار اور ایسی کوئی فوری ضرورت یا مجبوری نہ تھی۔ وہ کتاب لکھتے وقت اپنے زمانے کے معیاروں کو ہی سامنے رکھ سکتے

---

۱ گل کرسٹ اور اس کا عہد - محمد عتیق صدیقی - انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ۱۹۶۰ء ص ۱۴۴

۲ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً ص ۱۵۰

۳ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً ص ۱۱۰

تھے اور انھوں نے اس کا خیال رکھا۔ اِسی لئے انھوں نے اپنے قصّے کا ڈھانچا بھی خود ہی بنایا۔ اور یہ ڈھانچہ آگے چل کر ان کو فسانہ عجائب لکھنے پر مجبور بھی کرتا ہے اور اس کی طرف سرورؔ نے "سبب تالیف کتاب" میں اشارہ بھی کیا ہے :۔

"اس زمرے[1] میں ایک آشنائے بامزا فقیر کے تھے وہ بولے کہ "اس وقت تو کوئی قصّہ یا کہانی بہ شیریں زبانی ایسی بیان کر کہ رفع کدورت و جمعیت پریشانی طبیعت ہو —— فرمانبردار نے بجز اقرار انکار مناسب نہ جانا چند کلمے گوش گزار کئے —— وہ باتیں انھیں بہت پسند آئیں کہا "اگر بہ دلجمعی تمام تو اس پراگندہ تقریر کو از آغاز تا انجام قصّے کے طور پر زبان اُردو میں فراہم و تحریر کرے تو نہایت منظور نظر اہل بصر ہو ——"

آخر میں لکھتے ہیں :۔

"قصّہ[2] یہ دلچسپ بے نظیر ہے مطالعے سے خاطر خطیر اگر شاد ہو تو عاصی دعائے خیر سے یاد ہو۔ اس کے لکھنے میں نمود نظم و نثر کا خیال نہ تھا شاعری کا احتمال نہ تھا بلکہ نظرِ ثانی میں جو لفظ دقت طلب غیر مستعمل عربی یا فارسی کا مشکل نظر آیا۔ اپنے نزدیک اس کو دور کیا اور جو کلمہ سہل ممتنع روزمرے یا محاورے کا تھا رہنے دیا ——"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اُن کے سامنے نفسِ مضمون پر زیادہ زور تھا۔ وہ یہ کتاب میر امن سے مقابلہ کرنے کے لئے نہیں لکھنا چاہتے تھے بلکہ ایک اچھا طبع زاد قصّہ دوسروں تک پہنچانا چاہتے تھے۔ اس پلاٹ کی خوبصورتی کے لئے یہ دلیل بھی کچھ کم نہیں کہ انیسویں صدی کے اکثر و بیشتر قصّے اسی پلاٹ کے ارد گرد گھومتے تھے اور اس کی سب سے اچھی مثال تو خود سخنؔ دہلوی کی تصنیف "سروش سخن" ہے۔ نواب حیدر علی خاں کی تصنیف "جادۂ تسخیر" کا تانا بانا بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ خلیل الرحمان داؤدی، سروش سخن کے مقدمے میں لکھتے ہیں :۔

---

[1] فسانہ عجائب۔ نولکشور ۱۲ واں اڈیشن ص۱۶

[2] ایضاً ایضاً ص۱۸-۱۷

"سروشِ سخن[۱] کے اکثر واقعات فسانہ عجائب سے ماخوذ ہیں ——
تعجب[۲] ہے کہ جو کتاب فسانۂ عجائب کے جواب میں لکھی گئی ہو، وہ فسانہ عجائب
سے اس درجہ ماخوذ ہے ——"

اس سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ سخنؔ نے وہی نثری اسلوب برتا، جو فسانہ عجائب کی امتیازی خصوصیت ہے۔ خلیل الرحمان داؤدی لکھتے ہیں :—

"سخنؔ[۳] اگرچہ سرورؔ کا مدمقابل ہے لیکن اس نے وہی تمام داؤں پیچ اور گر استعمال کئے ہیں جو سرورؔ نے فسانہ عجائب میں کئے تھے۔ سخنؔ کو اچھی طرح علم تھا کہ سرورؔ کے اسلوب اور انداز ہی میں اس کی کتاب مقبول ہوسکتی ہے۔ چنانچہ سخنؔ بھی سرورؔ کی طرح مقفیٰ اور رنگین عبارت لکھتا ہے — واقعات[۴] کے بیان اور منظر کشی میں سخنؔ بھی سرورؔ کی طرح اپنا زورِ قلم صرف کرتے ہیں لیکن اس میدان میں سرورؔ کا مشاہدہ زیادہ گہرا اور وسیع ہے۔ اس لئے سخنؔ کے مناظر میں زندگی کی وہ جھلکیاں بہت کم ملتی ہیں، جن کی چمک سے پڑھنے والا دنگ رہ جاتا ہے۔ سرورؔ کے یہاں مزاح کی چاشنی حد درجہ لطیف صورت میں ملتی ہے۔ لیکن سخنؔ کے یہاں یہ بالکل معدوم ہے"

سروشِ سخن ۱۲۷۶ھ/ ۱۸۶۰ء لکھی گئی اور ۱۲۸۱ھ/ ۱۸۶۴ء میں مطبع نولکشور سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں آغازِ داستان سے پہلے سخن دہلوی نے رجب علی بیگ سرورؔ کو بہت سخت سست کہا اور طنز تشنیع کا نشانہ بنایا۔ وہ لکھتے ہیں :—

"اور جو[۵] اس قصے کو ملاحظہ کرے وہ یہ نہ سمجھے کہ فسانہ عجائب کا جواب لکھا ہے جتنا لکھا ہے لاجواب لکھا ہے۔ نہیں مرزا یگانہ میں یکتائے زمانہ ہیں وہ موحد ہیں ہم مقلد ہیں فرق اس قدر ہے کہ ہم کمسن، مرزا صاحب

---

۱ سروشِ سخن۔ سید محمد فخرالدین حسین سخن۔ مرتبہ خلیل الرحمان داؤدی ص ۳۷
۲ 〃 〃 〃 〃 ص ۴۰
۳ 〃 〃 〃 〃 ص ۴۷
۴ 〃 〃 〃 〃 ص ۴۸
۵ سروشِ سخن۔ سید فخرالدین حسین سخن دہلوی مطبع نولکشور ص ۵

پرانے آدمی ضعیف۔ پھر کہاں اُن کی تالیف اور کہاں ہماری تصنیف ہم نوجوان وہ صد باراں دیدہ سنجیدہ و فہمیدہ پیر کہن، پھر کہاں فسانۂ عجائب اور کہاں سروشِ سخن، مگس کو ہما کے ساتھ کیا ہمسری، ذرّے کو سُہا سے کیا برابری، جو لطف و نثر مرتب سمجھے وہ البتہ ہمارا مطلب سمجھے مگر صاحب موصوف نے جو اپنی تالیف میں بیچارے میرامن دہلوی کو بنایا ہے اپنی زبان کی تیزی سے اُس صاف گو کو ایک آدھ کڑا فقرہ سنایا ہے تو ہم بھی اب کہتے ہیں کہ سرؔور لکھنوی نے اٹھارہ مرتبہ فسانۂ عجائب کو درست کیا جو فقرہ سُست پایا، اسے چُست کیا مگر غلطی نظر نہ آئی۔ کئی مرتبہ کتاب چھپی مگر وہ بات نہ چھپی۔ قصہ اپنا از سر نو ملاحظہ فرمائیں۔ ابتدا سے انتہا تک دیکھ جائیں اور سمجھیں کہ کئی جگہ تانیث کو تذکیر لکھا ہے اور تذکیر کو تانیث باندھا ہے ارباب بینش پر سب آشکارا ہے حاجت تصریح نہیں اکثر غلط ہے بالکل صحیح نہیں۔ حق تو یہ ہے کہ جو اردوئے معلی کی زبان نہیں جانتا، تذکیر و تانیث کو نہیں پہچانتا، جو شاہجہاں آباد میں نہیں رہا ہے جس نے دربار شاہی نہیں دیکھا وہ فسانہ کیا لکھے۔"

سخن دہلوی اپنے آپ کو "حضرت غالب مدظلہ العالی کا نواسہ اور شاگرد" کہتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ غالب سرؔور کے قائل تھے۔ غالب اپنے ایک خط میں میاں داد خاں سیاح کو لکھتے ہیں:۔

"تذکیر[1] و تانیث کے باب میں مرزا رجب علی بیگ سے مشورہ لیا کرو اور دبتے ہوئے حروف بھی اُن سے پوچھ لیا کرو۔"

سخن کی تذکیر و تانیث کی شکایت یوں بھی بے جا ہے اس لئے کہ اس امر میں لکھنو اور دہلی کا اختلاف پر اتفاق ہے۔

سخنؔ کی "سروش سخن" رجب علی بیگ کی زندگی میں شائع ہوئی تھی لیکن انھوں نے اس کو زیادہ اہمیت نہ دی اور نہ کہیں اس کا ذکر کیا بلکہ ہلکے پھلکے اشارے کئے جن کا اطلاق سخن دہلوی پر بھی ہو سکتا ہے۔ البتہ ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۲ء میں سرؔور کے ایک شاگرد محمد جعفر علی شیون کاکوری نے "طلسم حیرت" لکھ کر سخن دہلوی کا جواب دیا اور سرؔور کی

---

[1] اردوئے معلی حصہ دوم۔ انوار المطابع ۱۹۲۲۔ ص ۳۳

پر زور حمایت کی - اور اشاروں کنایوں میں سخن دہلوی پر حملے کئے ہیں - وہ لکھتے ہیں :-

"بالکل[1] صاف صاف کہہ نہیں سکتا، خلاف کہہ نہیں سکتا کہ اس میں مدمقابل کی قلعی کھلتی ہے معیوب ہے بند بند لکھنا خوب ہے - راقم اسیر تشویش ہے - دست تحیر در ریش ہے کہ جن حضور نے سرور پر طعن تشنیع میں ذہن کند کی تیزی دکھائی ان کو کیا سمائی ہے - صاحب من جب آپ کے ہم وطن پر اس غضب کا فقرہ جھونکا کہ آپ سے ہوا خواہوں نے جھونکا کھایا۔ یہ بُرا دن پیش آیا - شیخی برباد کر دی - بارے ظرافت کی طبیعت شاد کر دی پھر آپ کے مقدمے میں تو کچھ سخن نہیں گو بندہ ان پر طعنہ زن نہیں یہ غالب یوں ہے کہ اگر حضرت کے ادستاد طنز کرتے تو نیر جوہر شمشیر زبانی کو اختر تاثیر بناتے گو کہ آپ کے نزدیک برج اسد یہ ہے اپنی حدیہ ہے گا وزمین دکھا دیتا آہو گیری کا مزا چکھا دیتا مگر جائے شفقت ہے کہنے والوں کو مقام گفت ہے کہ استاد فصاحت بنیاد بلبل ہزار داستاں طوطی ہندستان نے گلزار سرور پر باغ باغ ہو کر وہ رنگین تقریظ فرمائی کہ باغ دہار پر خزاں آئی پھر حضور نے کیا سمجھ کے کلام سرور میں شاخ نکالی - نکتہ چینی کی نظر سے آنکھ ڈالی - چرخ حقہ باز نے تازہ گل کھلایا - کل ہی وہ تھا - آج یہ ماجرا نظر آیا کہ گرو گڑ ہی رہے چیلے شکر ہو گئے - شاگرد استادی کا دم بھرنے لگے اپنی تحریر پر مرنے لگے - یہ لیاقت اور سرور پر زبانِ طعن دراز مثل مشہور ہے یہ منھ اور نواب کا زیر انداز - ابھی کچھ کہوں تو پیچ در پیچ ہو کر کڑ کٹے جھول جھال چھوڑ لکھنو سے سٹکیے اور چونکہ آجکل آپ کی طلاقت کا پنجرا کھلا ہوا ہے لیاقت کا ڈربا کھلا ہے فقرہ کا سقم تحریر ٹا پا جائے قرینہ اڑایا جائے یہ بیضہ سے پائے اپنا سر کھائے - اے صاحب آپ ابھی انڈے کے ملوک ہیں دو ہی دن گزرے ہوں گے کہ دولت خانے سے قدم خاکی فرماتے گلزار لکھنو کی بلبل دیکھ عقل کے طوطے اڑائے، صفیروں کے الحان متروک ہیں یہاں کی زبان میں لینی

---

[1] قصہ طلسم حیرت - محمد جعفر علی شیون لکھنوی - مطبع نامی منشی نولکشور - چوتھا اڈیشن ماہ جولائی ۱۸۸۸ء مطابق ماہ شوال ۱۳۰۵ھ ـــــ ص۱۵

چوڑے ہانکے بے گریز کھائے پر کٹے اڑاتے گو سر بہ گریباں پشیانی میانی سے
آشنا اپنی دوخانی کھڑکی جھانکے ۔ غالباً اگر چندے یہاں اڈا آپ کا اور رہا
ہم صفیر بریز بریز بولیں گے آپ ایسا تیز لوٹیں گے ۔"
اور طلسم حیرت کے بعد یہ بحث چلتی رہی اور لوگ اسی انداز کی داستانیں قلم کرتے رہے۔
لیکن طلسم حیرت کی داستان پلاٹ کے اعتبار سے مختلف ہے ۔ یہ بھی لکھنو کی معاشرت کا بہت
خوبصورت مرقع پیش کرتی ہے ۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے طلسم حیرت منفرد ہے ۔ تمام تر کتاب
ضلع جگت میں ہے شاید ہی کوئی جملہ ہو جو رعایت لفظی سے عاری ہو ۔ اردو نثر میں صنائع و
بدائع کی فراوانی کی اس سے بہتر مثال نہیں مل سکتی ۔ سید وقار عظیم لکھتے ہیں :۔

"طلسم حیرت[1] کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس میں شروع سے آخیر
تک لفظی رعایتوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے جس میں سے نکلنے کی کوشش جال
کو اور مضبوط بنا دیتی ہے ، اس لئے کہ ذہن کود پھاند کر یا پھلانگ لگا کر
کوئی راہ فرار تلاش بھی کرے تو فوراً گسی اور جال کے حلقے اُسے اسیر کر لیتے
ہیں ۔ ایک تو اس کو بات اختصار کے ساتھ کرنی نہیں آتی اور دوسرے وہ
سیدھا راستہ چلنا نہیں جانتا ۔ چھوٹی سی بات کو بلا ضرورت پھیلاتا ہے اور
سیدھی سی بات کو پیچیدہ بنا کر کہتا ہے اور ان دونوں کاموں میں لفظی رعایتوں
کا ایسا التزام رکھتا ہے کہ باید و شاید ۔"

ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں :۔

"طلسم حیرت[2] تمام کا تمام ضلع جگت میں ہے اردو نثر میں کوئی کتاب
ضلع جگت میں اس قدر کامیاب نہیں جتنی کہ طلسم حیرت ۔"

یہ کتاب لکھنو کا سکہ جمانے کے لئے لکھی گئی ۔ شیون نے سرور کی شاگردی کا
حق تو ادا کیا ہے مقفٰے و مسجع نثر کے فن میں اپنی استادی کا سکہ بھی جمایا ہے کہ اس کی
رعایتوں کو دیکھ کر سرور کی نثر بھی سادہ معلوم ہوتی ہے ۔
طلسم حیرت میں نہ تو داستان کی لذت ہے اور نہ کردار نگاری کے مرقعے ہیں لیکن

---

[1] ہماری داستانیں ۔ وقار عظیم ص۱۴۳ را ۱۴۴
[2] شمالی ہند میں اردو کی نثری داستانیں ۔ انجمن ترقی اردو کراچی ص۲۵۵

زبان و بیان نے اسے اردو کی ایک منفرد کتاب بنا دیا ہے۔

اسی زمانے میں اسی قبیل کی ایک اور داستان وجود میں - والی رامپور کے بھائی نواب حیدر علی خاں نے "جادۂ تسخیر" کے نام سے ایک کتاب لکھی جو ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء میں چھپی بقول مصنف "سنہ ۱۲۸۳ھ میں اس قصۂ رنگین اور فسانہ دلنشین کو شروع کیا۔ مدتوں فکر و اندیشے سے کام لیا"۔ تسلیم سہسوانی نے قطعہ تاریخ لکھا ہے

یہ کتاب[1] ایسی چھپی فضل خدا سے عمدہ | بند تعریف میں جس کی لب تقریر ہوا
لکھو تسلیم سنِ طبع اگر لکھتا ہے | 'جوئے تسخیر' ۱۲۸۹ھ 'مگر 'جادۂ تسخیر' ۱۲۸۳ھ ہوا

نواب حیدر علی خاں نے "سبب تالیف کتاب" میں کوئی ایسی بات نہیں لکھی جس سے کسی طرف اشارہ مقصود ہو لیکن اس کے خاتمۃ الطبع میں تسلیم سہسوانی نے یہ لکھ دیا کہ

"حق[2] تو یہ ہے کہ مصنف نے اپنا نیا سکہ بٹھایا مرزا رجب علی بیگ مغفور سرور کا پرانا نقش اٹھایا وہ ہندی کی چندی نکال کر عجب نقشہ اتارا ہے کہ مدعی تک کہتے ہیں کہ گھر بیٹھے میدان مارا ہے ـــــ بہرحال یہ کتاب اپنی خوبیوں میں یکتا ہے فرد ہے آگے اس کے اعجوبگی کے فسانہ عجائب گرد ہے کارنامہ ہے"۔

"جادہ تسخیر" کا پلاٹ فسانہ عجائب سے کسی حد تک ملتا جلتا ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے ذہن میں فسانہ عجائب کا تصور غالب ہے جس طرح فسانہ عجائب میں دیوؤں اور جادوگروں سے لڑائیاں ہوتی ہیں۔ یہاں بھی خورشید گوہر پوش اسی طرح دشمن کے چھکے چھڑا کر ایک کے بدلے دو کو نے کر لوٹتا ہے۔

"جادہ تسخیر" کی زبان بڑی صاف ستھری، روزمرہ اور محاورہ روانی سے استعمال ہوا ہے۔ لفظی رعایتیں اور قافیے کا اہتمام بھی، لیکن آورد سے زیادہ آمد معلوم ہوتی ہے۔

"وزیرزادی[3] نے کہا کون سا درخت ہے جسے ہوا نہیں لگی۔ ظاہر میں سب پارسائی کا دم بھرتے ہیں۔ بڑی بڑی نیک زنیں بڑی بڑی عصمت والیاں

---

[1] جادہ تسخیر۔ حیدر علی خاں۔ مطبع نامی نولکشور ۱۲۸۹ھ ص ۳۶۶
[2] " " " ۳۶۴-۳۶۵
[3] " " " ص ۱۴۲

برقع میں چھیچھڑے کھاتی ہیں۔ گھونگھٹ کی اوٹ میں نوالے نوش کرتی ہیں۔
حضور برہم نہ ہوں دشمنوں کا چیتا نہ ہوگا آپ کا چاہیتا اوروں کا چاہیتا نہ ہوگا۔
لیجئے مبارک یہ حضور کی شادی کا بیان ہے۔ اللہ رکھو خانہ آبادی کا ساماں ہے۔
بادشاہ نے شاہزادے کو خلعت سرفرازی سے سرفراز کیا۔ شادی کی تاکید کی'
خانہ دامادی کا حکم دیا ——"

میں نے فسانہ عجائب کے ضمن میں تین اہم داستانوں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے شعوری اور غیر شعوری طور پہ اس کا عکس قبول کیا تھا۔ سرور نے اپنی اس داستان کو ناول سے قریب کر دیا۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ ایک مربوط پلاٹ کے ذریعہ اپنے قصّے کو پیش کیا بلکہ اس میں کردار نگاری کے نمونے بھی پیش کئے۔ اس سے قبل داستانوں میں کردار نگاری کا کوئی وجود نہ تھا۔ فسانہ عجائب سے متاثر ہو کر جو داستانیں لکھی گئیں ان کے مصنفوں نے بھی اس بات کا خیال رکھا۔ غالباً اسی تتبع کا ہی نتیجہ ہے کہ ان کے پلاٹ "فسانہ عجائب" سے غیر معمولی مماثلت رکھتے تھے۔ اور صرف پلاٹ ہی نہیں بلکہ کرداروں میں بھی اُن کی جھلک نظر آتی ہے۔ مثلاً جانعالم اور آرام دل (سروش سخن کا ہیرو) میں بڑی حد تک مماثلت ہے۔ جس طرح جانعالم کی اتفاقاً سرِ راہے ملکہ مہر نگار سے ملاقات ہوتی ہے اور اس سے شادی کا وعدہ کر کے انجمن آرا کی جستجو میں چلا جاتا ہے، اسی طرح آرام دل کی ملاقات بھی صنوبر شہزادی سے ہوتی ہے اور وہ بھی وعدہ کر کے اپنی منزل پہ حسن افروز کی تلاش میں نکل جاتا ہے۔ جس طرح فسانہ عجائب کے آخری حصّے میں سرور نے جانعالم کو سمندر کے سفر پہ روانہ کیا اسی طرح سروش سخن میں بھی آرام دل کو "لہر آتی ہے"۔

فسانہ عجائب کے کرداروں کی کمزوریاں سروش سخن میں مستعار ہیں۔ یہی حال جادہ تسخیر کے کرداروں کا بھی ہے۔ ان میں بھی یہ مماثلت نمایاں ہے۔

فسانہ عجائب کا بغور مطالعہ کرنے کے لئے اس کے چند کرداروں کا مطالعہ ضروری ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ یہ ایک مربوط قصّہ ہے جس میں مختلف کردار اپنے اپنے زاویوں سے واقعات پہ روشنی ڈالتے ہیں۔ داستانوں میں چونکہ زور قصے اور اس سے متعلق واقعات پہ ہوتا ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ افرادِ قصہ میں سے چند ایک کا تجزیہ کیا جائے۔ قصہ گو کا مقصد کردار نگاری ہوتا ہی نہیں بلکہ قصہ گو تو اُن سے اپنے قصے کو

آگے بڑھانے میں مدد لیتا ہے۔

فسانہ عجائب ایک منفرد داستان ہے جس میں محدود سے چند کردار ہیں لیکن ان کرداروں میں محض چند کردار ہیں جن پر سرور نے پوری توجہ صرف کی ہے۔ سرور نے کرداروں کا بیان کہانی کے اندر اس طرح سمو دیا ہے کہ انھیں اشارہ کرنے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی اور ہم انھیں پہچان لیتے ہیں۔

فسانہ عجائب میں مندرجہ ذیل کردار نظر آتے ہیں:-

۱۔ جان عالم ۔ ۲۔ ماہ طلعت ۔ ۳۔ ملکہ مہر نگار ۔ ۴۔ انجمن آرا ۔ ۵۔ وزیرزادہ۔
۶۔ چڑیمار ۔ ۷۔ دیونی ۔ ۸۔ چڑیمار کی بیوی ۔ ۹۔ سوداگر ۔ ۱۰۔ ملکہ کا باپ ۔ ۱۱۔ توتا۔
۱۲۔ کالا دیو ۔ ۱۳۔ سفید دیو ۔ ۱۴۔ جوگی ۔

ان کے علاوہ ضمنی قصوں میں بھی کچھ بڑے جاندار کردار ملتے ہیں جیسے فسانہ شاہ یمن میں 'خداداد دوست' کا کردار —— لیکن یہ کردار نفسِ داستان سے کوئی تعلق نہیں رکھتے اس لئے ان پر بحث کا یہ وقت نہیں ہے۔

اس معاملہ میں قطعی دو رائیں نہیں ہوسکتیں کہ فسانہ عجائب کا سب سے جاندار کردار ملکہ مہر نگار کا ہے۔ یہ کردار گوناگوں خوبیوں کا حامل ہے۔ یہ ایک عاشق کا کردار ہے۔ عورت کا یہ روپ ہندستانی ادبیات کی روایات میں شامل ہے۔ اس لحاظ سے سرور کی یہ بدعت اجتہادی حیثیت نہیں رکھتی۔

ملکہ مہر نگار سرتاپا عاشق ہے۔ وہ ایک نظر میں جانعالم پر فریفتہ ہوجاتی ہے۔ ملکہ کوئی دل پھینک قسم کی عورت نہیں ہے۔ وہ دل کے ساتھ دماغ بھی رکھتی ہے۔ باپ کے اصرار کے باوجود شادی نہیں کرتی۔ کیونکہ باپ کی فقیری کی بنا پر وہ ان تمام ذمہ داریوں کو ادا کرتی ہے اور باپ کی کمی کو سلطنت کے امور میں پورا کرتی ہے۔ اس کے سامنے شادی ایک مسئلہ ہوکر آتی ہے کہ اس حکومت کے کاروبار کا کیا ہوگا اور یہ سوچ کر اپنی ذات کی قربانی پیش کرتی ہے۔ لیکن جان عالم پر عاشق ہونے کے بعد اسے دنیا و مافیہا کا ہوش نہیں رہتا۔ وہ تن من دھن اس پر نثار کرتی ہے اور پھر ہم ایسے عاشق کو دیکھتے ہیں جس کا راستہ مصلحت نہیں روک سکتی۔ وہ سلطنت پر ٹھوکر ماردیتی ہے اور عشق عاشقی کی روایات کو تازہ کرتی ہے لیکن اس عشق میں دل کے ساتھ اس کا دماغ بھی ہم سفر ہے، وہ عقل کی رہبری کو تسلیم کرتی ہے۔ جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ

جانعالم انجمن آرا کے عشق میں گھر سے نکلا ہے تو اسے مایوسی اور اندھیرا نظر آتا ہے کیونکہ اس نے بھی انجمن آرا کے حسن کا چرچا سُن رکھا ہے۔

لیکن جان عالم اس کے حسن سے متاثر نہیں ہوا تو کیا، اس کے حسن سیرت کی چھاپ تو پڑی۔ اس نے بھانپ لیا کہ یہ ایک قابلِ قدر ہے۔ یہ رفیقِ حیات بن سکتی ہے۔ یہاں محض اس کی محبت کی قدر کا احساس نہیں ہے بلکہ اس کی ذات کا انکشاف ہے، جو مختصر سی ملاقات میں ہو جاتی ہے اور پہلی مدد جو برینائے دور اندیشی کرتی ہے وہ یہی کہ اپنے باپ سے ملنے کے لئے کہتی ہے کیونکہ اُسے معلوم ہے کہ اس کا عامل باپ اس کی مدد کر سکتا ہے اور اس کی منزل کی کٹھنائیوں کو دور کر سکتا ہے۔

جانعالم اپنی منزل پر روانہ ہو جاتا ہے اگر ملکہ مہر نگار قدیم داستان کا کردار ہوتی تو وہ اُسے بھول جاتی لیکن ایسا نہیں ہے۔ وہ اس کی یاد میں تڑپتی ہے ایسے ہی جیسے کوئی عاشق تڑپتا ہے۔ ملکہ مہر نگار کے لئے ہجر کے یہ دن بڑے کٹھن ہوتے ہیں۔ وہ ہر لمحہ جانعالم کی یاد میں گزارتی ہے، سہیلیوں کی کوئی تسلی اس کو سکون نہیں دیتی۔

'فسانہ عجائب' اس روش کی عام داستانوں سے اس لحاظ سے بھی مختلف ہے کہ یہاں عاشق سچّا عاشق ہے۔ ملکہ مہر نگار جانتی ہے کہ اس کے ساتھ شہزادہ شادی کر سکتا ہے، ہو سکتا ہے لیکن عشق کسی اور سے کرتا ہے۔ وہ اِس عہد کے مردِ عاشق کی طرح ہرجائی نہیں ہے اس کے یہاں مکمل سپردگی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے سامنے آزمائشیں بھی سخت آتی ہیں۔

مہر نگار کا کردار اردو ادب کے منفرد کرداروں میں مانا جاتا ہے۔ تاریخ ادب اُردو کے مصنف نے اس کا تجزیہ کرتے ہوئے درست لکھا ہے کہ :-

> " اس میں شک نہیں کہ ملکہ مہر نگار کے کریکٹر میں سچّی محبت، باوفائی، دلیری، معاملہ فہمی، جرأت اور متانت و بربادی کو نہایت واضح طریقے سے دکھایا ہے۔"[1]

ڈاکٹر گیان چند فسانہ عجائب میں کردار نگاری سے مطمئن نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود لکھتے ہیں کہ :-

---

[1] تاریخ ادب اُردو - رام بابو سکسینہ ترجمہ مرزا عسکری ص ۲۶

"کردار نگاری کی جان مہر نگار کا کردار ہے۔"[1]

سید ضمیر حسن دہلوی لکھتے ہیں۔

"ملکہ مہر نگار[2] کا کردار ہر اعتبار سے پختہ اور فن کارانہ کردار ہے اور ہمارے ادب میں اس سے پہلے اتنا جاندار کردار اگر کوئی ہے تو صرف رانی کیتکی کا کردار ہے جو انشاء اللہ خاں انشا کی لافانی تخلیق ہے۔"

ڈاکٹر نیر مسعود لکھتے ہیں۔

سرور[3] نے ملکہ مہر نگار کے دل آویز کردار کو اس چابک دستی سے پیش کیا ہے کہ وہ فسانہ عجائب کو مسحور کر لیتی ہے۔"

ملکہ مہر نگار کے کردار کے جاندار ہونے کے باوجود دو رائیں نہیں ہیں لیکن اس کے تجزیے میں ضرور اختلاف ہے اور یہ بات فطری بھی ہے اس لئے اس عظیم قصے کا یہ کردار ایک دیوزاد ہے جس کے سامنے عام انسان بونے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ فسانہ عجائب کے نقاد اس کو اپنے اپنے زاویے سے دیکھتے ہیں۔

سید ضمیر حسن دہلوی جب اس کو بہ نظر غائر دیکھتے ہیں تو وہ محسوس کرتے ہیں گویا۔

"یہ[4] کردار لکھنوی عورتوں کے اس سلیم الطبع فرقے کی نمائندگی کرتا ہے جو خالص مشرقی اقدار کا حامل بھولا بھالا اور معصوم ہے جو مرد کی حماقتوں اور کج فہمیوں کو جانتا، سمجھتا اور دیکھتا ہے لیکن معاف کر دیتا ہے کیونکہ مرد کی پرستش اس کی سرشت میں داخل ہے۔"

یہ تجزیہ دلچسپ اور فکر انگیز ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ملکہ مہر نگار کا کردار ایک انفعالی عورت کا کردار نہیں ہے۔ وہ متحرک اور فعال شخصیت ہے۔ مرد کی پرستش اس کی فطرت نہیں ہے۔ وہ مرد کی پرستش محض اس لئے نہیں کرتی کہ وہ ایک مثالی مشرقی عورت بننا چاہتی ہے بلکہ اس لئے کہ وہ عاشق ہے جسے اپنے محبوب سے والہانہ محبت

---

[1] اردو کی نثری داستانیں۔ ڈاکٹر گیان چند ص۴۲۵

[2] "فسانہ عجائب" کا تنقیدی مطالعہ۔ سید ضمیر حسن دہلوی۔ ص۶۹-۷۰

[3] رجب علی بیگ سرور۔ حیات اور کارنامے ص۲۰۹

[4] فسانہ عجائب کا تنقیدی مطالعہ ص۵۸

ہے۔ وہ اس کے لئے ہر قربانی کرنے کے لئے تیار ہے۔

ملکہ دل ہی نہیں دماغ بھی رکھتی ہے اور یہاں وہ عام عاشق سے ذرا مختلف بھی ہو جاتی ہے۔ وہ جانعالم کی حماقتوں اور کج فہمیوں کو اس لئے معاف نہیں کرتی کہ مرد کی پرستش اس کے لئے جزو ایمان ہے بلکہ اس لئے کہ وہ جانعالم سے محبت کرتی ہے۔

سرورؔ نے ملکہ کے کردار کو خوب اچھی طرح سوچا سمجھا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر کہیں انھوں نے جانعالم کو اس کے عشق میں مبتلا کر دیا ہوتا کہ وہ انجمن آرا کا خیال چھوڑ دیتا تو ملکہ مہر نگار کے جسم سے اس کی روح نکل جاتی اور یہ کردار نہ صرف اپنی عظمت کو کھو دیتا بلکہ بے جان بھی ہو جاتا۔ جانعالم کا انجمن آرا سے عشق ہونا ہی ملکہ کی شخصیت پر جلا کرتا ہے۔ اس کے اندر سوز و گداز بھی پیدا ہوتا ہے اور درد و کرب بھی۔ اور یہی عاشق کے اندر بڑائی پیدا کرتا ہے اور یہی بڑائی ہے کہ جس نے اس کی شکست کو فتح میں بدل دیا۔

جب جانعالم اور انجمن آرا کی سواری ملکہ کے مکان پر پہنچتی ہے اور انجمن آرا اسے گلے لگاتی ہے اس وقت ملکہ آبدیدہ ہو کر بولی ــــ

"تم نے مجھے محجوب کیا، میں فقیر کی بیٹی، تم شہزادی ــــ ہر چند شاہ و گدا دونوں بندۂ خدا ہیں الّا تمہارے قدم آنکھوں پہ رکھوں تو بجا ہے ــــ آپ کے آنے سے مجھے بڑا افتخار ہوا ــــ"[۱]

اور انجمن آرا ملکہ کو اپنا رقیب نہیں، رفیق بنا لیتی ہے اور ملکہ بھی آخر تک رفاقت کا حق ادا کرتی ہے۔ سرورؔ نے ملکہ کے کردار کا تصور مجموعی طور پر کیا تھا۔ یہ کردار ڈھلا ڈھلایا اُن کے ذہن میں اترا تھا اور بڑے کردار عموماً اسی طرح مصنف کے ذہن میں داخل ہوتے ہیں اور سرورؔ نے جیسے ہی ملکہ مہر نگار کو اپنی تمام تر بھر پور شخصیت کے ساتھ دیکھا وہ اس پر فریفتہ ہو گئے۔ وہ انجمن آرا کو بھول جاتے ہیں لیکن مہر نگار جدا نہیں ہوتی۔ جہاز کے ٹوٹنے پر وہ مقیّد ہو کر سامنے آتی ہے اور سرورؔ انجمن آرا کو بھول جاتے ہیں۔

جانعالم کا کردار خاصا جاندار کردار ہے اور انسانی شخصیت کے مختلف مظاہر کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ ایک عاشق اور جانثار ہے۔ حالانکہ اپنی تلوّن مزاجی کا شکار بھی ہوتا ہے۔ اپنی منزل پر پہنچنے سے پہلے وہ کسی جگہ ٹھہرتا نہیں، نہ اسے کوئی گھنی چھاؤں

---

[۱] فسانۂ عجائب۔ نولکشور اڈیشن ۳۹ واں ص ۱۰۵

بیٹھنے پر اُکساتی ہے۔

جانعالم مصیبتیں جھیلتے جھیلتے خطۂ زر نگار میں پہنچ جاتا ہے اور وہاں اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انجمن آرا جس کے لئے اس نے اتنی مصیبتیں جھیلی ہیں، اُسے دیو اُٹھا کر لے گیا ہے۔ اس وقت وہ ایک لمحے کے لئے بھی ٹھہرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا اور اس جہاد پر روانہ ہو جاتا ہے۔

قسمت داستان کے ہیرو کا ساتھ دیتی ہے لیکن خطرات اس کے انسانی ذہن کو پریشان کرنے کے لئے کافی ہوتے ہیں۔

جانعالم کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ناعاقبت اندیش ہے اور اس ناعاقبت اندیشی کی سزا اسے چار بار بھگتنی پڑتی ہے۔

- پہلی بار جب وہ بے سوچے سمجھے تالاب میں چھلانگ لگاتا ہے۔
- دوسری بار جب وہ وزیر زادے کو روح کو دوسرے کے قالب میں لے جانے کا عمل بتاتا ہے۔
- تیسری بار جب وہ نقش سلیمانی کو خواص کے حوالے کر دیتا ہے۔
- چوتھی بار جب وہ دریا کی سیر کو جاتا ہے اور ملکہ کے منع کرنے کے باوجود کشتی پر سوار ہو جاتا ہے۔

یہ بھی قسمت کی بات ہے کہ جانعالم کو ملکہ مہر نگار مل جاتی ہے اور اس مجسم دل کے لئے پاسبان عقل کا کام کرتی ہے اور اس کو پریشانی سے نکالنے کی کوشش کرتی ہے۔

لیکن ان تمام کمزوریوں کے باوجود جانعالم بڑی خوبیوں کا مالک بھی ہے۔

جان عالم کے کردار کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر نیّر مسعود لکھتے ہیں:۔

"نازوں کا پالا ہوا، شہزادہ، ماں باپ کا اکلوتا بیٹا، وارث تخت و تاج ہے اس کو تمام ضروری علوم و فنون کی تربیت اعلےٰ پیمانے پر دی گئی ہے۔ وہ نہایت لائق، خوش گفتار، طاقت ور اور فنونِ جنگ کا ماہر ہے اور اس کی نمایاں خصوصیتیں دو ہیں۔ خوبصورتی اور خوش گفتاری"۔

اسی کردار کے بارے میں ڈاکٹر انصار اللہ نظرؔ نے اس شبہ کا اظہار کیا کہ یہ کردار، آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ المعروف بہ جانعالم کے نام کی رعایت سے پیش کیا

گیا ہے۔ لیکن خارجی شواہد سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ جہاں تک مذکورہ بالا خصوصیت کا تعلق ہے۔ یہ وہ خوبیاں ہیں جو عام طور پر ہیرو شہزادے کی شخصیت میں دکھائی جاتی ہے جیسا کہ میر حسن کے شہزادے بے نظیر میں کم و بیش ایسی خوبیاں ہیں۔

اس کے علاوہ کہیں ایسا ثابت نہیں ہوتا کہ اس داستان کے ہیرو کے نام میں کسی منزل پر کوئی تبدیلی ہوئی۔ یہ داستان ۱۲۴۰ھ کی ہے۔ اور داستان کا نقش اول امجد علی شاہ کی تخت نشینی سے ۱۸ برس پہلے کا ہے۔ میرے خیال سے نام کی یہ مماثلت محض اتفاقی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ سرور کو اس مماثلت کا احساس واجد علی شاہ کے عہد میں بھی نہیں ہوا، ورنہ وہ اس کردار کی بعض کمزوریوں کو یقیناً اس زمانے میں دور کر دیتے اور نفسِ کردار میں کوئی نمایاں تبدیلی پیدا کرتے۔

جب ملکہ مہرنگار، جانعالم کو وزیرزادے کے ساتھ خلا ملا دیکھ کر اس کو خبردار کرتی ہے اور جانعالم اس کی بات کو نہیں مانتے تو ملکہ انجمن آرا سے مخاطب ہو کر کہتی ہے۔

"برائے[1] خدا انصاف تو کیجیے، خاطر کی نہ لیجیے، ان کے حمق میں کسی بیوقوف کو تامل ہوگا۔ آپ اگر عقل کے دشمن نہ ہوتے تو کیوں حوض میں کود کر ساحرہ کی قید میں پھنستے"

اس کے بعد دریا کی سیر کے وقت جب ملکہ منع کرتی ہے اور جانعالم نہیں مانتا تو کہتی ہے:-

"خفقان[2] کیسا تمہارے دشمنوں کو مالیخولیا ہے"

پھر جب جانعالم اپنے قالب اصلی میں آجاتا ہے تو ملکہ انجمن آرا کو بلا کر کہتی ہے:-

"لو صاحب[3] مبارک ہو، اللہ تعالیٰ نے تمہاری ہماری حرمت و آبرو کو بچایا بچھڑے سے ملایا، یہ آپ کا احمق الذی شہزادہ ہے"

یہ انداز بیان یقیناً ایسا تھا کہ سرور اس میں تبدیلی کر سکتے تھے اگر ان کے ذہن

---

[1] فسانہ عجائب۔ نولکشور ۱۲ واں اڈیشن ص ۱۲۴

[2] ایضاً ایضاً ایضاً ص ۱۶۹

[3] ایضاً ایضاً ایضاً ص ۱۵۳

میں واجد علی شاہ کا خیال بھی آتا تو یہ کوئی مشکل نہ تھا۔

فسانہ عجائب کی ہیروئن انجمن آرا ہی کو کہنا چاہیئے اس لئے کہ قصّے کے پلاٹ کا بھی یہی تقاضا ہے۔ انجمن آرا سیدھا سادا محبوب کا کردار ہے، جس سے محبت کی جا سکتی ہے ایک عاشق (ملکہ مہر نگار) کو پیش کرنے کے بعد معشوق (انجمن آرا) کا تجزیہ رجب علی بیگ کو آزمائش میں ڈال دیتا ہے۔ انجمن آرا کا پہلا تاثر اچھا نہیں ہے۔ جانعالم اسے دیو کی قید سے چھٹکارا دلا دیتا ہے اور تنہائی کی ملاقات میں حسن و عشق کے تیر چلتے ہیں۔ انجمن آرا پہلی نظر میں شہزادے کو پسند بھی کر لیتی ہے لیکن جس ناز و انداز کا مظاہرہ کرتی ہے وہ فطری ہے۔ مشرقی تمدّن میں لڑکی شرمیلی ہوتی ہے وہ شادی کے ذکر سے جھینپتی اور اسے ٹالتی ہے۔ بناوٹی خفگی کا اظہار بھی کرتی ہے۔ انجمن آرا، مشرقی تمدّن کی غمازی کرنے میں ذرا مبالغے سے کام لیتی ہے۔ سرور نے اس پر خاصا زور بھی دیا ہے۔ جب جادوگروں کی لڑائی کے بعد جانعالم انجمن آرا کو قید سے چھڑاتا ہے تو اس کی ملاقات پہلی بار انجمن آرا سے ہوتی ہے۔ وہ ایک نظر میں تیرِ نگاہ کا گھائل ہو کر بے ہوش ہو گیا۔ انجمن آرا تن تنہا ـــــ

"بیکسی کے سوا کوئی ہمدم شریکِ زندانِ غم نہ تھا، دل قبضۂ اختیار سے جاتا رہا، حجاب ہر چند مانع آتا رہا، مگر جانعالم کا سر، سر کا زانو پہ رکھا، چہرے کی گرد جھاڑی، غشی تو کبھی آنکھ سے نہ دیکھی تھی، گھبرا کر رونے لگی، اس طرح روئے یار دھونے لگی اور یہاں جو بوند آنسو کی منھ پر پڑی اور دماغ میں خوشبوئے کنار دلدار چڑھی، لخلخے کا کام کر گئی، گلاب کیوڑا چھڑکنے کی حاجت نہ رہی، آنکھ کھول دی، سبحان اللہ سر خاک افتادہ کنارِ یار زانوئے دلدار پہ پایا، ناز و نیاز نے دماغ عرش پہ پہنچایا اور پاؤں پھیلایا، یہ اترایا، انجمن آرا نے جھجھک کر گھٹنا سرکایا۔ جانعالم نے چشم نیم وا سے شہزادی کا منھ دیکھا اور کہا "ہماری بے ہوشی ہوشیاری سے اچھی تھی"[1]

اب سرور نے بے نیازی، حجاب اور ناز و نیاز محبوبانہ کی مبالغہ آمیز تصویر

---

[1] فسانہ عجائب۔ نولکشور ۱۲ واں اڈیشن ص ۷۷-۷۸

پیش کی ہے۔

"یہ کہہ کے آنکھیں بند کر لیں کہ "پھر ہمیں عشق آیا، کیوں تم نے زانو سرکایا۔" انجمن آرا نے کہا۔ "کیا خوب، اتنا اختلاط میری چڑ ہے۔ میں نے تیری محنت و مشقت پر نظر کر کے یہ انسانیت کی حرکت کی تھی، تم چل نکلے، خدا جانے دل میں کیا سمجھے، اپنی راہ لیجئے، چلتا دھندا کیجئے، واہ وا نیکی برباد گنہ لازم۔"

اور یہی نہیں آگے چل کر کہتی ہے:۔

"عشق و عاشقی کی باتیں میری بلا جانے، رمز و کنایہ کسی اور سے جا کر کرو، اپنا چونچلا تہہ کر رکھو، اپنی صورت تو غور سے دیکھو، تم نے سنا نہیں شاید ــ مثل ــ حلوا خوردن را روے باید۔"

اس کے بعد جب یہ دونوں اپنے گھر پہنچتے ہیں۔ ہم صحبت مزاجداں تاڑ گئیں وہ سب پاس آ آ کے کہنے لگیں۔

"یہ صورت اللہ[1] نے دکھائی ہے یا جانِ عالم کی جوتیوں کے صدقے سے نظر آئی جس طرح ہمارے مطلب دل ملے، خالق اس کی بھی جی کی مراد دے۔" انجمن آرا غصّے کی شکل بنا، تیوری بھوں چڑھا، کہنے لگی ــ "تم سبھوں کی شامت آئی ہے، کیا بیہودہ بک بک مچائی ہے، چوچلے کی خوبی، بزرگی، خوردی سب ڈبو دی، واہ وا تم نے میری چڑ نکالی، اپنی دانست میں دیوانی بنالی، خدا جانے یہ کون ہے کہاں سے آیا ہے۔ سبھوں نے میرا مغز کھایا ہے۔ اسے تو کیا کوسوں، وہ تو مسافر بے چارہ ہے، جی میں آتا ہے، اس کا منھ نوچوں، جس جس نے یہ نخرا بگھارا ہے اور بھی مجھے چھیڑو گی تو رو دوں گی، اپنا سر پیٹ لوں گی۔"

لیکن اس کے باوجود انجمن آرا کی بناوٹ، غیر معمولی مبالغہ آمیزی کے ساتھ پڑھنے والے پر ظاہر ہوتی ہے۔ یہ بات انجمن آرا کے مزاج سے بھی میل نہیں کھاتی۔ وہ کم گو ہے لیکن وہ انتہائی کوشش کرتی ہے کہ شہزادے کو صاف صاف جواب

---

[1] فسانہ عجائب ۱۲واں اڈیشن نولکشور۔ ص۸۱

دے دیا جائے یہاں تک کہ انکار بھی کر دیتی ہے۔

"میری[۱] قسمت کمبخت بُری ہے، ایک مصیبت سے چھُڑا، دوسری آفت میں پھنسایا۔ ہر دم کے طعنے اپنے بیگانے کے سننے پڑے کہ یہ آیا مجھے قید سے چھڑایا، خدا جانے وہ کون ہے کہاں سے آیا ہے۔ اپنے تئیں شہزادہ بنایا ہے۔ میں آپ کی لونڈی ہوں، بہر صورت فرمانبردار، اگر کنوئیں میں جھونک دو، چاہ سے گر پڑوں، اف نہ کروں، مگر جو آپ اُس کی شکل پر ریجھ محنت و مشقت کو سمجھ بوجھ یہ مقدمہ کیا چاہتی ہیں تو میں راضی نہیں، اگر مزدوری کی اُجرت، خدمت کا انعام منظور ہے کہ بادشاہوں کے نزدیک احسان کسی کا اُٹھانا بہت دور ہے، تو روپیہ، اشرفی، جاگیر پر عنایت کرو کہ اس کا بھلا ہو، کام ہو، آپ کا نام ہو۔"

میں سمجھتا ہوں کہ اگر یہاں سرور اس کی آنکھوں سے بھی کام لینا چاہتے تو زیادہ کامیاب ہوتے اس لئے زبان سے ضرورت سے زیادہ باتیں کردیں۔ سرور نے اپنے آپ کو بڑی مشکل میں ڈال لیا ہے۔ انجمن آرا کی ہم نشین جلیسیں امیر زادیاں، جن سے اس بات کے روز مشورے رہتے تھے، وہ اس موقع پر سرور کو اس مشکل سے عہدہ برآ کرتی ہیں۔

"اے[۲] ہے لوگو! تمہیں کیا ہوا ہے آتو جی صاحب بے ادبی معاف آپ نے دھوپ میں چونڈا سفید کیا ہے، خیر ہے صاحبو، دلھن سے صاف صاف کہوایا چاہتی ہو، دنیا کی شرم و حیا کیا نگوڑی اُڑ گئی، اتنا تو سمجھو، بھلا ماں باپ کا فرمان کسی نے ٹالا ہے جو یہ ٹالیں گی، الخاموشی نیم رضا، بوڑھے بڑے کے روبرو اور کہنا کیا۔"

انجمن آرا اس کے بعد خاموشی سے اپنے آپ کو اپنے عاشق کے سپرد کر دیتی ہے وہ مشرق کی ایک سیدھی سادی عورت بن جاتی ہے جو اپنے شوہر کی بات فرمان سمجھ کر قبول کر لیتی ہے۔ وہ خاموش لڑکی ہو کر سامنے آتی ہے۔

دوسری بار اس کی زبان اس وقت کھلتی ہے جب وہ ملکہ مہر نگار سے ملتی ہے۔ ملنے

۱۔ فسانۂ عجائب ۱۲ واں اڈیشن صفحہ ۸۳-۸۴

۲۔ فسانۂ عجائب ر نولکشور صفحہ ۸۴

سے پہلے اس کے ذہن میں ملکہ کا کوئی اچھا تصور نہیں تھا لیکن پھر یہ تصویر بدل جاتا ہے۔ وہ اس کو اپنے شوہر کی بیوی تسلیم کر لیتی ہے۔ اس میں بے تکلفی بھی ہے اور شوخی و ظرافت بھی۔

"ہم نے خوب کیا، رنڈی یہ چونچلے کی باتیں بگیانہ وار نہ کرتی تو کیا ہوتا،
اے صاحب ہمارے تو رشتہ ہمسری، سررشتہ برابری ہے اور حساب کی راہ
سے پہلے تو سلامتی سے تمھیں ہو۔ سرکار آتش ہمیں ملا ہے، پہلے مزا آپ نے
چکھا ہے، جو بن لوٹا ہے۔"[1]

اس کے بعد پھر وہ ہمیں خاموش نظر آتی ہے یہانتک کہ پھر ہر موقع پر اپنی تقدیر کو قبول کر لیتی ہے۔ وزیر زادہ، جانعالم کو بندر بنا کر خود جانعالم کے جسم کو اپنا لیتا ہے۔ ملکہ مہرنگار اپنی ذہانت سے بھانپ لیتی ہے اور اس کا ذکر انجمن آرا سے کرتی ہے لیکن وہ خاموش رہتی ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ گوشت پوست کی بنی ہوئی نہیں ہے۔ وہ اس دنیا کو حقیقتاً جادو نگری سمجھتی ہے۔ یہانتک کہ ہمیں اس کے خلوص پر بھی شک ہونے لگتا ہے۔

وہ وزیر زادے کے سامنے زرا بھی احتجاج نہیں کرتی اور اگر ملکہ نہ ہوتی تو شاید تن بہ تقدیر اس نے اپنے آپ کو عیار وزیر زادے کے سپرد بھی کر دیا ہوتا۔

اس کی یہ کمزوری ہمیں اس وقت زیادہ واضح طور پہ نظر آتی ہے۔ جب وہ کالا دیو کی قید میں ہوتی ہے وہاں بھی کالا دیو اسے دوبارہ زندہ کرتا ہے۔

"انجمن آرا اُٹھ بیٹھی، دیو نے میوہ تر و خشک روبرو رکھا مگر پریشانی
ہر سو متحیر نگراں، شہزادی نے کہا "خیر ہے"۔
اس نے کہا "آج غیر انسان کی بو آتی ہے، خوف سے جان جاتی ہے"۔
وہ کہنے لگی۔ "ہمیں آج تک جانور کی پرچھائیں نہ نظر آئی تو نے
آدمی کی بو پائی، طرفہ خبط ہے، یہ جملہ بے ربط ہے"۔
غرضیکہ صبح تک مذکور ہر شہر و دیار عجائبات روزگار کا بیان رہا"۔[2]

یہاں وہ ہرگز ایسی عورت نظر نہیں آتی جو دیو سے نفرت کرتی ہو۔ ہمیں یہ بھی

---

[1] فسانہ عجائب ۱۹۱۰ء اڈیشن نولکشور ص ۱۲۱

[2] ایضاً ایضاً ص ۱۸۹

خیال ہوتا ہے کہ شاید جانعالم کو بھول گئی ۔ وہ دیو سے دنیا بھر کے قصے سنتی ہے۔ شاید سرورؔ کو خود بھی اس کا خیال آتا ہے اور اسی لئے جب وہ جانعالم سے ملتی ہے تو دہاڑیں مار مار کر روتی ہے اور اس "بے نیازی" کا اس طرح کفارہ ادا کرتی ہے ۔

دوسری جانب ملکہ مہر نگار ایک بادشاہ کے محل میں ہے ۔ بادشاہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن وہ اپنے محبوب کی یاد ایک لمحے کے لئے بھی فراموش نہیں کرتی اور بادشاہ سے مہلت لے لیتی ہے ۔ یہاں دیو کے مقابلے میں بادشاہ کو ترجیح بھی دی جاسکتی تھی لیکن وہ عاشق ہے ہر جائی نہیں ۔ وہ توتے کو جس عالم میں ملتی ہے ۔ وہ بھی ایک مہجور کا جاندار مجسمہ ہے ۔ وہ پیڑ کے نیچے تن تنہا رو رہی ہے ۔ مایوسی اور اندھیرے میں گھری ہوئی ہے لیکن طلبِ صادق اسے توتے کی شکل میں پیغامبر سے ملا دیتا ہے ۔

جب یہ قافلہ اپنے شہر فسحت آباد میں پہونچتا ہے تو اس وقت ہمیں تیسری بار انجمن آرا ایک بار پھر بولتی ہوئی نظر آتی ہے ۔ یہ وقت وہ ہے جب ماہ طلعت سامنے آتی ہے اور توتا انجمن آرا کو دکھا کر کہتا ہے :۔

"حضرت سلامت ! اتنا زبانِ مبارک سے فرماؤ کہ آج سچا کون ہے ۔
جھوٹے کے منھ میں کیا ہے اور تو کیا کہوں ۔ آپ کی کج بحثی کے باعث
جانعالم کے ہاتھ، یہ لوگ مہ جبیں ماہ سیما آئے، گو اتنا چکر ہوا ۔ میرے سبب
آپ کو ندامت ہوئی ۔ جھوٹے کے منھ میں گھی شکر ہوا ۔"

اس پر انجمن آرا توتے کو ڈانٹتی ہے اور ماہ طلعت کو تسکین دیتی ہے :۔

"دیوانے کیا بیہودہ بکتا ہے، پھر ماہ طلعت سے کہا "سنو میری جان !
جانور بے شعور، عقل سے دور، حیوانیت سے مجبور ہے، دنیا کا کارخانہ فسانہ ہے ۔"

یہاں وہ ایک خاموش عورت ہو کر سامنے نہیں آتی ۔ شاید سرورؔ اس بات کو واضح کرنا چاہتے تھے کہ انجمن آرا کے دل میں ماہ طلعت کی طرف سے کوئی میل نہ تھا ۔

ہمیں رجب علی بیگ سرورؔ سے یہ شکایت ہے کہ انھوں نے ماہ طلعت کے ساتھ انصاف نہیں کیا ۔ ہم پہلی بار ماہ طلعت کو اس وقت دیکھتے ہیں جب اس کی شادی جانعالم سے ہوتی ہے ۔ وہ ہر اعتبار سے ملکہ ہونے کے شایاں شان ہے ۔ سرورؔ اس کا سراپا مندرجہ ذیل الفاظ میں پیش کرتے ہیں :۔

---

[1] فسانہ عجائب ۱۲ واں اڈیشن نولکشور ص ۲۱۷

"ایک[۱] شہزادی پری پیکر، خوبصورت، نیک سیرت، حور نژاد، گل اندام، سیمیں بر، رشکِ شمشاد، ماہ طلعت، دود ماں والا سے متولد ہوئی۔"

ایک شہزادی اور وہ بھی جو پری پیکر، حور نژاد، اور گل اندام ہو، اگر اس کے اندر اپنے حسنِ خداداد کی داد چاہنے کا جذبہ ہو، تو کوئی امر غیر فطری نہیں اور نہ اُسے "ضد، ہٹ اور غرّہ" سے تعبیر کرنا چاہئے۔ یہاں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ وہ عورت بھی ہے اور شہزادی بھی، جب جان عالم بامراد واپس آتے ہیں اور انجمن آرا و ملکہ، اس سے ملنے کی خواہش کرتی ہے تو جان عالم کا باپ کہتا ہے :۔

"وہ[۲] عورت بدبخت، سخت منہ پھٹ، بڑھ بولی، فضول ہے، اسے شرمندہ کرنے سے کیا حصول ہے۔"

حالانکہ اس داستان میں توتا ہی زیادہ منہ پھٹ معلوم ہوتا ہے اس لئے جب وہ اپنے حسن کی داد چاہتی ہے تو توتے کے بارے میں کہتی ہے :۔

"توتا[۳] بہت عقلمند، ذی شعور، سیاح نزدیک و دور ہے اس سے پوچھنا ضرور ہے، اور یہی نہیں توتے سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتی ہے۔" اے مرغِ خوش خو، طائرِ زمرد لباس، سرخرو، بذلہ سنج، بے رنج، سچ کہنا، اس سج دھج کی صورت کبھی تیرے طائرِ وہم و خیال کی نظر سے گذری ہے۔"

ماہ طلعت سے ہماری ملاقات بہت مختصر ہے اور اس میں وہ یقیناً ہمدردی حاصل ہے اور ہمیں تشنگی کا احساس رہتا ہے۔

سرور کے ہاتھوں توتے کے ساتھ بھی انصاف نہیں ہوتا۔ جب سب کو اپنی اپنی مراد مل جاتی ہے تو وہ توتے کو بالکل بھول جاتے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ دوسری داستانوں کی طرح توتا بھی کسی سحر کا شکار ہوگا اور شاید جانعالم کے ہاتھوں وہ اس سحر سے چھٹکارا پا جائے اور پھر ہم اسے ایک انسان کی حیثیت سے دیکھ سکیں اور اس کی جانفشانی، محبت اور خلوص کی داد دے سکیں۔ اگر توتے کو انسانی قالب مل جاتا تو شاید قصہ اپنے منطقی انجام کو پہنچ جاتا۔

---

۱ فسانہ عجائب ۱۲ واں نولکشور اڈیشن ص ۲۱

۲ ایضاً ایضاً ص ۲۱۷

۳ ایضاً ایضاً ص ۲۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ الذی خلق من الماء بشرا فجعلہ نسبا وصھرا وکان ربک قدیرا،

سزاوارِ حمد و ثنا، خالقِ ارض و سما جلّ وعلیٰ صانع بیچون وچرا ہے۔ جس نے رنگ بے ثبات سے بایں زنگارنگی، تختۂ چمنِ دنیا پُر از لالہ وگل، جز دکل بنایا، اور اور باوجودِ ترسِ باغبان وبیم صیاد، ولولۂ رخِ گل وبلبل کو دے کر دام محبت میں پھنسایا اور عاشقِ باوفا و معشوقِ پُر دغا کو ایک آب وگل سے خمیر کرکے، پردۂ غیب سے بعرصۂ شہود لایا۔ ایک خلقت سے دو طرح کا جلوہ دکھایا اور انسانِ ضعیف بُنیان کو اشرف المخلوقات فرمایا۔ جلوۂ حسنِ بتاں بخدا، شیفتگی کا بہانہ ہے۔ نالۂ بلبلِ شیدا گوشِ گلِ رعنا کا ترانہ ہے۔ اس کی نیرنگیوں کے مشہور فسانے ہیں۔ ہم اس کی قدرتِ کاملہ کے دیوانے ہیں۔ صفت اس کی محال ہے۔ زبان اس تقریر سے لالِ ہے۔ جس کی شان میں مخبرِ صادق یہ فرمائے۔ دوسرا اس عہدے سے کب برآئے ما عرفناک حق معرفتک

نعت سرورِ کائنات محبوب خدا

برگزیدۂ انبیاء محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

بعد حمدِ خالقِ جن وبشر، حاکم قضا و قدر، مبداءِ شام طالعِ سحر، نعتِ سیدِ کائنات، خلاصۂ موجودات، بہترینِ عالم، برگزیدۂ نوعِ بنی آدم، کی ہے۔ جس کے چراغِ ہدایت کی روشنی

ے، تیرہ بخت گم گشتۂ کوچۂ ضلالت بہ راہِ راست آئے۔ بہ توفیقِ رفیق اور مدارج تحقیق کیا کیا مرتبۂ بلند پائے اور منحرف کور باطنوں کو فہمِ ناقص کی کجی اور زعمِ فاسد نے کیسے کیسے روزِ سیہ دکھائے۔ اس کے حق میں یہ حکمِ حق آیا ہے۔ بچشمِ غور دیکھو تو کسی اور نے بھی یہ رتبہ پایا ہے۔ لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ سرِ حلقۂ اولین، خاتم المرسلین، صفت کریم، احمد بے میم، محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ الطاہرین اور اصحابہ المکرمین وسلم۔

کوئی شاعر اس کی شان میں کہتا ہے لا اعلم رباعی ؎

ہر چند کہ آخر بہ ظہور آمدہ ۔۔۔ پیش از ہمہ شاہانِ غیور آمدہ

دیر آمدہ ز راہِ دور آمدہ ۔۔۔ اے ختم رُسل قربِ تو معلوم شد

اس مشتِ خاک کا کیا فہم و ادراک، جو شمۂ صفاتِ ذات بابرکات، زبان پر لائے، جو عجز میں نہ در آئے۔ کام و زبان ناکامی سے فوراً جل جائے۔ اور منقبت امیر المومنین، امام المتقین، یکہ تاز میدان لافتیٰ، خلاصۂ مضمونِ سورہ ھَلْ اَتٰی، یہی کافی ہے۔ جسے پیمبر نے کہا لَحْمُکَ لَحْمِیْ وَدَمُکَ دَمِیْ عَلِیٌّ مِنِّیْ وَاَنَا مِنْہُ اور مدح اہل بیت رسالت کہ ولا ان کے ایمان کی دلیل ہے اور محبت ان کی، ہر فرد بشر کو واجب۔ بایں حدیث جلیل ہے۔ مَثَلُ اَھْلِبَیْتِیْ کَمَثَلِ سَفِیْنَۃِ نُوْحٍ مَنْ رَکِبَھَا نَجیٰ وَمَنْ تَخَلَّفَ عَنْھَا غَرِقَ وَھَویٰ۔

مذکورِ شاہِ غیور، قباد شوکت، نوشیرواں معدلت

غازی الدین حیدر بادشاہ غازی ارشد و دمان سعادت

پس از حمد خدا و نعت سرور انبیا، لازم و ضرور ہے کہ مدح والیٔ ملک بیان کرے۔ قولہٗ تعالیٰ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ اگرچہ صفت شاہ، زبانِ گدا کا بیان کرنا، چھوٹا منہ بڑی بات ہے، مگر نام نامی و توصیفِ ذاتِ گرامی اُس کی وسیلۂ توقیر، اس تحریر کا اور مفتاح باب اس پریشان تقریر کا، جان کر، شمۂ از شمائل وذرہ از خورشید خصائل، رقم کرتا ہوں، شاہ کیوانِ بارگاہ، بلند مرتبۂ عالیجاہ، سرِ حلقۂ شاہان والا تبار، جم شوکت، فریدوں فر، سلیمان اقتدار، کشور گیر، ملک ستان، خدیو کیہان، ابوالمظفر معز الدین

شاہِ زمن غازی الدین حیدر بادشاہ غازی خلداللہ ملکہٗ وسلطنتہٗ و اَیدہُ اللہ بالنصر والظفر جل جلالہٗ! اگر معرکۂ رزم یا صحبتِ بزم اُس کی اِنشا کروں، صفحۂ دنیا پر نہ لکھ سکوں۔ دمِ رزم، رستم و سام و نریمان، مثلِ پیرِ نال لرزاں، اور وقتِ سخا اور عطائے زر و مال حاتم کے ہاتھ میں کاسۂ سوال۔ بزمِ طرب میں زہرہ و مشتری سرگرمِ نغمہ پردازی و عربدہ سازی، ہنگامِ عتاب و خشم، مریخ مستعدِ جلادی و بیدادی، یہ ادنیٰ عنایت ہے۔ بیت

چناں بموسمِ سرما دوشالہا بخشید کہ گرم شد ہمہ بنگالہ سرد شد کشمیر

بسکہ سحابِ بخشش، اُس بحرِ عطا کا روز و شب، مزرعۂ کہ و مہ پر بارش کرتا ہے۔ شہر میں سالہا کان مشتاق سائل کی صدا کا، اور دیدہ ندیدہ، صورتِ گدا کا۔ عدل یہ کہ ہاتھی چیونٹی سے ڈرتا ہے، شیر بکری کی اطاعت کا دم بھرتا ہے۔ بچشم اس کے عہدِ دولت میں ہزاروں نے دیکھا، بکری شیر کے بچے کو دودھ پلاتی تھی، کنار میں شفقت سے سلاتی تھی۔ بازِ تیز پرواز بچۂ کنجشک کا دمساز اور نگہبان، بلی کی عادتِ جبلی یہ کہ کبوتر سے ہراساں۔ دودِ دلِ اندوہناک، روزنِ ہر خانہ سے مسدود۔ شحنۂ داد رخنہ بندیِ فساد کو موجود، اللہ تعالیٰ اس امیدگاہِ عالم عالمیان کو، اپنے حفظ و اماں میں سلامت رکھے۔ دولت خواہ اُس والا جاہ کے بعیش و شادی مدام اور دشمن رو سیاہ بر رنجِ نامرادی گرفتارِ آلام رہیں۔ بحق ربِ ذوالمنن بہ تصدق پنجتن۔

بیانِ مولّف دربارۂ لکھنؤ

و

ذکرِ صنعتِ مردمانِ خجستہ رو و تذکرۂ ہر صاحبِ علم و کمال علی قدرِ حال و نمونۂ مکاناتِ ایں شہر

یہ ہیچ مدانِ ہیچمدان، محررِ داستان مقلّدِ گذشتگان سراپا قصور رجب علی بیگ تخلص سرورؔ، متوطن خطۂ بے نظیر دلپذیر، رشکِ گلشنِ جناں، مسکنِ حور و غلمان، جائے مردم خیز، باشندے یہاں کے ذکی فہیم، عقل کے تیز۔ اگر دیدۂ انصاف و نظرِ غور سے اس شہر کو دیکھے تو جہان کی دید کی حسرت نہ رہے۔ ہر بار یہ کہے، شعر

وہ بیشک لکھنؤ کی سر زمیں ہے
سنا رضواں بھی جس کا خوشہ چیں ہے

سبحان اللہ وبحمدہٖ عجب شہرِ گلزار ہے، ہر گلی کوچہ دلچسپ باغ و بہار ہے۔ ہر شخص اپنے طور پہ با وضع قطع دار ہے۔ دو رویہ بازار، کس انداز کا ہے، ہر دوکان میں سرمایہ ناز و نیاز کا ہے۔ گو ہر محلے میں جہاں کا ساز و سامان مہیا ہے، پر اکبری دروازے سے جلو خانے، اور چکے پُل تک، کہ صراطِ مستقیم ہے۔ کیا جلسہ ہے۔ نان بائی خوش سلیقہ، شیرمال، کباب نان نہاری بلکہ جہان کی نکمت اس آبداری کی، جس کی بو باس سے دل طاقت پائے، دماغ معطر ہو جائے۔

فرشتہ گذرے تو سونگھے۔ کیسا ہی سیر ہو، ذرا نہ دیر ہو، دیکھے سے بھوک لگ آئے۔ وہ سرخ سرخ پیاز سے نہاری کا بگھار، سریلی چھنکار، شیرمال شنگرف کے رنگ کی، خستہ بھربھری، ایک بار کھائیے، نانِ نعمت کا مزا پائیے۔ تمام عمر ہونٹ چاٹتا رہ جائیے۔ کباب اس آب وتاب کے کہ مرغ و ماہی کا دل سیخ آہ پُرحسرتِ محرومی سے کباب، ادرک کا لچھا، میاں خیراللہ کی دوکان کا کترا، ہاضم باریک نایاب۔

حسینی کے حلوا سوہن پر عجیب جوبن، اس کی شیرینی کی گفتگو میں لب بند، جہاں کو پسند، پپڑی دبیز، بسی بسائی، ہونٹ سے کھائیے، دانت کا اس پر تمام عمر دانت رہے۔ لگانے کی نوبت نہ آئے۔ جوزی خوب، حبشی اہل ہند کو مرغوب، دودھیا شیرخوارہ نوش کر جائے۔

ہر کنجڑن کی وہ تیکھی چتون، آدمی صورت دیکھتا رہے۔ رعبِ حسن سے بات نہ کرسکے۔ سنگین پریزاد، سرو قامت، رشکِ شمشاد، دوکانوں میں انواعِ اقسام کے میوے، قرینے سے چُنے، روزمرے محاورے اُن کے دیکھے نہ سنے۔ کبھی کوئی پکار اٹھی "میاں ٹکے کو ڈھیر لگا دیا ہے۔" کوئی موزوں طبیعت یہ فقرہ سناتی "مزہ انگور کا ہے، زنگتروں میں۔" کسی طرف یہ صدا آتی ہے " گنڈیریاں ہیں پونڈے کی"۔ ایک طرف تنبولی سُرخروئی سے یہ رمز و کنایہ کرتے، بولی ٹھولی میں چبا چبا کر ہردم یہ دم بھرتے، "گھٹے کا منہ کالا، جھوبہ گرد کر ڈالا، عبیر ہے نہ گلال ہے، کتھے چونے سے اڈھی میں مکھڑا لال ہے۔"

گلیوں میں گجردم یہ آواز آتی " شیرمال ہے، گھی اور دودھ کی۔ مفلس کا دل اچاٹ ہے، ٹکوں کی چاٹ ہے۔ کدھر لینے والے ہیں۔ نمش کی تقلیاں، کھیر کے پیالے ہیں۔ کیا خوب بُھنے بُھربُھرے ہیں، چنے، پرمل اور مُرمُرے ہیں۔

جیٹھ بیساکھ کی وہ گرمی، جس میں چیل انڈا چھوڑتی، دو پیسے کو برف کی قفلی جمی، دو کھائیے بدن تھرائے۔ زیادہ ہو کا کرے۔ لقوے فالج میں مرے۔

سرچوک ہمیشہ شانے سے شانہ چھلا، نسیم وصبا کو سیدھا رستہ نہ ملا۔ شیخ کولی کی مٹھائی جس نے کھائی، جہاں کی شیرینی سے دل کھٹا ہوا۔ بنارس کا کھجلا بھولا،

متھرا کے پیڑے کا ٹھٹھا ہوا، برفی کی نفاست، بو باس، در دراپن، نقرئی ورق کا جوبن، کسی اور شہر کا رکابدار اگر دیکھ پائے، یا ذائقہ لب پر آئے زندگی تلخ ہو، ہاتھ کاٹ کاٹ کر کھائے۔ امرتی مسلسل کا ہر پیچ ذائقہ کو پیچ و تاب دیتا، یاقوتی مفرح کا مزا، جب منہ میں رکھا، اصل تو یہ ہے، عسلِ مصفّیٰ جنت کی نہر کا حلق سے اترا، پراچوں کی گلی کی کھجور، لذت ٹپکتی ذائقے میں چور، بہتر از انگور، نہایت آب و تاب، ہم خرما ہم ثواب، بالائی نورا کی دوکان پر جب نظر آئی، بے قند و شکر، شکر کر، نورٌ علیٰ نور کہہ کر چھری سے کاٹ کر کھائی۔ مداریے حقے وہ ایجاد ہوئے، کسگر ایسے استاد ہوئے کہ جب ترڑا قاآن کا شاہ پیچوان کا دم بند ہوا سب کو پسند ہوا، پٹھانا کا تمباکو، مشک و عنبر کی خوشبو، جس نے ایک گھونٹ کھینچا، اسی کا دم بھرنے لگا۔ علی الخصوص مردِ تماش بین کے واسطے یہ شہر خراد ہے، یہاں ہر فن کا استاد ہے، سیکڑوں گھامڑ، بدگل کندۂ ناتراش، اطراف و جوانب سے آ، ہفتہ عشرے میں پھل پھلا، وضع دار ہو گئے۔

جب ابوتراب خاں کے کٹرے میں جا، میاں خیراتی سے کسی کی خیرات میں خط بنوایا، بارہ برس کے سن کا گالوں سے مزا آیا۔ چار پہر کھونٹی ٹوٹی پتہ نہ پایا۔ کاتبِ قدرت کا لکھا مٹاتا ہے، ایسا خط بناتا ہے۔ سید حسن خاں کے کٹرے کے دروازے پر عبداللہ عطر فروش کی دوکان، جائے نشست، ہر وضعدار جوان ہے، دو پیسے میں بیلے چنبیلی کا تیل، ریل پیل، فتنہ بپا کرنے والا، ایسا ملا کہ سہاگ کا عطر، گرد ہوا، جو نور سے دل سرد ہوا۔ عطر کی روئی رکھی کان میں، پھر جا بیٹھا کسی افیونی کی دکان میں، سفید سفید چینی کی پیالیاں، خوبصورت رنگتیں زالیاں، افیون فیض آبادی لالے کی، وہ رنگین جس نے تریاکِ مصر کے نشے کرکرے کیے۔ زیادہ پی جانے والوں کو جان کے لالے ہوئے، ایسے متوالے ہوئے جھگڑا بادۂ ارغوانی و زعفرانی کا پیدا، تبدیل ذائقہ کو فرنی کے خوانچے، نقرئی ورق جمے، پستے کی ہوئی چھڑکی ہوئی مہیا، چسکی پی۔ ایک دم کے بعد دم حقہ کا کھینچا، آنکھوں میں سرور موجود ہوا، وہاں سے بڑھا، کان میں آواز آئی "بیلے کے ہار ہیں" شوقین البیلے کو، پہن لے، چلا جا فرنگی محل کے میلے کو۔ جب یہ سج بنی، بگڑا، پنجوں کے بل چلا۔ یہ بھولا، وطن کی چال ڈھال راہ و رسم بھولا۔ اکثر باہر سے آ، یہ دیکھ

بنا، جونپور کے قاضی ہونے کو مفتی میں راضی ہوگئے۔

برسات کے موسم میں شہر کا یہ عالم ہے۔ ادھر مینھ برسا، پانی جا بجا بہہ گیا، گلی کوچا صاف رہ گیا۔ ساون بھادوں میں زر دوزی جوتا پہن کر پھرے، کیچڑ تو کیا مٹی نہ بھرے۔ باغ بہار کی، صنعت پروردگار کی۔ رضواں جن کا شائق، دیکھنے کے لائق۔ روز عیش باغ میں تماشہ کا میلا، ہر وقت چین کا جلسہ، موتی جھیل کا پانی، چشمۂ زندگانی کی آب و تاب دکھاتا، پیاسوں کا دل لہراتا۔ سڑک کے درختوں کی فضا جدھا کھجوا موجیں مارتا۔ ہار سنگھار کے جنگل میں لوگوں کا جمگھٹا، زنگار رنگ کی پوشاک، آپس کی جھانک تاک۔ تختۂ لالہ و نافرمان جن پر قربان اور بندۂ ہائے خاص کی سبک روی، خرام ناز، ہر قدم پر کبک دری چال بھول کر جبین نیاز رگڑتی۔ شاخِ سروان کے روبرو نہ اکڑتی۔ شائق ہزار در ہزار، شمع پروانوں کا عالم۔ غول کے غول باہم۔ آم کے درختوں میں ٹپکا لگا۔ خاص جھولا وہیں پڑا، جھولنے والوں پر دل ٹپکا پڑتا۔ محبت کے پینگ بڑھتے، دیکھنے والے درود پڑھتے، باغ میں کوئل، پپیہے مور کا شور، جھولے پر گھٹا رہی، ادھی گھنگھور ——— ساون بھادوں کے جھالے، وہ رنگین جھولنے والے۔

دشتِ غربت میں یہ جلسہ جو یاد آجاتا ہے۔ دل پاش پاش ہو جاتا ہے، کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ نہ کہ کانپور کی برسات، ہیہات ہیہات، دخل کیا دروازے سے باہر قدم دھرے، اور پھسل نہ پڑے۔ گلی میں پاؤں رکھا اور کیچڑ کا چھپکا، سر پر پہنچا، وہ اس فصل میں باہم نہ دیکھے، مگر چہلے کے پھنسے اور جنھیں سواری کا مقدور نہیں، دخل کیا جو وہ جائیں کہیں ان کے حق میں برسات حوالات، گھر جیل خانہ، نہ کہیں جانا نہ آنا۔ اگر خواب میں کہیں نکل گئے تو چونک پڑے کہ پھسل گئے اور جو بازاری کاروباری ہیں۔ ان کا یہ نقشہ دیکھا، ہاتھ میں جوتیاں، پائنچا چڑھا، کیچڑ میں لت پت، یہاں گرے، وہاں گرے۔ خدا خدا کر جیتے گھر پھرے اور جو شیخی کے مارے ننگے پاؤں نہ نکلے تو شعر

دیکھی ہے یہ رسم اس نگر میں   جوتا ہے گلی میں آپ گھر میں

پھر بر سرِ مطلب آیا، خاص بازار کہ شہر وسیع و خوش قطع ہے، اس کے نقشے

سے بانی و بہزاد نے خار کھایا، شبیہہ کشی تو کیا خاکہ خاک نہ کھینچا، ہاتھ تھرّایا کوٹھیاں فرح بخش و دلکشا، برج ہر ایک جہاں نما، سلطان منزل اور اختری منجن، نشاط افزا، توبہ شکن، انسان کو دیکھ کر سکتہ ہوجائے، کام ان کا وہم وقیاس میں نہ آئے۔ سرِراہ کی بارہ دری، جواہر سے جڑی پری کی صورت کی، قریب نہر جاری، تکلّف کی تیاری، پائیں باغ اس کا، جس نے دیکھا، باغ ارم سمجھا، سوسن صفت ہزار زبانیں بہم پہونچیں، تعریف نہ کرسکا، گونگے کا سپنا ہوا، رومی دروازہ اس رفعت و شان کا ہے، گذرگاہ ایک جہان کا ہے، اگر اس پر چڑھ جائے بام فلک پست معلوم ہو، فرشتوں کا مشورہ کان میں آئے۔ پہر اوّلیں اس کی زمین ہے۔ شش جہت میں دوسرا نہیں ہے، مسجد انتخاب ہے۔ امام باڑہ لاجواب ہے۔ مقبرے عالیشان، وہ نادر مکان کہ فلک بدیدۂ انجم نگراں ہے۔ اُن کی نظیر کی جستجو میں مشعلِ مہ و خورشید، روز و شب روشن کئے، کو بکو سرگرداں ہے، اگر پاؤں پھیلانے کی جگہ ان میں ہاتھ آئے، سرِدست مرجانے کو جی چاہے۔ گومتی کے انداز سے نہر کی کیفیت نظر آتی ہے، طبیعت لہراتی ہے، دو رویہ آبادی، عمارت کہیں رمنے، کسی جا باغ بنے، صبح و شام وہ بہار نظر آتی ہے کہ شام اودھ اور بنارس کی سحر بھول جاتی ہے۔

[علی الخصوص اس جدید سڑک کی کیفیت اور بہار ہزاروں برس زمانے میں یادگار ہے کہ خلقت سبحان اللہ وبحمدہٗ کہے کہ شرق سے تا غرب اس کا مذکور رہا تا آبادی معمورۂ جہان مشہور رہا۔ واہ کیا شستہ و رُفتہ ہے اگر صفائی عارضِ خوباں سے مثال دیجئے تو روا ہے یا شیشۂ حلب سے نسبت کیجئے تو بجا ہے۔ اس قدر شفافی اور صفا اس سڑک نے پائی کہ خط استوا کی شکل صفحہ دنیا پر نظر آئی۔ دل گرفتہ اور خاطر فسردہ کو تفریح اور شگفتگی ہوتی ہے۔ اس کی سیر حزن و ملال اہل جہاں کھوتی ہے کیسا ہی خفقان ہو دور ہوجاتا ہے، جگر کو طاقت دماغ کو فرحت، دل میں سرور، آنکھوں میں نور آتا ہے۔ مریضوں کی دوا ہی بیت الشفا ہے۔ سہ پہر کو گرمی میں آبپاشی ہوجاتی ہے آئندہ روندے کے گرد گرد پھٹکنے نہیں

لہ یہ عبارت ایک قلمی نسخے سے ماخوذ ہے جو آزاد لائبریری علی گڑھ میں موجود ہے۔

پانی ہے ہوا فرحت انگیز ہوتی ہے۔ طبیعت موزوں اور تیز ہوتی ہے۔ راہ راست جو سنتے تھے بدولت شاہنشاہِ جہاں خاقانِ زماں تنگنائے وسمت کی سرگشتوں نے پائی۔ بابِ امید و کامیابی کی سیدھی راہ ہاتھ آئی۔ لولے لنگڑے بے تکلف دوڑے جاتے ہیں۔ اندھے بھی خانہ مراد تک پہونچ جاتے ہیں۔ رستہ بازار سڑک پر تیار ہے۔ روم شام کی چیز کا ہر جا انبار ہے۔ دکانوں کا ساز و سامان دیکھ کر عقلِ فلاطوں دنگ ہے۔ انداز نیا جہاں سے نیا سو میل مگر طرز جدا منقش و رنگا رنگ عجب ڈھنگ ہے۔ سڑک خوب، دکانیں مرغوب، ہوا سرد و سیر ہے جو وہاں نہ پہنچا اس کی قسمت کا پھیر ہے۔ بابِ امید کا جو پتہ ہے، ادھر درِ دولت وا ہے، اودھر امام باڑہ حسین آباد کی بنا ہے، سڑک سے نمایاں ہے، جلّ جلالہٗ کیا شکوہ و صولت ہے، کیا عزم و شان ہے۔ رفعت امام باڑہ و شکوہِ برج طلائی پہ مرغ زریں جناح ہر صباح نثار ہوتا ہے۔ صدقے گنبدِ دوار ہوتا ہے۔ شوکت و بلندی پہ پھریریں، ساکنانِ زمین کی نظروں سے گم گئے۔ خورشید درخشاں کے منھ پہ زردی پھر گئی۔ دمِ نظارہ و طواف امام باڑہ دیدہ و دِل دولتِ کونین حصول کرتا ہے۔ ایسی ہی بنا بانیِ ارض و سما قبول کرتا ہے۔ در اجابت بروئے حاجت منداں وا ہے۔ ماتم خانۂ شاہِ شہدا ہے۔

جس دم ضریحِ پاک نظر آئی، چھاتی بھر آئی۔ دلِ خوں دیدہ، جیحوں ہو جاتا ہے خود بخود رونا چلا آتا ہے۔ قریب اس کے حوضِ مصفا ڈبڈبائی آنکھ سے کم نہیں۔ کس شے کو حسین علیہ السلام کا غم نہیں۔ عیش باغ میں موتی جھیل ہے۔ اس عزا خانے میں نہر رشک کوثر نمونۂ سلسبیل ہے۔ ہر لہر موج زن غمِ خامس آلِ عبا ہے چشمۂ فیض چھلک رہا ہے۔ سنگریزہ اس کا فخرِ دُرِ یکتا ہے۔ بانی پانی خجلت سے دریا ہے۔ اُس کے جلو خانے نادر کا وہ تیرپولیہ ہے حواسِ خمسہ کھوتا ہے۔ ہر در دیکھ لیشر ششدر ہوتا ہے۔

کیسی ہی طبیعت مکدر ہو اس کے اندر آئے فرحت ہو جائے۔ رومی دروازہ چشم حیرت کی طرح وا حسرت سے اُسے تکتا ہے اگر استحکام پر نگاہ کیجئے، سدِ سکندر کا نام نہ لیجئے۔ روبرو اس کے وہ تالاب ہے جس کے پانی کا قطرہ بہ از گوہر نایاب ہے۔ عقل باریک بیں اس کے کام میں حیران ہے۔ صنعت صانع نادر نگار نمایاں ہے۔ ہشت پہل اور کوئی تالاب نہیں، شش جہت میں اس کا جواب نہیں۔ مہندسِ فکر اس کے برج دیکھ کر گم حواس کرتا ہے بہ دقت منطقۃ البروج قیاس کرتا ہے۔ مختصر سا اس میں پائیں باغ ہے جس کے رشک سے لالے کے جگر میں داغ ہے۔ نافرمانی سے اس کے سوسن کبود ہے۔ نشانِ سیلی، باغباں سے نیلاہٹ چہرے پر نمود ہے۔ روشیں شفاف ہیں کیاریاں خس وخاشاک سے صاف ہیں سرسبز وشاداب ہے۔ نہایت آب وتاب ہے۔ درخت گل وثمر سے بھرے لہلہے ڈہڈہے ہرے۔ گلشنِ جنّت کا نمونہ ہے۔ باغِ ارم سے کیفیت میں دونا ہے۔ ہر شاخ پر مرغانِ خوش الحاں ترانہ سنجی میں مشغول ہیں عجیب درخت غریب پھل، نئے روش کے پھول ہیں۔ نونہالانِ مہدِ چمن قامت کشیدہ شاخہائے بار پر مثل کریمان سخا شعار خمیدہ دیدۂ روزگار، مثلش نہ دیدہ، ہر بوٹے پتے پر اپنے اپنے طور کا جوبن ہے۔ قابلِ نظارہ وہ گلشن ہے۔ اگر صد برگ کی طرح زبان بہم پہنچائے تعریف نہ کرسکے، گونگے کا سپنا ہوجائے۔ تالاب کے گرد تصاویرِ نادر ایستادہ، ہر ایک اپنے کام پر آمادہ، گویا بولا چاہتی ہیں۔ لب بہ تکلم کھولا چاہتی ہیں۔ ہر صورتِ نقلی پر گمان اصلی ہے۔ آغا کے ہاتھ کا قطعہ میر کی لکھی وصلی۔ مانیِ چین وبہزاد دیکھ کر چیں مانے، آزر دیکھ کر بُت ہوجائے۔ تختۂ ارژنگ ہوجائے۔

قریب اس کے بنگلوں میں باغ ہیں۔ باوجود خلقتِ حیوانی خصلت انسانی رکھتے ہیں، نام کو دو دوام ہیں لیکن آدمیوں سے رام ہیں۔ ہر دم لوگوں کا میلہ ہر وقت سیر ہے ہر نیک آغاز کا انجام بخیر ہے۔ سہ پہر کو امام باڑے کے رو برو گذرے، سیر ہر گذرے ہے۔ ہر طرح کے طیر، بڑی سیر، مینا بازار کا جلسہ ہر روز ہو جاتا ہے۔ ایک جہان لینے دینے، بیچنے خریدنے کو آتا ہے۔ کسی جا کبوتر گرہ باز، شاہجہانپور کے بلند پرواز کسی جگہ شیرازی گلے نگار نیلے، بھورے سیمابیے، سبزے، بھورے، گنڈے دار۔ ایک طرف بیا نیم کی پتی ٹکلی کوڑی آسمان سے لاتا ہے۔ ایک سمت بیٹھی ہلاتا ہے، کوئی مینا پھڑکاتا ہے، کوئی نیل کنٹھ چھڑاتا ہے، کہیں بٹیر بازوں کا غول، کہیں لوے تیتر کا مول تول ہے۔ کسی جا ٹینی مرغیاں، کسی جا مرغِ اصیل ہے، کہیں انڈے لڑتے ہیں، قال و قیل ہے، کوئی کہتا ہے یہ سالار جنگی ہیں ان میں کوٹھے پارچے کا میل ہے۔ یہ اُچھت دلی والے ہیں کوئی کہتا ہے یہ ہٹی سنگہ والے زیر بندی ہیں ان کے گلے کینل کی، لاتوں کے عالم نرالے ہیں کہیں گلوری میں ٹکڑی ہیں جیتے ہیں۔ مرغ باز، ان کے خوف سے خونِ جگر پیتے ہیں۔ کسی طرف بٹیروں کے تھیلے کابکیں، مرغ کے کھانچے ہیں، کہیں کبوتر کے ٹھاٹھر کابک کے ڈھانچے ہیں۔

ایک طرف میوہ فروش کی للکار ہے کسی سمت سقوں کے کٹوروں کی جھنکار ہے۔ فالودے والے جدا غل مچاتے ہیں، برف کی قفلیاں لوگ کھاتے کھلاتے ہیں۔ سانپ والے تماشا کرتے ہیں۔ قصہ خواں امیر حمزہ صاحبقراں کا دم بھرتے ہیں۔ کہیں لونگ چڑے والے ہیں، دال موٹھ کے خوانچوں کے عالم نرالے ہیں۔ کباب ہر طرح کے گرما گرم سیخوں پر تیار ہیں۔ مٹھائی کے خوانچے ہزار در ہزار ہیں۔ بزازوں کی دکانیں قطار قطار ہیں۔ صرافوں کے

روبرو اشرفی کے انبار ہیں - کسی جا بربری بکریاں ہیں، لوک ہے، خریداروں کی نوک چوک ہے، کوئی پھولوں کے ہار گنتا چکاتا ہے، کوئی ککڑ والے کے حقے میں شگفہ اڑاتا ہے جہاں کا ساز و سامان طفیلِ شاہجہاں مہیا ہے، مصر کا بازار سرد ہوگیا ہے - ہفت ہزاری ہے یا بازاری ہے، ہر شخص کے لب پر دعائے صحت و سلامت و ترقیٔ جاہ و حشمت شاہنشاہ جاری ہے - شہر میں امن و امان ہے - ہر ایک کی خوش گزراں ہے - راست باز خرّم ہیں، کج رفتار انٹی مار کم ہیں - کارواں سرا نمونہ سرائے ہستی ہے، ہموار بہ تزئین بے شمار بلندی ہے نہ پستی ہے لطف کوچ آرام مقام اس مقام سے ملتا ہے غنچہ سربستہ دل اس کے دید سے کھلتا ہے - بھٹیاریوں کی ہر طرف صدا ہے - مکان نفیس صاف کھانا، گرم سرد پانی بھرا ہے، خدمت کرنا ہمارا کام ہے، انعام دینے میں تمہارا نام ہے - ٹھنڈی چھاؤں چبوترہ پکّا ہے نہ یہاں چور ہے، نہ اُچکّا ہے - دن کو چین رات کو آرام ہے - نہ چارپائی میں ایک کھٹمل نہ گھر میں مچھر پسو کا نام ہے - شب کو یہ آواز آتی ہے - ہر ایک اپنے اپنے مسافر کو سمجھاتی ہے راہ کے ملے کا نہ اعتبار کرنا، بے جانے بوجھے کا ساتھ نہ اختیار کرنا - دن رہے منزل پہ اترو، صبح ہو تو سدھا ہو، آواز دینے پہ نہ بولے، اُسے مارو - ایک طرف حجام تھکے ماندوں کے پاؤں دباتے ہیں - پیادہ چلنے والے راحت پاتے ہیں اور وہ جو بنائے مسجد رفیع وصحن وسیع ہے، جس کے دیکھنے سے دل مشغول ذکر حق ہوتا ہے یا عبادت کا بھولا سبق ہوتا ہے - اگر دیدۂ بینا ہو تجلیٔ انوار الٰہی ظہور فیض نامتناہی محراب و منبر دیوار و در سے ہویدا ہے - جلوہ صانع ریاضِ مصنوع پیدا ہے - کوسوں سے یہ مسجدِ سربلند رشک کوہ الوند

نمایاں ہے، عقل اس کے کام میں حیراں ہے۔ اس عمارت کی بنا ڈالی طریقِ حنیف کی راہ نکالی کہ جو دیکھے سجدہ کرے، خدائے بزرگ کا نام لے۔ اگر شیدائے پارسی زندہ ہوتا شیدا ہوکر سجدہ کرتا۔ اور سن مار رومیِ محرومی سے کاریگری کا دم نہ بھرتا، شرمندہ ہوتا، دعائے حاجت مندلب پر آئی اور فرشتوں کے گوش زد ہوئی کاربراری بے کوشش و کد ہوئی۔ یہاں کا موذن ہر سحر فرشتوں کو چونکاتا ہے نعرہ اللہ اکبر شاخِ سدرہ سے اُچک جاتا ہے۔ زینہار آسیانِ سیہ روزگار ہے۔ معبدِ مردمانِ شب زندہ دار ہے تمام شہر صحنِ مسجد کا پائیں باغ ہے۔ ناظریانِ صنائعُ الٰہی کو بجز نظارہ فراغ ہے، واہ کیا مسجد جلیل ہے۔ مصداقِ بنائے خلیل ہے شعر؎

بندہ جو صفت کرے بجا ہے   کیونکہ کہ یہ خانۂ خدا ہے

از روز بنائے فلک مقرنس آج تک ایسی مسجد پُرشکوہ بارفعت، ساکنان زمین نے نہ دیکھی تھی بلکہ گوش زد نہ ہوئی تھی۔ ایسی بنائے خیر کی کسی کو کد نہ ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ اس بنا کے بانی کو تاظہور و قیام مہندی قائم رکھے۔ سایہ عاطفت اس کا خلق کے سر پہ دائم رکھے۔ روزِ جلوس سے جو کام کیا وہ خیر کا مکان جو تعمیر ہوا وہ سیر کا کارپرداز بھی سب خیر خواہ جانفشاں منہدم بنائے شر، فدیہ سلطان علی الخصوص جو جو مقرر اور منظور نظر ہیں باطن کے خوب بظاہر خوش اسلوب بسانِ شاخ پر ثمر ہیں۔ نواب اعظم الدولہ، عظیم اللہ خاں بہادر، شیدائے شہریار نام پر نثار، یادگار روزگار ہے، حسب ارشاد اس سب عمارت کی بنا ڈالی، وہ ترکیب نکالی کہ غربا نہال محتاج آسودہ حال ہوئے، تاحشر نام رہے گا، جہاں تحسین و آفریں کہے گا۔ شرف الدولہ کو خیر خواہ و رازداری

سے شرف و افتخار ہوا۔ بدولت عنایت خسروی نائب اختر تابندۂ سرکار ہوا۔ قمرالدولہ کی نشانِ ارادت و جبہ سائی صفحہ جبین پر ماہ آسا نمودار ہے۔ بندگانِ خاص میں ہلال عید سا انگشت نما ہے۔ متین مدبر، مطیع و خدمت گذار ہے اور رفیق الدولہ رفیق بالتحقیق، شب و روز بحرِ ارادت میں غریق ہے۔ اسی سے بیڑا اس کا پار ہے، آقا پرست وفادار ہے۔ راجا ہر ایک دیانت دار امانت شعار۔ فنِ سیاق میں طاق شہرۂ آفاق ہے۔

غرض کہ عجب جلسہ ہے ہر شخص بے مثل ایک سے ایک اچھا ہے۔ اس مجمع کو جامع المتفرقین رب العالمین، اپنے حفظ و اماں میں رکھے۔ شاہنشاہ زمان کو باحشمت و جاہ مع مرشد زادۂ عالم پناہ صحیح و سالم جہاں میں رکھے۔ شرق سے تا غرب تابع فرمان آسمان و زمین ہو۔ بحق رب ذوالمنن و بہ تصدق پنج تن، پھر وہ جلسہ شروع ہوا، اب یہ شہر خوب ہوا۔ سب کو مرغوب ہوا خوشنویس یہاں اس قطع کا قطعہ لکھتے ہیں اگر میر علی یا آغا جیتے ہوتے اپنے لکھے کو روتے۔]

شہر نفیس، مجمع رئیس، ہر فن کا کامل، یہاں حاصل ہے۔ خوشنویس حافظ ابراہیم صاحب سا، اس قطع کا قطعہ لکھا، جو میر علی یا آغا جیتے ہوتے، اپنے لکھے کو روتے، اشکِ حسرت سے وصلیاں دھوتے، مرزائی صاحب کا یہ حال تھا کوئی پرچہ ان کا ان کی نظر پڑ جاتا، نیریز، بریز، بریز کہتا۔ یاقوت رقم ہیرا کھاتا، مرثیہ خوان جناب میر علی صاحب نے وہ طرز نو مرثیہ خوانی کا ایجاد کیا کہ چرخ کہن نے مسلم الثبوت استاد کیا۔ علم موسیقی میں یہ کمال بہم پہنچایا۔ اس طرح کا دھرپت، خیال، ٹپہ گایا اور بنایا کہ کبھی کسی نایک کے وہم و خیال میں نہ آیا تھا۔ ایک رنگین احاطہ کھینچا ہے، جو اس میں آیا پھولا پھلا، وہ اُن کا پیرو ہوا، اور جس نے ڈھنگ جدا کیا، وہ ٹکسال باہر، بدرنگ ہوا۔ اگر تان سین جیتا ہوتا ان کے نام پر کان پکڑتا، بھیک مانگ کھاتا مگر نہ گاتا۔ ہزاروں

شاگرد، جگت اُستاد ہوا، مولوی سب میں پریزاد ہوا۔ امیروں میں حسین علی خاں بُلبل ہزار داستان، خوش الحان، مرثیہ گوبے نظیر، میاں دلگیر، صاف باطن نیک ضمیر خلیق فصیح مردِ مسکین۔ مکروہات زمانہ سے کبھی افسردہ نہ دیکھا، اللہ کے کرم سے ناظمِ خوب دبیر مرغوب، سکندر طالع، بصورت گدا۔ بارِ احسان اہلِ دول کا نہ اُٹھایا، عرصہ قلیل میں مرثیہ سلام کا دیوانِ کثیر فرمایا۔

طبیب ہر ایک مسیحائی کرتا ہے، قُم باذنی کا دم بھرتا ہے، جسے دیکھا بقراط سقراط، جالینوسِ زمان ہے۔ اس معنی میں یہ خطہ رشکِ زمینِ یونان ہے۔ میرک جان صاحب پیرنے کے فن سے ایسے آشنا ہوئے کہ مردم بجرد بہ سرگرمِ شنا ہوئے۔ شاعرِ زباں داں ایسے کہ عرفی اور خاقانی کی غلطی بتائی۔ فردوسی و انوری کی یاد بھلائی۔ شیخ امام بخش ناسخ نے یہ ہندی کی چندی کی، اور روزمرے کو ایسا فصیح و بلیغ کیا کہ کلامِ سابقین منسوخ ہوا، فصحائے شیراز و اصفہان اس سیفِ زبان کا لوہا مان گئے۔ اپنے قبح پر منفعل ہوئے، اس زبان کا حُسن جان گئے، زمینِ شعر کو آسمان پر پہنچایا، سیکڑوں کو اُستاد بنایا۔ خواجہ حیدر علی آتش کی آتش بیانی، شرر افشانی سے دل جلوں کے سینے میں سوز و گداز ہے، مردِ قانع شاعرِ ممتاز ہے۔

فرنگی محل کا حال کیا لکھوں۔ کہاں زبان و دست کا یارا جو شمہ لکھا۔ مولوی فاضل عدیم المثال، ہر شخص جمیع علوم کا استاد، کتبِ درسی ابتدا سے انتہا تک یاد، منقول و معقول میں دقیقہ باقی نہ رہا۔ ریاضی کے ریاض سے آسمان کو زمین کردیا۔ مولوی انوار کا پرتوِ فیض جہاں بیں روشن۔ مولوی مبین دوربین، سراجِ انجمن۔ مولوی ظہور اللہ، سبحان اللہ، ایسے فقیہ محقق کہاں ہوتے ہیں۔ یہی لوگ نادر الزماں ہوتے ہیں۔ اُدھر رکنِ دین بلا کہ میر سید محمد مجتہد مستند، مرزا کاظم علی متقی اخوند محمد رضا، رضائے خدا کا جویا، حاملِ قرآن۔ ہمہ داں، کسی علم میں عاری نہیں۔ روئے زمین پر آقا محمد تبریزی سا قاری نہیں۔

مگر وہ جوشش ہے، نیک اندر بد، یہ اصل ہے، لبِ معشوق مولویوں سے۔ وہ رنڈیاں، پری شمائل، زہرہ پیکر، مشتری خصائل، اس ناز و انداز، سحر کرامات غمزہ عشوہ ادا، گات بانکی کہ ہاروت اور ماروت تو کیا، معاذ اللہ اگر سب فرشتے، عرش سے

فرشِ خاک پر آئیں، اُن کی چاہ میں لکھنؤ کے کنویں بھر جائیں۔ گھڑی بھر ان سے زانو بزانو بیٹھے۔ توبہ نصوحا ٹوٹے۔ اُن کا دروازہ نہ چھوٹے۔ لوئی چرخ ان پر نثار ہے۔ ہر ایک حور کردار ہے، خوش مزاج، مردم شناس، روز مرہ شستہ، دمِ تقریر رمز و کنایہ، اسی کوچہ کے فیض سے انسان آدمیت بہم پہنچاتا ہے۔ تراش خراش اثر صحبت سے کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔

کلانوت قوال بے مثال، چھجو خاں غلام رسول، سب کو موسیقی میں کمال حصول، شوری کی منہ زوری کی دھوم ہے۔ ٹپے کا موجد ہوا۔ سب کو معلوم ہے۔ بخشو اور سلاری نے طبلہ ایسا بجایا کہ پکھاوج کو شرمایا۔ پتنگ ایسا بنا، ایسا اڑا کہ نزدیک و دور مشہور ہے۔ ستر بہتر تار ڈور کا، پتنگ خیراتی یا چھنگا کے ہاتھ کا، لڑائی کی گھات کا، رستم کی عافیت تنگ کرنے والا، منحنی ہاتھ پاؤں پر مولوی عمدو نے ایسا لڑایا، عمداً اتنا بڑھایا کہ کدیوں سے عبادت چھوٹی، دوڑ دوڑ کر ڈور لوٹی۔ آنکھ بچا کر پٹیا توڑا۔ فرشتے خاں کا پتنگ نہ چھوڑا۔ مردان بیگ مانجھا دینے والا دیکھا نہ سنا، غرضکہ جو چیزیں یہاں نئی بنیں، اور ایجادِ طبیعت سے کاریگروں نے نکالیں۔ سلف سے آج تک نہ ہوئی تھیں۔ زر دوزی ایسی بنی، یہ باریکی چھنی، کہ باہر بندو اورگی کی پٹی جو پائیں، بجائے جیغہ و سرپیچ سر پر لگائیں۔ جوتا خورد نوک کا ببر علی نے اس نوک جھونک کا بنایا کہ جہاں کو پسند آیا، آرام پائی جس کے ہاتھ آئی۔ دل نے چین پایا۔

چالیس سال جہاں کی دیکھ بھال کی، ایسا شہر یہ لوگ نظر سے نہ گذرے اور تو اور شہدا پیر بخارا کا ململ سا سیّدالشہدا کا شیدا، برس روز میں جو پیدا کیا عشرۂ محرم میں محتاجوں کو نذر حسین کھلا دیا، یہ یکرنگی مزاج میں سمائی، تمام سن جوا کھیلا۔ دوئے کے داؤ پر اَدھی نہ لگائی۔ ایک روپیہ ہوا خواہ سو کہہ دیا، تو سیکڑوں داؤ منجھ گئے، منہ سے نہ پنجے گئے۔ وہاں بھی ایک چوک لگا رہتا ہے۔ آدمی کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔ جب وہ لوگ نظر آتے ہیں۔ مشائخ فقیروں کے مزار خوب، خواب راحت میں آسودہ۔ سالک و مجذوب، شاہ مینا، شاہ پیر محمد شاہ خیر اللہ ایک سے ایک سبحان اللہ، بظاہر مردہ، حقیقت میں جیتے ہیں۔ اشیائے

لطیف، کھلتے پھیتے ہیں۔ مولوی عبدالرحمٰن برگزیدۂ یزدان، عالمِ باعمل، درویش کامل، خواجہ باسط اور میر نصیر، جن کا عدیل، نہ نظیر۔ خواجہ حسین وحسن سرگروہِ انجمنِ طبیعت بس کہ مصروف باختصار ہے۔ ایک ایک فقرہ لکھا ہے۔ وگرنہ ان بزرگواروں کی صفت میں کتابیں تحریر کرے تو بجا ہے مگر شعر ؎

کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد　　ہرچہ گیرید مختصر گیرید

اس پر عمل کیا، منصف سے انصاف طلب ہیں، ہٹ دھرم سے کیا کہیں، جھوٹے کے روبرو سچا رو دیتا ہے۔ بالفرض معترض کہے، یہ لوگ کہاں کے تھے، تو یہ جواب شافی کافی ہے کہ یہ شہر ایسا تھا، جیتے جی یہاں سے نہ نکلے، مر گئے۔ پر یہیں رہے اور یوں تو، مصرع

کس نہ گوید کہ دوغ من ترش است

جو گفتگو لکھنؤ میں کو بکو ہے۔ کسی نے کبھی سُنی ہو سنائے۔ لکھی دیکھی ہو، دکھائے۔ عہدِ دولت بابر شاہ سے تا سلطنت اکبر ثانی کہ مثل مشہور ہے، نہ چولھے آگ، نہ گھڑے میں پانی، دہلی کی آبادی ویرانی تھی۔ سب بادشاہوں کے عصر کے روز مرے لہجے، اُردوئے معلّیٰ کی فصاحت، تصنیفِ شعرا سے معلوم ہوئی۔ یہ لطافت اور فصاحت و بلاغت کبھی نہ تھی، نہ اب تک وہاں ہے۔ قطع نظر اس سے لوگ اس خِلقت کے، گرہ سے کھوئیں اور جلسہ کریں۔ چنانچہ ایک بندے کے شفیق جگت آشنا جناب میرزا محمد رضا، مجمع خوبی از پا تا فرق، تخلص برقؔ۔ فی الحقیقت کلام بلاغت نظام ان کا، صاعقۂ خرمنِ ہستی حاسد ہے۔ بھائی بند شاعروں کا بازار ان کے روبرو کاسد ہے۔ جوان خوشرو، بہادر آشنائے بامزہ، نیک خو، شبِ ماہ صحبتِ مشاعرہ، بدولت خانہ مرزا معیّن ہے۔ رئیس امیر صغیر و کبیر تشریف لاتے ہیں۔ اس مکانِ وسیع میں آدمیوں کی کثرت سے جگہ کی قلّت ہوتی ہے، ہوا کشمکش سے بار پاتی ہے، جب پنکھے کی سعی اٹھاتی ہے، سخن سنج، بیرنج خوش گو، نازک فہم، باریک بیں، نیکخو جمع ہوتے ہیں۔ لوگ ان سے، وہ لوگوں سے لطف اٹھاتے ہیں۔ تلامذہ مرزائے ممدوح خدمت کو حاضر۔ کورے کورے مداریئے، دمبدم گلوریاں، ورق لگی، کتھا بسا، چونا سنگ مرمر کا، متواتر قبل از

غزل خوانی، افیون کا چرچا ہوجاتا ہے۔ کوئی پیتا ہے، کوئی کھاتا ہے۔ اگر چاہ کسی کو چائے کی ہوئی، دودھ پیتے بچے تک شیر چائے موجود کردی۔ ہمیشہ صبح اُس شام کے جلسے کی ہو جاتی ہے، طبیعت نہیں گھبراتی ہے۔ گھر جانے والوں کو صدائے مرغِ سحر ندائے اللہ اکبر آتی ہے۔ ہر چند سب لوگ یہاں کے فقرہیں، مگر یہ بزرگوار زینتِ شہر ہیں اور لکھنؤ کے جیسے بازاری ہیں، کسی شہر کے ایسے ہفت ہزاری ہیں؟ دلّال مرفّہ حال خوش پوشاک چمکے چمکائے اور ملکوں کے سیٹھ کروڑپتی گاڑھے لنگوٹی یا دھوتی۔ جب بڑا تکلف کیا، گاڑھے کا مرزائی پہن لیا۔ کلمۂ حق کہنے والے کا مدار دار پر ہوتا ہے۔ منصور نگر اس کا محلہ ہے۔ یہ نکتہ بگوشِ دل وجاں سن الحق مُرّ۔ حاسدوں کے خوف سے یہ مذکور مختصر کیا۔ اگر زیادہ لکھتا، قصہ ہوتا۔

کوتاہ بین لکھنؤ کے نام سے چڑھ جاتے ہیں، رشک کھاتے ہیں، افترا پردازی کرتے ہیں، جل مرتے ہیں۔ اچھے آغاز کا انجام بخیر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مشقت کسی کی بیکار نہیں کھوتا ہے۔ یہ فسانہ بعہدِ دولت شاہ غازی الدین حیدر شروع ہوا تھا اور تمام بعصرِ سلطان بن سلطان ابو النصّر نصیر الدین حیدر دام ملکۂ ہوا۔ اللہ اللہ یہ عجب شاہ جمجاہ اریکہ نشین ہوا کہ حاتم کا نام صفحۂ سخا سے، مثلِ حرفِ غلط مٹا دیا۔ فقیروں کو امیر بنا دیا۔ عیش و نشاط کی طرف طبیعت جو آئی ایک ایک ادنیٰ کنچنی ہفت ہزاریوں سے اعلیٰ بنائی۔ محمد شاہ کی گور تھرائی۔ شہزادیوں کو کہاریوں پر رشک آیا۔ خواصوں کو صاحبِ نوبت کیا، چنڈول سکھپال میں چڑھایا۔ ہزار بارہ سے جلسے والی حور وش، برق کردار، کبک رفتار، نغز گفتار، از پا تا فرق، دریائے جواہر میں غرق، ہر دم دست بستہ، روبرو کھڑی رہی۔ جہاں کی نعمت ان کے سامنے پڑی رہی۔ اصیلوں کو کروڑوں روپئے دیئے۔ پیش خدمتوں نے بادشاہت کے چین کئے۔ قدسیہ محل پر طبیعت جو آئی معاً رفعت و شان فلکِ ہفتم پر پہنچائی۔ کئی کروڑ روپئے اس منظورِ نظر نے صرف کئے، خزانے خالی کر محتاجوں کے گھر بھر دئے۔ ہر وقت راجا اندر کا جلسہ رہا۔ نہروں میں عطر بہا۔ مکان اس طرح کے بنوائے کہ فلک گرداں نے صدقے ہو کر چکر کھائے۔ اندر آسن گلشنِ ارم کہ ایسا باغ اور اس طرح کی کوٹھی، چشم وگوش عالم نے دیکھی نہ سنی۔ دوازدہ، امام کی درگاہ ایسی بنائی کہ چرخ

گرداں کو اور خواب میں نظر نہ آئی۔ اندر آسن میں عطر کا حوض چھلکتا رہا، تمام شہر مہکتا رہا۔ مغلانیوں نے گوٹے کناری کی کترنوں سے چاندی سونے کے محل اٹھائے۔ خاصے والیوں نے لونگ، الائچی، زعفران کے، اپنے گھروں میں خاصے ڈھیر لگائے۔ مکّا خیاط مالِ دنیا سے مالا مال ہے، استغنا کا دم بھرتا ہے، سینا تو کیا ٹانکا کم بھرتا ہے۔ بجُز غمِ حسین شہریار کو اندوہ و غم نہیں، کون ہے جو اس زمانے میں شاد و خرم نہیں۔ اربعین تک عزاداری ہوتی ہے۔ خلقِ خدا ماتمِ حسین میں روتی ہے۔ لاکھوں روپیہ اس راہ میں صرف ہوتا ہے۔ چالیس شب کوئی نہیں سوتا ہے۔ تخمِ عملِ نیک مزرعۂ آخرت میں بوتا ہے۔ روزِ تولد ہر امام، وشبِ وفاتِ جگر بندان خیر الانام لاکھ لاکھ روپیہ کا صرف ہے۔ اس کی ہمت کے آگے فیاضانِ گذشتہ پہ حرف ہے۔ حسنِ صورت، شوکت و حشمت، جاہ و ثروت، جتنی دنیا کی خوبیاں ہیں، اللہ نے سب دی ہیں۔ ہر شب شبِ برات، روزِ عیدین کے ہیں۔ سیرِ دریا کی دفعتاً جو لہر آئی، گنگا سے نہر منگائی۔ اس میں بھی غربا نہال، کارندے مالا مال ہوگئے۔ لبکہ خامۂ مولف اختصار رقم ہے، مگر جتنا اس کی صفت میں لکھئے، بہت کم ہے۔ لہٰذا اس غزل پہ مطلب کو اختتام دیا۔ یہ داستان وہ نہیں جو لکھی جائے ناچار تمام کیا۔

غزل

تا ابد قائم رہے فرماں روائے لکھنؤ
یہ نصیر الدّین حیدر بادشاہِ لکھنؤ

گو ملے جنت بھی رہنے کو بجائے لکھنؤ
چونک میں اٹھتا ہوں اس پر کہہ کے ہائے لکھنؤ

رشک کھا کھا گو فلک مجھ سے چھڑائے لکھنؤ
تب میں جانوں دل سے جب میرے بھلائے لکھنؤ

یا تو ہم پھرتے تھے ان میں یا ہوا یہ انقلاب
پھرتے ہیں آنکھوں میں ہر دم کوچہ ہائے لکھنؤ

اُن کے استغنا سے کیا کیا آرزو کرتی ہے رشک
جامِ جم پر تُف نہیں کرتے گدائے لکھنؤ

کیوں گمانِ زاغ بلبل کے ترانے پر نہ ہو
یاد آجائیں جو وہ نغمہ سرائے لکھنؤ

ہر محلے سے بچا ناجی ہے عیسیٰ کو محال
چھوٹتے جیتا نہیں معجز نمائے لکھنؤ

جن وانس و وحش و طائر کیوں نہ سب محکوم ہوں
ہے سلیماں ان دنوں فرماں روائے لکھنؤ

دشتِ غربت میں کیا برباد وحشت نے تو کیا
دل سے اُڑتی ہے کوئی اپنے ہوائے لکھنؤ

یہ رہے آباد یارب تا بہ دورِ مشتری
میں کہیں ہوں، مانگتا ہوں پر دعائے لکھنؤ

بلبلِ شیراز کو ہے رشک ناسخ کا سرور
اصفہاں اس نے کئے ہیں کوچہ ہائے لکھنؤ

الٰہی بحرمت سید ابرار احمد مختار و بہ تصدق ائمہ اطہار، لکھنؤ کو آباد رکھ۔ والیِ ملک کو یہاں کے کار فرما رعیت پرور سریرِ حکومت پر دل شاد رکھ۔ جب تک گنگا جمنا میں پانی ہے، یہ خطۂ دلچسپ فرح افزا آباد رہے۔ فرد ؎

الٰہی لکھنؤ بستا رہے دورِ قیامت تک
سرورِ دشت پیما کا کبھی وہ شہر مسکن تھا

اور مقلد یہاں کے موجد سے بہتر ہوتے ہیں۔ شاگرد ہو کر استاد کے ہمسر ہوتے ہیں۔ مطبع اس شہر میں اکثر رنگ کے ہیں۔ نمونے نیرنگ کے ہیں۔ مگر ہمارے شفیق و مہربان یک رنگ حاضر و غائب یکساں جناب مولوی محمد یعقوب صاحب مدظلہ، عزیز دلہا ہمہ صفت موصوف ہیں دور دور مشہور و معروف ہیں۔ سابق ازیں فرنگی محل میں چھاپہ خانہ تھا اَلْعَاقِلُ یَکْفِیْہِ الْاِشَارَۃُ در رنگ ابنائے زمانہ تھا۔ اخبار کا پرچہ چھپتا تھا، ان کا پتہ نہ چھپتا تھا۔ خوشنویس ایسے جمع ہوتے تھے، اور محرر اپنے لکھے کو روتے تھے۔ اپنے اپنے انداز پر بے نظیر یادگار آغا ہم پہلوئے میر کلیں ولایتی دل کو بیکل کرتیں۔ بے تکلف کہ بے پاؤں اشارے پر چلتیں۔ کانپی کو دیکھ کے جی کانپتا۔ کیسا ہی زبردست جوان ہو، بیفرملے ایک فرما نکالنے میں ہانپتا۔

اور مقلدی میں یہاں کے لوگ صاحبِ کمال ہیں۔ باریک بیں، دقیقہ رس، نکتہ فہم، نازک خیال ہیں۔ یہ عجب ان صاحبوں کا لکھا ہے۔ مقلدی میں موجد ہو جاتے انھیں کو دیکھا ہے۔ اس شہر میں کئی مطبع رنگی ہیں۔ گواہ نیرنگی ہیں۔ لیکن ایک ہمارے عنایت فرما ہیں جناب میر حسن صاحب، صاحبِ حسن و جمال، جوان خوشرو، صاف باطن، حمیدہ خصال، حسنِ خلق انکا خلق میں مشہور ہے۔ عُجب و نخوت اُن کے نزدیک سے دور ہے۔ موسمِ شباب ہے، چہرے پر جوانی کی آب و تاب ہے۔ بیتِ ابرو، کاکلِ مشک بو، صفحۂ رخسار گلِ بے خار، از سرتا پا، ہر شے دیوانِ وجاہت میں انتخاب ہے۔ محمود نگر میں ان کا چھاپہ خانہ جدید ہے۔ عیاذاً م باللہ پھولا گلشنِ بے خزاں ہے کہ دید و نہ شنید ہے۔ عقل دنگ ہے۔ کارخانہ کیا ہے، تختۂ ارژنگ ہے۔ ایک سمت خوش نویس ثانی آغا و میر ہفت قلم،

پتھروں پر ایسی جلا کہ دمِ نظارہ پیکِ نگاہ کا پاؤں پھسلتا۔ یہ صفا اگر بغور دیکھو تو قلم موے یہ لکھا ہے کہ ہر پتھر پر طور کا جلوہ ہے۔ کتبِ پارینہ کے واسطے احیاے اموات کا نقشہ تھا معجزہ عیسیٰ کے اثبات کا نقشہ تھا۔ شائقوں سے ارنی کی جب صدا آتی بیلن سے بے لن ترانی اور نہ ندا آتی۔ گو تحریر کا مقدر زمانے میں ہے۔ سیاہی میں روشنائی کا جلوہ اسی کارخانے میں ہے۔ جو کتاب چھپی وہ مرقع مانی کی تصویر تھی۔ حرف مٹنے کا کیا، حرف مثل نوشتہ تقدیر تھے۔ شہروں میں اس چھاپے کی دھوم تھی۔ گردشِ تقدیر کسے معلوم تھی۔ دفعتہً فلک نے یہ چکر کھایا، حرفِ غلط کی طرح رگڑ کے شہر کو مٹایا۔ پروین سے بنات النعش کی صورت نظر آئی۔ ایسا تفرقہ پڑا کہ پھر نہ کسی کی خبر پائی۔

فقیر حسب الطلب مہاراج ایسری پرشاد نارائن سنگھ بہادر راج بنارس دام حشمتہم، بنارس میں آیا۔ شکر صد شکر کہ رئیس والا جاہ، رعیت پناہ، غریب نواز، غربا پرور، باریک بیں، قدر شناس، سخی، شجاع، سخن فہم، عدل گستر پایا۔ در نولا دوستوں کی تحریک سے مولوی صاحب کو شغل پارینہ منظور ہوا۔ پہلے عزم فسانہ سرور ہوا۔

ایک طرف فاضل صاحبِ درس و تدریس ہر ایک بینظیر، شیر و شکر کی طرح باہم ایک جا ولایتی گل، جسے دیکھ کر جی بے کل ہو گیا ہے۔ کیسا ہی جوان قوی ہیکل ہو اگر چاہے پہاڑ اٹھالے، مگر ایک کاپی میں ہاتھ کانپے۔ کیا دخل ہے جو بے دریافت دس فرمے نکالے۔ اس کی ہر کمانی کو اگر کارِ مانی کہوں بدگمانی ہے۔ بہزاد کی عقل کو حیرانی ہے۔ پرزے پرزے پر جلا ہے، صفا ہے، یدِ سحر کا ڈھلا ہے۔ کہیں پتھر صاف صاف، شفاف جن کے سنگ کا فرسنگوں نظر نہ آئے۔ مردمِ دیدہ اگر اس کی صفا کو نظر بند کریں، آنکھ پھسل جائے۔ ہر پتھر ہمسنگِ کوہِ طور ہے۔ کسی پر جلی لکھا کوئی قلم مُو سے مسطور ہے۔ کاری گر ہر ایک سرگرم فرماں روائی ہے۔ کتب کہن از سر نو زندہ ہوتی ہیں، ثبوت اعجازِ مسیحائی ہے۔ سبک دست چست و چالاک استاد ہیں۔ طبع بلند اُن کا مطبوع دل پسند اپنے کام میں ذی استعداد ہیں۔ بے لن ترانی کہتا ہوں، نئی تشبیہ ہاتھ آئی ہے۔

اس کی صحت کی خاطر بندہ کو لکھا۔
بجز اقرار چارہ نہ ہوا۔ انکار گوارا نہ ہوا۔
ہر چند یہ فسانہ بطرزِ زمانہ ہر ایک
چھاپہ خانہ میں نیا نیا رنگ لایا جس
نے چاہا جس فقرہ پر پانی پھیرا۔ صفحہ
کتاب سے بہایا۔ بقول فقیر جو مضمون
سمجھ میں نہ آیا یا نہ پڑھا گیا۔ وہ گُندلبولے
سے گڑھا گیا۔ جودت قلم نشاروں کی
ہوئی۔ اصلاحِ خط یاروں کی ہوئی شعر

اور تو بس نہیں چلتا ہے رقیبوں کا والے
توز کے نام کو لکھ لکھ کے جلا دیتے ہیں

یہ نہیں سمجھے۔ مصرع

قبول خاطر و لطف سخن خدا داد ست

تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ

فقیر نے اس کے دیکھنے میں عرق ریزی
از حد کی۔ حضرت کے خوف سے انتہا کی
کد کی۔ جس جگہ محل اور موقع پایا ہے کیا
کیا جملہ بڑھاپے میں بڑھایا ہے ایسی متاع
گراں بہا کس گنجینہ میں ہے۔ جس کی جگہ
ذی فہم قدر شناسوں کے سینہ میں ہے۔
الٰہی جب تک فلک کی حرکت سے چمنِ
دنیا میں نسیم بہاری رہے کار فرما
سر سبز، کام جاری رہے۔

بیلن کی سیاہی میں صاف کیفیتِ
روشنائی ہے۔ فریم ہر ایک رُقعہ کی
تصویر ہے، لکھا مٹتا نہیں گویا خطِ
تقدیر ہے۔ الٰہی جب تک فلک کی
کَل چلتی رہے اور کارخانۂ چرخِ زنگاری
رہے۔ یہ کار فرما سلامت رہے،
کارخانہ جاری رہے۔

نوٹ:۔ فسانۂ عجائب کے بیشتر نسخوں
میں جو سرور کے سامنے چھپتے رہے عام طور پر
مطبع میر حسن واقع محمود نگر کا ذکر ہے۔ جس میں
فسانۂ عجائب کا پہلا اڈیشن چھپا تھا لیکن افضل المطابع
کے نسخے (مطبوعہ ۶، ۲۲ھ) میں جہاں لکھنؤ
کے مطبعوں کا ذکر ہے وہاں منشی محمد یعقوب
انصاری صاحب کے مطبع کا ذکر ہے۔ اس کے
بعد اس مطبع کا ذکر کسی نسخے میں نہیں ہے واضح
ہو کہ موصوف سرور کے خاص دوستوں میں سے
تھے اور اس عبارت میں سرور نے چند اہم باتوں
کی طرف اشارہ کیا ہے اسی لئے میں نے مطبع میر حسن
کے ذکر کے پہلو بہ پہلو اس کو پیش کر دیا ہے۔
نیز یہ بھی کہ میرے نسخے کی بنیاد
یہ نسخہ بھی ہے۔

اطہر پرویز

بندہ کمترین تلامذہ اور خوشہ چین، خرمنِ سخن، جناب قبلہ و کعبہ، استادنا گرد
نواز، معزز و ممتاز مجمع فضل و کمال، نیک سیرت، فرخندہ خصال، خرد آگاہ، دانش

آموز، و یادگارِ جناب میر سوز، عرفیِ عصر، سعدیِ زماں، رشکِ انوری و خاقانی، آغا نوازش حسین خاں صاحب عرف مرزا خانی، تخلّص نوازش ہے۔ حقیقتِ حال یہ مقال ہے کہ طرزِ ریختہ اور روزمرّہ اردو کا، اُن پر ختم ہے۔ شعر ان کے واسطے، وہ شعر کی خاطر موضوع ہیں۔ کہنے کے علاوہ پڑھنے کا یہ رنگ ڈھنگ ہے، اگر طفلِ مکتب کا شعر زبانِ معجز بیان سے ارشاد کریں۔ فیضِ دہانِ تاثیر بیان سے پسند طبع سحبانِ وائل ہو۔ فی زمانا تو کیا سابقین جو موجدِ کلام کوس لمن الملکی بجاتے تھے۔ ان کے دیوانوں میں دس پانچ شعر تناسب لفظی یا صنائع بدائع کے ہوں گے۔ وہ اُن پر نازاں تھے اور متاخرین فخریہ سند گردانتے ہیں، لہٰذا جس شخص کو فہمِ کامل یا اس فن میں مرتبۂ کمال حاصل ہو اور طبع بھی عالی ہو آپ کا دیوان بچشمِ انصاف و نظرِ غور سے دیکھے۔ کوئی غزل نہ ہوگی جو ان کیفیتوں سے خالی ہو۔ ہر مصرع گواہِ ہزار صنعت، ہر شعر شاہدِ معانی، باکیفیت، مطلع سے مقطع تک ہر غزل پری کی صورت، اکثر اشعار آپ کے تبرکاً و تیمناً بطریقِ یادگار بندے نے لکھے ہیں۔ جہاں لفظ استاد ہو، وہ آپ کا شعر سمجھو۔

باعث تحریر اجزائے پریشاں

و

سرگذشتِ مجمع دوستاں مکلّف ہونا، مجبوب کا، بیانِ داستانِ مرغوب کا

حسب اتفاق ایک روز مع چند دوستِ صادق و محبّ موافق باہم بیٹھے تھے۔ مگر نیرنگیٔ زمانۂ ناہنجار و کجرویٔ فلکِ سفلہ پرور، دوں شعار سے سب بادلِ حزیں و زار اور ہجوم اندوہ و یاس سے اور کثرتِ حرمان و افکار سے کہ ہردم یہ پاس تھے۔ دل گرفتہ سینہ ریش اور اداس تھے۔ یہ ذکر بر زبان آیا کہ شعبدہ بازی چرخِ مکار از آدم تا ایندم یوں ہی چلی آئی ہے اور تفرقہ پردازی اس کی سوائے رنج و محن زیادہ مشہور ہے۔ یہ اور بُرائی ہے مگر یہی غنیمت جانیے اور لازم ہے کہ اس کا بھی احسان مانیے کہ تم ہم اس دم باہم تو بیٹھے ہیں۔ اُستاد ؎

جو ہم تم پاس بیٹھے ہیں سو یہ دم غنیمت ہے یہ ہنسنا بولنا رہ جائے تو کیا کم غنیمت ہے

اور واقعی شدتِ رنج و الم میں دوست صادق، یار موافق، ہمنشیں ہو تو کچھ خیال بیں نہیں آتا ہے۔ اور صحبتِ غیر جنس میں تختِ سلطنت تختۂ تابوت سے بدتر ہو کے کاٹے کھاتا ہے۔ سعدی ؎

پائے در زنجیر پیشِ دوستاں یہ کہ با بیگانگاں در بوستاں

لیکن زمانے کی عادت یہی ہے کہ باوجودِ کثرتِ غم و شدتِ اندوہ و الم دو شخص باہم نہیں دیکھ سکتا۔ مرزا ؎

پھینکے ہے منجنیقِ چرخ تاک کے سنگِ تفرقہ بیٹھ کر ایک دم کہیں ہو دیں جو ہمکلام دو

جب سلسلۂ سخن یہاں تک پہنچا، اس زمرے میں ایک آشنائے باصفا، پُر مزہ بندے کے تھے۔ انھوں نے فرمایا "اس وقت کوئی قصہ یا کہانی بہ شیریں زبانی ایسا بیان کر کہ رفع کدورت وجمعیتِ پریشانیٔ طبیعت ہو، اور غنچۂ سربستۂ دل، باہتزازِ نسیم تکلم کھُل جائے۔"

فرمانبردار نے بجز اقرار انکار مناسب وقت نہ جانا، چند کلمے گوش گزار کیے، اگرچہ گریہ کردن راہم دلِ خوش می باید۔ مگر اس نظر سے ع

ہرچہ از دوست می رسد نیکوست

وہ باتیں انھیں بہت پسند آئیں، کہا "اگر بدجمعی تمام تو اس پراگندہ تقریر کو از آغاز تا انجام قصے کے طور پر زبانِ اردو میں فراہم اور تحریر کرے تو نہایت منظورِ نظرِ اہلِ بصر ہو، لیکن تقصیر معاف ہو، لغت سے صاف ہو۔"

بندے نے کہا "طبیعت ابنائے روزگار بیشتر متوجہ عیب جوئی و ہنرپوشی ہے۔ بقول دلگیر شعر ؎

قصّے کے دیکھنے والے تو بہت ہیں دلگیر　　اور یہاں حسن شناسانِ سخن تھوڑے ہیں

وہ بولے "چشم داشت صلہ طلب، اجرت کسی سے متصور نہیں، فقط ہماری خوشی مدِّنظر رکھ، جیسا رطب و یابس کہے گا، ہمیں پسند ہے، بشرطیکہ جو روز مرہ اور گفتگو ہماری تمھاری ہے یہی ہو، ایسا نہ ہو کہ آپ رنگینیٔ عبارت کے واسطے، دِقت طلبی اور نکتہ چینی کریں۔ ہم ہر فقرے کے معنی فرنگی محل کی گلیوں میں پوچھتے پھریں۔"

بندے نے کہا "یہ تو مقدمۂ تحریر ہے۔ اگر سرکار کے کام کیے، جائے تقریر نہیں، مگر جلدی نہ کرنا، بوقت فرصت لکھوں گا۔"

وہ تو یارِ شاطر نہ بارِ خاطر تھے، قبول کیا۔ اسی دن سے ہمیشہ اس کا خیال رہتا تھا عدمِ فرصت سے نہ کہتا تھا۔ آخر الامر بمقتضائے عادت تلاشِ معاش کے حیلے میں فلکِ تفرقہ پرداز، گردونِ عربدہ ساز نے صورتِ مفارقت کی دکھائی، مہاجرت استقبال کو آئی۔ حسرت ؎

بوقتِ لقمہ خوردن اے حسرت گفتہ بلبہائم　　کہ روزی می کند از ہم جدا یارانِ ہمدم را

ربیع الثانی کے مہینے میں کہ سنِ ہجری نبوی صلی اللہ علیہ و آلہ وصحابہ وسلم بارہ سے چالیس تھی، آنے کا اتفاق مجبور کوردہ کانپور میں ہوا۔ بلکہ یہ بستی پوچ و لچر ہے، اشراف یہاں عنقا صفت ناپیدا ہیں اور جو ہوں گے تو گوشہ نشین عزلت گزیں۔ مگر چھوٹی امت کی بڑی کثرت دیکھی۔ یہ طور جو نظر آیا، دلِ وحشت منزل سخت گھبرایا کلیجہ منہ کو آیا، قریب تھا جنوں ہو جائے، تیرہ بختی سے روز سیاہ پیش آئے، لیکن بہ شربتِ عنایت و معجونِ شفقت، ارسطو فطرت، بقراط حکمت، حکیم سید اسد علی صاحب شیر بیشۂ علم و کمال سخن فہم، خوش خصال، طبع سودا خیز اور سرِ جنوں انگیز کو آرام و تسکین حاصل ہوئی، وہ اکثر حالِ فقیر دلگیر پر الطاف و کرم فرماتے تھے۔ تدبیریں نیک و احسن دافعِ رنج و محن بتاتے تھے۔

ایک روز ان سے بعدِ اظہار حال مکلّفِ فسانۂ دوستانہ یہ بھی کہا کہ "ایک کہانی لکھا چاہتا ہوں" سن کے فرمایا "بیکار مباش کچھ کیا کر" میر

تیر نہیں پیر تم کاہلی اللہ رے ۔۔۔ نام خدا ہو جواں کچھ تو کیا چاہیے

اس وقت یہ کلمہ توسنِ طبع کو تازیانہ ہوا، اگرچہ اس ہیچ مَیرز کو یہ یارا نہیں، کہ دعویٰ اردو زبان پر لائے یا اس فسانے کو بہ نظرِ نثاری کسی کو سنائے۔ اگر شاہجہان آباد کہ مسکنِ اہلِ زبان، بیت السلطنت ہندوستان کبھی تھا، وہاں چندے بود و باش کرتا، فصیحوں کو تلاش کرتا، تو فصاحت کا دم بھرتا۔ جیسا میر امّن صاحب نے چار درویش کے قصے میں بکھیڑا کیا ہے کہ ہم لوگوں کے دہن کے حصے میں یہ زبان آئی ہے۔ دلی کے روڑے ہیں پر محاوروں کے ہاتھ پاؤں توڑے ہیں۔ پتھر پڑیں ایسی سمجھ پر۔ یہی خیال انسان کا خام ہوتا ہے، مفت میں نیک بدنام ہوتا ہے۔ بشر کو دعویٰ کب سزاوار ہے۔ کاملوں کو بیہودہ گوئی سے انکار، بلکہ ننگ و عار ہے مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطّار بگوید۔ وہی مثل سننے میں آئی کہ اپنے منہ سے دھنّا بائی۔ لیکن تحریر اس کی ایفائے تقریر ہے۔ یہ قصہ دلچسپ بے نظیر ہے۔ امید ناظرینِ پُر تمکین سے یہ ہے کہ بچشمِ عیب پوشی و بہ نظر اصلاح ملاحظہ فرماکر جہاں سہو یا غلطی پائیں بہ اصلاح تزئین فرمائیں۔ کیسی ہی طبیعت عالی ہو ممکن

نہیں جو بشر خطا سے خالی ہو، اس کے مطالعہ سے خاطر عاطر اگر شاد ہو، عاصی دعائے خیر سے یاد ہو۔ نیازمند کو اس تحریر سے نمودِ نظم و نثر جودت طبع کا خیال نہ تھا۔ شاعری کا احتمال نہ تھا بلکہ نظر ثانی میں جو لفظ دِقّت طلب غیر مستعمل، عربی فارسی کا مشکل تھا، اپنے نزدیک اُسے دور کیا اور جو کلمہ سہلِ ممتنع محاورے کا تھا، رہنے دیا۔ دوست کی خوشی سے کام رکھا۔ "فسانۂ عجائب" اس کا نام رکھا۔ اِنّہٗ المبدأ و الیہِ المآب، عنایت ایزدی سے تمام ہوئی کتاب۔

آغاز داستان

نادر بیان صاحب سریر سلطانی مالک اورنگ کامرانی زینت تاج و تخت شاہنشاہِ گردوں بارگاہ شاہ فیروز بخت اور پیدا ہونا شاہزادہ جانعالم کا اور شادی ماہ طلعت سے

مثل ہی سے نہ الفاظِ تلازم سے یہ خالی ہے ہر اک فقرہ کہانی کا گواہِ بے شالی ہے
یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ سن رکھو تم فسانہ ہیں ہم لوگ

گرہ کشایانِ سلسلۂ سخن و تازہ کنندگانِ فسانۂ کہن، یعنی محرّرانِ رنگین تحریر و مورّخانِ جادو تقریر نے اشہب جہندۂ قلم کو میدانِ وسیع بیان میں باکرشمۂ سحرساز و لطیفہ ہائے حیرت پرداز گرمِ عنان و جولان یوں کیا ہے کہ سرزمینِ ختن میں ایک شہر تھا مینو سواد، بہشت نزاد، پسندِ خاطرِ محبوبانِ جہان، قابلِ بود و باشِ خوبانِ زمان، شمیم صفت، اس کی معطّر کن دماغِ جان، مسکّنِ التہاب قلب دافعِ خفقان، زمین اس کی رشکِ چرخ بریں، رفعت و شان چشمک زن بلندی فلک ہفتمیں، گلی کوچہ خجلت دہ گلشن آبادیٔ گلزار، لسانِ تختۂ چمن، بازار ہر ایک بے آزار مصفا ہموار، دوکانیں نفیس، مکان نازک پائمالِ خلقِ خدا با خاطرِ شاد، اسے

قسمت آباد کہتے تھے۔ سب طرح کی خلقت، رغبت سے اس میں رہتی تھی۔ والیِ ملک وہاں کا شاہِ گردوں وقار، پُرتمکین با افتخار، سکندر سے ہزار خادم، دارا سے لاکھ فرمانبردار، قباد شوکت، کاؤس حشم، مالکِ تاج و تخت، والا مرتبت، عالی مقام شاہنشاہ فیروز بخت نام۔

موجِ بخشش سے اس بحرِ جود و عطا کے، سائلانِ لب تشنہ، سیراب اور نائرۂ غضب کے شعلے سے دشمنِ بد باطن، جگر سوختہ بیتاب، دبدبۂ داد دہی و غلغلۂ عدالت سے دشمن و دوست جانی۔ چور مسافر کے مال کا نگہبان، ڈکیتوں کو عہدۂ پاسبانی، ملک وافر، سپاہ افزوں از قیاس، خزانہ لا انتہا، وزیر و امیر جانفشاں، تاج بخش و باج ستاں، محتاج اور فقیر کا شہر میں نام نہیں، داد و فریاد، آہ و نالہ سے کسی کو کام نہیں، رعیت راضی، سپاہ جاں نثار، دوست شاداں، دشمن خائف، شمع کا چور سرِ محفل لرزاں۔ اس نام سے یہ ننگ تھا کہ امیروں کا چورمحل نہ ہونے پاتا تھا۔ دزدِ حنا کا رنگ نہ جمتا تھا، سرِ دست ہاتھ باندھا جاتا تھا، آنکھ چُرانے سے لوگ چشمک کرتے تھے۔ کارِ خیر سے اگر کوئی جی چراتا تو تہمت اس پر دھرتے تھے۔

لیکن بایں حکومت و ثروت کا شانۂ امید کا چراغ گُل تھا، اولاد بالکل نہ تھی، خواہشِ فرزند در دل۔ نہ ہونے کی کاہش متصل۔ حسرتِ پسر میں رَبِّ لَا تَذَرْنِی فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوَارِثِیْنَ۔ ہر ساعت بر زبان۔ رَبِّ هَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا۔ وظیفۂ دہان۔ لڑکے کی تمنا میں بادشاہ مثلِ گدا دست دراز۔ ایسا لاپرواہ بے نیاز کی قدرت سے بانیاز۔ آغوشِ جنابِ باری میں تضرع و زاری اُس کی منظور ہوئی۔ لاولدی کی بدنامی دور ہوئی۔ ساٹھ برس کے سن میں گوہرِ آبدار، دُرِّ شاہوار صدفِ بطنِ بانوئے خجستہ اطوار سے پیدا ہوا، چھوٹا بڑا اس کی صورت کا شیدا ہوا۔

اس روح افزا کا فیروز بخت نے جان عالم نام رکھا، شب و روز پرورش سے کام رکھا۔ حسن اللہ نے یہ عطا کیا کہ نیر اعظم چرخ چہارم پر رعب جمال سے تھرآیا۔ اور ماہ باوجود داغِ غلامی، تابِ مشاہدہ نہ لایا۔ اس نقشِ قدرت پر

تصویرِ مانی و بہزاد حیران۔ اور صناعی آذر کی لیے لعبتِ حقیقت کے روبرو پشیمان، کاسۂ سر سراسر شورِ جوانی، زورِ شباب سے معمور۔ آنکھیں جھپکانے والی دیدۂ غزالانِ ختن کی، شرابِ عشق کے نشہ سے چکنا چور، چہرے پر جلال شاہی، شوکت جہاں پناہی نمایاں، حسنِ درخشندہ کی تڑپ، بہ از انجم و اختر تاباں۔ مصحفی ؎

اے دیکھ طفلی میں کہتی تھی دایہ　　یہ لڑکا طرحدار پیدا ہوا ہے

مرزا قتیل ــــ ع　پارہ خواہد شد ازیں دست گریبانے چند

لکھا ہے کہ جب وہ مہرِ سپہرِ سلطنت برجِ حمل سے جلوہ افروز ہو، زینت بخش کنارِ مادر و زیب دہ آغوش دایہ ہوا۔ درِ خزانہ و محبس کھلا۔ ہزارہا قیدی رہا ہو اپنے گھر آیا اور سیکڑوں لونڈی غلام نے فرمانِ آزادی پایا۔ شہر میں محتاج ناپید تھا مگر اشرفی روپیہ حاجیوں کے واسطے مکۂ معظم اور زائروں کی خاطر کربلائے مکرم میں بھیجا۔ ایک سال کا خراج رعیتِ محتاج کو معاف ہوا۔ شہزادے کے نام کے گنج آباد ہوئے۔ مسجدیں، مدرسے، مہانسرا، مسافرخانے تعمیر ہوئے، اہل شہر دل شاد ہوئے۔

نجومی، پنڈت، جفرداں حاضر ہوئے۔ بہت سوچ بچار کر برہمنوں نے عرض کی "مہاراج کا بول بالا، جاہ و حشم مرتبہ دو بالا، اعلیٰ رہے۔ ہماری پوتھی کہتی ہے بھگوان کی دیا سے، شہزادے کا چندرماں بلی ہے جو گرہ ہے وہ بھلی ہے۔ دیگ تیگ کا مالک رہے، دھرم مورت یہہ بالک رہے۔ جلد راج پر براجے۔ پرتھمی میں دھوم مچے۔ ایسی شادی رچے۔ مگر پندرھویں برس مشتری بارھویں آئے گی۔ سینچر پاؤں پڑے گا۔ ایک پنکھیرو سوئے کے برن میں ہاتھ آئے گا۔ تریا کی کھٹ پٹ سے وہ بچن سنائے گا کہ راج پاٹ چھوڑا، دیس بدیس لے جائے گا۔ ڈگر میں شہزادہ بھٹکے، کوئی پاس نہ پھٹکے۔ ساتھی چھٹیں اپنے ڈیل سے ڈانوا ڈول رہے پھر ایک منکھ ٹھاکر کا سیوک کرپا کرے، راہ لگائے۔ کوئی کلنکن لوبھی ہو، کشٹ دکھائے۔ وہاں سے جب چھٹے رانی ملے مہاسندر، وہ چرن پر پران وارے۔ پتا اس کا گیانی گن کی تکھتی دے، اس سے کئی بلچھ مارے، دکھ میں آڑے آئے، بگڑے کاج بنائے۔ جب اس نگر پہنچے، جس کے چت میں گھر چھٹے تولاب بہت ہو، دَرب گھنے ہاتھ آئیں۔ دور سب کلیس ہو جائیں پر ایک ہتی من کا کپٹی، استری پر دوچیت ہو، گھاتی کرے، جھجھ پڑیں، نر ناری لڑیں، اور کچھ جل میں بھی

ہل چل پڑے۔ پریتی لوگ چھٹ جائیں، نگر نگر کھوج میں پھر آئیں، سب بچھڑے مل جائیں، ماتا پتا کے ڈھنگ آئیں استری تین ہو، دو کا پر، مان رہے۔ ایک کی ہین ہو۔ بڑا راج کرے، دیا دھرم کے کاج کرے۔ گسیاں کی کرپا سے جان کی کھیر ہے، بڑی بڑی دھرتی کی سیر ہے۔"

یہ سن کر بادشاہ گونہ ملول ہوا۔ پھر مستقل مزاجی سے یہ کلمہ فرمایا فِعلُ الحَکِیمِ لَا یَخلُو عَنِ الحِکمَۃِ ان سب کو بقدرِ حال، فراخور کمال مالا مال کیا، خلعت و انعام دیا۔ بہ بشاشتِ تمام سرگرمِ پرورشِ صبح و شام رہا۔ کوئی برسوں میں بڑھتا ہے وہ نہالِ نو دمیدۂ بستانِ سلطنت گھڑیوں بلند و بالا ہوتا تھا۔ چند عرصے میں بحول و قوتِ الٰہی وہ ہاتھ پاؤں نکالے۔ دس برس کے سن میں ہرن کے سینگ چیر ڈالے۔ دست و بازو میں یہ طاقت ہوئی کہ درندۂ فیلِ مست ہوا، جوان رعنا چہرۂ زیبا رستم شوکت بمرتبہ زبردست ہوا، جو اس کا روئے منور دیکھتا۔ یہ کہتا۔ لَا اَعلَمُ

منہ دیکھو آئینہ کا تری تاب لاسکے ۔۔۔ خورشید پہلے آنکھ تو تجھ سے ملا سکے
تصویر تیری کھینچے مصور تو کیا مجال ۔۔۔ دستِ قضا تو پھر کوئی تجھ سا بنا سکے

تحصیل علم و فضل میں شہرۂ آفاق ہوا، جتنے فن سپہ گری ہیں ان کا مشاقِ کامل، جمیع علوم ہر فن میں طاق ہوا، جل جلالہ، باپ ویسا بیٹا ایسا خوب، محبت میں بسانِ یوسف ؑ و یعقوب علیہم السلام جب وہ ہلالِ سپہرِ شہریاری بدرِ کامل ہوا اور چودھواں برس بھر گیا، جوانوں میں شامل ہوا۔ بصلاح و صوابدید ارکانِ سلطنت و ترقی خواہانِ دولت شادی کی تجویز ہوئی۔ بتلاش بے شمار و تجسس بسیار، ایک شہزادی پری پیکر، خوبصورت، نیک سیرت، حور نژاد، گل اندام، سیمیں بر، رشکِ شمشاد، ماہ طلعت نام دودمانِ والا سے مقرر ہوئی۔ وہ جو آئینِ بادشاہی طریقِ فرماں روائی ہے اُسی طرح اس کے ساتھ اُس اخترِ تابندہ کو ہمقران کیا۔

ترانہ سنجی عندلیب خامہ گلشن بیان

سواری شہزادۂ جانعالم میں اور خرید نا توتے کا، اور کج بحثی ماہ طلعت کی توتے سے، اور مذکور حسن انجمن آرا اور شہزادے کا عاشق ہونا

بلبل نواسنج، ہزار داستان، طوطی خامہ زمزمہ ریز، خوش بیان لکھتا ہے کہ بعدِ رسم شادی، سیر و شکار کی اجازت، سواری کا حکم، شاہِ ذوی الاقتدار سے حاصل ہوا۔ گاہ گاہ شام و پگاہ جانعالم سوار ہونے لگا۔ ایک روز گذر اس کا گذری میں ہوا۔ انبوہِ کثیر جمّ غفیر نظر آیا اور غلغلۂ تحسین و آفرین از زمین تا چرخِ بریں بلند پایا۔ شہزادہ ادھر متوجہ ہوا۔ دیکھا ایک مرد پیر نحیف، نشتر اسّی برس کا سن، نہایت ضعیف، پنجرا ہاتھ میں لئے کھڑا ہے۔ اس میں ایک جانور مانندِ ساکنانِ جنانِ سبز پوش، خانہ بدوش، با منقارِ گلنار لطیفے لطیف، رنگین اور نکتے قابلِ تعریف پُر تمکین۔ مثالِ طوطی پسِ آئینہ بیان کرتا ہے۔ لا اعلم

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند — آنچہ استادِ ازل گفت ہماں میگویم

شہزادے کے دیکھتے ہی توتا اپنے مالک سے بولا "اے شخص، کوکبِ بخت تیرا افلاس کے برج تیرہ سے نکلا، نصیب چمکا، طالع بر سر یاری و زمانہ آمادۂ مددگاری ہوا، دیکھ ایسا شہزادۂ حاتم شعار ابر گہر بار متوجہ اس مشتِ پر، ذرۂ بے مقدار پر ہوا ہے، وہ بے کار شے کارگاہِ بے ثبات میں ہوں جس کا طالب نہیں کہیں۔ بجدّے کہ جانور ہوں اور بلّی کا کھاجا۔ نہیں مگر جو یہ نظرِ عنایت کرے ابھی تیرا

ہاتھ پُر زر ہو۔ دامن گہر سے بھرے۔"

جان عالم نے یہ سخنِ ہوش رُبا کلمۂ حیرت افزا کو سن، توتے عقل کے اڑا، پنجرا اس طائرِ ہمہ داں جانورِ سحر بیاں کا ہاتھ میں لے کے، مالک سے قیمت پوچھی، توتے نے کہا۔ مؤلف ؎

کب لگاتا ہے کوئی اس دلِ بیجاں کا مول سب گھٹا دیتے ہیں مفلس کے غرض مال کا مول

مگر جو حضور کی مرضی۔"

جان عالم نے لاکھ روپئے خلعت کے سوا عنایت کئے اور پنجرا ہاتھ میں لئے، دولت سرا کو روانہ ہوا۔ گھر میں جا ماہ طلعت کو توتا دکھا، یہ مصرع انشا کا پڑھا۔

انشا ع بازار ہم گئے تھے اک چوٹ مول لائے

توتے نے شہزادے کو سخنانِ دلچسپ، قصصِ عجیب، حکایاتِ غریب، شعر خوب، خمسہائے مرغوب سُنا، اپنے دامِ محبت میں اسیر کیا۔ یہ نوبت پہنچی کہ سوتے جاگتے، دربار کے سوا، جدا نہ ہوتا۔ جب دربار جاتا پنجرا بتاکید حفاظت ماہ طلعت کو سونپ جاتا اور دربار سے دیوانہ وار، بشوقِ گفتار، بیقرار جلد پھر آتا۔

ایک دن شہزادہ دربار گیا توتا محل میں رہا۔ اس روز ماہ طلعت نے غسل کیا اور لباسِ مکلّف سے جسم آراستہ، زیورِ پُر تکلف سے پیراستہ ہو، جواہر نگار کرسی پر بیٹھی، ہوا جو لگی، آئینہ میں صورت دیکھ خود محوِ تماشا ہوئی۔ بحرِ عُجب و نخوت میں آشنا ہوئی۔ خواصوں سے، جلیسوں سے، جو جو دمساز محرم راز تھیں، اپنے حسن وصورت کی داد چاہی۔ ہر ایک نے موافقِ عقل و شعور تعریف کی۔ کسی نے کہا "ہلال عید ہو" کوئی بولی" خدا جانتا ہے، دیدہ ہو نہ شنیدہ ہو، اللہ تعالیٰ نے بایں کثرتِ مخلوقات تمھارا ہمسر از قسم جنّ و بشر بنایا نہیں، پری نے یہ قدِ بالا، حور نے یہ حسن کا جھمکڑا پایا نہیں۔"

جب وہ کہہ چکیں، ماہ طلعت نے کہا "توتا بہت عقلمند، ذی شعور، سیاح نزدیک و دور ہے، اس سے پوچھنا ضرور ہے، مخاطب ہوئی کہ "اے مرغِ خوش خو و طائرِ زمرّد لباس سرخرو، بذلہ سنج، بیرنج، سچ کہنا، اس سج دھج کی صورت کبھی تیرے طائرِ وہم و خیال کی نظر سے گزری ہے۔ نیرنگیٔ چرخِ کج رفتار، فتنہ پردازیٔ گردشِ دارزوں

عیاں ہے۔ آگاہ سب جہاں ہے۔"

اس وقت توتا رنجیدہ دل، کبیدہ خاطر بیٹھا تھا، چپ ہو رہا۔ شہزادی نے پھر پوچھا۔ توتے نے بے اعتنائی سے کہا "ایسا ہی ہو"—— یہ رنڈی معشوق مزاج، طرّہ یہ کہ شہزادے کی جورو، شوہر مالکِ تخت و تاج، برہم ہو کے بولی۔ "میاں مٹھو جینے سے خفا ہو، جو ہمارے رو برو چبا چبا کے گفتگو کرتے ہو۔"

توتے نے کہا "سوال و جواب اور دھمکانا اور حکومت سے ڈرانا اور غصے کی آنکھ دکھانا اور ہے، کیوں الجھتی ہو، شاید تمھیں سچی ہو۔"

پھر تو شعلۂ غضب کا نونِ سینۂ شہزادی میں مشتعل ہوا، کہا۔ "کیوں جانور بدتمیز، ناچیز، تیری موت آئی ہے، کیا بیہودہ ٹیں ٹیں مچائی ہے، واہی بک رہا ہے، ہمارا مرتبہ نہیں سمجھتا۔"

توتے کے منہ سے نکلا "کیوں اتنی خفا ہوتی ہو، اپنا منہ ملاحظہ کرو، صاحب تم بڑی خوبصورت ہو۔" یہاں تو یہ حیص و بیص تھی کہ جان عالم تشریف فرما ہوا، عجب صحبت دیکھی کہ شہزادی بچشمِ پُر آب و با دلِ کباب غیظ میں آ، تھرا تھرا توتے سے بحث رہی ہے۔ شہزادے نے فرمایا۔ "خیر باشد!"

توتا بولا " آج نزا قہر ہے، خیر بخیر، مگر چندے حیات مستعار اس وحشی کی، اور آب و دانہ قفس میں پینا کھانا باقی تھا، اگر آپ اور گھڑی بھر دیر لگاتے، تشریف نہ لاتے تو میرا طائرِ روح گربۂ غضبِ شہزادی سے مجروح پرواز کر جاتا، ہرگز جیتا نہ پاتے مگر پنجرا خالی دیکھ مزاجِ عالی پریشان ہوتا، بحسرت و افسوس یہ فرماتے۔ انشا۔ ع

"توتا ہمارا مر گیا کیا بولتا ہوا۔"

ماہ طلعت ان باتوں سے زیادہ مکدّر ہوئی شہزادے سے کہا کہ "اگر میری بات کا توتا صاف جواب نہ دے گا تو اس نگوڑے کی گردن مروڑ اپنے تلووں سے اس کی آنکھیں ملوں گی، جب دانہ پانی کھاؤں پیوں گی۔"

جان عالم نے کہا "کچھ حال تو کہو"

توتے نے گزارش کی کہ "حضور! یہ مقدمہ غلام سے سنیے، آج شہزادی صاحب اپنی دانست میں بہت نکھر۔ بقا ع دیکھ آئینہ کو کہتی تھی کہ اللہ ری میں، پھر مجھ سے فرمایا "تو نے ایسی صورت کبھی دیکھی تھی؟ مجھ اجل رسیدہ کے منہ سے نکلا" خدا

نہ کرے! اس جرم قبیح پر شہزادی کے نزدیک کشتنی، سوختنی و گردن زدنی ہوں، بقول میر تقی میرؔ، شعر

بے جرم تہ تیغ ہی رکھا تھا گلے کو　　　کچھ بات بُری منہ سے نہ نکلی تھی بھلے کو

جان عالم نے کہا "تم بھی کتنی عقل سے خالی، حمق سے بھری ہو، تم تو پری ہو، اور جانور کی بات پر اتنا آزردہ ہونا۔ گو گویا ہے پھر طائر ہے، نادانی اس کی ظاہر ہے۔"

میاں مٹھو کو ان باتوں کی تاب نہ آئی۔ آنکھ بدل کے روکھی صورت بنائی اور ٹیں سے بولا "خداوندِ نعمت جھوٹ جھوٹ ہے، سچ سچ ہے، ہمسر جس کا کوئی نہیں، وہ ذات وحدہٗ لاشریک لہٗ کی ہے، اس کے سوا ایک سے ایک بہتر اور بدتر ہے وہ خود فرماتا ہے۔ فَضَّلْنَا بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ۔ میں نے تو جھوٹ اور سچ دونوں سے بچ کر ایک کلمہ کہا تھا، اگر راستی پر ہوتا، گردن کج کیے، سیدھا گور میں سوتا۔ یہ سن کردہ اور مجوز ہوئی۔ مثل مشہور ہے، راج ہٹ، تریا ہٹ، بالک ہٹ۔

جانعالم نے مجبور ہو کر کہا "جو ہو سو ہو، مٹھو پیارے سچ کہہ دو۔"

توتے نے بہ منت عرض کی "دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز۔ مجھ سے سچ نہ بلوائیے، میرا منہ نہ کھلوائیے، نہیں انجامِ راستی حضور کے دشمنوں کو دشت نوردی، بادیہ پیمائی، غریب الوطنی، کوچہ گردی نصیب ہوگی۔"

شہزادے نے کہا "یہ جملہ تم نے اور نیا سنایا، اب جو کچھ کہنا ہے، کہا چاہیے، باتیں بہت نہ بنائیے۔"

اس نے کہا "میں نے ہر چند چاہا، آپ رنج سفر، مصائب شہر بشہر، ایذائے غربت سے باز رہیں، کہ سفر اور سقر کی صورت ایک ہے، اس سے بچنا نیک ہے، مگر معلوم ہوا کہ حضور کے مقدر میں یہ امر لکھا ہے میرا قصور اس میں کیا ہے۔" رفیع سوداؔ ہے

چاک کو تقدیر کے ممکن نہیں کرنا رفو　　　سوزنِ تدبیر ساری عمر گو سیتی رہے

سنئے قبلہ عالم! یہاں سے برس دن کی راہ، شمال میں ایک ملک ہے، عجائب زرنگار، ایسا خطہ ہے کہ مرقع خیالِ مانی و بہزاد میں نہ کھینچا ہوگا اور پیر دہقانِ فلک نے، مزرعۂ عالم میں نہ دیکھا ہوگا۔ شہر خوب، آبادی مرغوب۔ رنڈی، مرد، حسین، طرحدار۔ مکان، بلور کے، بلکہ نور کے۔ جواہر نگار، عقل باریک بیں، مشاہدے سے دنگ ہو،

خلقت اس کثرت سے بستی ہے کہ اُس بستی میں وہم و فکر کو عرصہ تنگ ہو۔ خورشید ہر سحر اس کے دروازے سے ضیا پاتا ہے۔ بدر کامل وہاں دو دن نہیں رہتا۔ غیرت سے کاہیدہ ہو، ہلال نظر آتا ہے۔ وہاں کی شہزادی ہے انجمن آرا۔ اس کا تو کیا کہنا! کہاں میری زبان میں طاقت اور دہان میں طلاقت، جو شمۂ مذکور شکل و شمائل اس زہرہ جبیں، فخر لعبتانِ لندن و چین کا سناؤں۔ استاد ؎

ایک میں کیا خوب گر دیکھے اسے حسن آفریں   اپنی صناعی پہ حیراں خود وہ صورت گر رہے

لیکن سات سو خواص، زریں کمر، تاج دلبری بر سر، ماہ رو عنبریں مو، سر گروہ خوبانِ جہاں، جانِ جاں آرامِ دلِ مشتاقاں، اس کی خدمت میں شب و روز سرگرم خدمت گذاری، بڑی تیاری سے رہتی ہیں۔ اگر اُن کی لونڈیوں کو شہزادی صاحب بچشمِ انصاف دیکھیں اور کچھ غیرت کو بھی کام فرمائیں، یقین تو ہے چلّو بھر پانی میں محجوب ہو کے ڈوب جائیں۔"

ماہ طلعت یہ سُن کے سُن ہوئی، سر جھکا لیا۔ جانعالم نے پنجرا اٹھا لیا، دیوان خانے میں لے جا، مفصل حال دریافت کرنے لگا۔ ہر دم دمِ سرد دلِ پُر درد سے بھرنے لگا۔ مولوی جامی ؎

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد   بسا کیں دولت از گفتار خیزد
در آید جلوۂ حسن از در گوش   ز جاں آرام بر باید ز دل ہوش
ز دیدن ہیچ اثرے درمیاں نہ   کند عاشق کماں را غائبانہ

توتے کو شہزادے کی طرزِ گفتگو، رنگِ رو، آنکھ کی تری، ہونٹھ کی خشکی، دل کی دھڑک سے کہ یہ نشانِ عشق گمانِ خبط سب ہیں، ثابت ہوا کہ شہزادے کا دل پُرزے پُرزے اور دماغ عقل سے خالی ہوا، خیالِ محالِ وصالِ انجمن آرا بھرا۔ سخت نادم و خجل ہو کے دل سے کہا "کمبخت زبان تے، حسن کے بیان نے غضب کیا، منتر کارگر ہوا، پڑھا، جن سر پہ چڑھا، حضرت عشق کا گزر ہوا، چاہا کہ بہ لطائف الحیل اس عزم بیجا سے باز رکھے، کہا "اے نادان، دشمنِ جان! یہ قصد لاحاصل ہے، عمداً اس کوچہ میں پاؤں نہ دھر، اپنے خون سے ہاتھ نہ بھر۔ بقولِ مؤلف ؎

خدا کو مان، نہ لے نام عاشقی کا تو ور   کہ منفعت میں بھی اس کے ہیں سو ضرر پیدا

بیان اس کا محال ہے، مگر مختصر سا یہ حال ہے، عقل اس کام میں دور ہو جاتی ہے، وحشت نزدیک آتی ہے، لبِ خشک، چشم تر، چہرہ زرد، دل خون ہوتا ہے، بھوک پیاس مر جاتی ہے، خواب میں نیند نہیں آتی ہے۔ جانِ شیریں تلخ ہو، کلیجے میں درد۔ آخر کو جنون ہوتا ہے، لختِ جگر کھاتا ہے، خونِ دل پیتا ہے، مر مر کے جیتا ہے۔ رقیبوں کے طعنوں سے سینہ فگار ہوتا ہے، لڑکوں کے پتھروں سے سر گلنار ہوتا ہے، دن کو ذلت و خواری، شب کو انتظار میں اختر شماری۔ بیقراری سے قرار، سب کی نظر میں ذلیل و خوار۔ جنگل میں جی لگتا ہے، بستی اجاڑ معلوم ہوتی ہے، دربدر پھرنے میں دن تو کٹ جاتا ہے، تنہائی کی رات پہاڑ معلوم ہوتی ہے۔ دل جلتا ہے، دیدے سے دریا ابلتا ہے، شجرِ تمنا بے برگ و بار رہتا ہے، پھولتا ہے نہ پھلتا ہے، جوانی کا گھن، پیری تک ادھیڑ بن رہتی ہے، گونگا بہرا بن جاتا ہے، طبیعت سُن رہتی ہے۔ ابھی پہلی بسم اللہ ہے، ٹھنڈی سانسیں بھرتے ہو، لب پر آہ ہے۔ دیکھا نہ بھالا ہے، سینے کے پار عشق کا بھالا ہے۔ آئینہ ہاتھ میں لے منہ تو دیکھو، نقشہ کیا ہے۔ معشوق باوفا، گوگردِ سرخ لعلِ سپید سے نایاب ہوا ہے۔ کہاں ملتا ہے، خاک میں ڈھونڈتے ڈھونڈتے خواہاں ملتا ہے۔ یہ جو زمانے میں مشہور با مہر و وفا ہیں، بانی صد جور و جفا ہیں۔ عشق کمبخت بے پیر ہے۔ ادا! نوجوان یہی ٹیڑھی کھیر ہے، سنا نہیں کوہ کن نے جانِ شیریں کس تلخی سے کھوئی؟ یوسف کی چاہ میں زلیخا نے کیسے کنوئیں جھانکے، کیا کیا روئی؟ مجنوں کو اس دشت میں جنوں ہوا لیلیٰ کا کیا بگڑا۔ پرویز کا اس کوچے میں خون ہوا۔ شیریں نے کیا کیا۔ افسوس تو یہ ہے کہ اتنا بھی کوئی نہ سمجھا!

جامی ؎ غمِ چیزے رگِ جاں را خراشد   کہ گاہے باشد و گاہے نہ باشد

ذلت اس کام میں عزت ہے، درد کا نام یہاں راحت ہے، دل اس کشمکش میں ٹوٹ جاتا ہے، رستم کا اس معرکے میں جی چھوٹ جاتا ہے، اسفندیار سا روئیں تن ہو، تو موم کی طرح پگھل کر بہہ جائے۔ حسرت ہی حسرت رہ جائے۔ لوگوں نے ہزاروں رنج و صدمے اس کام میں اٹھائے، جب بعد خرابیٔ بسیار یہی ناتجربہ کار کہلائے۔ لیکن یہ وہ بُرا کام ہے کہ اس میں مشاق اور مبتدی کی رائے ایک سی ہے۔

اس کا آغاز ہے نہ انجام ہے، ع
عشق کے غم میں کوئی دوست گرفتار نہ ہو — دوست تو دوست ہے دشمن کو یہ آزار نہ ہو

مسدّس

کیا میں اس کافرِ بدکیش کا احوال کہوں — یہی خونخوار پیا کرتا ہے عاشق کا خون
زار کر دیتا ہے انسان کو یہ اور زبوں — رفتہ رفتہ یہی پہنچاتا ہے نوبت بہ جنوں
یہی خونریز تو خونخوار ہے انسانوں کا
دین کھوتا یہی کافر ہے، مسلمانوں کا

یہی کرتا ہے ہر اک شخص کو رسوا ظالم — یہی کرتا ہے ہر اک چشم کو دریا ظالم
کوہ دکھلاتا ہے گلہے، کبھے صحرا ظالم — کیا بتاؤں تمھیں کرتا ہے کیا کیا ظالم
دربدر خاک بسر چاک گریباں کر کے
جان لیتا ہے وہ بے سر و ساماں کر کے

یہی بانی تو زلیخا کی بھی تھا خواری کا — یہی باعث دمن و نل کی ہوا یاری کا
یہی فرہاد کا حامی تھا تبرداری کا — عشق کہئے نہ اسے قہر ہے یہ یاری کا
تلخ کامی ہوئی شیریں کو اسی سے حاصل
کئے بے پردہ وہ برباد ہزاروں محمل

اِس نے مجنوں سے بنائے ہیں بہت دیوانے — اس نے خود رفتگی میں اپنے کئے بیگانے
گو کہ مشہور جہاں اس کے ہیں سب افسانے — پر جو اس کام کا مشّاق ہو وہ ہی جانے
کبھی معشوق کے پردے میں نہاں ہوتا ہے
کبھی سر چڑھ کے یہ عاشق کے عیاں ہوتا ہے

ناقۂ لیلیٔ مضطر کا شتربان یہ تھا — نجد میں قیس سے پہلے ہی حدی خوان یہ تھا
چاہ میں ڈال کے یوسف کا نگہبان یہ تھا — جانِ ہر شیر کی لینے کو نیستان یہ تھا
حُسن بن جاتا ہے انداز کہیں ناز کہیں
دردِ دل ہے یہ کہیں سوز کہیں ساز کہیں

مثلِ فرہاد بہت مر گئے سر پھوڑ حزیں — دی ہے شیریں کی طرح کتنوں نے جانِ شیریں
پاس عذرا کے گیا اور کوئی وامق کے قریں — اس سے آوارہ بچا اور نہ بچا گوشہ نشیں
اس سے ملتا ہے جسے رنج و محن ملتا ہے
گور ملتی ہے کسی کو نہ کفن ملتا ہے

طور کو نور کے جلوے میں جلایا اِس نے — کبھی آتش کو ہے گلزار بنایا اس نے
جان چھوڑی نہیں جیتا جسے پایا اس نے — اور نیرنگِ جہاں اپنا دکھایا اس نے
کام مُردوں سے لیا زندوں کو ناکام رکھا
درد کا نام بھی بے درد نے آرام رکھا

اس کے افسانے ہیں دنیا میں بہت طول طویل — جس کا ہمدم یہ ہوا ہو گیا وہ خوار و ذلیل
اس کا بیمار پڑا رہتا ہے بستر پہ علیل — دھونس دے دے کے بجا دیتا ہے یہ کوسِ رحیل
رنج و ماتم کے سوا اور یہ کیا دیتا ہے
وصل کی شب سحرِ ہجر دکھا دیتا ہے

یہی اخفا ہے بصد زیب رگِ ہر گُل میں — سوز و نالہ یہ اسی کا ہے دلِ بلبل میں
یہی ہے جزو میں گر دیکھو یہی ہے کُل میں — گر فرشتہ ہو تو آجاتا ہے اِس کے جُل میں
خونِ بے جُرم زمانے کا بہاتے دیکھا
مَیل چتون پہ کبھی اُس کے نہ آتے دیکھا

ایک شمّہ ہے لکھا حال جو میں نے اس کا — جس پہ اس دیو نے الطاف کا سایہ ڈالا
دشت غربت میں وہ آوارہ و سرگشتہ ہوا — دوست بھی چھوٹتے ہیں شہر بھی چھوٹے اپنا
پاس جس کے یہ گیا خلق سے وہ دور ہوا
کون سا شیشۂ دل تھا کہ نہ وہ چور ہوا

ہجر کے رنج میں کتنوں کا ہوا اس میں وصال — لے گئے سینے میں فرقت کا سبھی درد و ملال
اسی کی گردش سے ہر اک ماہ ہوا بدر ہلال — کس کی طاقت ہے جو تحریر کرے اس کا حال
زیست کرنا غمِ ہجراں سے ہے یہ سب کو شاق
جان دے دیتے ہیں کہہ کہہ کے یہی ہائے فراق

وصل میں گو مزا ہے، ہجر کا رنج دل جانگزا ہے۔ چاہ کنویں جھکواتی ہے۔ یہ

وہ بیماری ہے جو جان کے ساتھ جاتی ہے۔ ہمیشہ سے اس کام والے، آہ و نالہ بر لب، خاک بسر، چاکِ گریباں، سب رہے ہیں۔ اگر عاشق کی عزت و توقیر ہوتی تو دنیا میں اس سے بہتر کوئی شے نہ بنتی۔ کچھ کچھ ان لوگوں کے مرتبہ شناس قدردان ہیں، مگر ہر جگہ کہاں ہیں اور یہ قصہ جو میں نے کہا، فقط بات کی پچ کا جھگڑا تھا۔ ورنہ کہاں ملکِ زرنگار، کجا، شہزادی عالی تبار۔"

جان عالم نے کہا "استغفراللہ اگر وہ جھوٹ تھا تو یہ فقرہ کب سچ ہے، یہ تو نری کھڑپچ ہے تموز ؎

خدا ہی کی قسم ناصح نہ مانوں گا کہا اب تو نہ چھوٹے گا ترے کہنے سے میرا دل لگا اب تو

اسی تقریر میں یہ حال ہوا کہ دل میں درد، چہرہ زرد ہونے لگا، لب پر آہِ سرد، گرفتارِ رنج و تعب، عشق کے آثار سب ظاہر ہوئے۔ ضبط کا پردہ درمیان سے اٹھا، شور فغاں سے اٹھا، جنون پیرا مون عقل بیچارہ نو گرفتار سلسلۂ محبت میں اسیر، بقولِ تیر ہوگیا، طالع بیدار دفعتاً سو گیا۔ میر ؎

طبع نے اک جنوں کیا پیدا اشک نے رنگِ خوں کیا پیدا
ہاتھ جانے لگا گریباں تک چاک کے پاؤں پھیلے داماں تک
بیقراری نے کج ادائی کی تاب و طاقت نے بیوفائی کی

توتا یہ حال دیکھ کر محجوب ہوا کہ ناحق رنڈی کی کج بحثی سے شہزادے کو مرگ کا مستعد کیا۔ بیٹھے بٹھائے خونِ بیگناہ اپنی گردن پر لیا۔ اب اس طرح کا سمجھانا، مانع ہونا، ابھارنا بھڑکانا، بلکہ زرا جلانا ہے۔ گھبرا کر تسکین و تشفی کرنے لگا اور زخمِ شمشیرِ عشق کو مرہم مژدۂ وصال سے بھرنے لگا۔ کہا "آپ ہوش و حواس بجا رکھئے، اگر مجھے ایسا سچا جانا کہ میرا جھوٹ سچ مانا، اس شرط سے آپ کو لے چلوں گا، جو میرا کہا نہ مانوگے، زک اٹھاؤگے، دھوکا کھاؤگے، پھر مجھ کو نہ پاؤگے، پچھتاؤگے۔"

جان عالم نے فرمایا "اے رہبر کامل، رنج کے غمگسار، راحت کے شامل! تیرے جادۂ اطاعت سے ہرگز قدم باہر نہ دھروں گا، جو تو کہے گا وہی کروں گا، مگر جلد حالِ مفصّل اور بُعدِ منازل و سمتِ شہرِ دوست سے نشان کامل دے۔ وگرنہ یہ دلِ بیتاب، خجلت دہِ بیقراریِ سیماب کہ قطرۂ خون سے فزوں نہیں، تڑپ کر ازراہِ چشمِ نادیدہ روئے دوست نکل جائے گا، پھر بجز حسرت و

افسوس تیرے کیا ہاتھ آئے گا۔ میر ؎

دل تڑپتا ہے متصل میرا — مرغ بسمل ہے یا کہ دل میرا

توتے نے کہا "اضطراب کا کام خراب ہوتا ہے، ناحق حجاب ہوتا ہے۔ اتنی جلدی موقوف کیجیے۔ آج کی رات اس شہر میں کاٹ، صبح اُدھر کی راہ لیجیے۔ اگر کشش صادق اور طالع بھی موافق ہے۔ انشاء اللہ منزل مقصود کو پہنچیں گے، عزم بالجزم درکار ہے درِ شہر پناہ پر خانۂ یار ہے۔"

جانعالم یہ خوش خبری سن کر بشاش ہوا پھر کہا۔ اُستاد ؎

مژدۂ وصل ہے کل رات کی نیت ہو حرام — دے اگر طالع برگشتہ نہ تدبیر اُلٹ

اس رات کی بیقراری، گریہ و زاری، اختر شماری، شہزادے کی کیا کہوں؟ ہر گھڑی بحالِ پریشان، سوئے آسمان، مضطر نگراں تھا کہ رات جلد بسر ہو، نمایاں رخ سحر ہو، تا عزم سفر ہو، اور یہ کہتا تھا۔ سعدی ؎

سعدیا نوبتِ امشب دہلِ صبح نہ کوفت — یا مگو صبح نباشد شبِ تنہائی را

آخرش تاثیر دعائے سحری، اثر نالہ نیم شبی سے، ظلمتِ شب بہ نورِ روز منوّر ہوئی۔ وزیر زادے کو باوجودِ خود فراموشی یاد فرمایا۔ لڑکپن سے تا زمانۂ عشقِ انجمن آرا اس سے بھی الفت رکھتا تھا۔ جب وہ حاضر ہوا، حکم کیا: "دو گھوڑے صبا رفتار، برق کردار، جن کی جھپٹ نسیمِ تُند رو کو کُھندل ڈالے، ان کے قدم سے کمیتِ صرصر کی ڈپٹ، پاؤں نہ آگے نکالے، جلد لا۔" بمجرّدِ ارشاد اصطبلِ خاص میں جا گھوڑے لایا۔ کچھ اسباب ضروری، وہ بھی بمجبوری لے کے، وہ دونوں خستہ تن، بقولِ میر حسن چل نکلے ؎

نہ سُدھ بُدھ کی لی اور نہ منگل کی لی
نکل شہر سے راہ جنگل کی لی

پہلا سفر عازمِ شہرِ دلدار کا، مع وزیرزادہ

اور رہبر ہونا توتے کا، ہرن کا ملنا اور تفرقہ باہم کا، ملاقات مرشدِ کامل کی، پھر حوض میں کودنا شہزادے کا طلسم کی گرفتاری، جانعالم کی بیقراری، پھر بدولت نقشِ سلیمانی رہائی پانی ــــ

بادیہ پیمایانِ مرحلۂ محبت و صحرا نوردانِ منازلِ مودّت، رہ روانِ دشتِ اشتیاق و طے کنندگانِ جادۂ فراق، مسافرانِ بارِ ناکامی بردوش، بجز راہِ کوچۂ یار، دین و دنیا فراموش۔ عشق سر پہ سوار، خود پیادہ۔ زیست سے دل سیر، مرگ کے آمادہ۔ لکھتے ہیں، کہ جب باایں ہیئتِ گدائی، وہ پروردۂ دامنِ ناز و آغوشِ شاہی، گھر سے نکلا اور درِ شہر پناہ پر پہنچا، پھر کر عماراتِ سلطانی، بسے ہوئے شہر کو بہ نظرِ پریشانی دیکھ آہِ سرد کھینچی، غریب الوطنی پر کمرِ ہمت چُست کی، اور فراقِ یارانِ وطن میں دل کھول کے خوب رویا۔ پھر فاتحہ خیر پڑھ کر آگے بڑھ توتے کو پنجرے سے کھول دیا گھوڑوں پر شہزادہ اور وزیر زادہ۔ سمندِ صبا پر میاں مٹھو بیاڈنیا دانا کھلتے نیسا پانی پیتے، روانہ ہوئے۔

بعد طے منازل و قطع مراحل، ان کا گذر ایک دشتِ عجیب، صحرائے غریب میں ہوا، ہر تختہ جنگل کا بہ روش باغ تھا، جو پھول پھل تھا تازہ کنِ دل، معطر نمائے دماغ تھا۔ جہاں تک پیکِ نگاہ جاتا۔ بجز گلہائے رنگین و یاسمن و نسرین اور کچھ

نظر نہ آتا۔ شہزادہ شگفتہ خاطری سے صنّاعی باغبانِ قضا و قدر کی دیکھتا جاتا تھا۔ ناگاہ ایک سمت سے دو ہرن برق وش، صبا کردار، سُبک جست، تیز رفتار، سامنے آئے، زربفت کی جھولیں پڑیں، جڑاؤ سنگوٹیاں جڑیں، گلے میں ہیکلیں مثلِ معشوقِ طنّاز، عربدہ ساز، سرگرم خرامِ ناز، چھم چھم کرتے، چوکڑیاں بھرتے۔

جانِ عالم بے چین ہوا، وزیر زادے سے کہا "کسی طرح ان کو جیتا گرفتار کیجیے۔" اس سعی میں گھوڑے ڈالے۔ یا تو وہ اپنی وضع پر چلے جاتے تھے، جب گھوڑوں کی آمد دیکھی، سنبھل، کنوتیاں بدل، چوکڑی تیز با جست و خیز، بھرنے لگے، انھوں نے گھوڑے ڈپٹائے۔ ان کا گھوڑا دوڑانا، وہ طائرِ فرزانہ، چوکڑی بھول کے پکارا، "ہاں ہاں اے نوجوان! کیا غضب کرتا ہے، یہ دشت پُر سحر ہے، بیہودہ کیوں قدم دھرتا ہے۔" ہر چند پکارا سر دے مارا، مگر سناٹے میں کسی نے نہ سُنا، توتے نے سر دھنا۔ اور مجبور ایک درخت پر بیٹھ رہا۔ وہ چلے گئے۔ دو چار کوس دونوں ہرن ساتھ بھاگے۔ پھر ایک اور سمت، دوسرا اور طرف چلا۔ ایک کے ساتھ شہزادہ، دوسرے کے تعاقب میں وزیر زادہ۔ یہ بھی جدا ہوئے۔ القصہ تا غروبِ آفتاب وہ شمسِ سپہرِ سلطنت، گھوڑا بگٹٹ پھینکے گیا۔ دفعتاً ہرن نظر سے غائب ہوا۔ اس نے باگ روکی، گھوڑا عرق عرق، خود پسینے میں غرق۔ سر سے پا تک بحالِ مضطر، حیران پریشان، نادم و پشیمان، یکہ و تنہا۔ وزیر زادہ نہ توتا، آپ یا دشتِ پُرخطر، گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ بوئے انسان و حیوان، مشامِ جان تک نہ آئی۔ طبیعت سخت گھبرائی۔ جب کسی کو نہ دیکھا یہ کہا استاد شعر:

اڑے یہ ترنگ جوانی کی کیا جس نے مجھ کو جلا وطن   ہوا ایسا بیش ازیں کا ہیکو میں نکل کے گھر سے خراب تھا

اور کبھی جو یادِ یاران ہمراہی جی میں آتی، تو یہ شعرِ دردناکِ میر سوز، بادلِ صد چاک و آہِ جگر دوز پڑھتا۔ میر سوز:

کہیو اے بادِ صبا بچھڑے ہوئے یاروں کو
راہ ملتی ہی نہیں دشت کے آواروں کو

کچھ آگے بڑھا، چشمۂ آب نظر پڑا، گھوڑے سے کود، ہاتھ منہ دھویا، اپنی تنہائی پر خوب رویا۔ اسی حالِ گریہ و زاری میں دستِ دعا بجنابِ باری اٹھا کر پکارا کہ

"اے کسِ بیکساں دائے مددگار رہِ گم کردگاں، مجھ خستہ و پریشان دور افتادہ از یاراں کی رہبری کر، تیرے بھروسے پر سلطنت کو خاک میں ملا، گھر سے ہاتھ اٹھا آوارۂ صحرائے غربت بتلائے رنج و مصیبت، ہوا ہوں۔ لا اعلم ؎

نہ مونسے نہ رفیقے نہ ہمدمے دارم　　حدیثِ دل بکہ گویم عجب غمے دارم

تیری ذات ہے یا یہ جنگلِ وحشت انگیز، دشتِ بلا خیز۔ جہاں بوئے عمارات نہیں آتی"۔ یہ کہہ کے زار زار، مانندِ ابرِ نو بہار، رونے لگا۔ فریاد و زاری، تڑپ اور بیقراری، اس کی بدرگاہِ مجیبُ الدّعوات قبول ہوئی۔ تیرِ دعا، ہدفِ اجابت سے، لبِ معشوق ہوا۔ ایک پیرمرد سفید داڑھی والے، سبز عمامہ سر پر، عبائے عُنّابی کندھے پر ڈالے، ہاتھ میں عصا، خضرصورت، بُزرگ سیرت پارسا، وارد ہو پکارے "السلام علیک اے نو بادۂ چمنِ سلطنت، وائے گرفتارِ محنت و محبّت۔"

شہزادے نے آنسو پونچھ، سلام کا جواب دیا۔ پیرمرد نے فرمایا "اے عزیز! کیا حاجت رکھتا ہے، بیان کر۔"

یہ سن کر ایسا خوش ہوا کہ رنج، راہ بھولنے کا، بھولا۔ وزیر زادے اور توتے کی جدائی بھی یاد نہ آئی، کہا "آپ کو قسم اُسی کی، جس نے میری رہبری کو بھیجا ہے، جلد نشانِ ملکِ زرنگار دکھا دیجئے، درِ دلدار تک پہونچا دیجئے۔"

وہ ستودہ صفات ہنسا اور کہا "اللہ ری بیخودی، ابھی بلائے ناگہانی، آفتِ آسمانی، جس میں آپ پھنسے ہیں، اسی سے نجات نہیں پائی، معشوقہ یاد آئی۔"

جانعالم نے کہا "کوئی آفت و ستم و بلائے ہجرِ جاناں اور مفارقتِ دوست سے سوا نہیں ہے۔" میر سوز ؎

نہ لگے دردِ جدائی کو قیامت کا رنج　　روزِ محشر کو نہ میری شبِ ہجراں سے ملا

اس صاف باطن نے فرمایا "صاحبزادے یہ صحرائے غضب، دشتِ پُرتعب ہے۔ ہر تختہ اس کا دامِ ستم، گل اور بوٹا نرا خارِ غم و الم ہے، یہاں کا پھنسا اُلجھا، حشر تک نہیں چھوٹتا۔ یہ سب کارخانۂ طلسم ہے۔"

شہزادے نے کہا "ہم سحرِ محبت میں گرفتار ہیں، ہمیں جینا مرنے سے زبوں ہے، دل کا حال دگرگوں ہے۔ شیفتہ ؎

ہمیشہ آگ نکلتی ہے اپنے سینے سے الٰہی موت دے، گذرا میں ایسے جینے سے

اس کریم النفس کو اس کے حال پر رحم آیا، فرمایا "بدحواس نہ ہو، نظر بہ خدا رکھ، کہ وہ چارہ سازِ عالمین جامع المتفرقین ہے۔"

شہزادے نے کہا "فی الحقیقت، مگر برائے خدا ایک نظر ملکِ زرنگار اور وہ معشوقِ طرحدار اگر نظر آئے، جانِ زار بچ جائے، زیست کا کیا اعتبار ہے، مرگ ہر دم ہمکنار ہے، حسرتِ دید تو نکل جائے۔"

اُس خدا پرست نے فرمایا کہ "آنکھ بند کر" پلک سے پلک شہزادے کی لگی، ملکِ زرنگار میں گذار ہوا اور صورت اُس حور کردار کی نظر پڑی۔ بمجرّدِ نگاہ دل سے آہ کی، بیہوشی ساری غشی طاری ہوئی۔ مرد بزرگ نے سمجھایا۔ "اس امر لاطائل سے کیا حاصل، زندگی درکار ہے، ایک روز دوست بھی ہمکنار ہے۔"

سمجھانے سے اتنی تسکین ہوئی کہ آنکھ کھولی، رات ہوگئی تھی۔ پیر مرد نے کچھ کھلا لبِ چشمہ سلایا۔ جس وقت افقِ چرخ سے راہ گم کردۂ مسافرِ مغرب یعنی آفتابِ عالم تاب، جلوہ افروز ہو، حصۂ چہارم آسمان پر آیا۔ شہزادے کی آنکھ کھلی، وہاں آپ کو پایا۔ جہاں سے ہرن کے پیچھے گھوڑا اٹھایا تھا سجدۂ شکر ادا کر سرگرمِ رہِ دوست ہوا، راہ کا پتہ اس رہبرِ خیلِ سبز پوشاں سے پوچھ لیا تھا، قدم بڑھایا جاتے جاتے ایک روز آفتاب کی تمازت بدرجۂ اتم تھی، پیاس کی شدت ہوئی۔ آب وہاں گوہرِ نایاب تھا۔ خضر تک اس دشت میں لاعلاج پانی کا محتاج تھا۔ زبان میں کانٹے پڑے، ریت کی گرمی سے تلوے جلتے تھے، دو گام قدم نہ چلتے تھے، لو کا شعلہ یہ سرگرم آزارِ جگر سوختگاں تھا کہ پرندے پتوں میں منہ چھپاتے تھے، کوسوں دوندے نظر نہ آتے تھے۔ دشت کورۂ آہنگراں تھا، ہر طرف شعلۂ جوالہ عیاں تھا، ریگِ صحرا کیفیتِ دریا دکھاتی تھی۔ پیاسوں کی دوڑ دھوپ میں جان جاتی تھی۔ صدائے زاغ و زغن سے سناٹا، دھوپ کا تڑاقا، دشت کا پتھر تپنے سے انگارا تھا۔ جانور ہر ایک پیاس کا مارا تھا۔ وہ تابشِ شمس جس سے ہرن کالا ہو، مذکور سے زبان میں چھالا ہو، بادِ سموم سے وحشیوں کے منہ پر سیہ تاب تھا۔ لو سے گاؤ زمین کا جگر کباب تھا، مچھلیاں پانی میں بھنتی تھیں۔ جل جل کر کنارے پر سر دھنتی تھیں، سرطانِ

فلک جلتا تھا، کیکڑا لبِ دریا اُبلتا تھا۔ ایسے موسم کے سفر میں زیست کیونکر ہو۔ مسافر خواب میں بڑاتے "چُلّو بھر پانی دو"۔ درخت خشک، سوکھے پتے کھڑکھڑاتے تھے، جانور پَر کھولے پھڑپھڑاتے تھے، چارپائے ایک سمت ہانپتے تھے، گرمی کے خوف سے کلپتے تھے۔ یہ حرارت مستولی تھی کہ دوستوں کی گرمی سے جی جلتا تھا۔ مسافرِ وہم پائے گمان سے راہ نہ چلتا تھا، خورشیدِ حشر کی طرح آفتاب تاباں تھا، صحرائے قیامت وہ بیابان تھا، اسی حالِ خراب میں شہزادہ سرگشتہ، دل برشتہ حیران، پریشان، ایک طرف درخت گنجان، سایہ دار دیکھ کر آیا تو وہاں حوضِ مصفّا، پانی سے لبالب بھرا پایا۔ پانی دیکھ کر جانِ رفتہ تن میں آئی، آنکھوں نے لہروں سے ٹھنڈک پائی، گھوڑے سے اتر پانی پینے کو جھکا، چرخ نے نیرنگی دکھائی، وہی معشوقۂ مرغوبہ مطلوبہ، جس کے سیلِ تلاش میں، غریقِ محیطِ الم، گرفتار لطمۂ غم مثلِ پرکاہ بہا بہا پھرتا تھا، حوض میں نظر آئی۔ آنکھ چار ہوتے ہی وہ بولی "اے شناورِ بحرِ محبت، وائے غواصِ چشمۂ الفت! دیر سے تیری منتظر تھی، للہ الحمد تو جلد پہونچا، تامل نہ کر، کود پڑ"، انہیں تو وہ آنکھ بند کرنے کا نقشہ ہرپل مدِ نظر تھا۔ بے تامل نہنگِ آفت کے منہ میں کود پڑا، زیست سے سیراب ہو یہ کہتا شعر ؎

کودا کوئی یوں گھر میں ترے دھم سے نہ ہوگا — جو کام ہوا ہم سے وہ رستم سے نہ ہوگا

کودتے ہی، سر تلے، ٹانگیں اوپر، غلطاں پیچاں، تحت الثریٰ کو چلا، گھڑی بھر میں تہہ کو پاؤں لگا، آنکھ کھولی، نہ حوض نظر آیا، نہ اُس دُرِ شہوار کو پایا، مگر صحرائے لق و دق، جسے دیکھ کے رستم و اسفندیار کا رنگ فق ہو، دیکھا، اس وقت سمجھا دوسری زک اٹھائی، توتے کی بات آگے آئی ع

وائے بر ما و گرفتاریِ ما

یہ کہہ کے آگے چلا، دور سے چار دیواری معلوم ہوئی، جب قریب آیا، باغ اور عمارت مفصل دیکھی۔ درِ باغ بسانِ آغوشِ مشتاق وا اور سرد ہوا۔ یہ تو گرمی کا مارا تھا، بے تکلف اندر قدم رکھا۔ باغ میں آیا، قطعہ دلچسپ پھولا پھلا پایا۔ تختہ بندی معقول، پیڑ خوش قطع، خوبصورت پھول، روشیں صاف، نہریں شفاف، چشمے ہر سمت جاری، نئی تیاری۔ درختوں پر جانورانِ نغمہ سرا، برگ و بار و گل سے بالکل باغ بھرا، باغبانیانِ پری وش، ہر روش

پر بَرَوشِ دلبری خراماں، شاخوں پر بلبلیں غزل خواں، بیچ میں بارہ دری عالیشان، سب تکلف کا سامان، اس کے متصل چبوترہ سنگ مرمر کا، بادلے کا سائبان کھنچا، مسند مغرق بچھی، ایک عورت خوبصورت عجب آن بان سے اس پر بیٹھی، خواصیں گرد و پیش۔ ڈِمغرور بحسن و جمالِ خویش، شہزادے کو دیکھ کر، ایک خواص پکاری "اے صاحب! تم کون ہو؟ جان نہ پہچان، بے دھڑک پرائے مکان میں چلے آئے۔"

یہ تو زیست سے بیزار، مرگ کا طلبگار تھا، اسے جواب نہ دیا، بے تامل مسند پہ پر برابر جا بیٹھا، یہ شعر پڑھتا تھا۔ استاد ؎

پھر بیٹھے ہو، دو زانو وضع مودب اُس سے — وضعی جو تھا تو ہم کو داب ادب نہ آیا

وہ تو فریفتۂ قدیم تھی، ہنس کے چپ ہو رہی، پوچھا۔ "آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں"۔ شہزادہ متحیر باغ کو دیکھ رہا تھا، جو پیڑ تھا، پردار جانور کی صورت، پھول کھلے پھل تیار، آپس میں سرگرم گفتار، جس میوے پر رغبت ہو، اس درخت کا جانور سامنے آ، رقص کرے۔ پھل بے ہاتھ لگائے، منھ کے پاس آئے جتنا اسے کھاؤ، ثابت پاؤ۔ جب طبیعت سیر ہو، اُسے درخت میں دیکھ لو۔

یہ حرکتیں اس کی خواصیں شہزادے کے دکھانے کو، درپردہ ڈرانے کو کرتی تھیں۔ اس قرینے سے جان عالم کو یقین ہوا کہ یہ سب جادو کا ڈھکوسلا ہے۔ پیر مرد سچ فرماتا تھا، افسوس بُرے پھنسے۔ یہ تو ان خیالوں میں تھا۔ اس نے مکرّر پوچھا، شہزادے نے جواب دیا کہ ہمارا آنا جانا، تمھیں خوب جانتی ہو، اجنبی ہیں، لیکن تم پہچانتی ہو، وہ مسکرائی خواصوں سے کہا "آپ مہمان ہیں، مروّت شرط ہے۔" انھوں نے کچھ اشارہ کیا، کشتیاں شراب کی، قابیں گزک و کباب کی، مع جام و صراحی خودبخود آئیں اور مینائے بے زبان، پنبہ دہان، رقصاں، یہ بولی۔ حافظ ؎

اگر شراب خوری جرعۂ فشاں بر خاک — ازاں گناہ کہ نفعے رسد بہ غیر چہ باک

پھر دفعتاً جام لبریز، بریز بریز کہتا، خندہ زناں، جان عالم کے قریب آ کر بولا حافظ ؎

بنوش بادہ کہ ایّام غم نخواہد ماند — چناں نہ ماند و چنیں نیز ہم نخواہد ماند

شہزادے نے انکار میں مصلحت نہ دیکھی، ڈرا کہ اگر عذر کروں اور اسی طرح یہ

شراب بے قصد حلق میں اُترے تو کیا لطف رہے۔ یہ کہا لا اعلم ؎

یار سے ہے لطف مے کا آہ یہ بیہودہ نہ ہو	یہ کوئی صحبت ہے ساقی واہ یہ بیہودہ نہ ہو

پھر اُس جام کو ناکام، ہاتھ میں لے کر، لہو کے سے گھونٹ، گلا گھونٹ گھونٹ پیے، وہ دورۂ بے سرانجام، پُر آلام گردش میں آیا، جب دو چار ساغر متواتر جادوگرنی نے پیے، کاسۂ دماغ سے عقل دور، ولولۂ مستی سے معمور ہو، چھیڑ چھاڑ کرنے لگی۔ شہزادہ اُس کا اختلاط، کج بحثی سے بدتر جانتا تھا، مجبور گردشِ گردونِ دون دیکھ کر سرنگوں ہو، کچھ ہاں ہوں کر دیتا۔ سچ ہے جسے جی پیار کرتا ہے، اس کی گالی بدزُرچی کے بوس و کنار سے زیادہ مزہ دیتی ہے۔

اسی صحبت میں آدھی رات گزری، خاصہ طلب کیا، دو چار نوالے جانعالم نے بجبر پانی کے سہارے اگل اگل حلق کے نیچے اتارے۔ اُس مرچھکی نے قرار واقعی ہتے مارے۔ کھانا زہر مار کر، شہزادے کا ہاتھ پکڑ، بارہ دری میں لے گئی۔ جواہر نگار سہری پر بٹھایا۔ ایک تو شراب کا نشہ، دوسرے عالم تنہائی، بیٹھتے ہی شرم و حجاب کا پردہ اُٹھا لپٹ گئی۔ وہ سرکا، پھر تو خفیف ہو کر بولی "تو نے سنا ہوگا۔ شہپال جادو شہنشاہِ ساحرانِ جہاں، فخر سامری و جیپال کا نام ــــ میں اس کی بیٹی ہوں۔ تمام باغ بلکہ نواح اس کا سب سحر کا بنا ہے۔ برسوں سے تیری فریفتہ اور شیدا ہوں۔ یہ تمنائے وصال خراب حال جیتی تھی۔ بجز لختِ جگر اور خونِ دل کچھ نہ کھاتی نہ پیتی تھی۔ آج لات منات کی مدد سے تو میرے اختیار میں آیا، دل کا مطلب بھر پایا، جس چیز کا شائق و طلبگار ہو، جو شے تجھے درکار ہو، بجز ملاقات انجمن آرا، جہاں کا سامان مہیا ہے۔ بشرطِ اطاعت و اظہارِ محبت۔"

جانعالم پہلے ڈرا، پھر جی مضبوط کر کے بولا "یہ سب سچ ہے، جو تو نے کہا، مگر تیری تقریر سے ثابت ہوتا ہے کہ تو راہ و رسمِ محبت سے آشنا ہے، نوشِ وصل نیشِ فصل کا مزہ چکھا ہے۔ انصاف کر، جس کے واسطے خانماں آوارہ، غربت کا مارا، سرگرداں ہوا ہوں تو اسی کے نام کی دشمن ہے، میں تیری دوستی پر کیونکر اعتماد کروں۔ دنیا میں تین طرح کے دشمن ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جو صریح اپنا عدو ہو، دوسرا دشمن کا دوست، تیسرا دوست کا دشمن۔ یہ سب سے بُرا ہے، اس سے کنارہ اچھا ہے یا یہی شرط

محبت ہے کہ ایک شخص کا نام خراب کرکے، جہاں آسائش ملے، وہاں بیٹھ رہے۔ فکرِ سلطنت، جستجوئے دولت میں سرپھرا نہیں ہوا ہوں، جو تیرے جاہ و ثروت پر اکتفا کروں۔ تجھے معلوم ہوگا، اللہ کی عنایت سے، گھر کی حکومت چین کرنے کو کافی تھی، مگر میرا تو یہ حال ہے۔ میر تقی ؔ

اک مدت پارۂ جگر رہے اک مدت گلخن تابی کی
برسوں ہوئے ہیں گھر سے نکلے عشق نے خانہ خرابی کی

یہ سن کے وہ کھسیانی کتیا سی جھنجلائی، کہا، "قدرتِ سحر میری سن لے، مغرب و مشرق کا فاصلہ، گردشِ چشم ہے، زنگبار جانا کیا پشم ہے، ادھر پلک جھپکائی، اتنے عرصے میں زنگبار گئی، اور آئی۔ خیر اگر میری ہم صحبتی کریہہ جانتا ہے، تیری امید بھی قطع کر دیتی ہوں۔ ابھی انجمن آرا کو لا، تیرے روبرو جلا، اپنا دل ٹھنڈا کرتی ہوں۔"

جانِ عالم بدحواس ہوا کہ رنڈی کے غصے سے ڈرا چاہیے۔ سخت غضب میں گرفتار ہوئے، انکار میں قتلِ معشوق مدِ نظر اور اقرار کرنے میں اپنی جان کا ضرر، دونوں طرح مشکل ہے، حیران ہو، مآلِ کار سوچنے لگا، منہ نوچنے لگا۔ واقعی یہ مقدمہ بہت پیچدار ہے، جس پر گذرا ہو، وہ جانے۔ دل کا حال یہ ہوتا ہے۔ جدھر آیا، آیا۔ جس سے پھرا، پھرا۔ اور یہ کیا عذابِ عظیم ہے، فراقِ محبوب وصال نامرغوب۔

آخرکار شہزادے کو بجز اطاعت، مصلحت نہ بن پڑی۔ دل کو تسکین دے کر کہا اگر اس سے موافقت کروگے، انجمن آرا کی اور اپنی زندگی ہوگی، خالق رحمۃ للعالمین، جامع المتفرقین ہے، کوئی صورت نکل آئے گی کہ اس بلا سے رہائی، درِ دلدار تک رسائی ہو جائے گی۔ الا حیلہ شرط ہے، یہ خیال کر ساحرہ سے کہا "ظالم! ہم تیرا جی دیکھتے تھے، ہم نے سُنا تھا کہ عاشق، معشوق کے ناز بردار ہوتے ہیں، مگر یہ جھوٹ تھا، دھمکاتے ہیں، ڈراتے ہیں، عاشقی میں حکومت، کسی نے کانوں سے نہ سنی ہوگی، ہم نے آنکھوں سے دیکھی، تو یہ نہ سمجھی، ایسا کون احمق ہوگا، جو تجھ سا معشوقِ عاشق خصال، اور یہ سلطنتِ لازوال چھوڑ کے، امرِ نادیدہ کی جستجو کرے، امیدِ موہوم پر جنگل جنگل، ڈھونڈتا پھرے، یہ فقط اختلاط تھا۔" یہ کہہ کے گردن میں ہاتھ ڈال دیا، وہ قحبہ تو ازار کھولے بیٹھی تھی، لیٹ گئی ناچار باخاطرِ افگار، اُس تیرہ بخت کا منہ کالا کر، ہاتھ منہ دھو، اس کے ساتھ سو رہا۔ وہ چڑمرانی بدست

لیٹتے ہی جہنم داصل ہوئی۔ یہاں نیند کہاں؟ جی سینے میں بیقرار، پہلو میں وہ خار ہردم، آہِ سرد دلِ پُردرد سے بلند، چشمۂ چشم جاری، فریاد و زاری دوچند، جگر میں سوزِ فراق نہاں، لب سے دودِ پنہاں عیاں۔ یہ رباعی بر زبان، لا اعلم ؎

کسی کی شبِ وصل سوتے کٹے ہے　　کسی کی شب ہجر روتے کٹے ہے
ہماری یہ شب کیسی شب ہے الٰہی　　نہ سوتے کٹے ہے نہ روتے کٹے ہے

مگر جب وہ کروٹ لیتی، اس کی جان خوف سے نکلتی، دم بخود ہوجاتا، جھوٹ موٹ سوجاتا، اسی حال سے بہزار خرابی، و مشاہدۂ بیتابی جانعالم، گریبانِ سحر چاک ہوا، جادوگرنی اٹھی، شہزادے کو حمّام میں لے گئی، وہاں اور عجائبات سحر دکھائے، نہاکر دونوں باہر آئے، خاصہ چنا گیا، بعد فراغ صحبتِ طعام، اس نے یہ کلام کیا کہ میرا معمول ہے، اس وقت سے پہر دن رہے تک شہپال کے دربار میں حاضر رہتی ہوں، تیری اجازت پاؤں تو جاؤں۔"

جان عالم نے دل میں کہا۔ "للہ الحمد جو دم تیری صورتِ پُر کدورت نہ دیکھیے غنیمت ہے۔ مگر ظاہر میں زمانہ سازی سے کہا۔" فرقت گوارا نہیں، روکنے کا یارا نہیں، جس طور بنے جلد آنا۔"

ساحرہ اس کلمہ سے بہت خوش ہو چل نکلی۔ اس کے جانے سے باغ سنسان ویران، وحشت انگیز، ہو، کا مکان ہوا۔ شہزادہ باخیالِ دلبر پھر تو بے تکلف ہو جی کھول کر رویا میر ؎

غمِ دل کو زبان پر لایا　　آفتِ تازہ جان پر لایا

کہا ہم سا بھی بدنصیب، دور از حبیب، دوسرا نہ ہوگا، جس کا یار نہ مددگار، جس سے دل کا درد کہیے، تا تسکین ہو، صحبت ان کی ملی ہے جنھیں دیکھ چپ ہو رہیے کہ عشق نہ اُن کے ذہن نشین ہو، ایک جانور، جو رہبر تھا، یُوں اڑا، دوسرا وزیر زادہ جو لڑکپن سے جاں نثار اور یاور تھا، وہ یوں چھٹا۔ ہوس ؎

سوائے اندوہ و یاس و حرماں، ہوا نہ حاصل جہاں سے ہم کو
اٹھائیں کاندھے پہ بارِ ہستی، سفر ہے بہتر یہاں سے ہم کو

اسی سوچ میں چھ گھڑی دن باقی رہا، جادوگرنی جیکی چمکاتی آئی، جانعالم کو اس کی صورت دیکھ کے رونا آیا، لیکن ڈر کے مارے ہنسنے لگا، نالہ گلے میں پھنسنے لگا

پھر وہی اکل و خرب کا چرچا مچا، جب نصف شب گذری، تو وہ سو رہی، ان کو بیداری، اختر شماری نصیب ہوئی، فرد ؎

شاہد رہیو تو اے شب ہجر　　جھپکی نہیں آنکھ مصحفی کی

اسی انداز سے دو مہینے گذرے۔ جان عالم کا روز کی کوفت سے یہ عالم ہوا کہ سوکھ کے کانٹا ہوگیا، بدن ڈھانچہ ہوگیا۔ استاد ؎

ہوں کاہ سے کاہیدہ بس زار اسے کہتے ہیں　　عیسیٰ سے نہ ہو اچھا بیمار اسے کہتے ہیں
بن ہاتھ لگے دس کے جا سے نہیں ہلتا ہیں　　لاغر اُسے کہتے ہیں بیّار اسے کہتے ہیں
تصویرِ مرقع ہوں سکتہ کا سا عالم ہے　　جُنبش ہی نہیں نقشِ دیوار اسے کہتے ہیں

قضارا ایک روز وقتِ رخصت، ساحرہ بولی "جان عالم! تیری تنہائی کا اکثر خیال بلکہ مجھے ملال رہتا ہے، تو اکیلا تمام دن گھبراتا ہوگا، باغ خالی کاٹے کھاتا ہوگا، مجبور ہوں کوئی تیرے دل کو بہلانے کی گوں نہیں، جسے چھوڑ جاؤں۔ یہ رنڈیاں بدسلیقہ ہیں، ان کو کہاں تک آدمیت سکھاؤں، ہنوز انھیں نشست برخاست کا قرینہ نہیں آیا۔ ان سے تو اور برخاستہ خاطر ہوگا۔"

شہزادے نے کہا "ہم کیا گھبرائیں گے، تنہا پیدا ہوئے، تمام عمر اکیلے رہے ہماری قسمت میں دوسرا لکھا نہیں، ہم صحبت ہمارا خدا نے خلق کیا نہیں، لیکن یہ اندیشہ ہمیشہ رہتا ہے۔ کوئی ہمیں مار ڈالے تو دن بھر مفت مٹی خراب رہے تم سے کون جاکر کہے۔ ہنسی کی جا ہے، رونے والا ناپید ہے۔"

وہ بولی "یہ مکان طلسم ہے۔ بادِ مخالف کا گذر محال ہے، تیرا کدھر خیال ہے؟"
شہزادے نے کہا "اگر کوئی جادوگر یہ قصد کرے اسے کون روکے۔"

وہ تو فریفتہ بشدت تھی، بند ہوئی۔ وہم یہ ہوا کہ میرے بعد کوئی جادوگرنی آئے اور اس پر عاشق ہوجائے، مار ڈالنا کیسا یہاں سے اڑا لے۔ تو تو کہاں پائے۔ سب محنت برباد جائے، فرطِ محبت نشۂ الفت میں انجام کار نہ سوچی۔ بے تامّل نقشِ سُلیمانی صندوق سے نکال، اس کے بازو پر باندھا، کہا "اب نہ تاثیر سحر، نہ دیو کا گذر، نہ پری سے ضرر ہوگا۔ دل کا کھٹکا مٹا، مزے اُڑا۔" یہ کہہ کے وہ تو بدستور چلی گئی، جانعالم کے سر پہ خرابی آئی، وہی بلبلانا، شور مچانا، باغ کو سر پہ اٹھانا، اور گاہ

انجمن آرا کے تصور سے یہ کہنا، مؤلف ؎

لکھا ہوا یہی قسمت کا تھا سو جان ملا — کہ میری خاک میں محنت دے آسمان ملا
ہزار صدمے پہ دل نے ہمارے اُف بھی نہ کی — جو اک رفیق ملا وہ بھی بے زبان ملا
نہ ہم نے چین بزیرِ فلک کبھی پایا — عنایتِ ازلی سے عجب مکان ملا
تری تلاش میں در در بھٹکتے پھرتے ہیں — ملا نہ تو ہی جو جوتی سے گو جہان ملا
نہ کہہ تو پیر فلک پر کہے گی ساری خلق — کہ خاک میں ترے جوروں سے کیا جوان ملا
بہت جہان کی کی سیر اے سرورِ حزیں — یہ بے خزاں نہ ہمیں کوئی بوستان ملا

ایک دن عالمِ تنہائی میں جانِ عالم کو یہ خیال آیا کہ اس نقش کی تعریف اس نے بہت کی تھی، کھولوں تو شاید عقدۂ کاربستہ کھلے۔ یہ سوچ کے اسے کھولا، اس کا یہ نقشہ تھا بست در بست کا نقش۔ ہر خانے میں اسمائے الٰہی مع ترکیب و تاثیر تحریر تھے، دیکھتے دیکھتے خانۂ مطلب میں نظر پڑی، لکھا تھا کہ کوئی شخص کسی ساحر کی قید میں اگر ہو، یہ اسم پڑھے نجات پائے یا مکانِ طلسم میں پھنسا ہو، اسے پڑھتا جدھر چاہے چلا جائے اور جو کوئی سحر کرتا ہو، اس پر دم کر پھونک دے، اسی دم اس کی برکت ساحر کو پھونک دے،

یہ سانحہ اس میں دیکھ کے قریب تھا کہ شہزادے کو شادیٔ مرگ ہو، جلد جلد وہ سب اسم یاد کر، نقش بازو پر باندھا۔ اس عرصے میں جادوگرنی موجود ہوئی، جانِ عالم کے تیور بُرے دیکھے، پوچھا "آج مزاج کیسا ہے۔"

وہ بولا "الحمدللہ بہت اچھا ہے، دیر سے تیرا منتظر تھا، لے تجھے شیطان علیہ اللعن کو سونپا، ہمارا اللہ نگہبان ہے۔" یہ سنتے ہی روح قالب سے نکل گئی، سمجھی پیچ پڑا۔ جانِ عالم چل نکلا، سحر سے روکنے لگی، تاثیر نہ کی۔ سر پیٹ کر کہا۔ سعدی ؎

کس نیاموخت علمِ تیر از من — کہ مرا عاقبت نشانہ نہ کرد

یہ کہہ کے ناریل زمین پر مارا، وہ پھٹا، ہزارہا اژدہا شعلہ فشاں پیدا ہوا، شہزادے نے کچھ پڑھا، وہ سب پانی ہو گئے، فانی ہو گئے، پھر تو منت کرنے لگی، پاؤں پر سر دھرنے لگی، جادوگرنیاں سمجھانے لگیں کہ "یہ شرطِ مروّت نہیں، جو اپنا والہ و شیدا ہو، اس سے دغا کیجیے۔"

شہزادے نے کہا "گریبان میں منھ ڈالو، سوچو تو ہم بھی کسی کے عشق میں، عزیز و دل سے جدا مصیبت کے مبتلا، سر بصحرا ہوئے تھے، ہمیں جبر سے قید کیا، ہزار طرح کا الم مفارقت دیا۔ یہ احسان کچھ کم ہے، ہم نے طلسم درہم برہم جو نہ کیا" وہ سمجھیں یہ نہ ٹھہریگا۔ عاشقی کا کام، نصیحت و پند و بند سے نہیں ہوتا اور جبر کا کام اگر اختیار کیا، حباب آسا ناپائیدار ہے اس کا کیا اعتبار ہے۔ حسن - ع

سدا ناؤ کاغذ کی بہتی نہیں

اور یہ قضیہ اتفاقیہ ہے ع

ہر روز عید نیست کہ حلوا خورد کسے

ے حسن

کبھی یوں بھی ہے گردشِ روزگار — کہ معشوق عاشق کے ہو اختیار

لیکن سوچو تو لاکھ طرح کا راحت و آرام ہو، جو جی نہ لگے تو کیا کرے استاد ے

دولتِ کونین حاصل ہو تو لٹھے لات مار — پھر نہیں لگتا ہے جی جس جا سے ہو جس کا اچاٹ

الغرض وہ سر پیٹتی رہیں، جانعالم نے بہ برکتِ اسمائے الٰہی اس طلسم سے رہائی پائی، اپنی راہ لی۔ چند روز میں پھر اس حوض پر وارد ہوا۔ اسپِ وفادار پتھر سے سر مار مار مر گیا تھا، اس کی لاش دیکھ کے دل پاش پاش ہوا، خوب رویا۔ اب لدر پنج پیادہ پائی کا، قدمبوس ہوا، سبحان اللہ! - کہاں وہ شہزادہ، پروردۂ ناز و نعم۔ کہاں یہ پیادہ پائی کا سفر دور و دراز، ہر قدم خار ہر گام آزار، مگر تصویر یار پیش نظر، ہر قطرۂ اشک میں سوسوختِ جگر، آہ و نالہ در دہان یہ شعر ہر ساعت برزبان۔ ناسخ ے

مارغ صحرا نوردی پاؤں کی ایذا نہیں — دل دکھا دیتا ہے لیکن ٹوٹ جانا خار کا

کیوں نہ کھٹکوں آسماں کو رات دن میں ناتواں — آبلے کی شکل اس میں مجھ میں عالم خار کا

رنگِ رو فق، دل میں قلق، سینہ فگار، پا آبلہ دار، چھاتی غم دوری سے شق، کبھی حکایت شکایت بیز، گاہ یہ غزل مؤلف کی درد آمیز پڑھتا چلا جاتا تھا، مؤلف

توڑ کر خم اور پٹک کر آج پیمانے کو ہم — سوئے مسجد جاتے ہیں زاہد کے بہکانے کو ہم

شمع رو محفل میں کب دیں بار پروانے کو ہم — ایک کیڑے سے بھی کیا کچھ کم ہیں جل جانے کو ہم

خوب سا کرتے ہیں ہم ایامِ عشرت کو قیاس — دھیان میں لاتے ہیں جس دم گذرے افسانے کو ہم

کل تلک تھا جس مکاں پر شمع رویوں کا ہجوم　　چھانتے ہیں اب وہاں پر خاک پروانے کو ہم
اشکِ گلگوں کے نشاں چھٹ کچھ پتہ ملتا نہیں　　جب خزاں میں ڈھونڈتے ہیں اپنے کاشانے کو ہم
جرم کچھ صیاد کا اپنی اسیری میں نہیں　　روتے ہیں کنجِ قفس میں آب و دانے کو ہم
رشکِ زلفِ یار سب عقدے ہیں میرے اے سرورؔ　　اور الجھ اٹھتے ہیں جتنی جب کہ سلجھانے کو ہم

چشمِ تر، رنگ زرد، آہ سرد، دل میں درد، پاؤں کہیں رکھتا، آبلہ پائی سے کہیں اور جا پڑتا۔ دل صفا، منزل میں عزم کہ آج در دلدار تک پہنچیے، آبلوں کو انسِ خار سخت بدحواسی تھی۔ کانٹوں کی زبان، تلووں کے خون کی پیاسی تھی۔ نہ کوچ کی طاقت نہ یارائے مقام، گھبرا کے وہ ناکام یہ کہتا، مؤلف ؎

بدل دے اور دل اس دل کے بدلے　　الٰہی تو تو رب العالمیں ہے
اور اس پر نقدِ جاں دیکر بدل لیتا سرورؔ　　گر دلِ بے رحم چڑھ جاتا کسی کا دھیان میں

اور جب جنونِ عشق کا ولولہ از حد ہوتا تو سر پٹک کر روتا، اور یہ کہتا، مؤلف ؎

قرار باقی نہیں جانِ زار بن تیرے　　ستا رہا ہے دلِ بیقرار بن تیرے
گھمنڈ تھا مجھے جن جن کا سب وہ بھاگ گئے　　حواس و ہوش و شکیب و قرار بن تیرے
سرورؔ کشتۂ محبوب خاک شرح کرے　　بسر جو کرتا ہے لیل و نہار بن تیرے

خلاصہ کلام یہ کہ اسی حالِ خراب اور دلِ بیتاب سے ہر چند سرگرمِ منزل تھا، دیدۂ دیدار طلب سے رواں خونابۂ دل تھا۔

رہائیِ طلسم سے اس گرفتارِ محبت کی

اور پہنچنا وادیٔ فرخناک بے خس و خاشاک میں، پھر ملاقات بانیِ مہر و وفا یعنی ملکہ مہر نگار، پُرتمکین باوقار سے، پیر مرد کا لوح دینا شہزادے کا رستہ لینا

عشق ہے تازہ کار تازہ خیال　　ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال
کہیں آنسو کی یہ سرایت ہے　　کہیں یہ خونچکاں حکایت ہے
گہ نمک اس کو داغ کا پایا　　گہ پتنگا چراغ کا پایا
کہیں طالب ہوا کہیں مطلوب　　اس کی باتیں غرض ہیں دونوں خوب

یہاں سے دشتِ نوردانِ وادیٔ سخن، جگر افگار و غربت زدگانِ پُرمحن، سینہ ریش، باپائے خمدار و دلِ خار خار، بیان کرتے ہیں، کہ وہ مسافرِ صحرائے اندوہ و حرماں، عادم ہمت جاناں بے توشہ و زادِ راہ، ہر روز بادلِ پُرسوز کراہ کراہ، بادیہ گردی کرتا، جیتا نہ مرتا۔ ایک روز نواحِ دلکشا و صحرائے فرح افزا میں گذرا، دیکھا کہ باغبانِ قدرت نے، صفحۂ دشت گلہائے مختلف رنگ سے، بہشتِ ہشتم، رشکِ صحنِ چمن، اور بوٹا پتا، گھانس کا بہ از گلِ باغِ ارم، خجلت دہِ نسرین و نسترن بنایا ہے، گرد جدولِ آبِ رواں، چشمہ ہر ایک چشمۂ حیواں، اور لالہ ہائے احمر نے چھڑکاؤ سے عجب رنگ جمایا تھا، نسیمِ بہار اور درختِ گلزار سے میدان رشکِ ختن و تاتار تھا۔ نہ کہیں گرد تھا نہ غبار تھا۔ درختوں پر فیضِ ہوا اور ترشح سے سرسبزی تھی اور چمک کا جوبن تھا۔ گل خودرو سے جنگل نمونۂ گلشن تھا۔ یہ تو مدتوں کا مسافت دیدہ، مسافرت کشیدہ تھا، وہ زمین خجستہ آئین بہت پسند آئی، دل میں آیا کہ آج کی شب اسی جا

سحر کیجیے، قدرتِ حق مدنظر کیجیے، ایک سمت زمین ہموار، درخت گنجان، چشمہ ہائے آب رواں دیکھ کے جا بیٹھا۔ جنگل کی کیفیت، جی بیکل کرنے والی، جانوروں کی چہل؛ اچھل کود کی دیکھا بھالی، خوش فعلی کی سیر، کلیل میں وحش و طیر، بوباس ہر برگ گل کی دھوم دھام، طائروں کے غل کی۔ بوٹے پتے کی نشو و نما، سرد سرد ہوا، ابر سیاہ کہیں گہرا سرخ و سفید اودی، ساون بھادوں کی گھٹا، رعد نعد و شور سے پہلوؤں کوٹنا، یہ کہہ رہا ہے میر سوز ؎

کی فرشتوں کی راہ ابر نے بند   جو گنہ کیجیے ثواب ہے آج

ندیاں نالے چڑھے، دریا بڑھے، جھیلیں، تالاب لبریز، ڈبے موج خیز، پپیہے کا مستوں سے مخاطب ہونا، پی پی کہہ جان کھونا، کوئل کی کوکو اور توتو سے کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ مور کا شور، برق کی چمک، بجلی کی کڑک، ہوا کا زور۔ زور کیفیت دکھاتا تھا۔ شام کا وقت، غروبِ آفتاب کا عالم، جانوروں کا درختوں پر بیٹھنا باہم، زمین پر فرش زمردیں بچھا، وہاں لہریں لے رہا۔ آسمان میں رنگا رنگ کی شفق پھولی، شام اودھ کی سیر بھولی۔ ایک سمت قوسِ قزح جسے دھنک کہتے ہیں، بعد علم و شان فلک پر نمایاں، سرخ، سبز، زرد، دھانی لکیریں عیاں، بلبل کے چہچہے، درخت سرسبز لہلہے، کوسوں تک سبزہ زار، پھولوں کی بہار، کہیں ہرن چوتے، کہیں پرند سیر کرتے، کسی جا طاؤسانِ طنّاز، سرگرم خرام ناز، لبِ ہر چشمہ، آبِ مرغِ آبی و مرغابی کبھی نمود ہونا ماہ کا چکور کا دوڑنا، بھرنا آہ کا، دونوں وقت ملتے۔ اس دید کی خراش سے دل پاش پاش، زخمِ جگر چھلے، یہ سیر جو ہجرِ جاناں میں نظر سے گزر جائے کیوں کر دل ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو، چھاتی نہ بھر آئے۔ استاد ؎

کارِ اخگر کرتی ہے ہر بوند تن پر یار بن   کیا عجب گر ہوں ہرے داغِ جگر برسات میں

قاعدہ ہے جب آدمی کو سامانِ عیش و نشاط، اس طرح کی سیر فرحت و انبساط میسر ہوتی ہے، جسے جی پیار کرتا ہے وہ یاد آتا ہے۔ شہزادے نے مدت کے بعد یہ فرحت جو پائی، یار کی یاد آئی۔ شعر ؎

میں وہ نہیں جو کروں سیرِ بوستاں تنہا   بہشت ہو تو نہ منھ کیجیے باغباں تنہا

اس سوچ میں بیٹھا تھا۔ ایک طرف سے رنڈیوں کا غل پیدا ہوا۔ یہ دھوکا

پا چکا تھا، سنبھل بیٹھا اور اسمائے ردِّ سحر پڑھنے لگا۔ بموجب مثل دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک پیتا ہے۔ جب وہ آگے بڑھیں، غور سے دیکھا چار پانچ سے عورت، پری زاد حور وش، تذریں کمر، نازک تن پیمبر، چست و چالاک، کمسن، الھڑ پنے کے دن، اچھلتی، کودتی، پیادہ اور جواہر نگار، ہوادار پر، ایک آفتاب محشر سوار، گرد پریوں کی قطار، تاج مرصع سر پر، لباس شاہانہ پُر تکلف در بر، نیمچۂ سلیمانی ہاتھ میں، سیماب وشی بات بات میں، بندوق چقماقی طائرِ خیال گرانے والی برابر رکھے، شکار کھیلتی، سیر کرتی چلی آتی ہے۔ حسن میں بے مثال، کاہش بدر غیرتِ ہلال۔ میر حسن ؎

رس پندرہ یا کہ سولہ کا سن   جوانی کی راتیں مرادوں کے دن

طالع بیدار یاورِ اقبال دم ساز، غمزہ عشوہ و انداز و ادا جلو میں، آفتِ جانِ عاشق، سرمایۂ ناز، جان عالم نے بآوازِ بلند کہا، میر تقی ؎

کیا تنِ نازک ہے جاں کو بھی حسد جس تن پہ ہے   کیا بدن کا رنگ ہے تہ جس کی پیراہن پہ ہے

یہ صدا جو اہتمام سواری، آگے آگے کرتی تھیں، ان کے کان میں پڑی، اور نگاہ جمال جان عالم سے لڑی، سب کی سب لڑکھڑا کر ٹھٹک گئیں، کچھ سکتے کے عالم میں سہم کر جھجک گئیں، کچھ بولیں "اِن درختوں سے چاند نے کھیت کیا ہے" کوئی بولی "نہیں ری سورج چھپتا ہے" ـــــ کسی نے کہا "غور سے دیکھ، ماہ ہے" ایک جھانک کے بولی "یا اللہ ہے" ایک نے غمزے سے کہا "چاند نہیں تو تارا ہے" ـــــ دوسری چٹکی لے کے بولی "اچھال چھکا تو بڑی خام پارا ہے" ـــــ ایک بولی "سرو ہے یا چمنِ حسن کا شمشاد ہے" ـــــ دوسری نے کہا "تیری جان کی قسم، پرستان کا پری زاد ہے" ـــــ کوئی بولی "غضب کا دلدار ہے" ـــــ کسی نے کہا "دیوانیو! چپ رہو، خدا جانے کیا اسرار ہے" ـــــ ایک نے کہا "چلو نزدیک سے دیکھ، آنکھ سینک کر، دل ٹھنڈا کریں" ـــــ کوئی کھلاڑن کہہ اٹھی "دور ہو، ایسا نہ ہو، اسی حسرت میں تمام عمر جل مریں" ـــــ ایک نے خوب جھانک تاک کے کہا "خدا جانے تم سب کے دیدوں میں چربی کہاں کی چھا گئی ہے، کیا ہوا ہے، یہ تو بھلا چنگا، ہٹا کٹا مردوا ہے" ـــــ سواری جو رکی، ملکہ نے پوچھا "خیر ہے" ـــــ

سب نے دست بستہ عرض کی "قربان جائیں، جان کی اماں پائیں، تو

زبان پر لائیں، ہمیشہ سواری حضور کی، اسی راہ سے جاتی ہے، مگر آج خلافِ معمول ان درختوں میں سے ایک شکل دلچسپ ایسی نظر آتی ہے کہ فرد ؎

سنا یوسف کو حسینانِ جہاں بھی دیکھے ایسا بے مثل طرحدار نہ دیکھا نہ سنا

ملکہ متعجب ہو کے پوچھنے لگی "کہاں؟"

ایک نے عرض کی "وہ حضور کے سامنے"

جیسے ہی ملکہ کی نگاہ چہرۂ بے نظیر، صورتِ دل پذیر، جانِ عالم پر پڑی، دیکھا ایک جوان رشکِ مۂ پیرِ کنعان، رعنا سرو قامت سہی بالا، بحرِ حسن و خوبی کا دُرِّ یکتا، کاسہ سر سے فرِ شاہی نمایاں، بادۂ حسنِ دل فریب سے معمور ہے، دماغِ کشورستانی ہے، اٹھتی جوانی ہے، نشۂ شباب سے چکنا چور ہے، خمِ ابرو محرابِ حسینان، سجدہ گاہ پردہ نشینان، چشمِ غزالی، سرمہ آگیں ہے، آہوئے رم دیدۂ کشورِ چین ہے، چتون سے رمیدگی پیدا ہے، مست مے محبت ہے، اس پر چوکتا ہے، دیدے کی سفیدی اور سیاہی، لیل و نہار کو آنکھ دکھاتی ہے۔ سوادِ چشم پر حور سویدائے دل صدقے کیا چاہتی ہے، حلقۂ چشم میں ہموار مردم دیدہ دھرے ہیں صانعِ قدرت نے موتی کوٹ کوٹ بھرے ہیں، مژہ نکیلی اس کمانِ ابرو کی، دل میں دو سار ہونے کو لیس ہے، رشکِ لیلیٰ یہ غیرتِ قیس ہے، ناوکِ نگاہ سے سپرِ چرخ تک پناہ نہیں، دلدوزی بے گناہوں کی، اس کی ملت میں گناہ نہیں، لوحِ پیشانی تختۂ سیمیں یا مطلعِ نور ہے، یا طباشیرِ صبح یا شمعِ طور ہے، کاکلِ مشکیں سے زلفِ سنبل کو پریشانی ہے، بو باس سے ختن والوں کو حیرانی ہے، عنبریں مولوں کو زندگی وبال ہے، بال بال پرپیچ و خمدار ہے، روئے تاباں بسانِ چشمۂ حیوان ظلمت سے نمودار ہے، ہما اپنے پر و بال سے، اس صاحب اقبال کا مگس راں ہے، رخِ تابندہ کی چمک سے نیرِ اعظم لرزاں ہے، لبِ گل برگِ تر پہ سبزے کی نمود ہے، یا دھواں دھار مشتاقوں کے دل کا دھواں ہے، نظر کام نہیں کرتی۔ قدرتِ ربِّ ودود ہے، ہر حلقۂ گیسوئے معنبر کا کمندِ گرہ گیر ہے، مگر بالوں کے الجھنے سے کھلتا ہے کہ کسی کی زلفِ پیچاں کا اسیر ہے، خندۂ دنداں نمائے ہونٹ لعلِ بدخشاں کا رنگ مٹاتا ہے، دانتوں کی تاب سے گوہرِ غلطاں بے آب ہو جاتا ہے، معشوقوں کا آن پر دانت ہے دل و جان وارتے ہیں، جو نظر سے پنہاں ہوں

ڈاڑھیں مارتے ہیں، دمِ تقریر دُرجِ دہان جو کھوتا ہے، ساحر موتی رولتا ہے، ہر کلمہ اعجاز نما ہے، بیمارِ محبت کا مسیحا ہے، ہاتھ ہر ایک نہالِ الفت کی شاخِ بار دار ہے، دل کی دست بُردی کو اور خزانۂ قارون بانٹ دینے کو سردست تیار ہے۔ کفِ دست کی لکیریں دستاویزِ محبت یدِ قدرت سے تحریر ہے، سرنوشت سے یہ کھلتا ہے کہ سلسلۂ الفت میں کسی کے رگ وپے بستۂ زنجیر ہے۔ مرآتِ سینہ میں عکس افگن کوئی صاحبِ جمال ہے، ہر نظر کسی کا خیال ہے، کمرِ نازک جستجو پر چست باندھے ہے، بیٹھا سست ہے، چلنے کو مثلِ صبا آندھی ہے، پاؤں وادیٔ تلاش میں سرگرم رفتار ہیں، زیرِ قدم دشت و کہسار ہیں۔ قسمت اپنی برسرِ یاری ہے کہ ہمارے دام میں یہ ہمائے اوجِ شہریاری ہے۔

یہ تصور دل میں تھا کہ کارپردازانِ محکمۂ ناکامی حاضر ہوئے اور مشاطۂ حسن و عشق نے پیش قدمی کر، متاعِ صبر و خرد، نقدِ دل و جان اساسِ ہوش و حواس، تابِ تواں ملکۂ جگر افگار، ارمغانِ رونمائی میں نذرِ شاہزادۂ والا تبار کیا، عقل و دانش گم، "صمٌ بکمٌ" کا نقشہ ہوا۔ حضرتِ عشق کی مدد ہوئی، سب بلا رد ہوئی، شوقِ وصل پیدا ہوا، جی شیدا ہوا، دفعتاً کیا تھا کیا ہوا۔ میر تقی ؎

تھی نظر یا کہ جی کی آفت تھی   وہ نظر ہی وداعِ طاقت تھی
ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ   صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ
دل پہ کرنے لگا طپیدنِ ناز   رنگ چہرے سے کر گیا پرواز

ملکہ تھرتھرا کر ہوا دار پر غش ہوئی، خواصوں نے جلد جلد گلاب اور کیوڑہ، بیدمشک چھڑکا۔ کوئی نادِ علی پڑھنے لگی، کوئی سورہ یوسف دم کرنے کو آگے بڑھنے لگی، کسی نے بازو پر رومال کھینچ کر باندھا، تلوے سہلانے لگی، کوئی مٹی پر عطر چھڑک کر سونگھانے لگی، کوئی ہاتھ منہ کیوڑے سے دھوتی تھی، کوئی صدقے ہو ہو روتی تھی، کوئی بولی "چہل کنجی کا کٹورہ لانا"۔۔۔ کسی نے کہا "لیشب کی تختی دھو کے پلانا"۔۔۔ کسی نے کہا "لاریب آسیب ہے"۔۔۔ کوئی بولی "عجب مہ پارہ ہے، جس کے دیکھنے سے دل ناشکیب ہے"۔۔۔ کوئی سمجھی "یہ شخص ہم جنس نہیں، قسمِ جن سے ہے"۔۔۔ کوئی بولی "یہ غشی تقاضائے سن سے ہے۔"

غرضکہ دیر میں ملکہ کو افاقہ ہوا مگر دلِ مضطرب طپاں، خواہش اسی طرف

کشاں، جذبِ عشق سے مقناطیس وآہن کا عالم، کششِ محبت سے کاہ وکہربا اُسی دم ہوگئی۔ رنگ رو طائرِ پریدہ، صبر وضبط دامن کشیدہ، مشورہ ہوا سواری ادھر سے پھیرو، ملکہ کو بیچ میں گھیرو، لیکن تابِ تحمل و یارائے صبر ملکہ کو بالکل نہ تھا، فرمایا دیوانیاں ہو، یہ کوئی مسافر بیچارہ، خانماناں آوارہ، غربت کا مارا، تھک کر بیٹھ رہا ہے، اس سے ڈرنا کیا ہے۔ چلو نزدیک سے دیکھیں۔ناچار وہ سب فرمانبردار چلیں، مگر جھجکتی ایک دوسرے کو تکتی، جوں جوں سواری قریب جاتی تھی، ملکہ کی چھاتی دھڑکتی تھی، دل میں تڑپ زیادہ پاتی تھی۔

اگرچہ جمالِ ملکۂ مہرنگار بھی، سحرِ سامری کا نمونہ، مہ و مہر سے دونا، عابد کُش زاہد فریب تھا۔ جانِ عالم بھی بے چین ہوا، مگر دامنِ ضبط دست استقلال سے نہ چھوڑا، جس طرح بیٹھا تھا، جنبش نہ کی، تیور پر میل نہ آیا۔

ایک خواصِ خاص بہ اشارۂ ملکہ آگے بڑھی، پوچھا "کیوں جی میاں مسافر، تمھارا کدھر سے آنا ہوا اور کیا مصیبت پڑی ہے، جو اکیلے سوائے اللہ کی ذات بِہیات، نہ کوئی سنگ نہ ساتھ، اس جنگل میں وارد ہو"

شہزادے نے مسکرا کر کہا "مصیبت خیلا تجھ پر پڑی ہوگی، معلوم ہوا یہاں آفت زدے آتے ہیں، کہو تو تم سب کی کیا کمبختی، ایاموں کی گردش نصیبوں کی سختی ہے جو چڑیلوں کی طرح ناکام سرِشام پھرتی ہو۔"

ملکہ یہ کلمہ سُن کے پھڑک گئی، خود فرمانے لگی "واہ واصاحب تم بہت گرما گرم، تند مزاج ہو، حال پوچھنے سے اتنا برہم ہو کر کڑا فقرہ سنایا کہ اس مردار کے ساتھ کھو مجھ چھٹ، سب کو چھل پائیاں بنایا۔"

جان عالم نے کہا "اپنا دستور نہیں کہ ہر کس و ناکس سے ہم کلام ہوں، دوسرے مردار سے بات کرنا مکروہ ہے، مگر خیر دھوکے میں جیسا اس نے سوال کیا، ویسا ہم نے جواب دیا، اب تمھارے منہ سے مردار نکلا، ہم سمجھ گئے چپ ہو رہے۔"

ملکہ نے ہنس کر کہا "خوب، یک نہ شد دو شد، صاحب چونچ سنبھالو ایسا کلمہ زبان سے نہ نکالو، کیا میرے دشمن درگور مردار خور ہیں، بھلا وہ تو کہہ کے سُن چکی، میں آپ سے پوچھتی ہوں، حضور کس سمت سے رونق افزا ہوئے اور قدوم

میمنت لزوم ہے، اس دشتِ پُرخار کو کیوں رشکِ لالہ زار کیا۔"

جان عالم نے کہا "چہ خوش، آپ در پردہ بناتی ہیں، بگڑ بگڑ یہ سناتی ہیں، ہم حضور کاہے کو ہیں، تم جو جیتے جی چار کے کندھے چڑھی کھڑی ہو، تم البتہ حضور ہو۔"

جو جو جلیسیں تھیں بولیں "ملکہ عالم! آپ کس سے گفتگو وہ بدو کرتی ہیں، یہ مردِ ط تو لٹھ ہے، سخت منہ پھٹ ہے۔"

ملکہ بولی "چپ رہو، ان باتوں میں دخل نہ دو، ایسا نہ ہو یہ بدمزہ ہو جائے تو صلواتیں سنائے۔"

وہ سب ہٹیں، آپس میں کہا "خدا خیر کرے آج جنگل میں گُل پھولا چاہتا ہے یہ پردیسی پنچھی راہ بھولا چاہتا ہے۔"

پھر ملکہ نے کہا "اے صاحب! کچھ منہ سے بولو، سر سے کھیلو۔"

جان عالم نے کہا "امرائیت کو کام نہ فرماؤ، پیچ آؤ، معلوم ہوا تم بڑی آدمی ہو، سواری مانجھے کی نہیں، خواصیں بھی تمھاری ہیں، خاک نشینوں کی ہم بستری اختیار کرو، تکلف تہہ کر رکھو، طبیعت حاضر ہوگی، تو تمھارے بیٹھنے سے کچھ کہہ اٹھیں گے، آپ ہوادار کیا، ہوا کے گھوڑے پر سوار، ہم فقیر بستر خاک پر سایہ دار، حافظ ؎

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا"

ملکہ نے کہا "اس مدۃ العمر میں ایسا مسافر جریدہ، دہن دریدہ تمھارے سوا بخدا نہ دیکھا نہ سنا، استاد ؎

زباں سنبھالو یہ منہ زوریاں غریبوں پر خدا کی سہو کوئی تم سا بھی بدلگام نہیں

تم کوئی زور چیز ہو، یکہ و تنہا، ٹٹو نہ گھوڑا، گٹھری نہ بقچہ، ننگا لچا، وہی مثل ہے، رہے جھونپڑے میں، خواب دیکھے محلوں کا، ہر بات میں ٹھنڈی گرمیاں کرتے ہو، جو یہی خوشی ہے تو لو" یہ کہہ کے ہوادار سے اُتر، شہزادے کے برابر بیٹھ گئی، خواصوں نے بہت بھیانک ہو کے کہا "لو بی بی یہ مُو، کیا سحر بیان، جادو کا انسان ہے، ملکہ سی پری کو، گالیاں دے دے کر، کیسا شیشے میں اتار لیا، بیٹھے بٹھائے میدان مار لیا۔"

ایک بولی "تجھے اپنے دیدوں کی قسم، سچ بولیو، ایسا جوان، رنگیلا، سجیلا، نکیلا،

ٹھٹھول، طرار، آفت کا پرکالہ، دنیا سے نرالا۔ تو نے یا کبھی تیری ملکہ نے دیکھا بھالا تھا؟ اری دیوانی، نادان، خوبصورتی عجب چیز ہے، اس کا دوست طالبِ دشمن کا مطلوب ہے، حسنِ خوب سب کو مرغوب ہے، جہاں کو عزیز ہے۔

غرضکہ جب ملکہ بیٹھی، جان عالم دم سرد بھر کے بول اٹھا۔ للا اعلم ؎

چہ گویم از سرو سامانِ خود عمریست چوں کاکل | سیہ بختم پریشاں روزگارم خانہ بر دوشم

سولف سراسر دل دکھاتا ہے کوئی ذکر اور ہی چھیڑو | پتہ خانہ بدوشوں سے نہ پوچھو آشیانے کا

گرفتارِ رنج والم، خوشی سے دور مبتلائے غم، بے یار و مددگار، دوست نہ غمخوار، آفت کا مارا، خانماں آوارہ ہمہ تن یاس، باختہ حواس، توشۂ راہ بجز غم جانکاہ نہیں، در رہبر سوائے دلِ مضطر ہمراہ نہیں، گو پاؤں میں طاقتِ رفتار نہیں، لیکن ایڑیاں رگڑنا بھی اس راہ میں ننگ و عار نہیں۔ یہ حال ہے وہ سب نام ہیں، کوہ و دشت اپنے مقام ہیں اور یہ چند شعر، میر سوز صاحب کے مطابقِ حال ہیں۔ میر سوز ؎

ظاہر میں گرچہ بیٹھا لوگوں کے درمیاں ہوں | پر یہ خبر نہیں ہے میں کون ہوں کہاں ہوں

اے ساکنانِ دنیا آرام دو گے اک شب | بچھڑا ہوں دوستوں سے گم کردہ کارواں ہوں

ہاں اہلِ بزم آؤں میں بھی پر ایک سن لو | تنہا نہیں ہوں بھائی با نالہ و فغاں ہوں

سوراخ و چاک لاکھوں داغوں کی کون گنتی | گلشن دل و جگر ہے گو صورتِ خزاں ہوں

نام و نشاں نے یارب رسوا کیا ہے مجھ کو | جی چاہتا ہے حق ہو بے نام و بے نشاں ہوں

قاتل پکارتا ہے ہاں کون کشتنی ہے | کیوں سوز چپ ہے بیٹھا کچھ بول اٹھ نہ ہاں ہوں

یہ پڑھ کے چپ ہو رہا۔ ملکہ سمجھی یہ مقرر شاہزادہ عالی تبار ہے، مگر کسی کا عاشقِ زار ہے، بات میں یہ تاثیر ہے، کہ ہر کلمہ ناوک کا تیر ہے۔ دل میں آیا، کسی طرح گھر لے چلیے، پھر مفصل حال معلوم ہو جائے گا، کہاں تک چھپائے گا۔ بہ منت و سماجت کہا "اے عزیز! یہ سرزمین ہمارے علاقے میں ہے، تم یہاں مسافرانہ، اتفاقات زمانہ سے وارد ہو، مہمانی ہم پر واجب ہوئی، چند گام اور قدم رنجہ کیجیے، غریب خانہ قریب ہے، آج کی شب استراحت فرمایئے، نانِ خشک کھائیے، صبح اختیار باقی ہے۔"

جانعالم نے تبسم کر کے کہا "پھر در پردہ امارت کی لی، یعنی ہم تو یہاں کے مالک ہیں، آپ بھوکے پیاسے سالک ہیں، چلو یہ فقرہ کسی فقیر کو سناؤ، محتاج کو کرّ و فر

جاہ و حشم دکھاؤ، جادۂ اعتدال سے زبان کو کام فرسانہ فرماؤ، یہاں طبیعت اپنی اپنے اختیار میں نہیں اور رواداری سے فرصت قلیل ہے، مکان پر جانا دعوت کھانا جبر ہے، اس کی کیا سبیل ہے؟"

ملکہ نے افسردہ خاطری سے کہا "دعوت کا رد کرنا منع ہے، آئندہ آپ مختار ہیں، ہم مجبور و ناچار ہیں۔"

جان عالم نے دل میں خیال کیا، برسوں کے بعد ہم جنسوں کی صحبت میسر آئی ہے اور یہ بھی شاہزادی ہے۔ اس کا آزردہ کرنا نری بے حیائی ہے، آدمیت کا لحاظ، انسانیت کا پاس، اپنی بے اعتنائی کا حجاب کر کے کہا "کھانے پینے سونے بیٹھنے کی ہوس دل سے اٹھ گئی ہے، مگر دل شکنی کسی کی اپنے مذہب میں گناہِ عظیم ہے، خدا علیم ہے۔ میر سوز نے عوض ہے ۔

دل شکنی کا بہت محال اے یار جو شیشہ ٹوٹے تو کیجے جواب شیشے کا

لیکن اتنی رکھائی اور کج ادائی، جو ظہور میں آئی، اس نظر سے تھی شعر ۔

در محفلِ خود راہ مدہ ہمچو منے را افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

دلفگاروں کی صحبت سے ملال حصول ہوتا ہے، غمگین کا ہم نشین ملول ہوتا ہے۔ میر درد ۔

نہ کہیں عیش تمہارا بھی منغص ہووے دوستو درد کو محفل میں نہ تم یاد کرو

اور جو یونہی مرضی ہے تو بسم اللہ، یہ کہہ کر اٹھا، ساتھ ساتھ، ہاتھ میں ہاتھ، پیادہ پا باتیں کرتا چلا، بسکہ شہزادہ لطیف و ظریف تھا، کوئی فقرہ نوک جوک، رمز و کنایہ سے خالی، زبان پر نہ لاتا تھا، ملکہ کا ہر بات پر دل پگھلا جاتا تھا، مگر دل سے کہتی تھی کہ "اے ناکام و بخت نافرجام! ایسا نہ کرنا، کہ ہاتھ ننگ و ناموس سے دھونا پڑے، بیٹھے بٹھائے الم مفارقت میں رونا، جان کھونا پڑے۔ ظاہر ہے کہ یہ کسی کا عاشق زار ہے، نشہ محبت میں سرشار ہے۔ دوسرے غریب الوطن، بقول میر حسن ۔

مسافر سے کرتا ہے کوئی بھی پیت مثل ہے کہ جوگی ہوئے کس کے میت

مگر تپشِ دل متصل ترقی میں تھی، خواہش، جی کی کاہش ہیں، بیقراری کو اس پر قرار تھا کہ خدا کے کارخانے میں کسی کو دخل نہیں ہوا۔ اے نادان! جو دم وصل ہے اسے غنیمت جان۔ آغازِ عشق میں انجام سوچنا خلاف ہے، اس میں شرع کی تکلیف معاف ہے۔ مؤلف ۔

غنیمت جان لے یہ صحبتیں آپس کی اے ناداں
دگرگوں حال ہوجاتا ہے اک دم میں زمانے کا

القصہ، تا در باغ پہنچے، دروازہ کھلا اندر آئے۔ جہاں کی فضائے صحرا دہ تھی وہاں کے باغ کا کیا کہنا! اگر ایک تختہ کی صفت تحریر کروں، ہزار تختۂ کاغذ پر بخطِ ریحاں نہ لکھ سکوں، دمِ تسطیر قلم میں برگ نکلتے، لکھنا بار ہوتا ہے، ہاتھ پاؤں بالکل پھولتے ہیں، صفحۂ قرطاس پر گل پھولتے ہیں، حاسد کو خار ہوتا ہے، بہت آراستہ و پیراستہ، عرض مربع ہیں، چاروں کونوں پر بنگلے، گرد سبزۂ نوخاستہ، دروازہ عالی شان، نفیس مکان۔ زیرِ دیوار، خندق پر کے لئے، اکیلے نہیں قطار در قطار، تختہ بندی کی بہار، روش کی پٹریاں، قرینے کی، مہندی کی ٹٹیوں میں رنگت بیننے کی۔ گل مہندی، سرخ زرد پرافشاں، عباسی کے پھولوں سے قدرتِ حق نمایاں۔ نرگس دیدۂ منتظر کی شکل آنکھ دکھاتی تھی، گل تنبو سے بھینی بھینی بو باس آتی تھی، میوہ دار درخت، یک لخت جدا، بار کے بار سے ٹہنیاں جھکیں، درخت سرکشیدہ، پھل لطیف و خوشگوار، پھول نازک و قطعدار، روشیں بلور کی، نہریں نور کی، حوض و نہریں فوارے جاری، چمنوں میں یاد بہاری، موسم کی تاک میں تاک کا مستوں کی روش جھومنا، غنچۂ سربستہ کا منہ تاک تاک کر نسیم کا چومنا، انگور کے خوشوں میں دلِ آبلہ دار کا پتا، زرلفت کی تھیلیاں پڑھیں، نگہبانی کو گوشوں میں باغبانیاں، الست کھڑیں، ہر تختہ ہرا بھرا، روش کی پٹریوں پر چینی کے ناندوں میں درخت گلزار، معنبر معطر بیلا چنبیلی، موتیا موگرا، مدن بان، جوہی، کیتکی، کیوڑا، نسرین نسترن کی نرالی آن بان، ایک سمت تختوں میں لالہ خوفِ خزاں سے بادلِ داغدار، گرد اس کے نافرمان کی بہار، سرو شمشاد لبِ ہر جو، فاختہ اور قمری کی اس پر کوکو، حق سرۂ شاخ گل پر بلبلِ شوریدہ کا شور، چمن میں رقصاں مور کہیں، خندۂ کبک دری کہیں تدرو بر سرِ جلوہ گری نہروں میں قاز، بلند آواز، تیز پرواز ایک طرف قرقرے، سرسے پانک درخت، گل و بار سے لدے، سیب و بہی و ناشپاتی سے، زنخ گلعذاروں کی کیفیت نظر آتی، سنبلِ مسلسل میں پیچ و تاب، زلف مہوشاں کا ڈھنگ، سوسن کی کی اودا ہٹ، مستی لبِ خوبرویوں کا جوبن دکھاتی، داؤدی میں صنعتِ پروردگار عیاں، صد برگ میں ہزار جلوے نہاں، آم کے درختوں میں کیریاں زمرد نگار، مولسری کے درخت سایہ دار، باغبانیانِ خوبصورت سرگرم کار، خواجہ سرا امرد اُن کے مددگار، حور و غلماں

کا عالم، بیلچے کھرپیاں جواہر نگار، ہاتھوں میں باہم۔ درخت اور روشوں کو دیکھتی بھالتی گل و بار چمن سے چنتی، گلا برگ سڑا بار۔ جھڑا پڑا خار۔ صحن سے نکالتی پھرتی تھیں۔ بیچ میں بارہ دری پُر شوکت، با رفعت و شان پرستاں کا سا مکان، ہر کمرہ سجا سجایا، صناعِ نادر دست کا بنایا، غلام گردش کے آگے چبوترہ سنگ مرمر کا، حوضِ مصفا پانی سے چھلکتا، فرش سب افشاں، سپھر کا۔ شامیانہ تمامی کا، سفید بادلے کی جھالر، کلابتوں کی ڈوریاں، سراسر مغرق بنا، چودھویں رات ابر کھلا، آسمان صاف، شب ماہ سامان اس تکلف کا، برسات کی چاندنی، سبحان اللہ۔ فواروں کے خزانے میں، بادلہ کٹ پڑا، ہزارے کا فوآرہ چڑھا، پانی کے ساتھ بادلے کی چمک، ہوا میں پھولوں کی مہک، فوارے نے زمین کو ہمسرِ آسمان بنایا تھا، ستاروں کے بدلے بادلے کے تاروں کو بچھایا تھا، بڑی چمک دمک سے، ملکہ کے مکان پر چاندنی دیکھنے کا سامان تھا۔ شہزادے کے آنے کا کسے گمان تھا۔ غرضکہ جانِ عالم کو لے جا، شامیانے تلے مسندِ مغرق پر بٹھایا، خرابِ ارغوانی و زعفرانی کی گلابیاں، کشتیوں میں لے کر وہ وہ زن پری پیکر، زیب دہِ انجمن ہوئی کہ بطِ مے رشک و خجالت سے بحرِ ندامت میں غوطہ زن ہوئی۔ ایک طرف جام و سبو ایک سمت نغمہ سرایانِ خوبرو و خوش گلو، سفید سفید صوفیانی پوشاک، سر سے پاؤں تک الماس کا زیور، دو رویہ صف باندھ کر کھڑی ہوئیں، ان کے بیٹھتے ہی گانا ناچ شروع ہوا، سارنگی کے سُر کی زوں ٹوں کی صدا، چرخ پر زہرہ کے گوش زد ہوتی تھی، طبلے کی تھاپ، بائیں کی گمک، خفتگانِ خاک کا صبر و قرار کھوتی تھی، ہر تان اُپج، تان سین پر طعن کرتی، بار بد اور نکیسا کے ہوش پراں تھے، جھجو خاں کو غش تھا۔ غلام رسول حیران تھے، زمزمے اور تحریر گٹکری پہ شوری زور و شور سے ہاتھ ملتا تھا۔ ہر لسی فقرے اور سُر کے پلٹے پر، الٰہی بخش پوربئے کا جی نکلتا تھا۔ ناچنے کو ایسے ایسے برق وش آئے اور اس تال وسم سے گھونگرو بجائے، کہ للّو جی شرمائے، کتھک جو بڑے اُستاد اتھک تھے، انھوں نے سم کھائے۔ ٹھوکر مردہ دلوں کی مسیحائی کرتی تھی۔ گت کے ہاتھ پر یہ گت تھی کہ مجلس کفِ افسوس ملتی تھی اور دمِ سرد بھرتی تھی۔

جب ہنگامۂ صحبت، بایں نوبت پہونچا کہ راجا اندر کی محفل کا جلسہ نظر سے گر گیا، بہشت کا سامان پیشِ چشم پھر گیا۔ اُس وقت ملکہ مہر نگار نے گلاس، شراب سے بھر کر شہزادہ

کو دیا کہا "اے ادلش کر دیجیے تاریخ سفر خاطرِ انور سے دور ہو، مجھے استفسارِ حال ضرور ہے۔" جان عالم نے باباب ظاہر انکار کیا۔

مہرنگار نے کہا "آپ دل شکنی روا نہیں رکھتے، اس پہلو تہی کرنے میں ملالِ خاطر کے سوا کیا مقصود ہے؟"

شہزادے نے مسکرا کر ساغر ہاتھ میں لیا۔ یہ کہہ کر باطبع شگفتہ پیا۔ انشاء ؎

گر یار ے پلائے تو پھر کیوں نہ پیجیے
زاہد نہیں ہیں شیخ نہیں کچھ ولی نہیں

پھر جان عالم نے جام لبالب اپنے ہاتھ سے بھر کے ملکہ کو دیا، دورِ جام بے دغدغہ نیرنگی ایام چل نکلا، دو چار ساغرِ آبِ آتش رنگ جوانی کی ترنگ میں پیہم و متواتر جو پیے، دونوں کو گونہ سرور ہوا، رنج سفر ادھر سے، تمیز و خیال خیر و شر ادھر سے دور ہوا، اس وقت جان عالم نے کہا۔ میر درد ؎

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے، ساغر چلے

یہ سن کر وہی خواص گرما گرم، جس نے شاہزادے سے پہلے گفتگو کی تھی، ملکہ کے بہت منہ لگی تھی یہ بولی۔ بقا ؎

لطف شبِ مہ اے دل اس دم مجھے حاصل ہو
اک چاند بغل میں ہو اک چاند مقابل ہو

ملکہ نے بحسرت فرمایا کہ "مردار، ہم تیری چھیڑ چھاڑ سب سمجھتے ہیں، کیا کریں افسوس کی جگہ ہے، حال اپنا موافقِ قول سودا ہے۔ رفیع سودا ؎

جو طبیب اپنا تھا دل اس کا کسی پر زار ہے
مژدہ باد اے مرگ، عیسیٰ آپ ہی بیمار ہے

جان عالم نے یہ سن کر اسی خواص کو سنا کر متنبہ کیا۔ استاد ؎

میں مسافر ہوں مجھ سے دل نہ لگا
کیا بھروسہ مرا رہا نہ رہا

ملکہ ٹال کے حال پوچھنے لگی کہ "تمھیں بخدائے عزوجل، سچ کہو تم کون ہو، کہاں سے آئے ہو، کس کی تلاش میں خود رفتہ گھبرائے ہو؟"

اس وقت جان عالم کو بجز راستی مفر نظر نہ آیا، کہا "ملک میں شاہ فیروز بخت کا بیٹا ہوں، جان عالم نام ہے، سرزمین ختن وطن ہے۔ فسحت آباد، بیت السلطنت کا مقام ہے، میں نے ایک توتا مول لیا تھا، بہت طرار، سحر گفتار، اس کی زبان سے شہرۂ حسنِ انجمن آرا سن کے نادیدہ، دیوانہ وار، بیقرار، بیابان مرگ آوارہ

وطن، موردِ رنج و محن ہوا ہوں۔" پھر توتے کا راہ میں اڑ جانا، وزیر زادے کا پتہ نہ پانا، شمۂ بیانِ گرفتاریٔ طلسم، اور اپنی خواری، جادوگرنی کا نقشِ سلیمانی کا دینا اور اپنا رستہ لینا، کہہ کر کہا، "بے ملکِ زرنگار پہنچے نہ جان کو چین، نہ دل کو قرار ہے، زیست بیکار ہے۔" اور یہ غزل پڑھی۔ مولف ؎

بسوزِ شمع رویاں اس طرح کا سینہ سوزاں ہوں　　کہ رفتہ رفتہ آخر جلوۂ سروِ چراغاں ہوں
نسیم صبح ہوں یا بوئے گل یا شمع سوزاں ہوں　　میں ہوں جس رنگ میں پیارے غرض دم بھر کا مہماں ہوں
نہ پھل پایا، لگانے کو بجز افسوس و حسرت کے　　میں نخلِ بے ثمر کس مرتبہ مردودِ دہقاں ہوں
عبث تدبیر ہے گور و کفن کی اس کے کوچے میں　　میں ننگ دو جہاں ننگے ہی رکھ دینے کا شایاں ہوں
نہ مرتے مرتے منہ پھیرا محبت سے کبھی میں نے　　جفائیں کس قدر جھیلیں وفا پر اپنی نازاں ہوں
تنی رہتی ہے اکثر چادرِ مہتاب تربت پر　　کہ تا معلوم ہو سب کو قتیلِ مہ جبیناں ہوں
سرورِ غم رسیدہ ہوں مجھے طوفانِ محشر میں　　ترانا تو ہی خاندانِ غریقِ بحرِ عصیاں ہوں

ملکہ نے جب سنا کہ یہ فریفتۂ جمالِ پری تمثال انجمن آرا ہے۔ آہِ دلدوز، نعرۂ جانسوز، کھینچ کر رونے لگی، امید قطع ہوئی۔ جان عالم نے بیقرار ہو کے کہا "اے ملکہ مہر نگار خیر باشد۔" ملکہ نے اسی حال میں کہا۔ استاد ؎

مائل اس فتنۂ عالم پہ کیا جو مجھ کو　　سوئے بیداد مگر مرضیٔ دوراں آئی
چاکِ دل تک تو کچھ اے دستِ جنوں پردہ تھا　　یہ کھلا اب تو کہ نوبت بہ گریباں آئی

اے شاہزادۂ والا تبار غارت گرِ کشورِ دلِ عاشقِ زار میرا حال سُن ؏

"عجیب واقعہ و طرفہ ماجرائے ہست"

"باپ میرا بھی شہنشاہ تھا، بہت سے تاجدار خراج گذار تھے، مگر ابتدا سے طبیعت متوجہ فقر اور عبادت کی عادت تھی۔ آخرکار کارخانہ دنیائے دوں ہیچ و پوچ جان کے یہ شعر وردِ زبان۔ سوز ؎

جب ہیچ ہی ہم بوجھ چکے وضع جہاں کو　　غم ہیچ الم ہیچ، طرب ہیچ، عطا ہیچ

غرضکہ حکومت کا بکھیڑا چھوڑ، معاملہ سلطنت بیکار جان، اور بے ثباتیٔ جہانِ گذران مدنظر کر، دنیا سے ہاتھ اٹھایا، بادشاہت مٹا آبادی سے منہ موڑا، اس صحرائے پُرخار میں مکان بنا کے بیٹھ رہا، ہر چند مجھے شادی کو ارشاد کیا، میں نے بسببِ مفارقت

انکار کیا، اب دفعتاً آفت آسمانی و بلائے ناگہانی، مجھ پر ٹوٹ پڑی کہ بیک نگاہ عاشق کیا، دیوانی ہوگئی، ہوش و حواس سے بیگانہ ہوگئی۔ میرؔ ؎

رسوا ہوا، خراب ہوا مبتلا ہوا
کیا جانیے کہ دیکھتے ہی مجھ کو کیا ہوا

اور تو اس کا عاشق و طلبگار ہے، جس کا نظیر، اس زمانے میں ہاتھ آنا بہت دشوار ہے۔ میرؔ ؎

محمل نشیں ہیں کتنے خدام یار میں یاں
لیلے کا ایک ناقہ سو کس قطار میں یاں

اب بجز مرگ کیا چارہ، میں ننگ خانماں خراب کنندۂ خاندان فقط ذلت و خواری ماں باپ کی اور گریہ و زاری اپنی چاہتی تھی، صبح تو کہاں، میں کہاں، یہ صحبت شب خواب ہو جائے گی، نمودِ صبح مفارقت، شامِ غربت کا رنگ دکھائے گی، دامنِ سحر کی طرح گریبان صبر چاک ہوگا، ہمارے سر پہ آفت و خرابی آئے گی، انصاف کیجیے، کس سے کہوں گی، بیقراری ستاتی ہے۔ جانِ عالم کی جدائی سے روح بدن سے جدا ہوتی ہے، جان جاتی ہے، ہم صحبتیں طعنے دیں گی، انیسیں چھیڑ چھیڑ کر جان لیں گی، جب لونڈیوں پر خفا ہوں گی، بڑبڑائیں گی، زبان پہ یہ کلمہ لائیں گی، "ملکہ عاشقی کا رنج و ملال یوں در پردہ ٹالتی ہیں، شہزادہ چلا گیا، نہ رک سکا، اس سے بس نہ چلا، غصے کی جھانجھ ہم پر نکالتی ہیں" باپ پر حال کھلا، تو خجالت ہوگی۔ ماں نے گر سنا تو ندامت سے کیا حالت ہوگی۔ رسوائی کے خوف سے دل کھول کر نہ رو سکوں گی۔ بدنامی کے ڈر سے جی نہ کھو سکوں گی۔ جب دلِ بیتاب ہجر سے گھبرائے گا، فرمایئے کون تسکین فرمائے گا کیا کہہ کے سمجھائے گا۔ آپ اُدھر تشریف لے جائیں گے ہم اِدھر غم فرقت سے گھٹ گھٹ کر مر جائیں گے۔ ہماری سرنوشت پر رونا روا ہے۔ ماجرا ہمارا عبرت و حیرت افزا ہے۔ ہر چند ظلِ سبحانی، عاملِ بے بدل ساحر بے مثل ہیں، علوی و سفلی سب کچھ پڑھا لکھا، ہماری پریشانی اور لوحِ جبیں کی تحریر نہ دیکھی کہ کیا پیش آنی ہے اور خط شکستہ سے ایسے نستعلیق نے کیا برا لکھا ہے، افسوس صد افسوس"۔ مؤلف ؎

وہ بھی ہوگا کوئی امید بر آئی جس کی
اپنے مطلب تو نہ اس چرخِ کہن سے نکلے

یہ باتیں کر دل پر ہاتھ دھرنے لگی، دامن و گریباں آنسوؤں سے بھگونے لگی۔ شہزادے کو ثابت کیا، یقین ہوا کہ ملکہ بہ شدت فریفتہ و شیدا ہے، بات سے خون

ملال پیدا ہے، دل دیکھنے کے مزے سے زبان لذت پا چکی تھی، جان ہجر کے صدمے اٹھا چکی تھی، بے چین ہو کر بولا "زبان کو تسکین کی باتوں میں کھولا۔ کہا "آپ کا کدھر خیال ہے، بندہ فرمانبردار بہرحال ہے، جو کہو گی بجا لاؤں گا، بارِ اطاعت سے سر نہ اٹھاؤں گا، مگر برائے چندے صبرِ دل پر جبر ضرور ہے، اگر اس کی جستجو میں نہ جاؤں گا، تمھیں میری کیا امید ہو گی، ہم چشموں کو کیا منہ دکھاؤں گا۔" سبحان اللہ وہ وقت دیکھا چاہیے کہ معشوق عاشق کی تسکین کرے، اپنی اطاعت اس کے ذہن نشین کرے، خوش قسمتوں کو ایسے بھی مل جاتے ہیں کہ عاشق کے رنج و غم کھاتے ہیں، دلداری کر کے سمجھاتے ہیں۔ اس کا لوگ رشک کرتے ہیں، آتشِ حسد سے جل مرتے ہیں۔ ملکہ یہ سن کر دل میں شاد بندِ فکرِ غم سے آزاد ہوئی۔ یہ بات امتحان کی ہے، جسے جی پیار کرتا ہو، اگر وہ جھوٹ بھی بولے تو عاشق کو سچ کیا بمنزلہ آیت و حدیث ہو جاتا ہے مگر یہ کہا۔ مصحفی ؎

عاشق سے بھی ہوتا ہے کہیں صبر و تحمل — وہ کام تو کہتا ہے جو آتا نہیں مجھ کو

لیکن خیر ہم تو اسے بھی جھیل لیں، یہ کھیل بھی کھیل لیں، اگر ہماری یاد تمھیں فراموش نہ ہو، وحشت کا جوش نہ ہو۔"

جان عالم نے قسمیں شدید کھائیں، اختلاط کی باتیں درمیان میں آئیں، کہ اس میں سرِ مو فرق نہ ہو گا اور مژدۂ وصل سے مسرور کیا، خیالِ مفارقت ملکہ کے دل سے دور کیا، کہا "اب ہنسی خوشی کی باتیں کرو، یہ بکھیڑا جانے دو، مفارقت سر پر کھڑی ہے، رات تھوڑی، کہانی بڑی ہے، فلک سفلہ پرور جفا کیش ہے، عاشق و معشوق کا بداندیش ہے۔ استاد ؎

بہ شبِ وصل شکوہ ہا مکنید — شبِ کوتاہ قصہ بسیار است

مگر شبِ وصل ہمیشہ سے کوتاہ ہے، خدا گواہ ہے۔ دو کلمے ہنسی کے ہنوز پورے نہ ہونے پائے، گردوں کو رشک آئے، یکایک مرغِ سحر بیدار باش پکارا، زاہد نے نعرۂ اللہ اکبر مارا، گجر کی آواز بھی دونوں کے کانوں میں آئی، بساولانِ سلطانِ خاورنے صبح کی دھوم مچائی، ملکہ پریشان ہو کے بولی۔ مؤلف ؎

وصل کی شب چونک اٹھے ہم سن کے زاہد کی صدا — یاں دمِ تکبیر ہی اللہ اکبر ہو گیا

ولہٗ ؎

زاہد بھی تیسرا ہے شب وصل میں حریف مشہور گو جہان میں صبح و خروس ہے

جان عالم نے نماز صبح پڑھ کر کمر بعزم سفر چست کی، ملکہ سہم کر آبدیدہ ہو، یہ شعر پڑھنے لگی۔ جرأت ؎

نہ آیا اور کچھ اس چرخ کو آیا تو یہ آیا گھٹانا وصل کی شب کا بڑھانا روز ہجراں کا

جب شہزادے نے چلنے کا قصد کیا، ملکہ نے کہا "اگر ہرج متصور نہ ہو، میرے والد سے ملاقات کر لو، یہ امر فائدے سے خالی، لا ابالی نہ ہوگا۔"

جان عالم نے کہا "بہتر ہے" پھر وہی خواص ہمراہ ہوئی، جب وہاں پہنچا دیکھا بوریائے بے ریا بچھا ہے، مصلے پر ایک مردِ مہذب، بذکرِ حق مشغول، بادلِ ملول بیٹھا ہے یہ رسم سلام بجا لایا، اس نے دعائے خیر دے کر، ہاتھ بڑھایا، چھاتی سے لگایا، قریب بٹھا کے فرمایا "ماجرائے شب تیرہ ملکہ فقیر پر روشن ہے، ایسی بدقسمت دوسری خلق میں خلق نہیں ہوئی، ہمارے کہنے سے انکار کیا، بڑے بول کا سر نیچا ہوا تو تم سے کیا دارو مدار کیا، جو تم اتنی تسکین نہ کرتے، تو اس کا زندہ رہنا محال تھا، اس طرح کا دل پر صدمہ اور ملال تھا، اگر ایفائے وعدہ کرو گے اللہ بھلا کرے گا، ورنہ یہ رنج بُرا ہے، دیکھئے اس کا کیا حال کرے گا، دلداری جگر فگاروں کی عیادت، مرضِ محبت کے بیماروں کی جوانمردوں پر فرض ہے۔ یہ سمجھنا۔ ساحل را از خس و خاشاک گذار و گل را از خار ننگ و عار نمی باشد۔"

شہزادے نے سر جھکا عرض کی "آپ کیوں محجوب فرماتے ہیں، مجبور ہوں، اس غم میں گھر چھوڑا، عزیزوں، یگانوں سے ترک کر، شہر سے منہ موڑا، وہ کہیں گے سخت کم ہمت اور بے جرأت تھا، راہ میں آسائش ملی، بیٹھ رہا، خوف سے جا نہ سکا، جھوٹا تھا ناحق عشق کا دم بھرا۔"

پیر مرد نے فرمایا "مرحبا، جزاک اللہ، یہی شرط جوانمردی و ثابت قدمی ہے، ہمیں بھی تمہارے اس عزم سے ایفائے وعدہ کی امید ہوئی۔" پھر ایک لوح عنایت کی، اور کہا "جب کوئی مہم سخت روبکار ہو بطرز فال اُس حال میں اسے دیکھنا جو نکلے اُس پر عمل کرنا۔ اللہ تعالیٰ وہ مشکل سخت ایک آن میں آسان کرے گا۔ لو بحفظ حافظ حقیقی سپردم

اَللّٰہ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ۔ فرد

بہ سفر رفتنت مبارک باد   بہ سلامت روی و باز آئی

شہزادہ رخصت ہوا لوح لے کر ملکہ کے پاس آیا، یہ شعر زبان پر لایا۔ مؤلف

کوچ کی اپنے اب تیاری ہے   تیرا حافظ جناب باری ہے

ملکۂ ناکام، گردشِ ایام دیکھ، اور یہ کلمۂ جانکاہ سن کر، کلیجہ تھام، سر دھن کر، یہ اشعار پڑھنے لگی۔ استاد

میں مر گئی سن اس کے سرانجام سفر کا   آغاز ہی دیکھا نہ کچھ انجام سفر کا

کہتے ہیں وہ اب جاتا ہے ایسی ہی دعا کر   مسدود ہو رستہ دل ناکام سفر کا

مت جان نکمی مجھے اے جان لئے چل   کرتی چلوں گی ساتھ ترے کام سفر کا

میں کشور ہستی ہی سے اب کوچ کروں گی   آگے نہ مرے لیجیو تو نام سفر کا

چلنے کی صلاح اس کے ٹھہرتی نہیں اب ساتھ   موقوف نوازش ہوا آرام سفر کا

آخر جبراً قہراً رخصت کیا۔ کہا "خدا حافظ امام ضامنِ ثامن کو سونپا۔ ع

ترا موسیٰ رضا ضامن ترا اللہ والی ہے

جس طرح پیٹھ دکھاتے ہو، اسی صورت اللہ تمھارا منہ دکھائے، غمِ دوری ہمارا دور ہو جائے۔ جان عالم یہ سن کر روانہ ہوا، یہاں طپشِ دل کو بہانہ ہوا، دریائے سرشک چشم خون پالائے موج زن ہوا، غریقِ لجۂ مفارقت جان و تن ہوا، جلیسیں بولیں " ملکہ جی کھوؤ گی، جو اس طرح بلک بلک کر روؤ گی، مسافر کے پیچھے رونا، زبون از حد ہے، بی بی خیر ہے، یہ شگونِ بد ہے، وہ بھی دن اللہ دکھائے گا، جو وہ پردیسی صحیح و سلامت خیر سے گھر آئے گا، تو ان کو یہ سمجھاتی۔ سوز

چشم کا کام اشک باری ہے   چشمۂ فیض ہے کہ جاری ہے

مؤلف

بیدرد کوئی اتنا سمجھتا نہیں ہے ہے   دل دکھے تو کس طرح سے فریاد نہ ہووے

ولہٗ

مجھ کو رونے کو نہ تم منع کرو ہم نفسو   غم دل کرتی ہوں میں دیدۂ تر سے خالی

اور جب آنسو کم کرتے تو دل اور جگر سینے میں برہم کرتے، اس وقت گھبرا کر یہ کہتی

مولف ؎

مدد اے سوزِ جگر تاکہ نہ ہووے خفت — نوک مژگان ہوئی پھر لخت جگر سے خالی
پھر نہ منہ اس نے کیا میری طرف ہی ظالم — سخت تم بھی مرے نالو ہوا اثر سے خالی
نہ لگا اس کو مری بات کو تو مان سرور — دل کا لگنا نہیں اے یار ضرر سے خالی

غرض کہ جوں جوں شہزادے کی مفارقت بڑھتی تھی، ملکہ صدمۂ ہجر سے دوں دوں گھٹتی تھی، بدر سا چہرہ ہلال ہوا، تپ جدائی سے عجب حال ہوا، کبھی کہتی تھی "وائے ناکامی اگر دل کا حال کہوں شرم آتی ہے، جو چپ رہوں جان جاتی ہے، یہ سب کہتے ہوں گے، ملکہ کو غیرت نہیں آتی، راہ چلتوں سے بیٹھے بٹھائے دل لگاتی ہے، آپ روتی ہے، ہمیں مفت رُلاتی ہے، اُس سمجھانے والے کو کہاں سے لاؤں، جسے دل کا حال سناؤں، زیست اسی میں ہے، جو مر جاؤں، اب کون آنسو پونچھ رونے کو منع کرے گا، کون میرے دمِ گرم پر آہ سرد بھرے گا، پیار سے سرھانی پر دھرے گا۔"

جب ملکہ کا یہ حال بتر چپکے چپکے جی سے باتیں کرنا، دیکھ کر لوگ گھیرتے، دستِ شفقت سرِ وحشت انگیز پر پھیرتے اور پوچھتے کہ 'اے جی کے دشمن ہمیں تو بتا دل کا حال کیا ہے' تو وہ کہتی 'اور تو کچھ جانتی نہیں پر یہ نقشہ ہے ہاتھ پاؤں سنسناتے ہیں خود بخود غش چلے آتے ہیں، دم سینے میں بند ہے، گھبراتا ہے مکان کاٹے کھاتا ہے، باغ ویران گل بوٹا خار معلوم ہوتا ہے، گھر زندان، بات کرنا بیکار معلوم ہوتا ہے، جان بیقرار ہے، بند بند ٹوٹتا ہے، دامنِ صبر دستِ استقلال سے چھوٹتا ہے، جنگل پسند ہے، ویرانی کا جی خواہش مند ہے، دشت کا سناٹا بھاتا ہے، بلبل کا نالہ دل دکھاتا ہے، خدا جانے کس کی جستجو ہے، دل کو مرغوب قمری کی کوکو ہے، تنہائی خوش آتی ہے، آدمیوں کی صورت سے طبیعت نفرت کھاتی ہے، سینہ جلتا ہے، دل کو کوئی سوس کرملتا ہے، آنکھ ظاہر میں بند ہوئی جاتی ہے، مگر نیند مطلق نہیں آتی ہے، ہاتھ چاہتے ہیں، سر دست چاکِ گریباں دیکھیں، پاؤں چل نکلے ہیں کہ بیاباں دیکھیں، نل دمن کی مثنوی سے ربط ہے، لیلیٰ و مجنوں کا قصہ پڑھتی ہوں، یہ کیا خبط ہے، دل کی تمنا ہے کہ بے قراری کر، آنکھیں اُنڈی ہیں کہ اشکباری کر، جہاں کی بات سے کان پریشان ہوتے ہیں، مگر جان عالم کا ذکر، دل لگا کر سنتی ہوں، جو کوئی سمجھاتا ہے، رونا

چلا آتا ہے، سر دھنتی ہوں۔ ناکامی مجھ خستہ و پریشاں کا کام ہے، آہ مجھ بے سر و ساماں کا تکیہ کلام ہے، منہ کی رونق جاتی رہی، زردی چھا گئی، بہار حسن پر خزاں آ گئی۔ ہر دم لب پر آہِ سرد ہے، ایک دل ہے اور ہزار طرح کا درد ہے، جان جانے کا وسواس نہیں، بزرگوں کا لحاظ و پاس نہیں، زیور طوق و سلاسل ہے، زیب و زینت سے بدمزگی حاصل ہے، دل و جگر میں گھاؤ ہے۔ بگاڑ بناؤ ہے، بستر زم خار خار ہے، ارے لوگو یہ کیا آزار ہے، سب سے آنکھ چراتی ہوں، ہم صحبتوں سے شرماتی ہوں، اب صدمہ اٹھانے کا یارا نہیں، بے موت اس بکھیڑے سے چھٹکارا نہیں، عجب حال ہے، اکثر یہ خیال ہے۔ مولف ؎

افسوس یہ حال ایک عالم دیکھے ایسا نہ ہوا کہ جانِ عالم دیکھے

اگر اسی کا عشق عاشقی نام ہے، تو میں در گذری۔ میرا سلام ہے، جو لوگ عشق کرتے تھے، کیونکر جیتے تھے بتاؤ تو کیا کھاتے تھے، دو دن سے کچھ نہیں کھایا، مگر پیٹ بھرا ہے، کھڑی ہوں جی بیٹھا جاتا ہے، پہلے مجھے نہ منع کیا۔ ہے ہے میرے جان کے دشمنو! یہ کیا کیا؟ اللہ کی مرضی کسی کا کیا بگڑا، میری قسمت کا لکھا، جو کیا اچھا کیا۔"

یہ سُن کے ایک کھیلی کھائی، عشق کے صدمے اٹھائی قریب آئی، کہا "قربان جاؤں واری ابھی سلامتی سے نو گرفتاری ہے، جو اتنی آہ و زاری اور بیقراری ہے، سہتے سہتے عادت ہو جائے گی تو تسکین آئے گی۔" ان باتوں کے سننے سے دل جو بھر آیا بے اختیار خونابۂ دل لختِ جگر چشمِ تر سے متصل بہانے لگی۔ دیدۂ دیدار طلب سے سمندر کی لہر لہرانے لگی، نظم میں دل کا حال سنانے لگی۔ مولف ؎

حالت ہے اس کی پہلے کی برق و شرار کی کیا کیا تڑپ سناؤں دلِ بیقرار کی
پھوٹے طپش سے دل کے یہ سب آبلے مرے منت کشی نہ کرنی پڑی نوک خار کی
دل اپنا قبر میں بھی جلے گا اسی طرح حاجت رہے گی ہم کو نہ شمع مزار کی
وعدے کی شب کو دیدۂ اختر جھپک گئے دیتے ہیں شل لوگ مرے انتظار کی
لے جائیو ادھر سے جنازہ مرا سرور حسرت بھری ہے دل میں مرے کوئے یار کی

رخصت ہونا جانعالم کا ملکہ مہر نگار سے،

اور پہنچنا ملک میں اُس غزالِ رمیدۂ صحرائے بے اعتنائی، پروردۂ مہدِ ناز و گہوارۂ کج ادائی، اور نپانا صیدِ مطلب کا، پھر گریہ و زاری پھر لڑائی جادو کی، ملاقات اس ماہرو کی

یہاں کا تو قصہ یہ چھوڑا یہاں
سُنو پھر اسی غمزدے کا بیان

طلسم کشایانِ گنجینۂ سخن، فن سامری و رہ نوردانِ اقلیم حکایاتِ کہن، مشّاق جادو و شعبدہ گری، رسامانِ جفاکش و محنت کشیدہ، سحر سازانِ سخن سنج، دریں سرائے سہ پنج، روے راحت ندیدہ، گوسالۂ سخن کو دیر خراب آباد میں یوں گویا کرتے ہیں، کہ ملکہ مہر نگار کے باغ سے چالیس منزل، ملکِ زر نگار کشورِ آفتِ روزگار تھا، شہزادہ دل زکف دادہ، یکہ و تنہا، صعوبتِ سفر کا مبتلا، پاؤں میں چھالے، لب پر آہ و نالے، گرتا پڑتا کئی مہینے کے بعد، اُس زمین خجستہ آئین میں پہونچا، اور جو جو پتے توتے نے بتلائے تھے، وہ سب اُس جوار میں پائے، واقعی عجب نواحِ شگفتہ و شاداب، ہر سمت چشمہ ہائے آب، جنگل سب سبزہ زار، گل بوٹے خود رو کی انوکھی بہار، ہوا فرحت انگیز، بو باس مشک بیز، جنوں خیز۔ جانعالم خوش و خرم، جلد جلد قدم اٹھاتا چلا جاتا تھا۔

ایک روز دو چار گھڑی دن رہے کیا دیکھتا ہے کہ ایک شے مثل آفتاب، بصد

آب و تاب، شمال کی سمت یہ درخشاں ہے کہ نگاہ نہیں ٹھہرتی، عقل حیران ہے، دل سے کہا، آثارِ حشر نمود ہوئے، یہ کیا قیامت ہے، ہم مشاہدۂ جمالِ جاناں سے محروم رہے، مشرق و مغرب کو چھوڑ سورج شمال کی طرف جا نکلا، افسوس صد افسوس۔ اب تک نہ دل کا مدعا نکلا۔ جب قریب پہنچا تو دیکھا دروازہ ہے، عالیشان سر بہ اوجِ فلک کشیدہ، دیدۂ روزگار ندیدہ، بسکہ مُطلّا ہے اور لعل و یاقوت اس کثرت سے جڑے ہیں کہ جوہریِ وہم و گمان حیران کھڑے ہیں، شعاعِ آفتاب سے یک رنگی خورشید حاصل ہے، شرمندہ اُس کے روبرو بدرِ کامل ہے، یقین ہوا اب بر سرِ مطلب پہونچا، یہ وہی دروازہ ہے، بابِ امید جس کا ذکر وہ سرخرو، زمرد لباس کرتا تھا۔ سجدۂ شکر بدرگاہِ منزل رسانِ راہ گم کردگان کیا اور خوش ہوکر دوڑا فرد ؎

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک — آتشِ شوق تیز تر گردد

غرض افتاں و خیزاں، درِ شہر پناہ پر آیا، دروازہ جواہر نگار، رفعت فلک دکھاتا، دیوار و در جگمگاتا، بلور کی اینٹیں، یاقوت کی تحریر، ہر خشت مُصفّا و مُطلّا، درِ بہشت کی طرح واحصن حصین، بصد فخر و تمکین بنا، جا بجا بُرجِ برنجی و آہنی ڈھلے ہوئے توپیں چڑھیں، گولہ انداز، جوان جوان بنفشہ بادلے کے دگلے، گلنار پہنے، ایک پیچے ہیجے چست و چالاک توپوں کے بائیں دہنے ٹہل رہے، زمین و آسمان ان کی ہیبت سے دہل رہے، گلی کوچے صاف خس نہ خاشاک دروازے پر پانچ ہزار سوار، لاکھ پیادے کی چھاونی، کچھ جنگ کے آمادہ تیار۔

جانِ عالم نے اُن سے پوچھا "اس شہر کا کیا نام ہے اور حاکم یہاں کا کون ذی احترام ہے؟" انھوں نے دیکھا، ایک جوان سرو قامت، قمر طلعت خوفِ سفر خاکِ رہگذر میں نہاں ہے، مگر دبدبۂ شوکت و صولت نشانِ جرأت چہرۂ انور سے عیاں ہے، وہ خود کہنے لگے "آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

شہزادے نے کہا "بھائی سوال دیگر جواب دیگر"

آخر ایک شخص نے کہا "قبلہ اس ملک کو زرنگار کہتے ہیں۔"

یہ سنتے ہی چہرہ بشاشت سے کُندن کی طرح دمکنے لگا، جو ریت کا ذرہ تھا،

افشاں کی صورت منہ پر چمکنے لگا۔ دل سے کہا: "یہ خواب ہے یا بیداری، طالع گردشِ دہ سے اُمید یاری و مددگاری نہ تھی، ایسی قسمت رہبر ہماری نہ تھی، پھر کچھ نہ پوچھا۔ یہ کہتا چلا۔ مولف ؎

للہ الحمد ٹھکانے لگی محنت میری   طے ہوئی آج کی منزل میں مسافت میری

دروازے سے آگے بڑھا، شہر دیکھا، قطعدار، ہموار قرینے سے بازار، کرسی ہر دکان کی کمر برابر، مکان ایک سے ایک بہتر و برتر، بیچ میں نہر جا بجا فوارے، سب عمارات شہر پناہ کے میل کے، جواہر نگار سانچے کے ڈھلے۔ ہاتھ کا کام معلوم نہ ہوتا تھا، نہ کہیں بلندی نہ پستی، ہموار بسی ہوئی بستی، ایک کا جواب دوسری طرف۔ اِدھر بزاز تو اُدھر بھی صرّاف کے مقابل صرّاف، بازار کا صحن، نفیس شفّاف۔ جوہری کے روبرو جوہری، زر و جواہر کا ہر سمت ڈھیر، نقد و جنس سے ہر شخص سیر، کوئی شے کسی طرح کا اسباب ایسا نہ تھا کہ اس بازار میں نہ تھا۔ مغرب و مشرق کی اشیائے نادرہ کا ہر جا انبار تھا۔ جنوب و شمال کا خریدار تھا، حلوائی، نانبائی، کنجڑے قصائی، سقوں کے کٹوروں کی جھنکار، میوہ فروشوں کی پکار، دلالوں کی بول چال، جہاں کا اسباب و مال، ہر کی کیفیت جُدا، قد آدم آبِ مصفّا، فواروں سے کیوڑہ گلاب اچھلتا، بازار مہک رہا۔ ہر طرف دھوم دھام خلقت کا اژدہام، چلنے پھرنے والوں کے کپڑے لتے ہوئے جاتے تھے۔ وہم و گمان کشمکش سے بار پاتے تھے۔

جان عالم قدرتِ حق دیکھتا جاتا تھا، ہوش برجا نہ آتا تھا، دل سے کہتا تھا۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ کیا ملک، کیا سلطنت، کیا شہر کیا بازار ہے۔ کیا بیوپاری ہیں کیسا کیسا خریدار ہے۔ ہر شخص کو آرام و راحت ہے، کیا بندوبست یا انتظام ہے۔ کیا حکومت ہے! جب چوک میں آیا پوچھا "ایوانِ جہاں پناہ دولت سرائے شاہ کدھر ہے؟"

لوگوں نے کہا "دستِ راست سیدھے چلے جائیے۔"

بازار طے کر قریبِ عمارات بادشاہی جب آیا، ان مکانوں کو نرا طلسم پایا۔ عقل کام نہ کرتی تھی، ہر کنگرہ ایوانِ فلک سے اونچا، برج ہر ایک جہاں نما خورشید

ساچمکتا، لیکن جو لوگ درباری یا ملازم سرکاری آتے جاتے دیکھے، سب سیاہ پوش، خمخانۂ الم کے جرعہ نوش، اس کا ماتھا ٹھنکا، پاؤں ہر ایک کئی من کا ہو گیا، ہر شخص کا منہ تکتا تھا، قدم اٹھ نہ سکتا تھا، کہتا تھا خدا خیر کرے، شگون بد ہے، دل کو بیقراری از حد ہے، چند قدم اور بڑھا، سواری کا سامان سامنے آیا۔ "بچو بڑھائیو" کا شور بلند پایا، دیکھا ایک خواجہ سرا پُرانا، زیرک و دانا محبوب علی خاں نام نواب ناظر سراپردۂ شاہی، باحترام۔ وہ بھی با خاطرِ حزیں، غمگین، سیاہ پوش، حواس باختہ ہوش فراموش اندوہ یاد، رنج سے ہم آغوش۔

جان عالم نے سلام کیا۔ وہ جواب دے کر شاہزادے کو دیکھنے لگا، حیران و ششدر، متحیر سا اور رو کے کہا "سبحان اللہ وبحمدہ کیا تیری قدرت کی شان ہے، جنسِ بشر میں کس کس طرح کا پری پیکر خلق کیا ہے کہ چشم کو تابِ جمال، زبان کو صفت کی مجال نہیں" نہایت متوجہ ہو کر پوچھا کہ "اے شمشاد نورستۂ چمن جہانبانی و سرو نوخیز بوستانِ سلطنت و حکمرانی، حضور کہاں سے رونق بخش اس شہر نحوست اثر کے ہوئے؟"

شہزادے نے کہا "میاں صاحب خیر ہے، ہم فقط اس شہر اور یہاں کے شہریار کے شوقِ دید میں وطن سے بعید ہو، خستہ و خراب، بادلِ مضطر و جانِ بیتاب یہاں پہونچے ہیں، برائے خدا یہاں کی نحوست، اپنی سیاہ پوشی کی علّت بیان کیجیے۔"

خواجہ سرا نے یہ سُن کر نعرہ مارا، بے چین ہو کر پکارا کہ "اے جوان رعنا! تو نے یہ قصہ سُنا ہو گا، زینتِ تختِ سلطنت، رونق شہر موجبِ آبادی، صاحبِ جاہ و حشمت، مالکِ عفت و عصمت، انجمن آرا یہاں کی شہزادی تھی، شہرۂ جمال، بےمثال، اس حور طلعت، پری خصال کا، از شرق تا غرب، اور جنوب سے شمال تک زبان زدِ خلق خدا تھا اور ایک جہان حسن کا بیان سُن کر، نادیدہ اس کا مبتلا تھا، آجتک چشم و گوش چرخ کج رفتار نے بایں گردشِ لیل و نہار، ایسی صورت دیکھی نہ سنی، بہت سے شاہ اور شہریار اس کے وادی طلب میں قدم رکھ کر، تھوڑے عرصہ میں آوارۂ دشتِ ادبار، پتھروں سے سر مار مار رہرو اقلیم عدم ہو گئے

اب چار پانچ روز سے، ہمارے طالع بیدار، جاگتے جاگتے، دفعتہً سو گئے۔ ایک ساحرِ مکار، جفاکار، بزور سحر اسے محل سے اٹھا لے گیا۔— ہنوز یہ جملۂ غم ناتمام تھا کہ جانِ عالم

کا کام تمام ہوا، آہ سرد کھینچ کر بحال خستہ و پریشان، مثالِ قالب بیجان، زمین پر گر کے بحسرت و یاس پکارا۔ شعر

جی کی جی ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی ‏ ‏ حیف ہے اس سے ملاقات نہ ہونے پائی

اے گردونِ جفا پرداز، وائے فلکِ عربدہ جو یہ کیا تیری خو ہے، اتنی دور لاکر ناکام رکھا، مولف ؎

عشرت کدے جہاں میں ہوئے سیکڑوں وہ لے ‏ ‏ اک دل ہمارا تھا کہ وہ ماتم سرا رہا
تاثیر آہ دیکھی نہ گریے میں کچھ اثر ‏ ‏ ناحق میں اس امید پہ کرتا بکا رہا
کیا دیکھتا ہے سینے کو میرے تو اے سرور ‏ ‏ جُز یادِ یار اس میں نہیں دوسرا رہا

شعر حسن ؎

یہ کہہ کر وہ اس طرح غش کر گیا ‏ ‏ کہے تو کہ جیتے ہی جی مرگیا

خواجہ سرا سخت گھبرایا، سمجھا یہ شخص بھی گرفتارِ محبت، اسیرِ دامِ الفت، اسی کا ہے، مجھ سے بڑی غلطی ہوئی، دفعتہً خبر بدسنانی نہ تھی، آفت اس کی جان پر جان کر لانی نہ تھی، ہر چند گلاب کیوڑہ چھڑکا، ہوش نہ آیا، بدحواس بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوا، روکر عرض کی، آج ماتمِ انجمن آرا تازہ ہوا" بادشاہ نے فرمایا "کیا ماجرا ہے؟"

اس نے عرض کی کہ "کسی ملک کا شاہزادہ، اس کی محبت میں سلطنت سے ہاتھ اٹھا، فقیرانہ سج دھج بنا، یہاں تک پہنچا ہے، مجھ سے جادوگر کے اٹھانے جانے کی خبر سن کر آہ کھینچ، زمین پر گرا ہے، اب تک ہوش نہیں آیا تھا، عجب صدمہ دل پر دھر گیا ہے، خدا جانے جیتا ہے یا مرگیا ہے، کیا عرض کروں۔ غلام کی نظر سے اس سج دھج کا جوان، پری پیکر آج تک از قسم بشر نہیں گزرا، اگر ان دونوں کی صورت آئینۂ چشم میں بہم نظر آتی، قران السعدین کی کیفیت کھل جاتی، جو حضور ملاحظہ فرمائیں گے، شہزادی کو بھول جائیں گے۔"

جبکہ بادشاہ غمِ مفارقتِ انجمن آرا سے بیقرار تھا، ارکانِ سلطنت سے کہا جلد جاؤ جس طرح ہو، اسے لاؤ۔"

لوگ دوڑے مُردے کی صورت اٹھالے گئے، اس عرصہ میں شام ہوئی،

بادشاہ نے ہاتھ منہ دھلوا، بیدمشک چھڑکا، کیوڑہ منہ میں چوایا، لخلخہ سنگھایا۔ جان عالم کو ہوش آیا، گھبرا کر اٹھ بیٹھا، دیکھا ایک شخص، تاج خسروانہ بر سر، چارقب ملوکانہ در بر، سن رسیدہ، لیل و نہار دیدہ، بڑے کرّوفر سے تخت پر جلوہ گر ہے اور چار ہزار غلام زریں کمر با شمشیر و خنجر اوچی بنا دست بستہ روبرو کھڑا ہے، گرد امیر وزیر، سپہ سالار، پہلوان، گردن کش ہر ایک اپنے اپنے قرینے سے زیب دہ کرسی و دنگل ہے، تہمتنوں کا جنگل ہے۔

جانعالم اٹھا، بطورِ شاہ و شہریار و شہزادہ ہائے عالی تبار رسمِ سلام بجا لایا۔ بادشاہ نے گلے لگا پاس بٹھایا۔ جب سے بادشاہ کی نظر پڑی تھی، محوِ حسنِ دلفریب، مفتونِ چہرۂ مہروش و صورت پُرزیب ہوگیا تھا اور حضارِ مجلس بھی سب ذنگ تھے، سکتے کے ڈھنگ تھے، سب کو صدمہ تازہ یہ ہوا کہ ایسا وارثِ تاج و تخت ہاتھ آئے اور محروم رہ جائے، اس وقت کا رنج و قلق، شہزادے کا کوئی فراق کشیدہ سمجھے، بقول مرزا حسین بیگ صاحب شعر؎

حسرت پہ اس مسافر بیکس کی رویئے　　جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے

مگر باعثِ شرم و حیا کہ لازمۂ شرفا و نجبا ہے، خاموش، سینے میں غم کا جوش و خروش۔ بادشاہ نے استفسارِ وطن اور نام جد و آبا کیا۔ یہاں فرطِ الم کثرتِ غم سے گلا گھٹ رہا تھا، مگر ضبط کو کام کر کے حسب و نسب اور ملک کا پتہ بتایا۔ پھر سر جھکا، شہزادی کا حال پوچھا، بادشاہ نے فرمایا "اے گرامی اخترِ سپہرِ شہریاری! مدت سے ایک جادوگر اس فکر میں تھا، یہاں بمرتبہ نگہبانی ہوتی تھی، لیکن وہ کافر دھوکا دے کر لے گیا، آج تک محل میں نہیں گیا ہوں، وہ محل جو عشرت کدۂ خاص تھا، ماتم سرائے عام ہے، ہر سو، شور رقت ہر سمت نالۂ پُرآفت بلند ہے، کھانا پانی حرام، چھوٹا بڑا مبتلائے آلام ہے۔"

جان عالم نے کہا "کچھ یہ بھی ثابت ہوا کہ کدھر لے گیا۔"

بادشاہ نے فرمایا "پانچ کوس تک پتہ ملتا ہے، آگے قلعہ ہے، سر بفلک کشیدہ، آگ سب بھری ہے، شعلہ سرگرم تا چرخ چنبری ہے اور انگاروں کا انبار، تا کرۂ نار ہے، وہاں کا حال نہیں کھلتا، عقل بیکار رہے، مگر قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سحر کا کارخانہ ہے۔"

شہزادے نے کہا "خیر اگر حیات مستعار باقی ہے بہ مدد ایزد کہاں جانے پاتا ہے۔" یہ کہہ کر اٹھا کہ "قبلہ خدا حافظ۔"

بادشاہ لپٹ گیا کہا "بابا خدا کے واسطے اس خیالِ محال سے درگزر، طائرِ خیال کے اُس دشت میں پر جلتے ہیں، پیکِ صبا کے پاؤں میں چھالے نکلتے ہیں دوسرے مجھے مفارقت تیری کب گوارا ہے، ایک کو دھوکے میں کھویا، تجھے دیدہ و دانستہ جلانے دینے کا کہاں یارا ہے، ایسی آفت میں تجھ سے جوان کو جانے دوں، بڑھاپے میں بدنامی لوں۔ سلطنت حاضر ہے، بسم اللہ حکمرانی کر۔ میں ضعیف ہوں، گوشے میں بیٹھ کر، اللہ اللہ کروں۔"

شہزادے نے عرض کی "یہ تخت و سلطنت حضور کو مبارک رہے، بندۂ آوارۂ خانماں ننگِ خاندان، گھر کی حکومت و ثروت چھوڑ، عزیزوں سے منہ موڑ، خراب و خستہ سرگرداں، در در حیران و پریشان ہو، یہاں تک پہونچا، اب یہ کلمہ ننگ اور ذلّت کا سننے کو جیتا رہوں، ملک بیگانے میں بادشاہت کروں، لوگ کہیں جادوگر تو شہزادی کو لے گیا، یہ شخص بے غیرت تھا، جیتا رہا، سلطنت کرنے لگا، جوانمردی سے بعید ہے، عاشق کو معشوق کی راہ میں جان دینا عید ہے۔ لا اعلم

تا سر ندہم پا نکشم از سر کویش نامردی و مردی قدمے فاصلہ دارد

پگ آگے پت رہے، اور پگ پاچھے پت جائے ع قدم عشق پیشتر بہتر۔ جس مددگار نے ہزار بلا سے بچا کر، یہاں تک زندہ و سالم پہونچایا ہے۔ وہی وہاں سے بھی، مظفر و منصور آپ سے ملائے گا۔ نہیں تو یہ صورتِ نحس لوگوں کو دکھانی کیا ضرور ہے، گو بشر مجبور ہے، لیکن اس زیست سے آدمی مرنا گوارا کرے بے موت مرے، پہلے جب عقل و عشق سے معرکہ اٹکا تھا، میرا دل کھٹکا تھا، عقل کہتی تھی 'ماں باپ کی مفارقت اختیار نہ کرو، سلطنت سی شے نہ چھوڑو، عشق کہتا تھا 'ماں باپ کس کے، بادشاہت کیسی، سر رشتہ الفت غیر توڑو، کوچۂ دلدار کی گدائی، سلطنت ہفت اقلیم ہے، اگر میسر آئے، بے یار خدا کسی کی صورت نہ دکھائے، عقل کہتی تھی 'آبرو کا پاس کرو، ننگ خاندان نہ ہو، غریب الوطنی سے عار کرو، صحرا نوردی نہ اختیار کرو، عشق کہتا تھا 'یار کے ملنے میں عزت ہے،

بادیہ پیمائی میں بہار ہے، تشنہ خونِ آبلہ پا، مدت سے صحرا کا خار ہے، عقل کہتی تھی یہ لباس شاہی، قبائے فرمانروائی چاک نہیں کرتے، دانش مند جادۂ راستی سے خلاف قدم نہیں دھرتے، عشق کہتا تھا، لباس عریانی ہے، عقل دیوانی ہے یہ وہ جامہ ہے، جسے احتیاج شست و شو نہیں، کیسی ہی ہاتھا پائی ہو، چاک نہ ہو، کسی آلائش سے ناپاک نہ ہو، اصلا کار سوزن و رفو نہیں نہ بار برداری اس کو چاہیے، نہ چور کا ڈر، نہ راہزن سے خطر ہے، پانی سے بھیگے، نہ آگ سے جلے، سڑے نہ گلے، گلے سے کبھی جدا نہ ہو، نہ کوئی اس کو لے سکے، نہ خود کسی کو دے سکے، نہ دشتِ وحشت میں اس کا تار آئے، نہ اس کے دامن تک سرِ خار آئے، نہ اس کا جسمِ لاغر پر بوجھ نہ بار ہے، مسافر صحرائے محبت کو یہی درکار ہے۔ آتش ؎

تن کی عریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس
یہ وہ جامہ ہے کہ جس کا نہیں سیدھا الٹا

آخر کار بصد تکرار عقل کو شکست فاش ہوئی، کوچۂ دلبر کی تلاش ہوئی، نام سے نفرت، ننگ سے ننگ ہو، نشان مٹایا سلسلۂ دیوانگی ہاتھ آیا، طبیعت عشق کی محکوم ہوئی، وحشت کی دھوم ہوئی، دامانِ غیرت گریبانِ حیا چاک ہوا، ننگ و ناموس کا قصہ بکھیڑا، پاک ہوا، ایک پرندہ کہ توتا تھا، رہبر و مددگار ہوا، دوسرا دوندہ وہ وزیر زادہ تھا، تنہائی میں غمگسار ہوا، پھر تو سلطنت اور وطن چھوڑ، عزیز یگانوں سے رشتۂ محبت توڑ، رہ نورد بادیہ حرمان و گام فرسائے دشتِ ادبار ہوا، لیکن ان کا ساتھ بھی نہ سزاوار رہا، پہلی بسم اللہ یہ غلط ہوئی کہ توتا اڑ گیا، وزیر زادہ ہرن کے ملنے سے چھٹ گیا، وہ جو اساسِ ظاہر کی، دل لگی کا ٹھاٹ گیا، تنہائی ہمراہ ہوئی۔ ممدِ دم گرم سرد آہ ہوئی، کچھ دنوں کے بعد طلسم میں پھنسایا، ہمیں لاکر دشمنوں کو ہنسایا، تھوڑی سی آفت اٹھا کے رہائی پائی، سمتِ مطلوب کی راہ ہاتھ آئی، مگر نہ سنگِ نشان دیکھا، نہ میل نظر آیا، نہ گردِ کارواں دیکھی، نہ صدائے زنگ و جرس سنی نہ راہبر ملا۔ نہ کفیل نظر آیا، سواری چھٹی پیادہ پائی ملی، فکرِ غیر سے رہائی ملی، جب اس منزل میں حضرت عشق نے آزمایا، باوجود آبلہ پائی اور خلشِ خار صحرا ثابت قدم پایا، دوسرے مرحلے میں امتحان مدنظر ہوا، پریوں کے اکھاڑے میں گذر ہوا، ایک مہ سیما کو اس جانب میلان ہوا، پھر وہی عیش و

نشاط کا سامان ہوا، بہت سے نیرنگ دکھائے، ہر شب عجب دن آگے آئے، بلٰلہ الحمد کہ شیشۂ عصمت سنگ ہوا و ہوس سے سالم رہا، وحشت دل کا بدستور عالم رہا، رخصت میں مصلحت جانی، جوان و پیر کی بات نہ مانی، اب گھر پہونچ کر دھوکا کھانا، جان بوجھ کر بھول جانا، کس ملّت میں روا ہے، یہ نرا وسوسہ ہے، مجھ سے وحشی بیخود سے، ایسی ہوشیاری دور ہے، جیتے جی گم منظور ہے۔"

اس گفتگو کی خبر محل میں پہونچی، کہ آج اس طرح کا مہ جبین حسین انجمن آرا کا عاشق وارد ہوا تھا، وہ بھی حرارتِ محبت سے اُسی آگ میں جلنے جاتا ہے۔ انجمن آرا کی ماں درِ دولت سرا پر چلی آئی، خواجہ سرا دوڑے بادشاہ سے عرض کی، "جلد شہزادے کو لے کر محل میں رونق فرما ہوجیے۔"

بادشاہ جان عالم کو ہمراہ لے، آرام گاہ میں تشریف لایا۔ وہ بھی ہزار جان سے نثار ہو، دیر تک پروانہ دار، اس شمع انجمن سلطنت کے گرد پھری، رنڈیوں نے گھیر لیا، سب کو قلق ہوا۔

غرضکہ بہ ہزار سعی بادشاہ نے بمنت صبح کی رخصت پر، اس شب روکا، پہر بجے خاصہ طلب ہوا۔ شہزادے نے انکار کیا، وہی نواب ناظر حاضر تھا، پانوں پر گرا، سمجھایا "پیر و مرشد کئی دن سے محل میں کھانا پانی سب کو حرام ہے، جو آپ کچھ بھی نوش فرمائیں گے تو یہ سب کھائیں گے۔"

ناچار با خاطرِ فگار، دو چار نوالے، پانی کے گھونٹ سے حلق میں اتارے پھر ہاتھ منہ دھو، نیند کا بہانہ کر، پلنگ پر جا لیٹا، مگر نیند کس کی اور سونا کیسا۔ مؤلف ؎

وا درِ دیدہ سدا رہتا ہے تیری یاد میں　　آنکھ جب سے لگ گئی روتے ہیں سو جانے کو ہم

پھر لیٹے لیٹے انجمن آرا کا تصور کر، دم گرم آہ سرد سینے سے بھر کر یہ پڑھنے لگا۔ ابیات ؎

تجھ بن ہے خراب زندگانی　　ہے مجھ کو عذاب زندگانی
اتنا تو نہ چھپ کہ دے کفن کا　　گھبرا کے نقاب زندگانی

جب کروٹیں بدلتے بدلتے پسلیاں دکھ جاتیں اور بیقراریاں ستاتیں تو دلِ بیتاب کو مستعدِ ضبط، آمادۂ جبر و صبر کر یہ کہتا۔ مؤلف ؎

کمال ضبط کو عاشق کرے اگر پیدا　　کہاں کی آہ کرے بات بھی اثر پیدا

ہزار رنگ زمانے نے بدلے پر افسوس — کہیں ہوئی نہ شب ہجر کی سحر پیدا
کرے گی ہمسری نالے کی میرے تو بلبل — شعور اتنا تو کر جا کے جانور پیدا
ہمیشہ ہاتھوں سے ان کے رہا ہوں میں جلتا — یہ زور گرم ہوئے تھے دل و جگر پیدا
یہ دل میں ذوق اسیری ہے جو قفس میں مدام — میں نوچتا ہوں جو ہوتے ہیں بال و پر پیدا

آخرش بعد نالہ و آہ، کراہ کراہ، صبح کی بعد فراغ نماز پر سوز و گداز مرنے پر کمر باندھی، شب کو یہ خبر عام ہوئی تھی کہ کل جادوگر کی لڑائی کو شہزادہ آمادہ ہو جائے گا، پہر رات رہے سے مجمع عام در دیوانِ خاص پر تھا، یکایک بادشاہ تخت پر سوار، برابر شہزادہ والا تبار برآمد ہوا، چشم مشتاقان میں نور طور نزدیک و دور، تجلی کر گیا، ہر شخص رو بہ قبلہ ہو، دعائے فتح و ظفر اس ماہ پیکر کی مانگنے لگا۔ القصہ جہاں تک لوگ آتے جاتے تھے، بادشاہ ساتھ آیا، آگے بڑھنے کی تاب نہ لایا۔ جان عالم نے قسمیں دے کر رخصت کیا۔ ناچار بادلِ داغدار و خاطر فگار قلعہ میں داخل ہوا۔ مگر وہاں سے ڈیوڑھی تک صدہا ہرکارہ، صبادم متعین کیا، کہ ہر دم کی خبر حضور میں پہنچے، جان عالم پھر اکیلا با حسرت و یاس رہا، غمِ دلبر رفیقِ قدیم پاس رہا، یہ شعر پڑھتا آگے چلا مصحفی ؎

اے غمِ یار میں بندہ ہوں رفاقت کا تری — نہ کیا تو نے گوارا مری تنہائی کو

آگ کا قلعہ سامنے تھا، آسمان سے زمین تک بجز شعلۂ جوالہ یا انگاروں کا ڈھیر، اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ شہزادہ غور سے دیکھنے لگا۔ ایک ہرن اُس آگ سے نکلا، اُچھل کود کر پھر اس میں غائب ہوا، جب مکرر آمد و رفت کی، جانعالم نے لوح پیر مرد کی دیکھی، اس میں معلوم ہوا کہ اگر یہ اسم پڑھ کر، ہرن کو تیر مارا اور خطا نہ کی، طلسم ٹوٹ جائے گا وگر نشانہ چوکا، خود آماجگاہِ خدنگِ قضا ہوا، کوئی راکھ کے سوا پتہ نہ پائے گا۔"

شہزادے نے کہا "جو ہرن مارا تو لطفِ زندگی ہے، نہیں حیلۂ مرگ خوب ہے، بے یار جینا معیوب ہے۔" یہ سوچ لبِ سوفار چلّے سے جوڑ، شست و مشت برابر کر، اسم شروع کیا۔ ادھر ہرن نکلا، ادھر تیر کمان سے سرگوشی کر کے چلا بسکہ یہ قدر انداز تھا، اس کی قضا دامن گیر، تیر دو سار ہوا۔ فردوسی ع

فلک گفت احسن ملک گفت زہ

ہرن زمین پر گرا، آسمان سے دار وگیر کا غل اٹھا، ہاں ہاں لیجیو، گھیر لو، جانے نہ پائے، قریب تھا خوف سے جی نکل جائے، زمانہ تیرہ وتار، صحرا پُرغبار ہوا گھڑی بھر میں وہ تاریکی دور ہوئی، آفتاب نمودار ہوا، نہ آگ رہی، نہ قلعہ برابر سطح میدان انسان نہ حیوان، مگر چبوترے پر لاش جھلسی ہوئی پاش پاش دیکھی یعنی وہ جادوگر، کریہہ منظر، سیندور کا ٹیکہ، ماتھے پر زرد زرد دانت، ہونٹوں کے باہر، منہ مہری سے گندہ شیطان کا بندہ، بالوں کی لٹیں لٹکی، ہڈیاں، کھوپڑیاں، گلے میں پڑیں، کالا بھجنگا، بدن سے ننگا، تیر سے چھد کر جہنم واصل، وہ حواصل ہوگیا ہے۔ شکر کا سجدہ بجالایا، قدم ہمت آگے بڑھایا، ہرکارے یہ ماجرا دیکھ، فوراً حضور میں حاضر ہوئے، بعد دعا وثنا عرض کی کہ "اے شہریار ذوی الاقتدار! فتح مبارک، شہزادہ بلا کا پتلا ہے، ایک تیر میں وہ آگ کا قلعہ ٹھنڈا کر، سرگرم راہ ہوا۔"

بادشاہ مژدۂ فرحت افزا سُن کر خوش ہوا، فرمایا "یقین کامل ہے کہ جانِ عالم حسب دلخواہ مراجعت کرے گا، فتح و فیروزی شامل ہے، ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات، خبرداروں کو خلعت و انعام، موافق قدر و منزلت، مرحمت کر، پھر روانہ کیا۔"

اس عرصے میں شہزادہ وہ وادی پُرخطر، میدان سراسر ضرر کو طے کر متصل قلعہ ساحر، جہاں انجمن آرا قید تھی، پہونچا۔ وہ عجیب معلّق قلعہ تھا۔ زمین سے چار پانچ گز بلند، ایک تختہ کمہار کے چاک کی طرح بایں سرعت، گردش میں تھا کہ نگاہ کام نہ کرتی تھی، آنکھ کی پتلی اتنا جلد نہ پھرتی تھی، بلند ایسا کہ دیکھنے میں پگڑی گرتی تھی۔ جان عالم وہاں ٹھہرا، وہ قلعہ بھی حرکت سے ساکت ہوا۔ اس وقت مفصل نقشہ معلوم ہوا کہ قلعہ ہے، جواہر نگار، بازیب و زینت بسیار، دروازے چار ہیں، برج گنے نہیں جاتے، ہزار در ہزار ہیں، کمندِ فکر اس کی بلندی کے روبرو کوتاہ ہے، ہر طرف سے مسدود راہ ہے۔ جہاں جان عالم کھڑا تھا، زمرد کا بنگلہ نظر آیا، اس میں سے آواز آئی کہ "اے اجل رسیدہ، کیوں ملک الموت کو چھیڑتا ہے، زندگی سے منہ پھیرتا ہے، مجھے تیرے حسن و صورت پر رحم آتا ہے، جلد یہاں سے جا خطائے اول، عوضِ خوبیٔ شکل و شمائل، معاف کی، دگرنہ بایں شدائد و خواری قتل کروں گا کہ آسمان تیرے

حالِ پریشان پرخون روئے گا، ساکنانِ زمین کو گوشت پوست ہڈیوں کا پتہ نہ ملے گا، بادشاہ تیرے غم میں جاں کھوئے گا، اس دشت کی خاک تیرے لہو سے رنگین ہوئے گی، روح بھی تا حشر خواب مرگ میں آرام سے نہ سوئے گی۔"

شہزادے نے ہنس کر کہا کہ "اے مادر بخطا، تو کیا ہماری خطا معاف کرے گا کہاں تک لاف و گزاف کا دم بھرے گا، انشاء اللہ تعالیٰ اور تو کیا کہوں، تجھے بھی اس کے پائینتی بھیجتا ہوں۔"

یہ سن کر وہ جھلّایا بنگلے سے سر نکال، تھوڑے ماش اس بدمعاش نے اور کالا دانا نکالا، اس وقت چرخ چکر میں آیا اور زمین تھرّائی، جب سرسوں میں بنولے اور رائی ملائی پھر تیتا بیتا اور لونا چاری کو پکارا۔ ان دانوں کو اس احمق نے آسمان کی طرف پھینک مارا، دفعتاً ابرِ تیرہ و تار گھر آیا، شہزادے پر پتھر اور آگ کا مینھ برسایا یہ بھی اسمائے ردِّ سحر پڑھتا تھا، آگے بڑھتا تھا، جب آگ قریب آتی، پانی ہو کر بہہ جاتی، اور پتھر بھی ہر ایک خاک تھا، ایسا وہ اسمِ پاک تھا۔ جادوگر خفیف ہو کر سحر تازہ کی فکر میں تھا، جان عالم نے لوح کو دیکھا، اس میں نکلا "کسی طرح لوح کو قلعہ کی دیوار سے لگا دے، پھر قدرت خالق کا تماشا دیکھ لے۔" شہزادے نے بجرأت تمام اچک کر لوح دیوار سے لگائی۔ اُس پر آفت آئی، مرتبہ اوّل سے زیادہ چکرّ میں آیا۔ پھرتے پھرتے اس طرح کی صدائے ہیبت ناک آئی کہ ہزار توپیں ایک بار چھٹیں، تو ایسی نہو۔ بدرجۂ مہیب تھی، کہ گاؤ زمین کا کلیجہ ہل گیا، خورشید برج اسد میں چھپ کر دہل گیا، زمانہ کا رنگ دگرگوں ہوا، جنگل گرد برد ہو گیا، وہ ناری سرد ہو گیا، لرزاں کوہ و ہاموں ہوا، میدان سیاہ، بلند صدائے نالہ و آہ ہوئی۔ چار گھڑی میں وہ تاریکی دور ہوئی، شہزادے کی طبیعت مسرور ہوئی نہ قلعہ نظر آیا نہ مکانات کا نشان پایا۔ لیکن ریت کا ٹیلہ، سرکنڈے گڑے، اور کچّا سوت نیلا پیلا، ان پر لپٹا، کچھ پھندے پڑے، اس میں وہ ماہِ شب چاردہ، حور کی صورت، نور کا عالم، پریشان بدحواس، سراسیمہ متحیر کوئی آس نہ پاس ہر سمت حیران ہو ہو دیکھ رہی تھی، جان عالم نے پہچانا۔ تاب نہ رہی، جی سینے میں رعب محبت سے سنسنایا، اکیلا دیکھ کے کلیجہ منہ کو آیا، ہر چند ضبط کیا، نہ ہو سکا تھرّاتا، دم چڑھا جاتا، دوڑ کر گرد پھرنے لگا، لڑکھڑاہٹ سے گرنے لگا۔

انجمن آرا نے شرما کر سر جھکا کر کہا "سنبھلو صاحب، کچھ پاس لحاظ بھی کسی کا نہیں، یوں بیباکانہ پاس چلے آنا، حرکت مجنونانہ ہے، لوگ کہیں گے دیوانہ ہے۔"

مگر اس گفتگو میں آنکھ بھی چار ہوگئی۔ سنانِ الفت ادھر تو گڑی تھی، ادھر بھی دو سار ہوگئی۔ شہزادہ خنجرِ عشق کا زخمی قدیم تھا، وہ تازہ شمشیرِ محبت کی گھائل ہوئی، طبیعت اُدھر مائل ہوئی، بدن تھرایا۔ جانعالم نے یہ سنایا۔ میر سوز

جس کو نہ ہو شکیب نہ تابِ فغاں رہے
تیری گلی میں وہ نہ رہے تو کہاں رہے

آہستہ رو تو منزلِ مقصود کو گئے
رفتار گرم تھے سو ہمیں درمیاں رہے

بندہ نواز حال پہ میرے کرو نگاہ
ہے جائے گریہ یہ کہ پسِ کارواں رہے

یہ کہہ کر گر پڑا، غش آگیا، عشق کی نیرنگیاں نہاں نہیں، حاجت اظہار و بیاں نہیں، کشش اس کی چھوٹے بڑے پر آشکارا ہے، ہزاروں کو اس نے فریب سے مارا ہے۔

انجمن آرا کو دلِ مضطرب نے تڑپ کر سمجھایا، بے قراری میں اس پر قرار آیا کہ یہ مقرر عاشقِ صادق ہمارا ہے۔ جو ایسی بلا سے نہ ڈرا، سر کو بیچ کر اس وادی میں پاؤں دھرا۔ وگرنہ اتنے دن گزرے، بیکسی کے سوا کوئی ہمدم شریک زندانِ غم نہ تھا، دل قبضۂ اختیار سے جاتا رہا، حجاب ہر چند مانع آتا رہا، مگر جانعالم کا سر، سر کا زانو پر رکھا، چہرے کی گرد جھاڑی، غشی تو کبھی آنکھ سے دیکھی نہ تھی، گھبرا کر رونے لگی، اس طرح روئے یار دھونے لگی، اور یہاں جو بوند آنسو کی، منہ پر پڑی اور دماغ میں خوشبوئے کنارِ دلدار چڑھی، لخلخے کا کام کر گئی، گلاب کیوڑہ چھڑکنے کی حاجت نہ رہی آنکھ کھول دی، سبحان اللہ سر خاک افتادہ، کنارِ یار زانوئے دلدار پر پایا، ناز و نیاز نے دماغ عرشِ اعلیٰ پر پہونچایا، اور پاؤں پھیلایا، یہ اترایا، انجمن آرا نے جھجک کر گھٹنا سرکایا۔ جانعالم نے چشمِ نیم وا سے شہزادی کا منہ دیکھا اور کہا "ہماری بے ہوشی ہشیاری سے اچھی تھی۔ مولف

میں جو چوکا تو وہ بھی چونک پڑا
ہوئی غفلت جو ہوشیار ہوا"

یہ کہہ کے آنکھیں بند کرلیں کہ "پھر ہمیں غش آیا، کیوں تم نے زانو سرکایا۔"

انجمن آرا نے کہا "کیا خوب، اتنا اختلاط میری چڑھ ہے۔ میں نے تیری محنت و مشقت پہ نظر کر کے، یہ انسانیت کی حرکت کی تھی، تم چل نکلے، خدا جانے دل میں

کیا سمجھے، اپنی راہ لیجیے، چلتا دھندا کیجیے، واہ واہ نیکی برباد، گنہ لازم۔

جانعالم نے جواب دیا۔ استاد ؎

خاک ہی اپنی اٹھے تو اس مکاں سے اٹھ سکے ہم جہاں جوں نقش پا بیٹھے نہ واں سے اٹھ سکے

الّا چور کی داڑھی میں تنکا ہیں تمھیں اپنا عاشق کبھی نہ سمجھوں گا، نہ معشوقوں کے دفتر میں آپ کا چہرہ لکھوں گا۔"

انجمن آرا نے کہا "چہ خوش بہلا دل تو بہلالو، کچھ ہو یا نہ ہو، زبان کا مزہ نکالو، یہ تو وہی مثل ہوئی۔ مان نہ مان میں تیرا مہمان، تمھارا بعینہ حال یہ ہے۔ فرد ؎

چہ خوش گفتست سعدی در زلیخا الا یا ایہا الساقی ادر کاساً وناولہا

عشق و عاشقی کی باتیں، میری بلا جانے، رمز و کنایہ کسی اور سے جا کر کرو، اپنا چوچلا تہہ کر رکھو، اپنی صورت تو غور سے دیکھو، تم نے سنا نہیں شاید۔ مثل۔ حلوہ خوردن را روئے باید۔"

جانعالم نے کہا "میں بیچارہ خستہ تن، غربت زدہ، دور از وطن، مہنت پن کہاں سے لاؤں، کیوں کر ویسی صورت بناؤں، ایک ہنستا ہے، ایک روتا ہے، کفر و اسلام میں بڑا فرق ہوتا ہے، تمھیں ابھی تک موہن بھوگ کا ذائقہ نہیں بھولا ہے۔ دم تقریر زبان پر حلوا ہے، ہم نے آپ کے واسطے جوگ لیا، سلطنت کو تج دیا، اب مراد پوری ہوئی، دور دوری ہوئی۔"

انجمن آرا پتے کی سن کر، کھسیانی ہوگئی، کہا "چلو صاحب وہ موا قربان کیا تھا، اپنی پہ چوبچ بند کرو، کٹی جلی کی ہنسی، اپنے گھر جا کر کرو، سحر و جادو زور و ظلم، مکر و فریب سے انسان ناچار ہے، اس میں کسی کا کیا اختیار ہے، مگر خیر اور جو چاہیے کہہ لیجیے، در پردہ کیا، صاف صاف گالیاں دیجیے، یہ باتیں قسمت کی گردش سنواتی ہے، دیکھوں ابھی تقدیر آگے کیا کیا دکھاتی ہے، اگر خدا ہمارا گھر بار چھڑا، موذی کے بس میں نہ پھنساتا، تو ہر ایک راہ چلتا ہمیں کاہے کو ایسی باتیں سناتا۔"

جان عالم یہ سن کر ڈر گیا، رنگ زرد ہو گیا، خجالت سے مر گیا، سہم کر آبدیدہ ہو کہنے لگا "میری کیا مجال، جو آپ کو کچھ کہوں، میں تو خانماں آوارہ مسافر ہوں، انصاف تو کرو تم کتنی ہٹ دھرم، احسان فراموش ہو، ہنسی میں رو دیا، ہمیں دونوں جہان سے کھو دیا۔"

انجمن آرا نے دیکھا، اس کے آنسو جاری، ہچکی طاری ہے، مسکرا کر کہا، ایک بات مطلب کی کہی مگر ؎

سچ ہے اوچھے کا بھی احسان برا ہوتا ہے

خاطر جمع رکھ، اپنے گھر چل کر، تجھے مال و زر سے لادوں گی کہ تو چل نہ سکے گا، بوجھ سے ہل نہ سکے گا۔

شہزادے نے کہا "آخر سلطنت کا گھمنڈ آیا، ہمیں محتاج جان کے یہ فقرہ سنایا، ہم بھی کبھی حاجت روائے عالم مشہور تھے، مگر الفت سے مجبور تھے، اگر تم پر عاشق نہ ہوتے کیوں سلطنت کھوتے، سر پہ ہاتھ رکھ کر روتے۔"

یہاں تو یہ نوک جھوک، چھیڑ چھاڑ ہو رہی تھی، وہاں خبر فتح و ظفر، ہرکاروں نے بادشاہ کو پہونچائی، وہ تو ہمہ تن گوش تھا، اس وقت مع ارکانِ دولت روانہ ہوا ایک سکھپال ہمراہ لیا، صبا وار سنّاٹے میں آ پہنچا، جو جو نزدیک تھے، دور کھڑے رہے، کہاریاں بادشاہ کا تخت قریب لائیں۔ انجمن آرا منہ چھپا کر بیٹھ گئی، جانِعالم پاس سے سرکا، بادشاہ تخت سے اُترا، جانِعالم کو گلے لگایا۔ جرأت کی تعریف کی، ہمت پر تحسین و آفریں کہی۔ پھر بیٹی کو چھاتی سے لگا۔ سکھپال میں سوار کیا، شہزادے کو برابر تخت پر بیٹھا لیا، ترقی خواہانِ دولت، ملازمانِ قدیم نزدیک آئے، زرِ سُرخ و سفید، تخت اور سکھپال پر نثار کیا، اس قدر اشرفی روپیہ تصدق ہوا کہ آج تک جو محتاج مسافر ادھر جاتے ہیں، چاندی سونا پاتے ہیں، نصیب جاگ جاتے ہیں۔

پھرتے پھرتے بادشاہ کے جلوس، سواری، نوبت و نشان، فوج سب سامان آ پہنچا۔ اہلِ شہر یہ خبر سُن کر، ہزاروں دوڑے، شادیانے بجاتے، مبارک سلامت کا غل مچاتے، شہر میں داخل ہوئے۔ ملک کی رونق گئی ہوئی پھر آئی، خلقت نے جانِ تازہ پائی، محل میں انجمن آرا رونق افروز ہوئی، سب کو شادیِ نوروز ہوئی۔ محل والیوں نے کہرام مچایا۔

بادشاہ نے فرمایا "یہ خوشی کا وقت ہے، نہ ہنگامِ غم۔ اسی طرح سب بچھڑے خدا کی عنایت سے باہم ہوں۔"

انجمن آرا کی ماں گرد پھرتی تھی، دمبدم سجدہ کرنے کو زمین پر گرتی تھی، کہتی تھی "ہمارے دن اللہ نے پھیرے، مگر بدولت جانِعالم۔"

انجمن آرا جب یہ نام سنتی، خوش کیا کھل جاتی، الّا لوگوں کے سنانے کو تجاہل عارفانہ کرکے یہ سناتی "صاجو! کیا بار بار کہتے ہو، جو میرا مقدر سیدھا نہ ہوتا تو وہ کون تھا، جو دن پھیرتا۔"

ہم صحبتیں مزاجداں، اس رُکھائی سے تاڑ گئیں کہ آپ کی بھی آنکھ پڑی، طبیعت لڑی، جب اس کی ماں سرکی، وہ سب پاس آ آکے کہنے لگیں۔ "ہے! ہے!! ہم تو تیری مفارقت میں مرتے تھے، زندگی کے دن گھڑیاں گِن گِن بھرتے تھے، یہ صورت اللہ نے دکھائی یا جانِ عالم کی جوتیوں کے صدقے سے نظر آئی، جس طرح ہمارے مطلب دلی ملے، خالق اس کی بھی جی کی مراد دے۔"

انجمن آرا غصے کی شکل بنا، تیوری بھوں چڑھا، کہنے لگی۔ "تم سبھوں کی شامت آئی ہے، کیا بیہودہ بک بک مچائی ہے، چوچلے کی خوبی، بزرگی، خوردی سب ڈوبی، واہ وا تم نے میری چڑھ نکالی، اپنی دانست میں دیوانی بنالی، خدا جانے یہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے، سبھوں نے میرا مغز کھایا ہے، اسے تو کیا کوسوں، وہ تو مسافر بیچارہ ہے، جی میں آتا ہے، اس کا منہ نوچوں، جس جس نے یہ نخرا بگھارا ہے اور کبھی مجھے چھیڑوگی تو رو دوں گی، اپنا سر پیٹ لوں گی۔" یہ کہہ کر مسکرانے لگی، ہونٹ چبانے لگی۔ آپس میں رمز و کنایے رہے تمام ملازمان بادشاہ، مع رؤسائے ترقی خواہ نذریں لے کر حاضر ہوئے، شہر میں منادی ہوئی کہ جتنے ساکنانِ قلمروِ بادشاہ ہیں، فقیر سے ہفت ہزاری، بڑے آدمی سے بازاری تک آج کاروبار موقوف کرکے ناچ دیکھیں، خوشی کریں، اور جسے مقدور نہ ہو، سرکار سے لو۔

تمام شہر میں، عیش و نشاط، راگ رنگ کی مجلس بافرحت و انبساط ہوئی، بادشاہ نے جشن جمشیدی کیا، تمام شب بادۂ گلگوں کا دور رہا، ناچ گانا صحبت بے تکلفانہ، یہ طور رہا، دمِ صبح بادشاہِ کیواں جاہ دیوان عام میں رونق افزا ہوا۔ اس قدر زر و جواہر، محتاج فقیروں کو عنایت و امداد ہوا کہ کاسۂ گدائی ان کا جام و صراحی سے مبدّل ہوگیا۔ محل میں بر محل رت جگے، صحنک جا بجا، کونڈے، حاضری، دونے پڑیاں، منتوں کی، جس جس نے مانی تھیں کرنے بھرنے دینے لگیں اور ڈومنیاں تڑاق پڑاق، پریوش، خوش گلو، بانداز مع

سامان و ساز حاضر ہوئیں۔ ’مبارک سلامت‘، کہہ کر، شادی مبارک گانے، چہچہے، مچلاتے، نئی مبارک باد سنانے لگیں۔ مؤلف ؎

شادی و جشن سزاوار مبارک ہووے
آج شہزادی کا دیدار مبارک ہووے
صد و سی سال سلامت رہے با امن و اماں
حسن کی گرمیٔ بازار مبارک ہووے
وہ بھی دن آئے جو سہرا بندھے سر پر اس کے
سب خوشی سے کہیں ہر بار مبارک ہووے
بعد شادی کے خدا دے کوئی فرزند رشید
ہم کہیں آ کے یہ دلدار مبارک ہووے
خار کھاتے رہیں کمبخت جو دشمن ہوں سرور
دوستوں کو گل و گلزار مبارک ہووے

ترانہ سنجی عندلیب خامہ در محفل سور و سرور شادی

وعروسی و دامادی اس مصائب کشیدۂ فراق اور ہمہ تن اشتیاق یعنی شہزادۂ جانعالم کی پہلے اجازت طلب ہونا اس کا رونا پھر سامان برات کا

کدھر ہے تو اے ساقی گلعذار
مرا غم سے دل ہوگیا خار خار
پلادے کوئی ساغرِ لالہ رنگ
جوانی کی لائے جو دل میں ترنگ
سہے کتنے صحرا نوردی کے رنج
بھلا کچھ تو شادی کا ہوں نغمہ سنج

سرود سرایانِ بزم شادی و نغمہ پردازانِ محفلِ عروسی و دامادی انجمنِ بیان میں یوں زمزمہ سنج ہوئے ہیں کہ جلسۂ عیش و طرب سے فرصت سب کو ہوئی۔ ایک روز بادشاہِ جمجاہ محلسرائے خاص میں جلوہ بخش تھا، بی بی سے خلوت میں فرمایا کہ "حقوق اور احسان جیسے جانعالم کے ہمارے ذمۂ ہمت ہیں، تمام عالم جانتا ہے اور یہ بھی نزدیک و دور مشہور ہے کہ عشق انجمن آرا میں نادیدہ مبتلا ہو، سلطنت کھو یہاں آیا ہے، اور کس مردانگی سے جادوگر کو مار کر اس کے پھندے سے چھڑایا ہے۔ اس کی قطع نظر صورت، سیرت، خُلق، مروت، ہمت و جرأت، یہ جتنی صفتیں ہیں سب خالق نے عطا کی ہیں، حسب عالی نسب والا، حسن میں مہر و ماہ سے نرالا، مناسب کیا ضرورت ہے کہ جلد سامان شادی درست کر، منعقد کرو۔ خدا جانے آج کیا ہے کل کیسا ہو،

کارِ امروز بفردا مگذار۔"

اس نے عرض کی کہ "جو رائے اقدس میں گذرا، یہی میرا عین مطلب تھا۔"

بادشاہ نے فرمایا "آج انجمن آرا سے یہ مقدمہ اظہار کرکے جواب باصواب حاصل کرلو۔ کل سے سرگرمِ سامانِ شادی ہو۔" یہ کہہ کے بادشاہ دیوان عام میں رونق افزا ہو، انجمن آرا کو ماں نے طلب کیا، اور دو چار مغلانیاں، آتونِ سن رسیدہ، محلداریں، جہاں دیدہ قدیم جو تھیں، انھیں بلوایا، شہزادی کی جلیسیں بھی، یہ خبر سن کر بے بلائے آئیں، اس نے، پہلے بیٹی کو گلے سے لگایا، پیار کیا، پھر کہا "سنو پیاری دنیا کے کارخانے میں یہ رسم ہے، کہ بادشاہ کے گھر سے فقیر تک، بیٹی کسی کی ماں باپ پاس ہمیشہ نہیں رہتی، اور غیرت دار کے گھر میں لڑکی جوان ہر وقت رنج کا نشان، خفّت کا سامان ہے اور خدا اور رسول کا حکم بھی یہی ہے کہ جوان کو بٹھا نہ رکھو، شادی کردو، ورائے ان باتوں کے ایک شخص نے تمھارے واسطے، گھر بار چھوڑا، سلطنت سے ہاتھ اٹھا، کسی آفت سے منہ نہ موڑا، جی پر کھیل گیا، کیا کیا بلائیں جھیل گیا، سرکھپایا اور جان جوکھوں کی، جب تم نے ہم کو دیکھا، ہم نے تمھاری صورت دیکھی، شکل میں پری شمائل، فرخندہ خو، فرشتہ خصائل، تمام شہر عاشقِ زار ہے، چھوٹا بڑا اس پر فریفتہ اور نثار ہے۔ ہر چند تم پارۂ جگر، نورِ نظر ہو، مگر واری جو انصاف ہاتھ سے نہ دو تو تم میں اس میں بڑا فرق ہے، تمھیں اللہ نے عورت بنایا ہے، وہ مردِ میدانِ نبرد ہے، رنڈی مرد کا بہت تفاوت مشہور ہے آگاہ نادان و ذی شعور ہے۔ الّا جانی! ہمارا کہنا آرسی مصحف میں نظر پڑے گا۔ دیکھئے گا جو دکھائی دے گا۔

انجمن آرا نے یہ سن کر سر جھکا لیا، رونے لگی، کہا "حضرت! صورت شکل کا مذکور یہاں کیا ضرور تھا، یہ اللہ کی قدرت ہے، کسی کو بنایا، کسی کو بگاڑا، بہت سے لولے، لنگڑے، کانے کھدرے، گونگے بہرے ہیں، وہ چاہے نہ جیئیں، کہیں نور ہے، کہیں نار ہے، گل کے پہلو میں خار ہے۔ یہ سب صنعتِ پروردگار ہے، دنیا میں کون سی شے بیکار ہے، بُروں سے اچھوں کی تمیز ہے۔ یوں تو بادشاہِ مصر غلام عزیز ہے، اور جو بارِ احسان سے دب کر فرماتی ہو کہ ایسا کرو تو دنیا عالم اسباب ہے، ایک کا کام دوسرے سے ہوتا آیا ہے، یہ شخص نہ آتا اور میرے مقدر میں رہائی ہوتی، کچھ ایسا

سامان نکل آتا اور کوئی اللہ کا ولی پیدا ہو جاتا، میری بند چھوڑ آتا۔للمولفہ ؎

نیک و بد زمانہ نہیں اختیار میں ہوتا وہی سرور ہے جو سر نوشت ہو

میری قسمت کمبخت بُری ہے، ایک مصیبت سے چھڑا، دوسری آفت میں پھنسایا، ہردم کے طعنے اپنے بیگانے کے سننے پڑے کہ یہ آیا مجھے قید سے چھڑایا، خدا جانے وہ کون ہے، کہاں سے آیا ہے۔ اپنے تئیں شہزادہ بنایا ہے۔ میں آپ کی لونڈی ہوں، ہر صورت فرمانبردار، اگر کنویں میں جھونک دو، چاہ سے گر پڑوں، اف نہ کروں، مگر جو آپ اس کی شکل پر ریجھے، محنت و مشقت کو سمجھ بوجھ، یہ مقدمہ کیا چاہتی ہیں تو میں راضی نہیں، اگر مزدوری کی اُجرت خدمت کا انعام منظور ہے کہ بادشاہوں کے نزدیک، احسان کسی کا اٹھانا بہت دور ہے، تو روپیہ، اشرفی، جاگیر عنایت کرو کہ اس کا بھلا ہو، کام ہو، آپ کا نام ہو۔"

یہ فقرہ سن کے وہ بہت ہنسی کہا" شاباش بچی اس کی جانفشانی کی خوب قدردانی کی، واقعی وہ بیچارہ، تمھارے ملک کا یا روپیہ پیسہ کا محتاج ہے، اری نادان وہ تو خود صاحبِ تخت و تاج ہے۔"

اس بات پر ہمسنوں نے قہقہہ مارا، کہا" حضور! بس ان کا یہ شعور ہے، ان کے نزدیک وہ شہزادہ نہیں مزدور ہے۔"

انجمن آرا نے جھنجھلا کر کہا کہ" روپیہ وہ شے ہے اور ملک وہ چیز ہے کہ اس کے واسطے اسفند یار سا رُوئیں تن مارا گیا، فریدون و افراسیاب کا سر اتارا گیا۔"

وہ جو دائی دوا آتو مغلانیاں پرانی پرانیاں حاضر تھیں، بولیں" قربان جائیں، واری ماں باپ کی عدول حکمی میں، خدا و رسول کی نافرمانی ہوتی ہے، تمھیں انکار مناسب نہیں، اور خدانخواستہ یہ کیا تمھارے دشمن ہیں، جو راہ چلتے کے حوالے کسی کے کہے سنے سے، بے دیکھے بھالے کر دیں گے۔ آدمی روز بروز عقل و شعور سیکھتا ہے، نشیب و فراز، بات کا محل و موقع سوچتا سمجھتا ہے، تم سلامتی سے ابھی تک وہی بچپنے کی باتیں کرتی ہو، کھیلنے کودنے کے سوا قدم نہیں دھرتی ہو۔"

انجمن آرا نے جواب دیا، سر زانو پر رکھ لیا، لیکن وہ جو امیر زادیاں، اس کی ہم نشیں، جلیسیں تھیں، جن سے اس بات کے روز مشورے رہتے تھے، بولیں" ہے ہے! اے لوگو، تمھیں کیا ہوا ہے آتو جی صاحب، بے ادبی معاف آپ نے دھوپ میں چونڈا اسفید کیا ہے، خیر ہے صاحبو، دلھن سے صاف صاف کہلوایا چاہتی ہو، دنیا کی شرم و حیا گوڑی کیا اُڑ گئی، اتنا تو سمجھو، بھلا ماں باپ کا فرمان کسی نے ٹالا ہے، جو یہ نہ مانیں گی، الخاموشی نیم رضا، بوڑھے

بڑے کے روبرو اور کنا گیا۔"

یہ سُن کر اَتو قدیم جس نے انجمن آرا کو پالا، پڑھایا، لکھایا تھا، اُس نے مبارکباد کہہ کے انجمن آرا کی ماں کو نذر دی، محل میں قہقہے مچے، شہزادی رونے لگی، نواب ناظر، بیگم کی نذر لے کر، بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوا، نذر دی، خلعت مرحمت ہوا، یہاں تو ارکانِ سلطنت اسی دن کے روز منتظر رہتے تھے، یہ مژدہ فرحت افزا دریافت کر کے اٹھے، بمراتب نذریں گزریں۔ توپخانوں میں شلک کا حکم پہنچا، نوبت خانوں میں شادیانے بجنے لگے، مبارک سلامت کی صدا زمین و آسمان سے پیدا ہوئی۔ شعر ؎

فلک پر یہ مبارک باد ہے اب کس کے ملنے کی ‌ ‌ ‌ یہ ایسا کون بختاور ہے جس کا بخت جاگا ہے

بادشاہ نے وزیرِ اعظم سے ارشاد کیا "جانِ عالم یہاں مسافرانہ وارد ہے، تم اموراتِ محل میں مستعد ہو۔ ہم اس کا سامان سرانجام کریں۔"

وزیر آداب بجا لایا، خلعت فاخرہ ملا، ہاتھی پالکی سے سرفراز ہوا۔

جانِ عالم کا یہ نقشہ تھا، چہرہ پر بشاشت سے سُرخی، باچھیں تابنا گوش کھلیں، فرحت کے باعث بندِ قبا ٹوٹے جاتے تھے۔ مگر شرم کے باعث آپ سر نہ اُٹھاتے تھے۔ بادشاہ نے رمّال، نجومی، پنڈت، جفرداں، جو جو علم ہیئت اور ہندسے اور نجوم میں طاق، شہرۂ آفاق تھے، طلب کئے اور ساعت سعید کا سوال کیا، کسی نے قرعہ پھینکا، زائچہ کھینچا، شکلیں لکھیں، کسی نے پوتھی کھولی، کوئی حرف مفرد لکھ کر حساب کرنے لگا، کوئی تُلا، برچھک، دھن، مکر، کُنبھ، مین، میکھ، برکھ، متھُن، کرک، سنگھ، کنیاں، گن کر بچار کرنے لگا۔ کوئی مشتری، مریخ، شمس، زہرہ، عطارد، قمر، زحل کا حال مع گردش برج کہہ کے حمل، ثور، جوزا، سرطان، اسد، سنبلہ، قوس، عقرب، جدی، دلو، حوت، میزان کی میزان دے کر شمار کرنے لگا۔ کہا "بعد مدت قمر اور مشتری کا بطرز خلاف حمل میں قِران ہے، اس ہفتہ کا دن رات سعدِ اکبر ہے، اور بالاتفاق ایک روز مقرر کیا، حضور سے بقدر علم و کمال خلعت اور انعام عنایت ہوا، اور بعد جلسۂ شادی بامیدِ دیگر دادِ دادِ وافر امیدوار کیا۔

القصہ بموجبِ احکامِ اختر شناسانِ بلند بینِ فلک سیر، ماضی مستقبل کے حال داں، باریک خیال و منجمانِ صدرنشینِ مسندِ دیرِ حکم روایانِ خوش فال، مانجھے کا جوڑا، دلھن کے گھر سے چلا، مزدور سے تا فیل نشین زن و مرد بالباسِ رنگین، پکھراج کی کشتیوں میں زعفرانی جوڑے، سنہرے خوانوں میں ہنڈیاں، مقوی مفرح ذائقہ ٹپکتا، خوان تک بسا، اور

دودھ کے واسطے اشرفیوں کے گیارہ توڑے، طلائی چوکی، جواہر جڑا، زمردنگار کٹورا، بٹنا ملنے کا کنگنا، بہ از عقد ثریا، دُرِ یکتا بڑا بڑا ٹنگی ملتان کی تھی، بیل بوٹے میں گلستان کی تھی۔ بٹنا اور تیل بے میل جو عطر کشمیر پہ خندہ زن ہو، معطر دماغ انجمن ہو۔ کنٹروں میں عطر سہاگ، مہک پری، ایجادِ نصیر الدین حیدری۔ ارگجۂ محمد شاہی، فتنے کی بو، چارسو۔ زعفران کا ساختہ کھلا، کوسوں تک خوان سے خوان ملا، نوبت نشان گھوڑوں پہ شہنا نواز، نقارچی جوان جوان، سکھپال اور چنڈولوں میں زنانی سواریاں، ان کے بناؤ کی تیاریاں، کہاریاں پری چھم، برقِ درخشاں کا عالم۔ باہم قدم قدم، اس سامان سے وہ سب مانجھا لے کے، درِ دولت نوشاہ پہ جو بس گئے، شہر کے کوچہ د بازار بس گئے، وہاں دولھا، یہاں دلھن نے، مانجھے کے جوڑے پہنے، منادی نے ندا کی ”جو سفید پوش نظر آئیگا، اپنے خون سے سُرخ ہوگا، یعنی گردن مارا جائیگا“ بادشاہ نے خود ملبوسِ خاص رنگیں زیب جسم کیا۔ رنگ کھیلنے لگا، تمام خلقت ہولی کی کیفیت بھولی، شہر میں شہاب اور زعفران کے سرخ و زرد نالے بہے۔ گلیوں میں عبیر و گلال کے ٹیلے ٹیکرے رہے، کوچہ ہر بازار کا زعفران زارِ کشمیر تھا، ایک رنگ میں ڈوبا، امیر و فقیر تھا۔ پھر بتاکیدِ تمام خاص و عام کو حکم ہوا، کہ آج سے چوتھی تک، سوائے اہلِ حرفہ، اپنے امورِ ضروری موقوف کر، گھروں میں ناچ دیکھو، جشن کرو، جو کچھ احتیاج ہو، سرکار سے لو، اور ہر رئیس محلہ اور سردارِ قوم سے فرمایا ”جو تم سے متعلق ہوں، ان کی فرد درست کر حضور میں گزرانو۔ ان کے کھانے پینے کا سامان، خواہ ہندو ہو یا مسلمان، حضور سے ملے گا اور اربابِ نشاط کے دارغہ کو احکام ملا کہ جس کی جیسی لیاقت ہو یا جس کا جو شائق ہو، بشرطیکہ اس کے لائق ہو، برضامندی طرفین ویسا طائفہ وہاں بھیج دو۔“

دوکانداروں کو ارشاد ہوا ”دن رات دوکانیں کھلی رہیں۔ قریب قریب ناچ ہو، ان کے کھانے کا صرف تصرفی باورچی خانے میں ٹھہرا۔ ہندوؤں کو پوری کچوری، مٹھائی، اچار، مسلمانوں کو پلاؤ، قلیہ، زردہ، قورمہ۔ ایک آبی، دوسری شیرمال، فرنی کا خوانچہ، طشتری، کباب کی، بہت آب و تاب کی، شہر میں گلی گلی، عیش و طرب، خوشی میں چھوٹے بڑے سب۔ نہ کسی کو کسی سے غرض، نہ مطلب۔ پکا پکایا کھانا کھانا، دوکانوں پر بیٹھے، ہر وقت ناچ دیکھنا، سرکار کا کام بنانا، بغلیں بجانا، بیت ؎

بہشت آنجا کہ آزارے نہ باشد   کسے را با کسے کارے نہ باشد

اور اس سے پہلے بہ تعینِ تاریخ روزِ شادی نامے بادشاہوں کو، فرمان راجہ بابو کو، صوبہ داروں کو شُقے، عالموں کو پروانے جاچکے تھے۔ دو چار منزل گرد و پیش، سرِ راہ دو دو کوس کے فاصلے سے باورچی اور حلوائی کھانا مٹھائی تیار کئے بیٹھے رہتے تھے کہ اس عرصے میں جو مسافر گذرے، یا طلبیدۂ بادشاہ آئے، بھوکا نہ جائے، اور مژدۂ شادی راہ چلتوں کو سنا شہر میں بھیج دیتے تھے کہ یہ جلسہ قابلِ دید ہے۔

غرضکہ دو منزل چار منزل، بلکہ دس بیس دن کی راہ سے، تماش بین بے فکرے لکھنؤ والوں سے سیر دیکھنے کو آئے اور ساچق کا دن آیا، اگر سب سامان بیان کروں، کہانی ناتمام رہ جائے۔ مگر وہی مشتے نمونہ از خروارے۔ پچاس ہزار چوگھڑے، روپہلے، سنہرے، جواہر نگار۔ نقل اور میوے سے لبالب، لاکھ خوان بجنس و خوبی بسیار، پُر تکلف سب۔ پچاس ہزار میں مصری کے کوزے، باقی میں میوہ اور قند کی جھڑیاں، مرصع کاری کی بڑی تیاری کی۔ نقرئی، دہی کی مٹکی، گلے میں مچھلیاں، ناڑے سے بندھیں، آرائش کے تخت بے حساب اس روش کے جن کے دیکھنے سے صناعیِ صانعِ حقیقی کی یاد آئے، گل بوٹا اس سج دھج کا، جو نقل کو اصل کر دکھائے۔ آتشبازی کے ٹوکرے قطار در قطار، بے پایاں سرو، جھاڑ، درخت میوہ دار، ہزار در ہزار لابیاں، بہت تزک بڑا سامان، آرائش کے گلدستوں سے چمنِ رواں ساتھ تھا۔ سردست یہ باغ ہاتھوں ہاتھ تھا۔

اس انداز سے ساچق گئی، مہندی کی شب ہوئی۔ وزیرِ درست تدبیر نے خوب تیاری کی، ہزارہا من نارنول کی مہندی، وہ رنگین، جس کی دید سے دستِ نظارہ مثلِ پنجۂ مرجان رشکِ عقیقِ یمن اور لعلِ بدخشاں ہو جائے۔ ایک بار لگائے لال ہو، تمام عمر کفِ افسوس ملے۔ ایسا ملال ہو، جڑاؤ سینیوں میں حنا، شمع مومی و کافوری، اس پہ روشن، ملیدے کے خوانوں پہ جوبن، آرائش و آتشبازی ہمراہ، سب کے لب پہ واہ واہ، بہت چمک دمک سے مہندی لایا، اور یہ رنگ ڈھنگ حسنِ تدبیر سے دکھایا کہ تمام ہمچشموں میں سرخرو ہوا۔

برات کی رات کا حال سنو، دیوان خاص سے دُلھن کا مکان، پانچ کوس تھا۔ دونوں طرف بلّور کے جھاڑ، آدمی کے قد سے دو چند، سو سو بتی کے سربلند، پانچ چھے

گز کے فاصلے سے روشن اور دس گز جُدا، نقرئی طلائی، پنجشاخہ جلتا۔ ان سے کچھ دور، ہزاروں مزدور ٹھاٹھروں پر روشنی کرتے، جھاڑ رشک سرو چراغاں چمکتے، جا بجا ترپولئے اور نوبت خانے بنے، کتھک اتھک ان پر ناچتے، نوبت بجتی، مغرّق شامیانے تنے، اس کے قریب آتشبازی گڑی، روشنی یہ روشن تھی کہ چیونٹی سوار کو بہ ہیئت مجموعی مفصل معلوم ہوتی تھی۔

غرض کہ دولھا سوار ہوا، شور و غل یکبار ہوا، کسی نے کہا "سواری جلد لانا"، کوئی پٹکہ شملہ سنبھال کر پکارا، "خدمت گار کو بلانا"، پلٹنیں آگے بڑھیں، باجے بجنے لگے، کوس دکور گرجنے لگے، نوبت و نشان، ماہی مراتب، جلوس کا سامان، سواروں کے رسالے دو رویہ باگیں سنبھالے، خود ایسے اِکّے بیش قرار درما ہے دار۔ پھر ہزار بارہ سے تختِ رواں تمام تمامی سے منڈھا۔ ان پر رنڈیاں جوان جوان، شادی مبارک گاتیں، بیج دبیج دکھاتیں، طبلے بھڑبھڑاتیں، بہت سے سانڈنی سوار، تیز رفتار خاص بردار خاصیاں، کندھوں پر دولھا کے برابر، اُن کے قریب برچھے والے، باندار چوبدار روشن چوکی والے، شہنائیں، پُر تکلف، سُرنائے ہزاروں غلام زرّیں کمر، سنہری، روپہلی انگیٹھیاں ہاتھوں میں، جھولی میں عنبر سارا عودِ غرقی بھرا، دشت مہکتا، گرد ہزار پنجشاخا پھنکتا، سونے چاندی کی دستیاں روشن، قورمین چالیس بادشاہ پُر شوکت و جاہ پیچھے، بارہ ہزار ہاتھیوں پر امیر وزیر، ارکانِ سلطنت ترقی خواہ۔ خواصی میں انجمن آرا کا بھائی، جان عالم کا سالا، بجائے شہبالا، آہستہ آہستہ، قدم قدم۔ خوش وخرّم چلے۔ کوچہ و بازار بوباس سے معطّر تھا، چرخِ گردان اس تماشہ کو بچشمِ انجم نگراں تھا۔ دشت کا وحش و طیر حیران تھا۔ بھر رات رہے دولھن کے دروازے پر پہونچے، ماما، اصیلیں دوڑیں، پانی کا طشت، ہاتھی کے پاؤں تلے پھینکا، کسی نے کچھ اور ٹوٹکا کیا، دولھا اُتر کر مجلس میں داخل ہوا، بارہ سو طائفہ رنڈیوں کا سوائے بھانڈ، بھگتیے، ہیجڑے، زنانے کشمیری، قوال، بین کار، رُبابیے، سرودیے کے حاضر تھا۔ ناچ ہونے لگا، قریب صبح قاضی طلب ہوا۔ بساعتِ معیّن کئی سلطنت کے خراج پر مہر بندھا، طالب و مطلوب کو سلکِ ازدواج میں منسلک کیا، مبارک سلامت کا غل مچا۔ میر سوز ؎

فلک شب کتخدائی دیکھ اسکو سوز یوں بولا تجھے یہ رات اے رشکِ مہِ انور مبارک ہو

سب طائفے ساتھ کھڑے ہو، ایک سُر میں مبارکباد گانے لگے، کئی لاکھ روپئے بادشاہ نے عنایت کئے، دولھا زنانے میں طلب ہوا، وہاں رسمیں ہونے لگیں، وہ بھی عجب وقت تھا،

آرسی مصحف روبرو، محبوب دلخواہ دوبدو۔ سورۂ اخلاص کھلا، آئینہ رونمائی، میں مزے لوٹتا سلسلۂ محبت مستحکم ہورہا، ڈومنیوں کا سٹھنیاں گانا، دولھا دولھن کا شرمانا، کبھی ٹونے گاہ اچھے بنے سلونے۔ ہمجولیوں کا پوچھنا، "ٹونا لگا؟" دولھا کا ہنس کے کہنا۔ "عرصہ ہوا" کوئی دولھن کی جوتی، دولھا کے شانے میں چھواگئی، کوئی اسی کا جل پارا ہوا لگا گئی۔ ہمسنوں کی چھیڑ چھاڑ، ان کے جوبن کی بہار، نقط ململ اور شبنم کے دوپٹوں کی آڑ، جس دم یہ رسمیں ہوچکیں، جب نوبات کی نوبت آئی۔ عجب سیر نظر آئی۔ اس طرح بنی کہ دیکھی نہ سُنی۔ میر حسن ؎

وہ جب پاؤں پر کی اٹھاتے اڑا   نہیں اور ہاں کا عجب غُل پڑا

جب یہ رسمیں ہوچکیں۔ پھر ڈومنیوں نے باہونی گائی۔ سب کی چھاتی بھر آئی۔ کہرام مچا، جب دولھن سب سے رخصت ہونے لگی، رو رو جی کھونے لگی، سواری تیار ہو، دروازے پر آئی، دولھانے سہرا سر سے لپیٹ، دلھن کو گود میں اٹھایا، سب کا دل امنڈ آیا، شور و غل مچایا۔

دنیا کے کارخانے قابل دید ہیں۔ بلکہ دیدنی شنیدنی ہیں، شادی میں غم سلف سے توام ہے مگر ثبات بجز ذات باری کسی کو نہیں۔ مقدمات جہانِ گذران، خواب پریشاں ہیں اس میں سب حیران ہیں۔ ان کا حال کیا کہیں مولف ؎

اک وضع پر نہیں ہے زمانے کا طور آہ   معلوم ہوگیا مجھے لیل و نہار سے

غرضکہ دولھن کو سکھپال میں سوار کیا، بادشاہ نے ملک و سلطنت، خزانہ جہیز میں لکھ دیا، برات رخصت ہوئی۔ وہ اہتمام تجمل سواری کا سامان، ہر شخص خرم و خندان، جہیز کا بڑھنا، لوگوں کا دولھا پر دعائیں پڑھنا، نسیم سحر کا چلنا، شمع کا جھلملا جھلملا کے جلنا، شہنا میں بھیروں، بھاس، الیا، للت، رام کلی کا پھونکنا، نقیب اور چوبداروں کا کوئل کی طرح کوکنا، نوبت کی ٹکور، جھانجھ کا جھانجھ سے شور، جھٹ پٹا وقت، نور کا تڑکا، کڑکیتوں کا سو میل کڑکا، کچھ کچھ تاروں کی چمک، نقاروں کی صدا، دھونسے کی گمک، چاند کے منھ پر سفیدی، دلھن والوں کی یاس و ناامیدی، عطر کی ہر سو لپٹ، پھولوں کی مہک، سب کو نیند کا خمار، کوئی پیادہ کوئی سوار، فرشی باسی ہار، پھولوں سے رشک صحن چمن، کہیں جھول کہیں شکن۔ کسی جا پھروٹے اور بیڑوں کے پتے کھلے پڑے، کہیں لوگ حیران و ششدر کھڑے، مجلس کے فراق میں، اہل محفل کے اشتیاق میں۔ شمع کی زاری، اشک باری، لگن میں پروانوں کی بیقراری، خاکساری، دولھا کے لوگوں کی

خوش بشاش تیاری، دلھن کے گھر میں نالہ و زاری۔ کہیں کوئی نیند کے جھونک میں پڑا، کوئی یہ سامان بہ چشم عبرت دیکھ، تاسف میں کھرلا، شمع فانوس میں گل، گلگیر میں، زیر انداز پر پروانوں کے پر، فراش فرش اٹھانے کی تدبیر میں۔ بیٹھے ہوئے ہر ایک کی آواز، کہیں سوز، کہیں ساز، یہ وقت دیکھنے کے قابل ہوتا ہے، راہ چلتا دیکھ کر روتا ہے۔ اس کی لذت وہ جانے، جس کی نظر سے یہ ہنگامہ گذرا ہو۔ کسی کی برات تو دیکھی ہو، گو بیاہ نہ کیا ہو۔

قصہ مختصر، دولھا شگفتہ خاطر، خنداں چہرے پر شباب کی چمک، عارض تاباں سے حسن کی بہار عیاں، ہاتھی پر سوار، گرد شاہ و شہریار، زرِ سرخ و سفید نثار ہوتا، ہر چوک ہو کے دیوان خاص میں داخل ہوا، جو رسمیں یہاں کی تھیں، ہونے لگیں۔ بکرا ذبح کیا، انگوٹھے میں لہو لگا دیا، پھر کھیر کھلا کے رسومات سے فرصت پائی۔ اب یہ منتظر ہوئے کہ شام ہو وصل کا سرانجام ہو۔

اس دن جانعالم کا گھبرانا، گھڑی گھڑی گھڑیالی سے دن کی خبر منگوانا، دیکھنے کی گوں تھا۔ بدحواس پھرتا تھا کہ کہیں جلد رات ہو، بے تکلفی کی ملاقات ہو، کبھی کہتا تھا واہ قسمت کی خوبی، پہر بھر کا عرصہ ہوا، گھڑی نہیں ڈوبی۔ ہوش کہاں بجا تھا، مکرر پوچھتا تھا، ابھی کیا بجا تھا۔ اُدھر انجمن آرا بھی جمائیاں لیتی تھی۔ تکیے پر سر دھر دیتی تھی، جب اور کچھ تدبیر بن نہ آتی تھی، لوگوں کے چونکانے کو اونگھ جاتی تھی۔ غرضکہ خدا خدا کر، وہ دن تمام ہوا، نمود وقت شام ہوا، عروسِ شب نے مقنعۂ مہتاب سے روپوشی کی، مشتاقوں کو فرصت ملی، گرمجوشی کی، لوگ آنکھ بچا کر جا بجا کنارے ہوئے، دولھا دولھن چھپر کھٹ میں ہمکنار، بیتابی کے مارے ہوئے، شادی کا زور شباب کا عالم، مشتاقوں کا بیٹھنا، باہم آنکھوں میں خمار نیند کا، دل میں اشتیاق دید کا، عطر سہاگ اور فتنے کی خوشبو، بٹنے اور تیل کی عجب میل کی مہک، ہر سو پھولوں سے پلنگ بسا، اوقچہ کسا، خود نشۂ عشق سے باختہ حواس، تمنائے دل پاس نہ کچھ دغدغہ، نہ وسواس، ہنگامۂ صحبت طرفین سے گرم، اُدھر شوق اِدھر شرم، ایک طرف ولولہ گرمجوشی، ایک سمت کثرت حیا سے منہ پر خموشی۔ بیان کرنا، گزشتہ حال کا، خیال لوگوں کی دیکھ بھال کا۔ یہ معمول ہے اس روز ہم سنیں برابر والیاں تاکتی جھانکتی ہیں، لیکن ان ڈروں پہ چپ نہ رہے، آہستہ آہستہ دونوں نے دکھڑے کہے۔ جانعالم نے توتے سے ذکر سن کر، در بدر خراب و خستہ ہو کر آنا، توتے کا بیٹھ رہنا، وزیر زادے کا صدمۂ فراق سہنا، پھر طلسم کا پھنس جانا، جادوگرنی کا ستانا، بعد اس کے نقش سلیمانی لینا، وہاں سے چل دینا، بہ کشادہ پیشانی و خوش بیانی بیان کیا، مگر ملکہ مہرنگار

کی ملاقات، جگت رنگی کے حرف و حکایات، اس کی طبیعت کا آجانا، اپنا بے اعتنائی سے چلے آنا، کچھ شرما کر بات کو مطلب کی جا سے چبا چبا کر کہا۔ یہ اکثر ہوا ہے کہ معشوق کے روبرو جو اس پر کبھی کوئی عاشق ہوا ہے، اس کا ذکر کرتا ہے، شیخی بگھارتا ہے، کچھ جھوٹ اپنی طرف سے جوڑتا ہے، دل کے پھپھولے توڑتا ہے، اس کی شرح گو طول طلب ہے، پر عاشق مزاجوں پر منکشف سب ہے۔

انجمن آرا نے جادوگرنی کے قصے پر تاسف کیا، ملکہ کے مذکور پر بناوٹ سے ہنس دیا، پھر روکھی صورت بنائی ناک بھوں سمیٹی، تیوری چڑھائی۔ مگر چلے آنے کے سہارے پر مسکرائی، اپنا بھی اشتیاق لٹے دیئے۔ از روز ملاقات، محنت و مشقت کی قدر دانی سے، جادوگر کی لڑائی کی جانفشانی سے، بیان کیا۔ پھر دونوں بے ساختہ ہو شرم و حیا کھو، ہم آغوش ہوئے۔ رنج درکنار، غم و دردِ مہاجرت فراموش ہوئے۔ مولف ؎

یہ ہمکناریٔ جاناں سے تازہ لطف اُٹھا | گلے سے ملتے ہی، سب رنج درکنار ہوا

سینے سے سینہ، لب سے لب، ہاتھ پاؤں، بلکہ جتنے اعضائے جسم ہیں، سب وصل تھے، مثل ہے ایک جان دو قالب۔ وہ ایک جان ایک ہی قالب، غالب ہے کہ ہوگئے۔ استاد ؎

ایام وصل میں ہم لپٹے ہیں جیسے اس سے | یوں وصلی کے بھی کاغذ چپاں بہم نہ ہوں گے

خواہش کو اضطرار، حیا مانع کار، بہ سر تکرار، دونوں کے دم چڑھ گئے۔ جنگ زرگری، گاؤ زوریاں کر رہے تھے، شاہزادی موقع پر ہاتھ نہ لگانے دیتی تھی۔ جب بے بس ہو جاتی تو چٹکیاں لیتی تھی۔ گاہ کہتی تھی — "اے صاحب اتنا کوئی گھبراتا ہے، دیکھو تو کون آتا ہے"، کبھی خود اُٹھ کر دیکھتی بھالتی تھی، کوئی دم یوں ٹالتی تھی، آخر کار غنچۂ سربستہ و تمنائے دراز، بحرکت نسیم وصل شگفتہ و خنداں ہوا، دُرِ ناسفتہ درج شہریاری، رشک عقیق یمن، غیرت دہ لعل بدخشاں ہوا، رشک و حسرت سے جگر صدف چاک ہوا، دشمن کمبخت در پردہ ہلاک ہوا۔ تقاضائے سن، الھڑپنے کے دن، اس وقت دونوں گھبرائے، اور وہ کیفیت سب بھولے۔ جب دامنِ شب میں، چادرِ پلنگ پر، شفق صبح پھولی۔ غرضکہ شرما کر استراحت فرمائی، دلِ بیتاب نے تسکین پائی۔

ہنوز پلک نہ جھپکی تھی، نمود سحر ہوئی، عام شب کی خبر ہوئی، دمِ صبح ایک سرخرو، دوسرا اندلیدہ مُو، حمام میں داخل ہوئے۔ جو جو محرم راز، شریک ناز و نیاز تھیں، رات کی باتوں کے پتے، رمز و کنایہ میں دینے لگیں۔ سب نے قہقہہ مارا، جب روبرو پنجری اور شیشے میں قبول آیا، شرما کر سر جھکایا، غمزہ و ناز ہر انداز میں رہا، نہا دھو، خاصہ نوش فرمایا۔

جانعالم بادشاہ کے حضور میں آیا، خلعت فتح پایا، امورات سلطنت بمشورۂ شاہزادہ ہونے لگے، بعد رسم چوتھی چالے کے، لب دریا ایک باغ بہت پُرتکلف کا نشاط افزا نام، بادشاہ نے رہنے کو عنایت کیا۔ اگر اس باغ کی تعریف رقم کروں، شاخِ زنبق و نرگس کی ٹہنی کو لاکھ بار قلم کروں، اِلا خضر کی حیات، رضواں کا ثبات درکار ہے، نہیں تو ناتمام ہے، لکھنا بیکار ہے۔ سو بار خزاں جائے بہار آئے، ایک پٹڑی کی روشِ صفا تحریر نہ ہو سکے، خامۂ مانی بھسل جائے۔ رشکِ گلزارِ جناں ایک تختۂ فردوس سا، کئی کوس کا، باغ بے پایان برگ و بارِ گُل، اس کے جورِ خزاں سے آزاد بالکل، نہ بلبل پر ستم باغباں، نہ خوفِ صیاد، عجائب و غرائب چہچہے، نئے رنگ ڈھنگ کے ترانے یاد، جتنے دنیا کے میوے ہیں تر و تازہ، ہمیشہ تیار، سرسبز، پتے خوشرنگ، پھول پھل مزیدار، گل تکلیفِ خار سے بَری، جہاں کی نعمت ہر تختہ میں بھری۔ روش کی پٹڑیوں پر مہندی کی ٹٹیاں کتری ہوئی برابر۔ چمن میں وہ درخت پھلے پھولے، جسے دیکھ کر انسان کی عقل بھولے، پھولوں کی بوئے خوش سے دل و دماغ طاقت پائے، جو پھل نظر سے گذرے، بار خاطر نہ ہو۔ ذائقہ زبان پر، منھ میں پانی بھر آئے۔ نہریں ہزار در ہزار، پُر از آبشار، گرد چرند و پرند، خوبصورت، قطعدار، باغبانیان پری زاد، حور وش کمسن، مہ لقا، بیلچے جواہر نگار، ہاتھوں میں ہر ایک آفت کا پرکالہ، دلربا، مہ سیما، کنوئیں پختہ، جڑاؤ چرخی رسّی کلابتو کی۔ ڈول وہ کہ عقل دیکھ کر ڈانوں ڈول ہو، چرسے پر نزاکت برسے۔ بیل کے بدلے نیل گائے کی جوڑیاں، آہو جن کے روبرو چکارہ۔ باغبانیاں، مہ پارہ زربفت کے لہنگے، قیمت کے مہنگے، شبنم کے نفیس دوپٹے، مغرق مصالح کی کرتی انگیاں چھرطے، پاؤں میں طلائی واچھڑے۔ کان کی لو میں ہیرے کی بجلی، برق دم، سب کی آنکھ جس پر پڑے۔ کوئی ڈول کو سنبھال پٹا خیال گاتی، کوئی شعر برجستہ یا ہندی کا دوہا اس میں ملاتی، چھیڑ چھاڑ میں چٹکی لے کے اچھل جاتی۔ ایسے باغِ پُر بہار میں جانعالم اور انجمن آرا ہاتھ میں ہاتھ، پریوں کا اکھاڑا ساتھ، دین و دنیا فراموش، ہر دم نوشا نوش باعیش و نشاط، اوقات بسر کرنے لگا، جہاں کا ساز و سامان، ہر دم مہیا، شراب و کباب، چنگ و رباب کا جلسہ، خدمت گذاریں، پری پیکر ماہ طلعت، سب کام کو حاضر، جیسے کنھیا، شامِ عشرت سحر کرنے لگا، نہ خیال اپنے شہر و دیار کا، نہ خوف گردشِ روزگار کا، نہ دھیان اس جگر فگار، کشتۂ انتظار، ملکہ مہر نگار کا۔

پھر مذکور اُس مہجور کشتۂ فراق کا سوختۂ آتشِ اشتیاق کا

وہ کون خستۂ محزوں جگر برشتہ دل خوں ملکہ مہر نگار، شہزادے کے آنے کی امیدوار

اور حکایات ضرب المثل

کدھر ہے تو اے ساقیٔ بے خبر
نہ کی لطف سے غمزدوں پہ نظر

ہوا حال شادی کا سب اختتام
مگر غم کا قصہ ہے وہ ناتمام

طپش سے تڑپ سے تو کر دے بہم
کہ لکھتا ہوں پھر داستانِ الم

خوشی سے مجھے رنج مرغوب ہے
یہ مونس ہی ہمدم بہت خوب ہے

یہی ساتھ دیتا شب و روز ہے
یہ غم عاشقوں کا غم اندوز ہے

نالہ نوازانِ بزمِ ماتم و تفتہ جگرانِ کلبۂ غم، حاکیانِ حکایتِ اندوہ و ملال و نثارانِ دل خوں آشفتہ حال لکھتے ہیں کہ اس بے سرو سامان، گشتۂ ہجران دور از دلدار، ہمقرینِ غم، رو نادیدۂ شادی، حجلہ نشینِ ماتم، دلریشِ سینہ فگار، یعنی ملکہ مہر نگار کا فرقت میں یہ حال ہوا۔ استاد ؎

یاں تک کہ اٹھانے کا وقت اپنے قریب آیا
اس پہ مرے بالیں پہ تم اُٹھ کے نہ آ بیٹھے

میں نام ترا لے لے دن رات جو چلّاؤں
او سنتے ہوئے بہرے کیوں کر نہ گلا بیٹھے

جو کوئی کہتا "خیر ہے، ملکہ گھُلی جاتی ہو، کیوں اتنا رنج و غم اٹھاتی ہو" تو یہ کہتی

مصحفی ؎

غم کھاتی ہوں لیکن مری نیت نہیں بھرتی   کیا غم ہے مزے کا کہ طبیعت نہیں بھرتی

مولف ؎

نہ پوچھو کچھ مری حالت کہ اس دل کے لگانے سے   پریشاں سینہ سوزاں منفعل سر در گریباں ہوں

ایسی باتیں درد آمیز وحشت انگیز کرتی کہ سننے والوں کی چھاتی پھٹتی، وہ کہتیں "ملکہ نظر بجدا رکھو" حسن ؎

اسے فضل کرتے نہیں لگتی بار   نہ ہو اُس سے مایوس امیدوار

سوز ؎

پھر بہار آتی ہے تجھ میں اے گلستاں غم نہ کھا   وہ چلی آتی ہے فوجِ عندلیباں غم نہ کھا
گو کہ شب آخر ہوئی اے شمع تو زاری نہ کر   پھر وہی محفل وہی تیرا شبستاں غم نہ کھا

وہ سُن کر یہ کہتی کہ "میں چراغ سحری ہوں، یقین ہے کہ تا صبح جل کر، بزمِ جہاں سے سفری ہوں"۔ خسرو ؎

پس از آنکہ من نمانم بچہ کار خواہی آمد

مولف ؎

ہماری جان کے جانے میں جب عرصہ رہا تھوڑا   تب اس کے دل میں آیا دھیان میرے پاس آنے کا

آجتک اس غفلت شعار، فراموش کار، کی کچھ خبر نہ آئی۔ ہم نے غمِ جدائی میں جان گنوائی۔ مؤلف

تپِ جدائی سے اس طرح اب نزار ہوں میں   اجل کے منہ سے بھی غالب ہے شرمسار ہوں میں
کیا ہے رنجِ جدائی نے ایسا کاہیدہ   نظر میں خلق کی رشکِ خطِ غبار ہوں میں
جو تو وہ گل ہے کہ عالم کے دل میں ہے تری جا   تو سب کی آنکھ میں کھٹکا کیا وہ خار ہوں میں
قرار می برُد از قلق آہ و زاری ما   سرورؔ رنج میں کس کے یہ بیقرار ہوں میں

یہ معمول تھا، جب چار گھڑی دن رہتا، سوار ہوکر ان درختوں میں جہاں جانِ عالم سے ملاقات ہوئی تھی جاتی اور جو جو شریکِ رنج و راحت تھیں، ان سے مخاطب ہو یہ کہتی۔ اہلی شیرازی ؎

خوش آنکہ تو باز آئی و من پائے تو بوسم   در سجدہ فتم خاک قدم ہائے تو بوسم
ہر جا کہ تو روزے نفسے جائے گرفتی   آنجا ہمہ دم دگریہ کناں جائے تو بوسم
روئے تو تصور کنم و لالہ و گل را   در حسرتِ رخسار دل آرائے تو بوسم

ہر جا کہ غزالیست چو مجنوں سرو چشمش
در آرزوئے نرگسِ شہلائے تو بوسم

من اہلِ درویش تو آں شاہِ بتانے
دستیکہ بوسم بتمنائے تو بوسم

اور کبھی صبح سے پھرتے پھرتے قریب شام، بادلِ ناکام، اسی جنگل میں پھر آتی، یہ غزل زبان پر لاتی۔ جرأت ؎

بہ شکلِ مہر ہی گردش ہے ہم کو سارے دن
جو تم پھر آؤ تو پیارے پھریں ہمارے دن

بہ وصل کیونکہ مبدل ہوں ہجر کے ایام
مگر خدا ہی یہ بگڑے ہوئے سنوارے دن

رہے تھا جبکہ ہم آغوش مجھ سے وہ پیارا
عجب مزے کی تھیں راتیں عجب تھے پیارے دن

نہیں ہے تیرے مریضانِ ہجر کا چارہ
اب اپنی زیست کے بھرتے ہیں یہ بچارے دن

کب اس سے ہوگی ملاقات میں یہ پوچھوں ہوں
ذرا تو دیکھ نجومی مرے ستارے دن

لگایا روگ جوانی میں کیوں میاں جرأت
ابھی تو کھیل تماشے کے تھے تمہارے دن

رات کو بحالِ بیقرار، وہ سوگوار، ناچار، گھر آتی، تمام شب کراہ کراہ سب کو جگاتی اور یہ سناتی۔ استاد ؎

حرام نیند کی، اقرارِ وصلِ جاناں نے
الٰہی کوئی کسی کا امیدوار نہ ہو

وہ رات جسے شبِ فرقت کہتے ہیں، بے چینی سے پہاڑ ہو جاتی، تو وہ غم کی ماری سخت گھبراتی، یہ لب پر لاتی۔ استاد ؎

جیسا شبِ عشرت کو فلک تو نے گھٹایا
کی جلد نہ فرقت کی ستم گر سحر ایسی

ہے ہے آج نہ صدائے مرغِ سحر آئی، نہ موذن نے ندائے اللہ اکبر سنائی، نہ خوابِ غفلت سے پاسبان کمبخت چونکا، اور نیند کی جھونک میں گھڑیالی بھی گجر کا بجانا بھول گیا۔ جرأت ؎

تھے شبِ وصل میں سب جان کے کھانے والے
آج کیا مر گئے گھڑیال بجانے والے

شب کو نالہ تھا دن کو زاری تھی، دن رات اس پر سخت بھاری تھی۔ لوگ کہتے تھے "ملکہ اللہ کو یاد کرو، کبھی تو دل شاد کرو، شافیٔ مطلق تمہارے مرضِ مفارقت کو، بہ صحتِ وصل بدل کرے۔ اب روزِ وصال عنایتِ ذوالجلال سے قریب ہے۔" تو اُس وقت بہ حسرت یہ کہتی۔ مؤلف

شبِ وصل جو قسمت میں ہے تو ہووے گی
دُعا کرو شبِ فرقت تو یہ سحر ہووے

غزل

مریضِ ہجر کو صحت سے اب تو کام نہیں
اگرچہ صبح کو یہ بچ گیا تو شام نہیں

رکھو دیا نہ رکھو مرہم اس پہ ہم سمجھے
ہمارے زخم جدائی کو التیام نہیں

کیا جو وعدۂ شب اس نے دن پہاڑ ہوا
یہ دیکھیو مری شامت کہ ہوتی شام نہیں

وہی اُٹھائے مجھے جس نے مجھ کو قتل کیا
کہ بہتر اس سے مرے خوں کا انتقام نہیں

اُٹھایا داغِ گل افسوس تم نے دل پہ سرور
میں تم سے کہتا تھا گلشن کو کچھ قیام نہیں

استاد سہ

آخر شب وصال کی جا پیش کی وہی
ہر دن تھا اے فلک مجھے جس رات کا خیال

معاملات عشق دیکھئے، وہاں شہزادے کو غم سے فراغ، کیفیت باغ گلعذار، بغل میں راحت و آرام، یہاں ملکہ آتشِ فراق سے، با دلِ پُر داغ، خارِ غم جگر میں گرفتار، رنج و آلام، لیکن دردِ دلِ بیقرار، نالۂ جگر افگار، رائیگاں نہیں جاتا۔ جب تڑپ بلبل کے دل میں زیادہ ہوتی ہے، موسم گل آتا ہے، اسی طرح سوزِ دل عاشق جو حد سے فزوں ہو، معشوق رحم کھاتا ہے، بھولا ہوا یاد آئے، ورنہ ہجر میں پھڑک کر مر جائے مطلوب کو نعش پہ لائے؛ اس کی بھی جان گنواتا ہے۔ حضرتِ عشق دشمنِ جاں عاشق و معشوق ہیں، ان کا حال کیا کہیں، چنانچہ یہ نقل ضرب المثل ہے اور حقیقت میں اصل ہے بغور سن کر تامل کرو۔

نقل سوداگر کے بیٹی کی، انگریز کا آنا،

فریفتہ ہو جانا، آخر کو جان دینا دونوں کا

کلکتہ میں ایک سوداگر تھا، عالیشان متاعِ ہر دیار، تحفہ ہر جوار، دوکان میں فراواں۔ اس کی بیٹی تھی حسین، مہر طلعت، ماہ جبین، سیمین تن، کافر فرنگ، غارت گرِ لندن۔ غرضکہ اور تو اسباب سب طرح کا دوکان میں تھا، مگر گھر میں وہ زور رقم طرفہ ٹوم تھی، فرنگ سے ہند تک، اس کے حسن کا چرچا تھا۔ روم سے شام تک اور بمبئی سے سورت تک، اس کی صورت کی دھوم تھی۔

استاد ؎

اسلام اب کہاں ہے عاصی فرامش ہے ۔۔۔ ہے رخنہ سازِ ایماں وہ زادۂ فرنگی

ہزاروں انگریز بریز، بریز، کرتے، اس پر شیفتہ و بیتاب تھے، لاکھوں مسلمان سرگرداں، خستہ و خراب تھے، جب ہوا کھانے کو سوار ہو کر آتے تھے، راہ میں دو رویہ خلقت کی جان، اس کی خواہی میں برباد جاتی تھی۔ گبرو ترسا اس کا کلمہ پڑھتے تھے، یہود و نصاریٰ اس کا دم بھرتے تھے، مسلمان دل و جان نذر کرتے تھے۔ مولف

کہتا ہوں چکھو یہ دل بریاں کا توس ہے ۔۔۔ اس لعبتِ فرنگ کو دکھلا کے قاشِ دل

اتفاق زمانہ کوئی انگریز لندن سے تازہ وارد ہوا، جلیل القدر، ذیشان، خوبصورت، نوجوان، شورِ عشقِ سودا خیز سر میں، سوز دل میں، مزاج بے شر، بے قراری آب و گل میں۔ میر ؎

تھا طرحدار آپ بھی لیکن　　ره نہ سکتا تھا اچھی صورت بن

قضارا، وہ آفت کا مارا، کچھ اسباب لینے اس کی کوٹھی میں آیا، اور اس غارت گرِ دین و ایمان، ہر گبر و مسلمان سے دو چار ہوا، عشق گلے کا ہار ہوا، دیکھتے ہی متاعِ عقل، اسباب ہوش و حواس گرہ سے کھو بیٹھا، دل سے ہاتھ دھو، دمِ نقد جان کو رو بیٹھا، اسباب خریدنے گیا تھا، سودا مول لیا، اس نے مشتری سمجھ، میزانِ محبت میں تول لیا، ہاتھ پاؤں نے سست، دل نے ہمت ہاری، دن دہاڑے لٹ گیا۔ عشق کا بیوپاری جب اور کچھ تدبیر بن نہ آئی، خرید فروخت کے حیلے میں آمد و رفت بڑھائی، پھر تو یہ حال ہوا۔ جرأت ؎

دن میں سو سو بار اب ہم اُن کے گھر جانے لگے　　منھ چھپانے وہ لگے ہم ان پہ مرجانے لگے

سلف سے عشق آج تک چھپا نہیں۔ مشہور ہے اس مقدمے میں انسان مجبور ہے۔ میرؔ ؎

عشق بے پردہ جب فسانہ ہوا　　مضطرب کد خدائے خانہ ہوا

جب یہ امر مفصل سوداگر کے گوش زد ہوا۔ پاس نام و نشان، خوف ذلت و رسوائی کا از حد ہوا پہلے دونوں کو نصیحت کی۔ پند کیا، پھر سلسلۂ آمد و رفت قطع کیا، دیکھا بھالی کا رخنہ بند کیا۔ ادھر شعلۂ عشق نے بھڑک کر، صاحب کو سلامت نہ رکھا، تاب و تواں شکیب و تحمل کو، ہیزمِ خشک کی طرح جلا، صبر کا قافلہ لوٹ لیا میرؔ ؎

بسترِ خاک پہ گرا یہ زار　　درد کا گھر ہوا دلِ بیمار
خاطر افگار، خار خار ہوئی　　جاں تمنا کشِ نگار ہوئی
دل نہ سمجھا اور اضطراب کیا　　شوق نے کام کو خراب کیا
رفتہ رفتہ سخن ہوئے نالے　　لگے اُڑنے جگر کے پرکالے

یہاں تک تپِ مہاجرت اور دردِ مفارقت سے حال درہم برہم ہوا کہ صاحب بہادر شکست فاش اٹھا کر صاحب فراش ہوئے، دل و جگر سینے میں پاش پاش ہوئے۔ حس و حرکت کی طاقت نہ رہی، لینے کے دینے پڑ گئے۔ استاد ؎

مرض یہ پھیلا پڑا ہے تپ جدائی سے　　کہ بیٹھ لگ گئی یاروں کی چارپائی سے

جو جو اس کے دوستِ دلی، محب قلبی تھے، نصیحت و پند و قید و بند کرنے لگے، عورتوں کی بیوفائی، بتوں کی سنگ دلی، معشوقوں کی کج ادائی، بہت مشرح سمجھائی، سودمند نہ ہوئی،

خاطر میں نہ آئی۔ ایک دوستدار۔ اس کا غم خوار تھا کہنے لگا "کیوں جویائے مرگ ہوا ہے، ظالم یہ کیا کرتا ہے، اس کا انجام ذلت ہے حاصل اس کا خفت ہے، یہ خیالِ محال اپنے دل سے نکال، زورقِ زندگانی سفینۂ نوجوانی دیدہ و دانستہ ورطۂ ہلاکت میں نہ ڈال، اپنے کس و کو پر نظر کر، للہ دلِ خود رفتہ کو سنبھال؛ تو نے پسر مجشٹن کی حکایت نہیں سُنی، کہ اس پر کیا گذری، آخر کار کیسی خفت ہوئی۔"

اس نے کہا "کیوں کر"۔

حکایت پسر مجسٹن بیٹے کا پیدا ہونا، سفر کی کیفیت،

جہاز کی تباہی، شہزادی کا ملنا پھر مفارقت، مجسٹن کا ساتھ جانا

وہ بولا "اسی شہر میں ایک شخص تھا مجسٹن نام۔ نہایت اہل دُوَل، مرفّہ حال، صاحبِ علم و فضل، جامع ہر کمال، طبیب اور ادیب بے بدل، سخن سنج، لطیفہ گو برمحل، کمالات میں یگانۂ روزگار، تجارت میں نامورِ ہر دیار، سو سو جہاز۔ ایک بار تجارت کو جاتا تھا، نصیب ایسا جاگتا تھا، مٹی کو چھوتا، سونا ہاتھ آتا تھا۔ کسی طرح کا خواہش مند، بجُز فرزند ارجمند نہ تھا، شب و روز اِس کا خیال تھا، مدام فرحت میں یہ ملال تھا۔ خوش قسمتوں کی دُعا جلد قبول ہوتی ہے، تمنائے دل حصول ہوتی ہے۔ پچھتر برس کے سن میں اللہ نے بیٹا عنایت کیا، حسب دلخواہ، صورت میں غیرتِ ماہ، بہت شاداں سرگرمِ پرورش ہوا۔ جب بارہ برس کا سن ہوا، بسبب طبع رسا و تعلیم استادانِ باذکا جمیع علوم اور فن میں کامل ہوا۔ درس دینے کا مطب کرنے لگا۔

تیرہویں سال باپ سے سفر کی اجازت چاہی، کہ تجارت میں کوئی دقیقہ باقی نہ رہ جائے۔ مجسٹن نے کہا۔ "اپنا بھی یہی قصد ہے، مگر چندے توقف شرط ہے۔"

اس نے عرض کی "حضور عمرِ طبعی کو پہونچے، مسن ہیں، فدوی کے سیاحت کے دن ہیں، چاہتا ہوں آپ کے بقیدِ حیات سفر کو جاؤں، جودتِ طبع دکھاؤں؟

آخر مجسٹن نے دس بارہ جہاز پُر از متاع و مال، پندرہ بیس رفیقِ قدیم دیانت دار،

امانت شعار، ہمراہ کر، رخصت کیا۔ جہاز ایک سمت روانہ ہوئے، دو مہینہ کے بعد، ہوائے جورِ گردوں سے جہاز تباہ ہو گئے۔ مجسٹن کے بیٹے کا بھی جہاز ڈوبا، یارانِ ہمراہی عالمِ بقا کو راہی ہوئے، یہ ایک تختہ پر ڈوبتا، اچھلتا بہہ چلا، حیاتِ مستعار باقی تھا۔ ساتویں دن تختہ کنارے پر لگا، اس کو غش سے جو افاقہ ہوا، تختے سے اترا اور گھاس کی رسّی بنا، وہ تختہ پتھر سے اٹکا دیا، پھر آپ بتلاشِ آب و دانہ، روانہ ہوا، چند قدم بڑھا تھا کہ شہر نمودار ہوا، آہستہ آہستہ بیٹھتا اٹھتا شہر میں داخل ہوا۔ وہاں عجیب سانحہ طرفہ ماجرا نظر آیا، دکان ہر ایک کھلی، اشرفی، روپیہ کا ڈھیر، اسباب سب طرح کا موجود، مگر آدمی کا پتہ مفقود، اس قرینے سے ثابت ہوا کہ عرصہ سے یہ بازار جنسِ بشر سے خالی ہے، شہر کا وارث ہے نہ والی ہے، پھرتا پھرتا قلعہ میں آیا، دیکھا باغ سرسبز، پُر میوہ، بیچ میں بنگلہ، زربفت کے نفیس پردے پڑے۔ پردہ اٹھا، بنگلے میں آیا۔ پلنگ جواہر نگار گسترده، اس پر کوئی بشکلِ مردہ، دوپٹہ تانے، نہ کوئی پائنتی نہ سرہانے، پڑا ہے۔ اس نے دوپٹہ سرکایا، عورت نے چونک کر سر اٹھایا، اس کی صورت دیکھ کر کہا کہ "اے عزیز! اپنی جوانی پر رحم کر، یہ مکان نہیں، سیلِ فنا ہے، تو ناآشنا ہے اس سے درگذر، وگرنہ آفت کا مبتلا ہوگا، خدا جانے ایک دم میں کیا ہوگا۔"

اُس نے کہا کہ "ایسا ماجرا کیا ہے، بیان تو کر"

عورت نے کہا "پہلے تو اپنے آنے کا حال سنا کیونکر آپھنسا۔"

اس نے کہا۔ "سات دن سے بھوکا پیاسا ہوں، جو کچھ کھاؤں، داستانِ پریشان سناؤں۔"

عورت بولی "مدت کے بعد کھانے کا نام تیرے منہ سے سنا ہے، سو کھانا یہاں کہاں، بجز غم کھانے کے اور پانی سوا اشک بہانے کے، آنسو پینے کا نام ہے، اس سے نہیں جیتی ہوں اور کھانے کی قسم سے قسم تک نہیں کھاتی، متحیر ہوں، کیونکر جیتی ہوں، مگر تنہائی میں ہاں خوف کھاکے روز دن بھرتی ہوں۔ ہر شب کہ شبِ اولیں گور ہے، جاں کنی رہتی ہے، سخت جانی کی بدولت نہیں مرتی ہوں۔ جرأت ؎

یہ غلط کہتے ہیں بے آب و خورش جیتے ہیں   لختِ دل کھاتے ہیں اور خونِ جگر پیتے ہیں

تو اس باغ میں جا اور جس میوے پر رغبت ہو کھا۔"

مجسٹن کے بیٹے نے جا کے میوہ کھایا، نہر سے پانی پیا، گو نہ الم و رنج فاقے سے افاقہ ہوا، پھر عورت کے پاس آکے، حسب و نسب اپنا اور باعثِ سفر، جہاز کی تباہی کی مفصل

سرگذشت سنائی، پھر اس کا ماجرا پوچھا، وہ بولی "اے شخص اس شہر بے چراغ کی میں شہزادی ہوں۔ باپ میرا والی ملک تھا، مجھ کو سوائے سیر و شکار، کسی امر سے سروکار نہ تھا، ایک روز لبِ دریا مصروفِ تماشہ بیٹھی تھی، دفعتہً سانپ نمودار ہوا اور میری طرف بڑھا، میں نے تیر مارا، معلوم نہیں لگا، یا خطا کر گیا، پھر جو دیکھا تو اژدہائے مہیب، بہ شکل عجیب جھپٹا آتا ہے، میں تو ڈر گھوڑے پر چڑھ کر بھاگی، جو جو ہمراہ رکاب تھے، وہ طعمۂ دہنِ مارِ خونخوار ہوئے۔ کہاں تک بیان کروں، ساکنانِ شہر مع بادشاہ انسان سے تا حیوان کوئی بھی نہ بچا، فقط میں سخت جان باقی ہوں اور یہ صحبت ہے کہ قریبِ شام وہ خون آشام آکر اس بنگلے کے نیچے بیٹھتا ہے، دو گھڑی کے بعد غائب ہو جاتا ہے۔ مجھ پر جب بھوک پیاس کا غلبہ ہوتا ہے، اسی باغ سے میوہ کھا پانی پیتی ہوں، اس خرابی سے جیتی ہوں۔ کوئی غمخوار بجز ذات پروردگار نہ تھا، آج تجھے دیکھا خوفِ خدا آیا، مطلع کر دیا۔"

پسر مجسٹن نے کہا "خاطر پریشان جمع رکھ، اگر فضل الٰہی شریکِ حال ہے تو اس آفت سے جلد نجات ہو جائے گی۔" یہ کہہ کر جس جگہ سانپ کے بیٹھنے کا نشان تھا، وہاں گڑھا کھودا اور قلعے سے بارود لا کر اس میں بچھائی اور دور تک نقب سی بنائی، پھر گھاس ہری اس پر جمائی۔ شہزادی نے کہا۔ "اب وہ آتا ہی ہوگا۔" یہ سن کر سرِ نقب جا پوشیدہ ہو کر بیٹھ رہا کہ دفعتہً وہ افعیِ پُر زہر، خدا کا قہر آیا اور اپنی جگہ پر اس سبز قدم نے فرشِ زمردیں پایا۔ بہت خوش ہو کر بیٹھا، یہ تو تاک میں تھا، پتھر سے آگ نکال، اس نقب میں ڈال دی۔ فوراً ایک دھماکا پیدا ہوا، وہ ٹکڑا زمین کا مع سانپ آسمان پر پہونچا، دونوں نے شکر کا سجدہ بدرگاہِ دافع البلیّات کیا۔ باہم بے اندیشہ و غم رہنے لگے۔ سات برس دونوں ساتھ رہے۔ اس عرصے میں دو لڑکے بھی پیدا ہوئے۔ ایک دن رنجِ تنہائی کی شہزادی نے شکایت کی کہ اکیلے طبیعت نہیں لگتی۔ صائب ؎

بہارِ عمر ملاقاتِ دوستدار انست ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ چہ خط برد خضر از عمر جاوداں تنہا

کوئی ترکیب ایسی نکالو کہ پھر یہ شہر آباد ہو، خاطرِ غمگیں شاد ہو۔"

وہ بولا کہ "اگر وطن جاؤں اور مجسٹن کو یہاں لاؤں تو یہ بستی بسے۔"

عورت نے کہا۔ "اکیلی میں کیونکر بسر کروں گی، میں بھی ساتھ چلوں گی۔"

آخرش ایک ایک لڑکا دونوں گود میں لے کر چل نکلے، قضارا وہاں پہونچے جہاں تختہ بندھا تھا،

ذہن میں آیا، اُسی پر سوار ہو کھول دو، کہیں تو جا نکلو گے۔ یہ سوچ کر دونوں سوار ہوئے۔ وہ تختہ کھولنے لگا۔

شہزادی بولی "مال و اسباب تو اس قدر ہے کہ بیان قاصر ہے، مگر ایک ناریل اکسیر سے بھرا ہے، دولت لازوال ہے، جو تو اجازت دے تو اسے لے آؤں۔ مصرع

بدوزد طمع دیدۂ ہوش مند

مجسٹن کے بیٹے نے کہا: اچھا۔" وہ تختہ کچھ کھلا کچھ بندھا یوں ہی رہا، شہزادی لڑکا لئے اتری، اس کے اُترتے ہی ایسی تند ہوا چلی، کہ رسّی ٹکان سے ٹوٹ گئی، تختہ بہہ چلا۔ ہرچند اُس نے ہاتھ پاؤں مارے، وہ ساحلِ مطلب سے کنارے ہوا، کنارے پر شہزادی بحالِ خراب۔ دریا میں وہ با دلِ کباب بہہ نکلا، دل سے کہتا تھا، دیکھئے مرضی ناخدائے کشتی بادبان شکستہ کیا ہے۔ یہ جھونکا ہوائے قوم عاد کا ہے، اس سوچ میں تھا کہ ایک جہاز نمود ہوا، اہلِ جہاز نے جو دیکھا تختے پر کوئی جوان گود میں لڑکا، نادان لئے بہا جاتا ہے، رحم کھا پنسوئی کو دوڑا، جہاز پر لیا۔

اتفاق زمانہ مالکِ جہاز مجسٹن کا دوست دمساز تھا، اس کو پہچانا، بہت تعظیم و تکریم سے پیش آیا، برس روز میں جہاز کلکتہ میں داخل ہوا، جہاز کا حاکم مجسٹن کی ملاقات کو آیا، بچھڑے بیٹے کو باپ سے ملایا۔ یہاں جس دن سے جہاز کی تباہی مجسٹن نے سُن پائی تھی۔ غریقِ لجۂ غم تھا، بالے بیٹے کو دیکھ کر سجدہ بدرگاہِ باری کیا، پوتا گھاتے میں ملا، اور کلماتِ شکریہ اس سے کرنے لگا۔ اس نے کہا "بندہ پرور خیر ہے، دنیا اسی کا نام ہے، جس کا کام جس سے نکلے، وہ فخر و سعادت سمجھے۔"

بعد چند روز مجسٹن نے بیٹے سے رودادِ سفر پوچھی، اس نے ابتدا سے انتہا تک سب سرگذشت بیان کی: یہ سن کر سمجھا، مشکل پیچ پڑا، مگر سہل سا یہ جواب دیا "اَلْخَیْرُ بِمَا وَقَعَ"۔ خیریت اسی میں تھی۔ جو ہوا مصرع بر سرِ فرزندِ آدم ہرچہ آید بگذرد۔

بیٹے نے کہا "مناسب یہ ہے کہ اب جلد چلئے، ایسا ملک مالا مال، یہ دولت لازوال، ہاتھ سے نہ دیجئے۔"

مجسٹن نے کہا: "خیر ہے یہ بھی ایک فسانہ تھا، جو میں نے سُنا، اور خواب تھا، جو تو نے دیکھا۔ لا اعلم ؎

ایامِ وصال و صحبتِ سیم تناں   در عالمِ خواب احتلامے شد و رفت

اس نے کہا۔ "آپ سا عقلمند ایسا کلمہ فرمائے تو نہایت بعید ہے۔ دنیا میں تین مرکے ہیں زر، زن، زمین۔ یہ سامان سب جمع ہیں۔ اگر آپ نہ جائیں گے فدوی تنہا جائے گا۔"

مجسٹن نے کہا "افسوس! ہم تجھے دانا جانتے تھے۔ اِلّا ہماری نادانی تھی، حمق کی مقتضی تمھاری نوجوانی تھی، اے بھائی! کوئی نادان سے نادان عورت کی بات کا دھیان نہیں کرتا، یہ باتیں جب تک تھیں، جو تم اور وہ باہم تھے، وہ مونس تھی، تم ہمدم تھے، اب خیریت ہے۔ سعدی ؎

زن دوست بود ولے زمانے　　تا جز تو نیافت مہربانے

چو در برِ دیگرے نشیند　　خواہد کہ ترا دِگر نہ بیند

مصرع ؎ اسپ و زن شمشیر وفا دار کہ دید

ہر چند اُس نے مغز خالی کیا، یہ مقدمہ اس پہ حالی کیا، وہ بے مغز نہ سمجھا۔

مصحفی ؎ سودِ نصیحت کا نہیں عاشق کو　　میں نہ سمجھوں تو بھلا کیا کوئی سمجھائے مجھے

ناچار مجسٹن نے کہا۔ "تم جب تک ذلّت نہ اُٹھاؤ گے، اور ہمیں خراب نہ کر دگے، اس حرکتِ بیجا سے باز نہ آؤ گے، نہ چین لو گے۔"

اسی دن سامانِ سفر درست کیا، بہت سے جہاز مع اسباب اور چند مشیرِ خوش تدبیر ہمراہ لے، روانہ ہوا۔ چند روز میں وہ جزیرہ ملا، جہازوں کا لنگر ہوا۔ مجسٹن کا بیٹا اترا، مگر جہاں ویرانہ بوم و غول کا آشیانہ تھا، وہاں بستی دیکھی، اور جس جگہ بیہڑ تھا، اسے ہموار پایا، بلندی نظر آئی، نہ پستی دیکھی، آدمی ہر سمت سرگرمِ کاروبار، شہر پناہ تیار۔ اسے تعجب ہوا، سمجھا کہ میں بھول گیا۔ کسی سے پوچھا "اس شہر کا نام کیا ہے، والیِ ملک کون سا ہے۔"

وہ بولا "مدت سے یہ ملک بہ سبب آفتِ آسمانی اجاڑ ہو گیا تھا۔ رعایا برایا، بلکہ بادشاہ بھی نہ بچا تھا، فقط بادشاہ کی بیٹی باقی تھی، اب برس دن سے اُس نے شوہر کیا ہے، شہر از سرِ نو آباد ہوا، نیا طرز ایجاد ہوا، یہاں مفسد ہے نہ ڈنڈی ہے، نام اس کا شہزادی سنڈی ہے۔"

مجسٹن نے یہ ماجرا اُن بیٹے سے کہا "خوش تو بہت ہوئے ہو گے، دیکھ لیا، پھر چلو۔"

اُس نے کہا "اتنی سفر کی صعوبت اٹھائی، اس کی صورت بھی نظر نہ آئی، دو باتیں کروں تو پھر چلوں۔"

مجسٹن نے کہا "یہ مصیبت کچھ نہ تھی، جو بات کرنے میں ایذا اٹھے گی۔"

وہ کب مانتا تھا۔ انھیں لوگوں سے پھر پوچھا۔ "شہزادی کبھی سوار بھی ہوتی ہے؟"

وہ بولے "روز"۔

غرضکہ سواری کا وقت دریافت کر لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر سرِ راہ کھڑا ہوا کہ شہزادی شب دیز کو مہمیز کرتی آ پہنچی۔ یہ پکارا "ہم نے ایفائے وعدہ کیا حاضر ہوئے اور لڑکا بھی فضلِ الٰہی سے سلامت موجود ہے، کیا ارشاد ہوتا ہے؟"

اس نے بیگانہ وار جیسے کسی اجنبی کو کوئی دیکھتا ہے، گھورا مگر جواب کچھ نہ دیا، چلی گئی۔

یہ خفیف گھر پھرا۔ مجسٹن نے حال پوچھا، بولا "ملاقات نہ ہوئی، کل پھر جاؤں گا۔"

اس نے کہا "صبح کا جانا روزِ الم شامِ غم دکھائے گا، بہت پچھتائے گا۔"

اس نے دوسرے روز بیٹے کو سکھایا کہ جب سواری قریب آئے گھوڑے سے لپٹ جانا اور یہ زبان پر لانا کہ "دنیا کا لہو سفید ہو گیا، مہرِ مادری سے محبتِ پدری میں لطف زیادہ پایا کہ ہمیں ساتھ بہ آرام تمام لیے پھرتا ہے۔ تم بات بھی نہیں پوچھتی ہو، بلکہ پہچانتی نہیں۔"

جس دم سواری قریب آئی تو یہ بہت جلا تھا اور سمجھ چکا تھا کھیل بگڑ گیا، کہا "شہزادی باگ کو روکو وہ خود تو رکی تھی باگ بھی رک گئی۔ پسر مجسٹن بولا۔ مولف

یاد ایام کہ نفرت تھی زمانے سے تجھے — ہوئی وحشت تھی بہت غیر کے آنے سے تجھے
خوف آتا تھا کہیں آنے سے جانے سے تجھے — مکر تھا یاد، خبر تھی نہ بہانے سے تجھے
بیدھڑک غیر سے باتوں کا کبھی طور نہ تھا — ہمیں ہم تھے تری صحبت میں کوئی اور نہ تھا

کبھی چوٹی کی خبر تھی، نہ تھا کنگھی کا خیال — بارہا الجھے ہی رہتے تھے ترے سر کے بال
پان کے لاکھے سے اور مسّی سے ہوتا تھا ملال — مجھ کو افسوس یہ آتا ہے کہ گزرا نہیں سال
ایسی کیا بات ترے دل میں سمائی ظالم — دفعتاً سب وہ رہ و رسم بھلائی ظالم

تھی لگاوٹ ہی تجھے یاد نہ خلطا سب سے — گرمجوشی کا بھلا کب تھا یہ لپکا سب سے
بیٹھنا کونے میں ہر دم تجھے تنہا سب سے — تجھ کو لگ چلتے کبھی ہم نے نہ دیکھا سب سے
اب تو ٹٹی میں کیا چھید غضب تو نے کیا — کھل گیا سب یہ ترا بھید غضب تو نے کیا

فکر صد شکر ہوئی جلد رہائی تجھ سے — اب تو تا حشر مکدّر ہے صفائی تجھ سے
وضع اپنی نہیں کیا کیجیے برائی تجھ سے — نہ ملیں پر جو کہے ساری خدائی تجھ سے
بخدا ملنے سے ہم ہاتھ ترے دھو بیٹھے — خوش رہو تم کہ تمھیں کھول کے دل رو بیٹھے

اب قسم کھاتا ہوں، لو دل نہ لگاؤں گا کبھی | ذلت و رنج نہ اس طرح اٹھاؤں گا کبھی
گر طرحدار بھی اس دہر میں پاؤں گا کبھی | ربط تو کیا ہے نہ میں پاس بٹھاؤں گا کبھی
موسم اب دل کے لگانے ہی کا جاتا نہ رہا | ربط کیا خاک کریں ہم وہ زمانہ نہ رہا
بر زباں یاروں کے یہ ذکر رہے گا ہر بار | گو کہ عاشق تھا مگر تھا یہ بڑا غیرت دار
دیکھ بد وضع کیا دیکھئے ایسا انکار | سر پٹک مر گئے سب پہ نہ ملا وہ زنہار
کرے معشوق کسی سے تو دغا ایسی کرے | پیچ کرے بات کی عاشق تو بھلا ایسی کرے

یہ سن کر وہ شرمندہ ہوئی، پھر لڑکا گھوڑے سے پلٹا۔ یہ بیچارہ نادان باتوں کا سود و زیاں کچھ نہ سمجھا، جو کچھ کہ باپ نے سکھایا تھا کہنے لگا۔ جب کہہ چکا، شہزادی نے پنجۂ تہور سے کھینچ لڑکے پر جھونک دیا۔ وہ دھم سے گر پڑا، دایۂ اجل نے کنارۂ عاطفت میں اٹھا، اہل قبور سے ملا دیا، پھر باگ اٹھا چل نکلی۔ مجسٹن کے بیٹے نے بہت خاک اڑائی، بیٹے کی لاش باپ کو دکھائی۔ اس نے کہا "کیوں جو ہم نے کہا تھا، وہی آگے آیا۔"

وہ بدنصیب بولا۔ "صبحِ اختتام ہے، جو ہونا ہے ہو جائے گا۔"

مجسٹن نے کہا "تو اپنا بھی حال ایسا ہی بنائے گا۔"

سحر دم جب وہ چلا، مجسٹن کا جی نہ رہ سکا۔ ساتھ ہوا۔ جس دم شہزادی کی سواری پاس آئی باگ پکڑ لی، ہنوز زبان نہ ہلائی تھی، شہزادی نے کہا "اے مجسٹن! ہم نے سنا تھا کہ تو مردِ جہاں دیدہ و سرد و گرمِ روزگار چشیدہ، تجربہ رسیدہ ہے، مگر افسوس بہ ایں ریش و فش، تو نے سُنا نہیں۔ لااعلم

ز حادثاتِ جہاں بس ہمیں پسند آمد | کہ خوب و زشت بد و نیک در گذر دیدم

اس پیرانہ سالی میں تجھ پر ہزار سانحے گذرے ہوں گے، کچھ الم و رنج کا مزا یا فرحت و خوشی کا نشہ باقی ہے؟ اے نادان دنیا میں کس کس بات کو یاد کیجئے، کس کا غم، کس سے خاطر شاد کیجئے، اگر عقل رسا یا کچھ فہم و ذکا ہو تو دنیا میں کافی ہے یہ بات، "گذشتہ را صلوات۔"

مصحفی ؎

اے مصحفی میں روؤں کیا پچھلی صحبتوں کو | بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

یہ کہہ کر گھوڑا چچکارا کہ پھر سلسلۂ جنبانی اس امر بے معنی کی موجب مضرتِ جاں جاننا۔"

مجسٹن نے بیٹے کو سلام کیا اور کچھ کلام کیا، وہ بھی نطفہ ضعیف کا پیدا، بوڑھے باپ کا بیٹا

تھا، محجوب وطن پھرا، جیتے جی باپ سے آنکھ چار نہ کی۔

پھر اس انگریز نے کہا "مطلب اس حکایت سے یہ ہے کہ آدمی وہ بات نہ کرے، جس کا حصول ذلّت و خفت ہو، کہو اب کیا کہتے ہو؟"

یہ قصہ سُن کر وہ فرہادِ بے ستون، عشقِ شیریں زبانی سے یہ کہنے لگا۔ بقول استاد ؎

کب تلک جیوں گا میں موت اک دن آنی ہے ہجر میں جو آجاوے عین مہربانی ہے

سب جلسہ سر پٹک کر اُٹھ کھڑا ہوا کہا "جب یہ جان گنوائے گا۔ تب جھگڑا جائے گا۔"

آخر کار جب اس کا حال ردی ہوا، دوستوں کو چٹھیاں لکھ کر جمع کیا "کل اس مقام سے ہمارا کوچ ہے۔ اگر ہماری وصیت بجا لاؤ گے، دنیا میں نام حشر کو بخیر انجام ہوگا۔"

سب نے قبول کیا۔ اس نے کہا "بعد انتقالِ روح، ہمارا جنازہ تکلف کا بنا کر بجرے کی چھت پر، صندوق میں نعش دھر، باجے بجاتے، ہمارے معشوق کی کوٹھی جو لبِ دریا ہے، اس کے نیچے سے لے جانا اور دل میں یہ تھا۔ استاد ؎

ساتھ وہ میرے جنازے کے لحد تک آئے اے اجل تیرا قدم مجھ کو مبارک ہووے

غرض کہ رات کو اُس مریضِ فرقت کا، ہجر میں وصال ہوا، اس جہان سے انتقال ہوا۔ گویا

مرنے کو بھی لوگ کہتے ہیں وصال یہ اگر سچ ہے تو مرجاتے ہیں ہم

مولف

مر کے حاصل کیا فرقت ہی میں لو نامِ وصال جان دی ہم نے مٹایا ہے خلش ہجراں کا

صبح کو یہ خبر عام ہوئی کہ سوداگر بچے کے عاشقِ محرومِ ناکام کا کام تمام ہوا، مرگیا۔ شدہ شدہ سوداگر کو اور اُس ماہ پیکر کو، یہ حال معلوم ہوا، جذبِ محبت سے حال تغیر ہوا، مگر ضبط سے کام لیا، دلِ بیقرار کو تھام لیا، انگریز جمع ہو، بصد پریشانی وصیت بجا لائے، جنازہ درست کر، بجرے کی چھت پر دھر، لباس سب نے سیاہ کیا، بلند نالہ و آہ کیا، سرنگے باجے بجاتے چلے، عجب سانحہ تھا۔ ہزارہا زن و مرد کنارے کنارے گریاں چلا آتا تھا، جس نے صندوق کی طرف دیکھا، فریاد مچاتا تھا، اُسی دن سے دریا دریا اشک، ہر بحر کی چشم سے رواں ہے۔ مثلِ سیماب بیقرارانہ دواں ہے۔ اور جسے احباب حباب کہتے ہیں، یہ فرطِ قلق سے ہر محیط کی چھاتی میں، پھپھولا پڑتا ہے اور پھوٹتا ہے، موجوں سے تلاطم نہیں چھوٹتا ہے، ماہیانِ دریا کا خنجرِ الم سے جنجر یعنی گلا زخم دار ہے، سنانِ غم سینہ کے پار ہے۔ ساکنانِ دریا کو بسکہ شمشیرِ عشق کا خوف و خطر ہے، اس ڈر سے

ہر سنگِ پشت کی پیٹھ پر سپر ہے۔

خلاصہ یہ کہ اسی صورت سے جنازہ اس کی کوٹھی تلے آیا، اور صندوق سے اُس زندۂ جاوید نے بہ آواز بلند سنایا، اُستاد ؎

اے فلک آخری پھیرا ہے نہ ہو تجھ سے گر اور　　اُس کے کوچے میں جنازہ مرا سنگین تو ہو

اُسی وقت وہ مہ پارا، کششِ دل اور طپش متصل سے مطلع ہو، دیوانہ وار بیقرار کوٹھے پر چڑھی اور بیتابانہ پوچھا کہ "یہ لاش دلخراش، کس جگرِ پاش پاش کی ہے، کہ صاحبانِ بارگاہِ عشق سے صدائے دور باش، دور باش کی ہے"

وہ بولے کہ "یہ کشتہ تمھارا ہے۔ رنج مفارقت نے آپ کے اسے مارا ہے، افسوس کہ اس بیکس نے جان دی، اور تم کو مطلق خبر نہ ہوئی"

کسی شخص نے عمداً اسے سنا کر یہ شعر پڑھا جرات ؎

مُکر جانے کا قاتل نے نرالا ڈھب نکالا ہے　　سبھوں سے پوچھتا ہے کس نے اس کو مار ڈالا ہے

یہ سنتے ہی وہ نعرۂ جانسوز، آہِ دلدوز، سینۂ بریاں سے کھینچ کر کود پڑی، عشق کا نشانہ دیکھئے، صندوقِ نعش پر گر ٹکڑے ٹکڑے مثلِ جگرِ عاشق زار ہو، خوابِ مرگ میں سو بختِ خفتۂ عاشق جگایا، کششِ محبت نے بچھڑوں کو اس طرح ملایا، دیکھنے والے تھرا گئے، دلگدازوں کو غش آ گئے۔ شہر میں یہ چرچا گھر گھر ہوا، منزلوں یہ اخبار مشتہر ہوا۔ اس کے ماں باپ نے بہت سی خاک سر پر اڑا، دونوں کو پیوند زمین کیا۔ اس عشقِ فتنہ انگیز نے کیا کیا نہیں کیا، تہ خاک ہجر کے ماروں کو، بیقراروں کو قرار آیا، ہزارہا شخص دیکھنے کو، سر مزار آیا۔ مطابق قول میر تقی ؎

حیرتِ کارِ عشق سے مردم　　شکل تصویر آپ میں تھے، گم
کام میں اپنے عشق یکتا ہے　　ہاں یہ نیرنگ ساز یکتا ہے
جس کو ہو التفات اس کے نصیب　　ہے وہ مہمان چند روز غریب
ایسی تقریب ڈھونڈ لاتا ہے　　کہ وہ ناچار جی سے جاتا ہے۔
کون محروم وصل یاں سے گیا　　کہ نہ یار اس کا اس جہان سے گیا

پھر یہاں سے خامۂ مصیبت نگار حالِ ملکۂ زار لکھتا ہے کہ آخر کار جی بہ تنگ ہوا، تپ دوری سے یہ ڈھنگ ہوا۔ استاد ؎

لگے زمیں پہ اب سب آثار نے ہم کو　　یہ دن دکھائے ترے انتظار نے ہم کو

فراق میں ترے بن موت اب تو مارا ہے — تڑپ تڑپ کے دلِ بیقرار نے ہم کو
جب اپنا آہ دمِ نزع کنٹھ بیٹھ گیا — تم آئے بالیں پہ اُس دم پکارنے ہم کو

صبح سے تا شام، ٹکٹکی جانبِ در، دستِ تاسف بر سر، اور ہر دم یہ کلمہ زبان پہ استاد ؎

زبسکہ رہتا ہے آنے کا اس کے دھیان لگا — صدائے در پہ ہے در پردہ اپنا کان لگا
بیادِ زلف نہ تا دُورِ آہ سب پہ کھُلے — میں منھ پہ اس لئے رہتا ہوں بیچوان لگا
ہزار خوار ہوئے تجھ سے عندلیب یہاں — یہ بے ثبات چمن ہے نہ آشیان لگا

آخر کثرتِ انتظار سے، نظر کمی کرنے لگی، اور جانِ زار تڑپنے سے، دل بیقرار کے برہمی کرنے لگی یہ نوبت آئی ؎

گئے دن ٹکٹکی کے باندھنے کے — اب آنکھیں رہتی ہیں دو دو پہر بند

اس وقت کششِ محبت، ملکہ مہر نگار نے، جانعالم کے دل کو بیچین کیا، خیال آیا کہ خدا جانے صدمۂ فرقت سے اس کا کیا حال ہوگا، دل نے کہا جینا وبال ہوگا۔ گھبرا کے دست پاچہ ہوا، عیش و نشاط بھولا؛ یہ تازہ گل پھولا، انجمن آرا سے کہا: "زیادہ طاقت مفارقتِ احبابِ وطن مجھ خستہ تن کو نہیں، آج بادشاہ سے رخصت خواہ ہوں گا۔" بہر حال اطاعت اور رضا اس کی جمیع امور پر مقدم جانتی تھی، کہا "مجھے بھی تمنائے سیر کوہ و بیابان، بے بیاں ہے۔" شہزادہ موافق معمول دربار میں حاضر ہوا اور سلسلۂ سخن بہ طلب رخصت وطن کھولا، بادشاہ محزون و غمناک ہو، فرمانے لگا "یہ کیا کہا جو کلیجہ منھ کو آنے لگا، جانِ من تابِ جدائی نہیں، رخصت بادیہ پیمائی نہیں، اگر خواہش سیر ہے، تو فضا اس نواح کی جا بجا مشہور ہے۔ خزانہ موجود، فوج فرمانبردار، ملک حاضر، جو منظور ہے۔"

جانِ عالم نے دست بستہ عرض کی "اے شہریار! با وقار پُر تمکین برس دن میں حضور کو مجھ غمگین سے یہ محبت ہوئی کہ مال و ملک سلطنت، بلکہ جان تک سے دریغ نہیں، وائے بر حالِ مادر پدر، سوختہ جگر جنھوں نے لاکھوں منتوں، کروڑ مرادوں سے، دن کو دن، نہ رات کو رات، جان کر سولہ سترہ برس دنیا کی خاک چھان کر، مجھ کو پالا، ولولۂ طبیعت نے گھر سے نکالا، اب مدتِ مدید، عرصہ بعید گذرا، انھیں میرے مرنے جینے کا حال معلوم نہیں، ان کے صدمے کو غور کیجئے، رخصت بہر طور دیجئے، آدمیت سے

بعید ہے، آپ عیش و نشاط کرے، ماں باپ کو رنج و تعب میں چھوڑ دے، امیدوار ہوں۔ اس امر میں حضور در کدّ نہ کریں، بکشادہ پیشانی اجازتِ وطن دیں، اگر حیات مستعار، ذلیت ناپائدار باقی ہے، پھر شرف آستان بوس حاصل کروں گا، نہیں تو اس فکر میں گھٹ گھٹ کے مروں گا۔ دین برباد ہوگا، دنیا میں عزت آبرو نہ رہے گی، خدا ناخوش ہوگا، خلقت تن پرور، راحت طلب کہے گی۔"

بادشاہ سمجھا یہ اب نہ رکے گا، آنسو آنکھوں میں بھر کر کہا "خیر بابا مرضیٔ خدا، جو تیری رضا، مگر تیاریٔ سامانِ سفر کو چالیس دن کی مہلت چاہیے۔"

جانِ عالم نے یہ بات قبول کی، یہ تو رخصت ہو کر گھر آیا۔ خبرداروں نے اس حال کا خاص و عام میں چرچا مچایا۔ خلاصہ یہ کہ شدہ شدہ، یہ غلغلہ گھر گھر ہوا۔ خورد و کلاں بوڑھا اور جوان شہر کا اس خبر سے باخبر ہوا۔

عزمِ جانِ عالم زرنگار سے سوئے وطن،

تیاری سامانِ رخصت انجمن آرا کی عزیز اقربا سے فرقت اور پہونچنا ملکہ پاس، پھر نکاح کرنا —

چل اے توسنِ خامہ چالاک وچست
کہ اب بیٹھے بیٹھے بہت جی ہے سست
جگہ بیٹھ رہنے کی دنیا نہیں
یہاں خاک بیٹھے کوئی دل حزیں
سفر ہر نفس سب کو رہتا ہے یاں
سرائے فنا بھی عجب ہے مکاں
نہ بیٹھا کبھی جم کے اک جا سرور
قریبوں سے اپنے رہا دور دور

طے کنندگانِ ملکِ معانی، و سیاحانِ اقلیمِ خوش بیانی، بادیہ پیمایانِ بے توشہ، بادِ محبت برسرراہ نوردانِ ہوش باختہ، بے راہ بر، یادِ دلدار در دل، دین و دنیا، فراموش، الم ہمراہ ہر گام نالہ و آہ، تصویرِ یار، ہم آغوش، لکھتے ہیں کہ اس عازمِ سمتِ معشوق، عاشق خصال، کو چلّہ وہیں گذرا، سامانِ سفر تیار ہوا، اب صبح کو اُس چلّہ نشینِ حجرۂ محبت کی رخصت ٹھہری، سرِشام بادلِ ناکام، بادشاہ دامنِ سحر کی صورت گریباں چاک کر، مع ارکانِ سلطنت، دو کوس شہر سے باہر، سرِراہ دامنِ کوہ پر جا بیٹھا، وزیرِ خوش تدبیر سے فرمایا کہ "تم شہزادے کو رخصت کرو، ہم یہاں سے جلوس، سواری، سامانِ سفر دیکھ لیں گے،" یہ خبر اہلِ شہر کو معلوم ہوئی تمام

خلقت پانچ برس کا لڑکا، پچانوے برس کا بوڑھا، رنڈی مرد، دوسرے ٹیکرے پہ اسی دم جمع ہوا۔ جھٹپٹے وقت جانعالم نے سواری طلب کی، ہر کاروں نے حضور میں عرض کی۔ بادشاہ راہ کی طرف متوجہ ہوا، روشنی نمود ہوئیں، پلٹنیں آئیں، سجی سجائیں، توپخانہ گذرا، پھر بارہ ہزار ہاتھی سواری کا، ہودج و عماری کا، ہزار بارہ سو جنگی گاڑہ مست، ایک سے ایک زبردست، چاروں بھٹیاں ٹپکتیں، بان، پٹے، سونڈوں، میں چڑھے، بھسونڈے رنگے، طلائی، نقرئی، زنجیریں کھنکتیں، جھولیں زربفت کی، نئے نئے رسے، کلابتوں کے ہیکلیں، جڑاؤ مغرق گجگاہیں پڑیں۔ دو رویہ اس انداز کی کہ اگر اصحاب فیل، انھیں دیکھتے خوف کھاتے، کبھی کعبہ ڈھانے نہ آتے فیلبان زربفت کی قبا یا کمخواب کی پہنے، جوڑیدار پگڑیاں باندھے، کمر میں پیش قبض یا کٹار، ہاتھوں میں گجباگ، جواہر نگار، مستوں کے ساتھ، دو بوڑے بردار، ایک چمکتا سنڈا، ہاتھ میں ڈنڈا، دو برچھی والے، دیکھے بھالے، آگے نہ پیچھے تریل قریب، سانٹھ مار۔ برابر دو سوار، پھر کئی لاکھ سواروں کے پرے، ہاتھیوں سے پرے پرے، سرتاپا، لوہے کے دریا میں ڈوبے، بیس اکیس برس کا ہر شخص کا سن، شباب کی راتیں، جوانی کے دن، خود بکتر زرہ پہنے، بائیں دہنے چار آئینہ فولادی میں ہر دم روئے مرگ معائنہ کرتے، ہاتھوں میں داستانے، خانہ جنگوں کے بانے، دو تلواریں، ایک قاش زین میں، دوسری ڈاب میں۔ تپنچے کی جوڑیاں قبور میں، نشۂ بہادری سے سرور میں۔ کمر میں قرولی، یا کٹار آبدار، سپر پشت پر، برچھا ہاتھ میں، تیکھا پن ہر بات میں، مثل نہنگان بحر ہیجا و شیران کُنام وغا، مونچھوں کو تاؤ دیتے، ہر بار نوک کی لیتے، گھوڑے وہ خوش خرام کہ سمند سبز فام، جس کا قدم دیکھ کر آج تک چال بھولا ہے۔ دیکھنے والے کہتے تھے، چمن رواں کیا پھلا پھولا ہے، دو صفیں باندھے ہوئے، بیچ میں پنج شاخے روشن، گھوڑے کُداتے، جوبن دکھاتے، چلے گئے۔ پھر ہزار بارہ سو سانڈنی سوار، خوش رفتار، زرد زرد قبائیں، دربر سرخ پگڑیاں سر پر، آبی بانات کے پاجامے پاؤں میں، ہتھیار لگائے، مہاریں اٹھائے، ستاروں کی چھاؤں میں، سانڈنیوں میں دو دو سو کوس کا دم، ہر قدم گھنگھرو کی چھم چھم بجتی فلک اب تک بلبلاتا ہے، جب ان کا دھیان آتا ہے، قدم قدم پہ جب بڑھے، تو سواری کے خاصے نظر آئے، عربی، ترکی، تازی، عراقی، یمنی ادر کاٹھیاواڑ کا دکھنی، وہ وہ گھوڑا جو ابلق لیل و نہار کی نظر سے نہیں گذرا، ہڑانہ موترانہ رس کا خلل، ڈنگ اجاڑ، نہ کھونٹا اکھاڑ، سانپن نہ ناگن، عقرب نہ ارجل، شب کور نہیں، منھ زور نہیں، کم خور، نہ مٹھا نہ گھوٹا، بال بھونرے

سے صاف، حشری، کمری، کہنہ لنگ نہیں، سینہ تنگ نہیں، ہمہ تن اوصاف، کسی پر جڑاؤ زین بندھا، کسی پر چار جامہ، دوال کو کسا، کسی کی فقط گردنی الٹی گنڈہ، پٹہ ساز، یراق جواہر نگار، پوزی دمچی، طرحدار کلغی لگی، پاکھر پر تکلف، پٹھوں پر پڑی، دوگاما گام، شہ گام، یرغہ ایبیہ، لرجوا، ڈلکی کا مینجا الیل کرتا؛ جلودار، چنور لئے مشغول، مگس رانی میں ہمرکاب تپائی بردار، معقول سرگرم جانفشانی میں۔ باگ ڈوریں، پرزر سائیس لے کر نکلے، اُن کے بعد نوبت نشان، ماہی مراتب، علم اژدہا پیکر، جلو میں نصرت و ظفر، بڑا جلوس، نہایت کرّ و فر آیا، نوبت کی ندا، جھانجھ کی جھانجھ سے صدا، قرنا کا شور و غل، شہنا میں بھیروں بھباس کے سُر، بالکل۔ نقیب اور چوبداروں کی آواز پر سوز و گداز، عجب کیفیت کا عالم تھا، اور ہر نقارہ لئے شتری اور فیلی سے گوش کرد بیان کر ہوا جاتا تھا۔ ایک طرف شہر کے لڑکوں کا غول، "بچا دے، بچا دے" کا غل مچاتا چلا آتا تھا۔ میر سوز ؎

کہے تو مہر و مہ لے کر عصائے نور ہاتھوں میں
یہی کہتے تھے گردوں پر ادب سے اور تفاوت سے

پھر شکار کا سامان، میر شکار لائے، بازِ آہنی چنگال، تیز بال، بحری باشے، شاہین عقاب، فلک سیر، جہاں کے طیر، ان کے قریب تازی، ولایتی کتے، بودار گلڈانک تازی، جانبازی کرنے والے۔ چیتے جو دشمنوں کا بُرا چیتے بلکہ لہو پیتے، سیاہ گوش در آغوش، ہرن لڑنے والے، خانہ زاد گھر کے پالے، اُن کے بعد ہزارہا سقّہ، خواجہ خضر کا دم بھرتا، چھڑکاؤ کرتا، کمر میں کھاروے کی لنگیاں، شانوں پر بادلے کی جھنڈیاں، مشکوں میں بید مشک بھرا، دہانے میں ہزارے کا فوارہ چڑھا، متعدد غلام بادلہ پوش، حلقہ بگوش، ہاتھوں میں ہیرے کے کڑے پڑے، منقل انگیٹھیاں، سونے چاندی کے لئے عنبر و عود جھونکتے نکلے۔ پھر تو کوسوں تک جنگل رشکِ ختن و تاتار، مثل طبلۂ عطار ہوگیا۔ ان کے متصل دو ہزار لالٹینیں والے، کمسن، بلور کی صاف صاف شفاف لالٹینیں لئے، شمع مومی و کافوری، روشن کئے، وہ سب غنچۂ دہن، زیب انجمن بڑھے، پھر صدائے اہتمام نقیبانِ خوش گلو چار سو بلند ہوئی اور صبح صادق نے جلوہ دکھایا، ہاتھ کو ہاتھ نظر آیا۔ شاہِ خاور بھی دریچۂ مشرق سے سر نکال، مشغولِ نظارہ ہوا، حسرت میں وطن آوارہ ہوا۔ دمِ سحر، نسیم و صبا کی فر فر، شمع کا جھلملا جھلملا اداس جلنا، سواری کا آہستہ آہستہ چلنا، پہاڑی جانوروں کی سیر، ذکرِ حق میں وحش و طیر، سرسبز درخت لہلہے پھول، رنگ برنگ کے ڈہڈہے، سقوں کی آب پاشی، صدائے نالۂ مرغانِ خوش الحان

سے دلخراشی، خسروِ انجم کا مع ثابت و سیارہ چھپتے جانا، سورج کی کرن کا جگمگانا، پھولوں کی بو باس، چشمہ سرد و شیریں، آس پاس۔ خلق کا مجمع، دامنِ کوہ پر سب کی نگاہ، کبھی اس کیفیت پر، گاہ اُس انبوہ پر، اِدھر مسافروں کی کثرت، اُدھر بادشاہ پُر ارمان، خلقِ خدا باحسرت۔ بچشمِ انتظار، امید وارِ آمد پیادہ و سوار، و تماشائے عجیب روزگار تھے۔ یکایک غول خاص برداروں کا آیا۔ کمخواب کی مرزائی، انگرکھے گجراتی، مشروع کے گھٹنے، دلّی کی ناگوری پاؤں میں، سر پر گلنار اینٹھے، طرحدار خاصیوں کے غلاف، باناتی سقرلاتی، باغ و بہار۔ گرد پوش، ململ کے سینگڑے، ساز مطلا، جھلا جھل کے۔ رفل، چقماق توڑے دار۔ قرابین، شیر بچے جس سے شیر زندہ نہ بچے، جواہر نگار اور برچھی دار، یکے بیش قرار درماہے دار، راکب و مرکب جھگڑے کا عالم۔ گرداگرد بیچ میں شہزادۂ جان عالم، اسپ بادِ رفتار پر سوار، برابر انجمن آرا کا سکھپال، پری تمثال، ہزار پانچسو کہاریاں، پیاری پیاریاں، کمسن جسم گدرایا شباب چھایا۔ نندہیت و اطلس کے لہنگے، مسالہ ٹکا ململ کے دوپٹے، باریک بنت گوکھرو کی کُرتی، انگیا کاشانی مخمل کی کرتیاں کندھوں پر سکھپال کے برابر کچھ اٹھائے، باقی برابر جائے۔ کچھ اِدھر کچھ اُدھر۔ جڑاؤ کڑے، ملائم ہاتھوں میں پڑے۔ پاؤں میں سونے کے تین تین چھڑے۔ کانوں میں سادی سادی بالیاں، نشہ حسن میں متوالیاں۔ کسی کا کان جو آلا تھا تو حسن کی دوکان میں ناز و انداز کا نرخ دوبالا تھا۔ اندازِ ناز نرالا تھا۔ وہ آہستہ تیوری چڑھا کے پاؤں رکھنا، کبھی سسکی جھجکی، بڑی سیر تھی، کئی سو سواری کا دوڑنے والا خواجہ سرا۔ عجیب عجیب طرح کا انکٹا، چشنیں ترکنیں سرگرم اہتمام، خواجہ سرایانِ ذی لیاقت معقول، گھوڑوں پر سوار، بندوبست میں مشغول، جریب زمین میں پڑتی، کوس کا پہیہ ساتھ، زمین کی پیمائش، سواری کی آرائش، بڑا تزک، بہ مرتبۂ کرّ و فر نہایت دھوم دھام، بادشاہ کے پاس آ پہونچے۔

جانعالم نے دیکھا ظلِ سبحانی کے چشمۂ چشم سے جوئے خون جاری، ہچکی لگی، بیقراری طاری، گھوڑے سے کود کر تسلیمات بجا لایا۔

بادشاہ نے بہ قسم فرمایا۔ "اس وقت ہمارے پاس نہ آؤ، خدا کو سونپا، چلے جاؤ۔"

مجبوراً شہزادہ مجرا کر سوار ہوا، جس دم جانعالم نے گھوڑا بڑھایا، تمام خلقت کا جی بھر آیا علی الخصوص بادشاہ کی بیقراری، جانعالم اور انجمن آرا کی گریہ و زاری دیکھ کر، تمام تماشائی واویلا مچا کہنے لگے۔ "آج رونق شہر کی رخصت ہے۔ زینتِ سلطنت کی فرقت ہے، ایسے

مہر و ماہ کے جانے سے شہر میں غدر پڑے گا، اندھیر ہو جائے گا۔ ان کا الم جدائی و رنجِ دشت پیمائی، ہزار روزِ سیہ شامِ غم دکھلائے گا۔"

کہتے ہیں کہ سیکڑوں مرد، رنڈی، اپنے کے سُنتے ہمراہ ہوئے، غریب الوطنی اختیار کی، وہاں بود و باش گوارا نہ ہوئی۔ ان کے بعد چھے سات سو پالکی، نالکی چنڈول، محافہ امیرزادیوں کا، اور انیسوں جلیسوں کی، تین چار سو کھڑکھڑیا اور نفس پیش خدمتوں کا دو تین سو میانہ، چھپلا مغلانی، آتون محلداروں کا، ہزار نو سو رتھ اکبر آبادی، دو برجے سائبان دار، نئے مغرق پردے چمکتے ناگوری بیل جو ثورِ فلک نے نہ دیکھے تھے، جُتے۔ اتا، چھوچھو، چٹھی نویس، باریدار، لونڈیاں، باندیاں، سوار، یہ بھی قطار قطار گذر گئے۔ چھکڑے اونٹ ہاتھی خزانے اور اسباب کے ڈیرے خیمے لدے لدائے کسے کسائے، جکڑے نظر آئے۔ غرضکہ تا شام، بھیر بنگاہ بازاری سرکاری سب لوگ چلے گئے۔ لکھا ہے کہ روپے اور اشرفیاں امام ضامن کی درمِ رخصت اتنی آئیں کہ تمام راہ سید مسافروں نے پائیں اور کھجور کلچوں کا یہ حال ہوا کہ راتب کے سوا ہاتھیوں کو کلچے ملے اور اہلِ لشکر کو بانٹ دیئے، کھجوریں جو بٹ نہ سکیں، راہ میں پھینک دیں، وہ اگیں۔ اسکے درخت اُگے کم تھے، اس دن سے جنگل ہوگئے۔ اس وقت بادشاہ سراسیمہ، بدحواس باحال یاس دولت سرا میں آیا، وہ بسا بسایا شہر لٹا اجڑا ویران نظر آیا، بازار میں جا بجا چراغ گل، سرِ شام پگڑی غائب، اندھیرا بالکل۔ جس طرف دیکھا لوگ تھکے ماندے پھر کر پڑے تھے۔ بازار میں تختے لگے ٹٹر جڑے تھے۔ لوگ سوزِ مفارقت سے دردمند، دوکانیں بند، جو جہاں پڑا تھا، شہزادے کی رخصت کا ذکر کر رہا تھا۔ دو شخص اگر باہم تھے، بادلِ پُر غم تھے کوئی سوتا تھا۔ کوئی چپکا پڑا روتا تھا۔ بستی سنسان، بازار میں سناٹا، خلق خدا اندوہ کی مبتلا، بادشاہ کو دونا قلق ہوا، رنگ فق ہوا، محلسرا میں آیا، وہاں بھی چھوٹے بڑے کو غمگین پایا۔ لوگوں کے عزیز جدا ہوگئے۔ سب اس یوسفِ رفتہ کے زندانِ فراق میں اسیر بلا ہوگئے۔ علی الخصوص انجمن آرا کی ماں جس کی نظر سے وہ چاند سورج چھپ گئے، زمانہ آنکھ میں تیرہ و تار، دل غم سے خار خار حیرت میں نقش دیوار ہو رہی تھی۔ آنکھوں پر زور تھا، رو رہی تھی۔ بادشاہ نے سمجھایا، ہاتھ منھ دھلوایا، کچھ کھلایا۔

یہ تو سب نالۂ بلب آہ در دل، جانِ عالم اور انجمن آرا اُردو بمنزل پانچ پانچ کوس کا کوچ، دو چار دن کے بعد ایک دو مقام براحت و آرام کرتے چلے، فوج ظفر موج ساتھ اردو ئے

معلیٰ کا عجب عالم تھا۔ ایک شہر روز ہمراہ۔ جہان کی نعمت تیار، شام و پگاہ، صراف بزاز، جوہری۔ روپیہ پیسہ اشرفی، کھرے سے کھری۔ ڈھاکے کا ریزہ، بنارس کا گلبدن، گجرات کا کمخواب، الماس زمرد یاقوت، احمر جو چاہو سو لو۔ ایک طرف قصاب اور نانبائی پکی پکائی لئے ہوئے، میوہ فروش، خانہ بدوش، حلوائی مٹھائی درست کئے، مینا بازار، باغ و بہار، جدا جدا، ہر گنج کا جھنڈا گڑا، چوپڑ کا بازار پڑا، جلوخانے کے روبرو نصف گذرے تک دوکانیں کھلیں۔ اکاسی دیا جلتا، بھولا، بچھڑا، اس کی روشنی میں آملتا، کوتوال سرگرم پاسبانی۔ بازاریوں کی نگہبانی، زر نگار وند میں پھنکتا۔

غرض کہ سب خرّم و شاداں رواں تھے مگر جانِ عالم جذبِ محبّتِ ملکہ سے کبھی یہ کہتا تھا شعر

به سامان سفر با خود دلِ رنجیدهٔ دارم
بکف چیز یکه دارم دامنِ برچیدهٔ دارم

ورودِ لشکرِ فیروزی اثر دیارِ ملکۂ مہر نگار میں،

پیر مرد کی ملاقات، اور انجمن آرا اور ملکۂ مہر نگار کی دو بدو گفتگو، پھر جان عالم کا نکاح، بعد رخصت بصد شوکت و حشمت

مشاطۂ خامہ نے عروسِ دلفریبِ سخن کو بصد زیب و زینت، حجلۂ بیان میں اس طرح گویا کیا ہے کہ جس روز ورودِ لشکرِ فیروزی اثر، ملکہ مہر نگار کے باغ سے قریب ہوا، خبر داروں نے یہ مژدۂ جاں بخش فوراً ملکہ کو پہنچایا کہ "مبارک ہو، شہزادہ تشریف لایا۔"

بسکہ غمِ مفارقت سے تاب و طاقت طاق تھی، سنتے ہی غش آیا۔ پھر سنبھل کر فرمایا، بخت خفتہ کب بیدار ہوتا ہے، ایسا پاؤں پھیلائے سوتا ہے اور جو میرا دل بہلانے کو یہ کہتے ہو تو سُن لو۔ مولف ؎

تفریحِ کلفتوں کی ترغیب ہے لاحاصل — بہلانے کی باتیں ہیں یہ دل بھی بہلتے ہیں

چندے جو یہی لیل و نہار ہے، تو قصہ فیصلہ ہے، تدبیر خلافِ تقدیر سراسر بیکار ہے۔

مؤلف ؎

گہ اس کے ہجر میں یونہیں اندوہ گیں رہے — تو ہوئے گا وصال دلا یہ یقیں رہے

ہے احتیاط شرط کہ اس چشم تر پہ آہ — دامن رہے رہے نہ رہے آستیں رہے

مدفن کا اپنے ہم کو تردد ہو کس لئے — کوچہ کی تیرے یار سلامت زمیں رہے

تو گلشنِ وصال کی کر سیر عندلیب
جو جو کہ انتخاب تھے صفحے پہ دہر کے
کس کی خوشی، کہاں کی ہنسی، کیسا اختلاط
چھوٹا نہ نزع میں بھی خیال اس کا اے سرورؔ

ہم خرمنِ فراق کے بس خوشہ چیں رہے
ایسے وہ مٹ گئے کہ نشاں بھی نہیں رہے
ہم کو نہ چھیڑ و تم کہ وہ اب ہم نہیں رہے
دم بھرتے ہم اسی کا دم واپسیں رہے

اس عرصے میں، وہی خواص، دل آرام، بارہ دری سے نیچے اتری پھر کہا۔ "خدا جانے کہاں سے یہ لشکر اترا ہے۔"

ملکہ ہنس کر، بجیلۂ سیر خواصوں کے کندھوں پر ہاتھ دھر، ٹھنڈی سانس بھر کوٹھے پر چڑھی، دیکھا تو فی الحقیقت لشکرِ بے پایاں، سپاہ فراواں ہے، خیامِ شاہی، اِستادہ ہیں، پھرتے چلتے، سوار اور پیادہ ہیں۔

یکایک شہزادہ جانِعالم بچند سوار، اسپِ صرصر خرام، رخشِ تیزگام پہ سوار نظر آیا، یا تو اُسے نچا کھچا، منزلوں کا مارا، دشتِ غربت کا آوارہ دیکھا تھا، اب چم و خم، جاہ و حشم سے پایا، بدن تھرآیا، اعضا اعضا میں رعشہ ہوا۔ یہ زور تماشہ ہوا۔ استاد

آتے ہی ترے چھٹتا ہے رعشہ سا بدن میں
ہر چند کہ ہیں بیٹھے ہر لحظہ سنبھل ہم

وہ زردئ چہرۂ پُرغم، مژدہ وصل کی سُرخی سے بدل گئی، غش سے سنبھل گئی۔ شہزادہ گھوڑے سے اُتر سیدھا ملکہ کے پاس گیا، رسمِ سلام بجا لایا۔ اس نے دعا خیر دے کر چھاتی سے لگایا "للّٰہ الحمد تمھیں بصحت و عافیت اللہ نے کامیاب دکھایا!" پھر انجمن آرا کی سواری آئی۔ تسلیم کی۔ پیر مرد نے فرمایا "شہزادی! فقیر کے حال پہ رحم کیا، اللہ بھلا کرے۔"

اس نے عرض کی کہ "کنیز مدت سے حضور کی، صفت و ثنا ظل سبحانی کی زبانی سنا کرتی تھی، آج شہزادہ کی بدولت، سعادتِ آستاں بوس حاصل ہوئی" — دو گھڑی بیٹھی پھر التماس کیا کہ "اگر اجازت دیجئے، ملکہ کی ملاقات سے مسرور ہوں۔"

اس حق پرست نے فرمایا "اس کا پوچھنا کیا، بابا! بے تکلف، خانہ خانۂ شما است۔"

جان عالم رخصت ہو خیمہ میں آیا۔ انجمن آرا نے ملکہ کے مکان کا رستہ لیا۔ آنے کی خبر پیشتر ملکہ کو پہونچی تھی، سامان اس اجڑے مکان کا درست ہو چکا تھا، جب سواری اتری، لبِ فرش لینے آئی، فراخی سلام کیا، اس نے گلے سے لگالیا۔ ملکہ آبدیدہ ہو کر بولی "تم نے مجھے محجوب کیا، میں فقیر کی بیٹی، تم شہزادی، ہر چند شاہ و گدا دونوں بندۂ خدا ہیں، الّا تمھارے قدم آنکھوں

پر رکھوں تو بجا ہے۔ آپ کے آنے سے مجھے بڑا افتخار حاصل ہوا ہے۔"

انجمن آرا بولی "ہم نے خوب کیا، رنڈی یہ چونچلے کی باتیں بیگانہ وار نہ کرتی، تو کیا ہوتا، اے صاحب! ہمارے تمہارے تو رشتہ، ہمسری، سر رشتہ برابری ہے اور حساب کی راہ سے پہلے تو سلامتی سے تمہیں ہو۔ سرکار کا اُنس ہمیں ملا ہے، پہلے مزا آپ نے چکھا ہے، جوبن لوٹا ہے۔"

غرضکہ دو دو نوکیں ہوگئیں، پھر اختلاط حرف و حکایات، رمز و کنایہ، شب بھر رہے۔ جس وقت عروسِ شب نے مقنعہ مغرب میں منھ چھپایا اور نوشاہ، روزِ مشرق سے نکل آیا، انجمن آرا جانعالم کے پاس آئی، دیر تک اخلاق و محبت، ملکہ کا مذکور کیا کی کہ اس صفت کی عورت آج تک دیکھی تھی۔

دوسرے دن جانعالم نے ملکہ کے باپ سے عرض کی، اَلکَرِیمُ اِذَا وَعَدَ وَفَا۔

اُس سالکِ راہِ حق نے ارشاد کیا "ہم اس لائق کہاں ہیں" لیکن مصرع؎ شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را ــــ تم قول کے پورے، اقرار کے سچے ہو، بسم اللہ اپنے زمرۂ کنیزوں میں، سرفراز کرو، شادی کا نام لینا منھ چڑانا ہے نہ اب وہ ہم ہیں نہ ہمارا زمانہ ہے۔"

آخرش بطورِ شرعِ شریف ملکہ کا نکاح، جانعالم کے ساتھ ہوا۔ اب یہ معمول ہوا کہ ایک شب انجمن آرا کی، دوسری رات ملکہ کی ملاقات ٹھہری، اور ان دونوں میں وہ راہ و رسم، محبت و الفت کی بڑھی کہ شہزادے کی عاشقی نظر سے گر گئی۔ نظری ہوئی اور سچ ہے جو طرفین سے نجیب الطرفین ہوتے ہیں، ان میں رشک و حسد، رنج و ملال، دخل نہیں پاتا، کٹی جلی، ڈاہ، بغض، عداوت، کج بحثی، دانتا کلکل، روز کی تو تو میں میں چھوٹی امت پر ختم ہے، لاکھ طرح انھیں سمجھاؤ، نشیب و فراز دکھاؤ، لیکن ان لوگوں سے بے جھونٹک جھانٹا نہیں رہا جاتا۔ دو دن ایک طرح پر صحبت بمار نہیں آتی ہے۔ زندگی انسان کی تلخ ہو جاتی ہے۔ لاکھ طرح کا غم ہوتا ہے، ناک میں دم ہوتا ہے۔ مولف ؎

عشق میں طرفین سے الفت برابر چاہئے　　　جو بدل بندہ ہو اس کو بندہ پرور چاہئے

داستانِ حیرت بیانِ رخصتِ جانِ عالم

پیر مرد کا عمل بتانا، چلتے وقت وزیر زادے کا مل جانا، انجمن آرا کے میلان سے شہزادے کو بندر بنانا، اس بیچارے کا ہزاروں مصیبت اٹھانا، پھر مع الخیر صحت پانا

مصیبت نگار و مصائب رقم — جگر چاک و مغموم میرا قلم
زمانے کے کچھ طرز لکھتا ہے یاں — عجائب غرائب ہے یہ داستاں
مری بات یارو یہ کرنا یقیں — کسی کا کوئی دوست مطلق نہیں
جو یہ دوست ہیں ایسے دشمن کہیں — نہیں ہیں نہیں ہیں نہیں ہیں نہیں
کیا امتحاں میں نے اکثر سرور — ضرورت کی کچھ دوستی ہے ضرور

قصہ کوتاہ، چندے شہزادہ والا جاہ، وہاں رہا۔ ایک روز یہ سب عاشق و معشوق باہم بیٹھے تھے۔ جانعالم نے کہا "ہمیں وطن چھوڑے، عزیزوں سے منھ موڑے، عرصہ ہوا، ہنوز دلّی دور ہے اب چلنا ضرور ہے!"

وہ دونوں نیک خو، رضا جو بولیں "بہت خوب"۔

اسی روز حرفِ رخصت، ملکہ کے باپ سے درمیان آیا۔ مردِ انجام بیں نے روکنا مناسب نہ جانا۔ سفر کی تیاری ہوئی۔ دمِ رخصت اس قدر مال و اسباب، نقد و جنس کی قسم سے شہزادے

کو ملکہ انجمن آرا کا جہیز بھول گیا اور وقتِ وداع پیر مرد نے با دلِ پُر درد جانعالم سے کہا "فقیر پاس کچھ نہ تھا جو پیش کرتا، مگر ایک نکتہ بتاتا ہوں، جب امتحان ہوگا خزانۂ قارون سے زیادہ کام آوے گا۔ اگر احتیاط کروگے۔"

پھر چند فقرے تنہا لے جا کے بتا کے تاکید سے کہا "اگر یہ مقدمہ حقیقی بھائی سے اظہار کروگے، یاد رکھو حضرت یوسف سے زیادہ صدمے سہوگے۔ زمانے کے اخوان الشیاطین پُر از کید آمادۂ کیں ہیں۔ اسی سبب سے دنیا میں راز کہنا بُرا ہے، چُپ رہنا بھلا ہے۔ یہ نکتہ حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے سب کو یاد ہے کہ دنیا میں برادرِ حقیقی دشمنِ مادر زاد ہے ؎

بھاگ ان بردہ فروشوں سے کہاں کے بھائی　　بیچ ہی ڈالیں جو یوسف سا برادر ہووے

پھر انجمن آرا پاس آ فرمایا "شہزادی! فقیر زادی کنیز کو عزیز جان کر، نظرِ الطاف و کرم ہر دم رکھنا یہ بھی خدمت گذاری میں قصور نہ کرے گی، اسے تم کو سونپا، تمھیں حافظِ حقیقی کے سپرد کیا، لو خدا حافظ۔" سواری دیر سے تیار تھی، لوگوں پر ثابت تھا کہ کوئی امرِ پوشیدہ درویشِ باوقار شہزادے پر بہ تکرار ظاہر کرتا ہے۔ اتفاقاتِ زمانہ، اسی روز وہ وزیر زادہ، جو وطن سے ساتھ نکل، ہرن کے پیچھے، گھوڑا پھینک، دشتِ ادبار میں شہزادے سے جُدا ہوا تھا، سرگشتہ و پریشان پھرتا پھراتا، پیادہ پا، اِدھر آ نکلا، اس نے جو یہ لشکر جرّار اور قافلہ تیار دیکھا، پوچھا "کس کی سواری ہے، کہاں کی تیاری ہے؟"

لوگوں نے تمام جانعالم کا قصہ سنایا۔ یہ خوش ہوا جی میں جی آیا، پوچھا "شہزادہ کہاں ہے؟" وہ بولے "پیر مرد جو یہاں کا مالک ہے، فقیر سالک ہے، کچھ کہنے کو تنہا جدا لے گیا ہے۔"

اس عرصے میں جانعالم رخصت ہو سوار ہوا۔ وزیر زادے نے دوڑ کر مُجرا کیا شہزادے نے گھوڑے سے کود کے گلے لگایا۔ دیر تک نہ چھوڑا۔ اسی دم لباسِ فاخرہ پہنا، ہمراہ سوار کیا، راہ میں سرگذشت تفرقہ پوچھتا لکھتا چلا، جب خیمہ میں داخل ہوا، وزیر زادے کو محلسرا میں طلب کیا۔ انجمن آرا اور ملکہ کو نذر دلوا کہا۔ "یہ وہی شخص ہے جس کا الم مفارقت مدام دل میں کانٹا سا کھٹکتا تھا، جی سینے میں بھٹکتا تھا۔ دیکھو جب اچھے دن آتے ہیں، بے تلاش بچھڑے مل جاتے ہیں۔ جس دن گردوں نے ہمیں آوارۂ دشت ادبار کیا تھا، جدا ہر ایک دوستدار و غمخوار کیا تھا، اب مساعدتِ بخت سے ایامِ سخت دور ہوئے، ہم مجبور ہوئے۔"

وزیر زادے کا حال سنو، انجمن آرا کا حسن و جمال بے مثال دیکھ دیوانہ ہو ہوش و حواس

عقل کھو، نمک حرام بنا، وصل کی تدبیر میں پھنسا۔ استاد ؎

یار اغیار ہو گئے اللہ   کیا زمانے کا انقلاب ہوا

خدا ملے تو ملے آشنا نہیں ملتا   کوئی کسی کا نہیں دوست سب کہانی ہے   استاد

دو چار گھڑی صحبت رہی، پھر اپنے اپنے خیموں میں گئے۔ وزیر زادے کے واسطے خیمۂ عالی اِستادہ ہوا۔ پھر جتنی جلیسیں انیس حسین مہ جبیں، دونوں شہزادیوں کے ہمراہ تھیں، اُسے دِکھا فرمایا ——"جس طرف تیری رغبت ہو دلوادوں۔"

وہ نطفۂ حرام اور خیال میں تھا، عرض کرنے لگا: "میری کیا مجال ہے اور کیا تاب و طاقت ہے جو اُنھیں بُری نگاہ سے دیکھوں۔"

جانعالم بہت رضامند ہوا کہ بڑا نیک طینت صاف باطن ہے۔ بہ اسباب ظاہر اس نظر سے زیادہ مدِ نظر ہوا، دل میں گھر ہوا۔ تمام صعوبتیں حالاتِ سفر رنج راہ نفع و ضرر شہزادے نے بیان کیا، مگر جب پیر مرد کے مشورے کا ذکر آتا، ٹال جاتا۔ وہ سمجھا کچھ اس میں بھید ہے۔

ایک روز ملکہ مہر نگار اور انجمن آرا نے متفق ہو کر، جانعالم سے کہا۔"یہ نیا ماجرا ہے۔ ہر دم ایک شخص غیر اور جوان کو شریکِ صحبت، خلا مِلا رکھنا، کیا مناسب ہے اور دابِ سلطنت سے بھی یہ امر بعید ہے۔ شیطان کو انسان دور نہ جانے، غیر تو کیا اپنے کا اعتبار نہ مانے۔"

جانعالم نے کہا "پھر ایسا کلمہ زبان پہ نہ لانا، اس نے تمہاری لونڈیوں کا پاس کیا، نہ کہ تمہارا حفظِ مراتب اور میں بھی تو ایسا بیہودہ نادان نہ تھا، جو خلافِ وضع حرکت کرتا۔"

ملکہ یہ سُن کر ہنسی، انجمن آرا سے مخاطب ہو کر کہا۔"برائے خدا انصاف تو کیجیے، خاطر کی نہ لیجیے، ان کے حق میں کس بیوقوف کو تامل ہوگا، آپ اگر عقل کے دشمن نہ ہوتے، تو کیوں حوض میں کود کر ساحرہ کی قید میں پھنستے، نام ڈبوتے، تو بھلا سچ کہو، شرمندہ نہ ہو، جی میں کیا سمجھے تھے، جو کود پڑے، ذرا یہ خیال نہ آیا، غواصِ فکر کو محیط تامل میں غوطہ زن نہ فرمایا کہ کہاں انجمن آرا، کجا جنگل کا حوض، وہ اس میں کیونکر آئی۔ وہ از نسلِ شاہی تھی، یا از خاندانِ ماہی تھی۔"

جانعالم کھسیانا ہو گیا، کہا: "بات اور مسخراپن اور کہاں کا ذکر، کس جگہ ملایا، کیا میری حماقت کا موقع تمہارے ہاتھ آیا۔ یہ تو سمجھو۔ شعر ؎

عشق ازیں بسیار کردست و کند   سبحہ را زنار کردست و کند

استاد ؎ کہتے ہیں جسے عشق وہ از قسم جنوں ہے   کیونکر حواس اپنے میں پاتے ہیں خلل ہم

بھلا اپنی باتیں تم یاد کرو، دل میں منصف ہو۔"

ملکہ نے کہا "دیکھا، آپ شرمائے تو یہ کہانی لائے، میں تو رنڈی ہوں۔ ناقص عقل سب کہتے ہیں۔ بھلا صاحب! اگر مجھ سے بیوقوفی کی حرکت ہووے، تعجب نہیں، لیکن شکر کرنے کی جا ہے کہ آپ کا مزاج بھی میرا ہی سا ہے۔"

آخر یہ بات ہنسی میں اُڑ گئی۔ مگر وہ مکار ہر کوچ و مقام میں وقت کا منتظر تھا۔ ایک روز غم اندوز شہزادے کا خیمہ، صحرائے باغ و بہار، دشتِ لالہ زار، مگر ہمہ تن خار خار، ہمراز آزار میں ہوا۔ فضائے صحرا نے کیفیت دکھائی، پھولوں کی خوشبو دماغ میں سمائی، جا بجا چشمے رواں دیکھ کر، یہ لہر آئی کہ تنہا وزیر زادے کا ہاتھ پکڑ، لبِ چشمہ جا بیٹھا۔ کشتی شراب کی طلب ہوئی۔ جس دم جانعالم کی آنکھوں میں سرور آیا، اختلاط کا زبان پر مذکور آیا۔ اس دغا شعار غدار نے وقتِ تنہائی صحبت بادہ پیمائی، نشے کی حالت، غنیمت جانی، رونے لگا۔

شہزادے نے ہنس کر کہا "خیر ہے؟"

وہ بولا "جو جو شرطِ رفاقت، حقِ خدمت دنیا میں ہوتا ہے، غلام سب بجا لایا، مگر محنت و مشقت غریب الوطنی، دشت نوردی، کا عوض خوب بھر پایا۔ جب آپ سا قدر داں بات کو چھپاوے تو پھر اور کسی سے کس بات کی اُمید رہے۔"

جانعالم نشے میں انجام کار نہ سوچا۔ اس فیلسوف کے رونے سے بےچین ہو گیا کہا۔ "اگر تجھے یہی امر ناگوار ہے تو سُن لے جو اسرار ہے۔ مجھے ملکہ کے باپ نے یہ بات بتائی ہے کہ جس کے قالب میں چاہوں، اپنی روح لے جاؤں"۔

اس نے پوچھا "کس طرح؟"

شہزادے نے ترکیب بتا دی۔ جب وہ سب سیکھ چکا، بولا "غلام کو بے امتحان غلطی کا گمان ہے۔"

شہزادہ اُٹھ کر جنگل کی طرف چلا۔ چند قدم بڑھ کر، بندر مردہ دیکھا کہا "دیکھ میں اس کے قالب میں جاتا ہوں۔" یہ کہہ کر شہزادہ زمین پر لیٹا بندر اُٹھ کھڑا ہوا۔ وزیر زادے کو سب ڈھنگ یاد ہو گیا تھا، فوراً وہ کور نمک زمین پہ گرا، اور اپنی روح جانعالم کے قالبِ خالی میں لا کھڑا ہوا اور کمر سے تلوار نکال، اپنا جسم ٹکڑے ٹکڑے کر کے دریا میں پھینک دیا، شہزادے کا نشہ کرکرا ہوا، سمجھا بڑی خطا ہوئی، از ماست کہ بر ماست، خود کردہ را علاجے نیست۔

وہ کاذ بندر کے پیچھے دوڑا، شہزادہ بے چارہ بھاگ کر درختوں کے پتّوں میں چھپا، پھر تو بدلجبی تماموہ نطفہ حرام، لہو کپڑوں پر چھڑک، بیدھڑک ملکہ کے خیمے میں آیا، رویا پیٹا چلایا کہا۔ "اس وقت ظلم کا حادثہ ہوا۔ میں وزیر زادے کے ساتھ سیر کرتا تھا، یکایک جنگل سے شیر نکلا، اسے اٹھالے چلا۔ ہر چند میں نے جانبازی سے شیر کو تہ شمشیر کیا، زخمی ہوا، مگر اُسے نہ چھوڑا لے ہی گیا۔"

ملکہ نے تاسف کیا، سمجھایا "قضا سے کیا چارہ۔ یہی حیلۂ مرگ اس کے مقدر میں تھا۔" پھر انجمن آرا کے پاس گیا، وہاں بھی یہی اظہار کیا، الّا گھبرایا ہوا، باہر چلا گیا۔ ملکہ انجمن آرا کے خیمہ میں آئی۔ وزیر زادے کا مذکور آپس میں رہا، لیکن ملکہ کو قیافہ شناسی کا بڑا ملکہ تھا، پریشان ہو کر یہ کلمہ کہا۔ "خدا خیر کرے، آج بہت شگونِ بد ہوئے تھے۔ صبح سے داہنی آنکھ پھڑکتی تھی، راہ میں ہرنی اکیلی رستہ کاٹ میرا منھ تکتی تھی، اپنے سائے سے بھڑکتی تھی۔ خیمے میں اُترتے وقت کسی نے چھینکا تھا، خوابِ متوحش نماز کے وقت دیکھا تھا، تم بھی فضلِ الٰہی سے عقل و شعور رکھتی ہو، آج کی حرکتیں شہزادے کی غور کرو، خلاف عادت ہیں، یا مجھی کو وہم بے جا ہے۔"

انجمن آرا نے کہا "تم جانتی ہو، وزیر زادے سے محبت کیسی تھی، رنج و الم بُرا ہوتا ہے، بدحواسی میں کیا ہوتا ہے۔"

القصہ وہ شب ملکہ کے پاس رہنے کی تھی۔ اسے اندر کا حال کیا معلوم تھا، طبیعت کے لگاؤ سے انجمن آرا کے خیمے میں آگیا۔ جس وقت پہر بجا، ملکہ انتظار کر کے وہاں گئی، دیکھا شہزادہ مضطرب بیٹھا ہے مگر اِس نے پوچھا "آج کہاں آرام کرو گے؟"

وہ ہچک کر بولا۔ "جہاں تم کہو۔"

ملکہ نے کہا۔ "یہیں سو رہو۔"

شہزادے نے کہا "خوب" — یہ کلمہ بھی خلافِ دستور ظہور میں آیا۔ اس کا 'خوب' کہنا، ملکہ نے بُرا مانا۔ انجمن آرا کا ہاتھ پکڑ کر اپنے خیمے میں لائی، روئی، پیٹی، چلائی۔

انجمن آرا بولی "ملکہ خدا کے واسطے کچھ مفصل بتاؤ۔"

وہ بولی "غضب ہوا، قسمت اُلٹ گئی۔ شہزادے سے چھٹ گئی۔ خدا کی قسم یہ جانِ عالم نہیں۔" وہ بھی شہزادی تھی، گو سیدھی سادی تھی، کہا "درست کہتی ہو، بہت سی باتیں اُس نے آج نئی کی ہیں۔"

ملکہ نے کہا "خیر اب جو ہوا سو ہوا، تم یہیں سو رہو۔" پھر حبشنوں اور ترکنوں سے فرمایا "ہم سوتے ہیں، تم درِ خیمہ پر مسلح جاگو۔ اس وقت اگر شہزادہ کیا فرشتہ آئے، بار نہ پائے۔"

یہ خبر سُن کر وہ نامرد ڈرا۔ اکیلے اور خیمے میں جا پڑا۔ ایک ڈر دو طرف ہوتا ہے۔

ملکہ نے کہا "دیکھا اگر جا نغالم ہوتا، کبھی اکیلا نہ سوتا، بے تامل چلا آتا۔ بدمزگی کا باعث خفگی کا سبب پوچھا، اسے کس کا ڈر تھا۔"

انجمن آرا کہنے لگی "صورت تو وہی ہے۔" اس وقت ملکہ نے ماجرا غیر کے قالب میں روح لے جانے کا، دمِ رخصت اپنے باپ کے بتانے کا مفصل بتایا، پھر کہا "یہ حال وزیر زادے سے کہا ہوگا، یہ فساد اس کا ہے۔ ہمیں روز اوّل اس کی چتون پر شک آیا تھا، سامنے لانے کو منع کیا تھا، سمجھایا تھا، وہ نادان ہمارا کہنا خاطر میں نہ لایا، اس کا مزہ پایا۔"

القصہ وہ شب کہ شبِ اولین گورتھی، رونے پیٹنے میں کٹی۔ انجام کار کا تردّد و تفکر رہا کہ دیکھیے شیشۂ ناموس و ننگ سنگِ ظلم سے کیوں کر بچتا ہے، اور یہ کہتی تھیں ؎

کسے تیغِ جفائے چرخ سے امید ہنسنے کی
جو ہووے بھی تو ہاں شاید دہانِ زخم خنداں ہو

اسی فکر و اندیشہ میں صبحِ قیامت نمود ہوئی۔ سواری ڈیوڑھی پر موجود ہوئی۔ کوچ ہوا خبرداروں نے اس بنے شہزادے سے عرض کی "یہ سرزمین غضنفریہ ہے، یہاں سے پانچ کوس شہر ہے، حاکم وہاں کا غضنفر شاہ زرہ پوش ہے۔" حکم کیا خیمہ ہمارا شہر کے قریب ہو۔ کار پرداز حسب الارشاد عمل میں لائے۔ جب شہزادیاں خیمہ میں داخل ہوئیں، خود آیا۔ ادھر یہ بیچاریاں ڈر سے بادلِ صد چاک، اُدھر وہ بچا بھی خوفناک ساعت بھر بیٹھ، اُٹھ گیا۔

جب غلغلۂ فوج اور آمدِ لشکر، وہاں کے بادشاہ نے سُنا کہ لشکرِ بے شمار، سپاہِ جرّار، شہر کے متصل آ پہنچی۔ اسے بہت تشویش ہوئی۔ وزیر خوش تدبیر کو چند تحفے دے کر استفسارِ حال بظاہر استقبال کو بھیجا تا ملازمت حاصل کر کے، مِن و عن حضور میں عرض کرے۔ وزیر حاضر ہوا۔ عرض بیگیوں نے خبر پہونچائی، وہ توذابِ سلطنت ریاست کا رنگ ڈھنگ جانتا تھا۔ وزیر اعظم کا بیٹا تھا، روبرو طلب کیا، بعدِ ذکر و اذکار، ہر شہر و دیار، اپنا سبب آمد، بہجتِ سیر و شکار، اور اچھا ہونا آب و ہوا اس جوار کا، اور دیکھنا یہاں کے شہر و شہر یار کا، بیان کیا۔ دمِ رخصت خلعتِ فاخرہ، وزیر کو عنایت ہوا، اور بطرزِ دوستانہ کچھ ہدایا بادشاہ کو روانہ کیا۔

جب وزیر اپنے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حسنِ اتفاق، دبدبہ شوکت وصولت،

آئینِ سلطنت، رعب و جرأت کا اس کے، اس رنگ ڈھنگ سے ذکر کیا کہ وہ بادشاہ بیساختہ مشتاق ہو کر سوار ہوا۔ خبرداروں نے اس حال سے مطلع کیا۔ ارکانِ سلطنت، وزرا، امرا بخشی، سپہ سالار، پیشوائی کو گئے۔ جب قریب پہونچا، خود درِ خیمہ تک آیا۔ معانقہ کر، دونوں تخت پر جا بیٹھے۔ بسلسلۂ کلام، بلاغت نظام، طرفین سے کھُلا، وہ بھی اُس کی صورت پہ غش ہوگیا۔ فصاحت پر عش عش کرتا رہا۔ بعد تکرار شہر کا مکلّف ہوا۔ جلد جلد عماراتِ شاہی، سبھی سجائی خالی ہوئیں۔ اُس کو اُتارا، لشکر وہیں رہا۔ پھر حسبِ طلبِ ملکہ و انجمن آرا، سرچوک دو محلسرا برابر خالی ہوئے۔ شہزادیاں وہاں اتریں۔ چند روز دعوت، جلسے رہے۔ جب فرصت ملی، دل میں سوچا اگرچہ جانِ عالم بندر ہے، الّا اس کے جینے میں اپنی مرگ کا خوف و خطر ہے۔ ایسی تدبیر نکالئے کہ اسے جان سے مار ڈالئے۔ پھر بے کھٹکے، آرام صبح و شام کیجئے۔ ملکہ سے ڈرتا تھا، پیر مرد کے نام لینے سے مرتا تھا، جیسے چور کی داڑھی میں تنکا۔ یہ سوچ کر حکم کیا "جہیں بندر درکار ہیں، جو لائے گا دس روپیہ پائے گا۔"

اہلِ شہر ہزاروں بندر پکڑ لائے۔ جو سامنے آتا بغور دیکھ سر تڑوا تا۔ تھوڑے عرصے میں بہت بندر ہلاک اُس سفاک نے کئے۔ جب بندر کم ہوئے، دام بڑھے، بحدیکہ فی بندر سو روپیہ مقرر ہوئے۔ دو کوس چار کوس گرد و پیش نام و نشان نہ رہا۔ بندر عنقا ہوگیا۔ چنانچہ وہیں کے بھاگے ہوئے آج تک متھرا، اور بندرابن، اور اودھ بنگلے میں خستہ تن ہیں۔ بلکہ اس زمانے میں بندرابن بالفتح تھا۔ اب عرصہ دراز گذرا، وہ بندروں کی کثرت جو نہ رہی۔ اس کسرت سے یہ لفظ بالکسر خلقت کہنے لگی۔ غرض کہ شہر میں ہر طرف غلغلہ ہوا۔ سب کی یہی معاش ہوئی، ہر شخص کو بندر کی تلاش ہوئی۔

ایک چڑیمار زیرِ دیوارِ سرا اس بستی میں بستا تھا، مگر محتاج، مفلوک، بہزار جستجو و تکاپو، تمام دن کی گردش میں دس پانچ جانور جو ہاتھ آجاتے، دو چار پیسے کو بیچ کر، جورو خصم روٹی کھاتے، اگر خالی پھرا، فاقے سے پیٹ بھرا۔ ایک روز اس کی جورو کہنے لگی "تو سخت احمق ہے، دن بھر جانوروں کی فکر میں دَر دَر خاک بسر، اُلّو سا دیوانہ ہر ایک ویرانہ جھانکتا پھرتا ہے۔ اس پہ جو روٹی ملی تو بدن پہ لتّا ثابت نہیں۔ کسی طرح ایک بندر بھی ہاتھ آئے تو برسوں کی فرصت ہو جائے۔"

لالچ تو بُرا ہوتا ہے، وہ راضی ہوا کہا "کہیں سے آٹا لا روٹی پکا، اور جس طرح بنے، تھوڑے چنے بہم پہونچا، صبح بندر کی تلاش میں جاؤں گا، نصیب آزماؤں گا۔"

اس نے مانگ جانچ وہ سامان کر دیا، دو گھڑی رات رہے، چڑیمار جال پھٹکی، پھنک،

لاسا کپا چھوڑ ٹی جو دھوکے کی تھی، وہ توڑ روٹی اور چنے اور رسّی لے کر چل نکلا۔ شہر سے چھے سات کوس باہر نکل درختوں میں ڈھونڈھنے لگا۔

وہاں کا حال سنئے شہزادہ جو بندر بنا تھا، اُس نے جس دن سے بندر پکڑتے لوگوں کو دیکھا تھا اور سر توڑوانے کا حال سنا تھا، بدحواس پریشان، سراسیمہ، زیست سے یاس، حیران ہر طرف چھپا پھرتا تھا کہ مبادا کوئی پکڑے جائے، زندگی میں خلل آئے۔ اس روز کئی دن کا بے دانہ و آب، خستہ و خراب، ضعف و نقاہت سے ایک درخت کی کول میں غش ہو کر پڑا تھا۔ چڑیمار نے دیکھا، دبے پاؤں آکر گردن پکڑی۔ اس نے آنکھ کھولی، گلا دستِ قضا میں پایا، جینے سے ہاتھ اٹھایا۔ یقین ہوا زیست آنی تھی۔ آج پیمانۂ بقا بادۂ اجل سے لبریز ہو کر چھلکا، پکارا "اے گردونِ دوں! اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ" چڑیمار نے کمر سے رسی کھول، مضبوط باندھا، پھر شہر کا رستہ لیا، تھوڑی دور چل، بندر نے کفِ افسوس مل کہا۔

"اے شخص! کیوں خون بے گناہ، راندۂ درگاہ اپنی گردن پر لیتا ہے۔ مصیبت زدہ کو اور دُکھ دیتا ہے۔"

وہ بولا "کیا خوب! تو تو باتوں سے مجھے ڈراتا ہے، اگر دیو، بھوت، جن آسیب جو بلا ہے، بلا سے، مگر تیرا چھوڑنا ناروا ہے۔ آج قسمت آزمائی، نعمت غیر مترقبہ ہاتھ آئی، تجھے بادشاہ کو دونگا، سو روپئے لوں گا، چین کروں گا۔"

یہ سُنتے ہی سُن ہو گیا۔ رہی سہی جان قالب سے نکل گئی۔ ہر چند منت و سماجت سے کہا "لالچ کا کام بُرا ہوتا ہے"۔ کچھ کام نہ آیا، چڑیمار نے جلد جلد قدم بڑھایا، قریب شام، شادکام گھر آیا۔

جورو سے کہا "اچھی ساعت گھر سے گیا تھا، طائرِ مطلب، بے دام و دانہ، خواہش کے جال میں پھنسا۔" یہ کہہ کر خوب ہنسا۔

اب دو کلمے یہ سنئے، جس دن شہزادہ گرفتار بلائے تازہ ہوا، یعنی چڑیمار کے دامِ حرص میں گرفتار ہوا، ملکہ دل گرفتہ خود بخود گھبرائی اور رو رو کر یہ بیت زبان پر لائی۔ استاد ؎

ہوئی گیا وہ تاثیر اے آہ تیری   تھی آگے تو کچھ بیشتر آزمائی

انجمن آرا نے کہا۔ "تم نے سنا یہ کمبخت بندر پکڑوا کے سر کچلواتا ہے، یقین جانو جانِ عالم اسی ہیئت میں ہے اور آج خدا کرے، صبح سے بیطرح دلِ ناکام کو اضطراب ہے، جانِ زار کو

پیچ و تاب ہے۔ گھر کاٹتا ہے، غم کلیجہ چاٹتا ہے، معلوم ہوتا ہے، شہزادہ پکڑا گیا یا کوئی اور آفتِ تازہ ستم نو بے اندازہ چرخ کہن دکھائے گا، ہنسی کے بدلے رُلائے گا۔ میرؔ

جس سے جی کو کمال ہو الفت — جس کی جانب درست ہو نسبت
جنبش اس کی پلک کو گرداں ہو — دل میں یاں کاوش اک نمایاں ہو
یار کو دردِ چشم اگر ہووے — چشمِ عاشق لہو سے تر ہووے
واں دہن تنگ یاں ہے دل تنگی — حسن اور عشق میں ہے یک رنگی

انجمن آرا نے جھلّا کر کہا: "اس سے اور فزوں کیا، دنیا میں تباہی اور خرابی ہوگی! شہر چھٹا سلطنت گئی۔ ماں باپ عزیز و اقربا کی جدائی نصیب ہوئی۔ زخمِ دل و جگر آلے پڑے ہیں۔ جان کے لالے پڑے ہیں۔ مصحفیؔ

مرض الموت سے کچھ کم نہیں آزار اپنا — دل میں دشمن کے بھی یارب نہ چبھے خار اپنا

اور جس کے واسطے آوارہ و سرگشتہ ہوئے، یہ صدمے سہے، نحوستِ بختِ نافرجام، گردشِ ایام سے اسے کھو بیٹھے، وطن سے ہاتھ دھو بیٹھے، اب رضینا بہ قضا مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔ ناسخؔ

مجھے فرقت کی اسیری سے رہائی ہوتی — کاش عیسیٰ کے عوض موت ہی آئی ہوتی
ابرِ رحمت سے تو محروم رہی کِشت مری — کوئی بجلی ہی فلک تو نے گرائی ہوتی
ہوں وہ غم دوست کہ سب اپنے ہی دل میں بھرتا — غمِ عالم کی اگر اس میں سمائی ہوتی

یہاں تو یہ باتیں تھیں، ادھر چڑیمار کی جورو، چراغ لے کر بندر کو دیکھنے لگی۔ بندر سوچا، وہ کمبخت مرد بر سرِ رحم نہ ہوا، کیا عجب یہ رنڈی ہے، اگر نرم زبانی سے مذکور آفتِ آسمانی سنے اور مہربانی کرے، اس خیال سے پہلے سلام کیا، وہ ڈری تو یہ کلام کیا۔ "اے نیک بخت! خوف نہ کر، دو باتیں میری گوشِ دل سے سن لے۔"

گنواریاں جی کی کڑی بھی ہوتی ہیں۔ بندر کا بولنا اچنبھا سمجھ کر کہا "کہہ"۔

وہ بولا۔ "ہم غریب الوطن، گرفتارِ رنج و مبتلائے محن، گھر سے دور، قید میں مجبور ہیں۔ ماں باپ نے کس کس ناز و نعم سے پالا، فلک نے کون کون سی مصیبت دکھانے کو گھر سے نکالا۔ یہاں تک کہ در بدر حیران پریشان کر کے بُرے دن دکھائے، کہ تیرے پاس گرفتار ہو کر آئے۔ استادؔ

پیدا کیا خدا نے کسی کو نہیں عبث　　　لایا مجھی کو یاں پہ جہاں آفریں عبث

اب صبح کو جب ہم گردن مارے جائیں گے۔ تب سو روپے تمہارے ہاتھ آئیں گے۔ خون بے گناہ کی جزا حشر کو پاؤ گی، بکینٹھ چھوڑ نرک میں جاؤ گی۔ پیسہ روپیہ ہاتھ کا میل ہے، اس پر جو میل کرتی ہو، کتنے دن کھاؤ گی۔ دھبہ اس کا جیتے جی نہ چھوٹے گا۔ دھوتے دھوتے مرجاؤ گی۔ اگر ہمارے حال پہ رحم کرو، خدا اور کوئی صورت کرے گا سو روپے کے بدلے، تمہارا گھر اشرفیوں سے بھرے گا۔ ہمارے قتل میں گناہ بے لذّت یا ایک موذی کی حسرت نکلنے کے سوا اور کیا فائدہ ہے۔ اگرچہ ایسا جینا مرنے سے بڑا ہے۔ لیکن خدا جانے ارادہ ازلی مشیت ایزدی کیا ہے۔ ہماری تقدیر میں کیا کیا لکھا ہے، جو خدا کے نام پہ نثار ہے، اللہ اس کا ہر حال میں ممدو مددگار ہے، تو نے بادشاہ یمن کا قصہ سنا نہیں؟ ایک سلطنت دی، دو پائیں، لالچیوں کی قضا آئی، جانیں گنوائیں"۔ رنڈی موم کی ناک ہوتی ہے۔ جب پھر گئی، جدھر پھیرا پھر گئی۔ بندر کی باتوں پہ کچھ تعجب کچھ تاسف کر کے کہنے لگی ـــــ

"ہنومان جی! وہ کہانی کیسی ہے سناؤ مہاراج"۔

فسانۂ شاہِ یمن

سلطنت سائل کو دینا، اور بی بی کو مع بیٹوں لے کر شہر سے نکلنا، راہ میں سوداگر کا فریب، پھر فرزندوں کی جدائی، آخر کو سلطنت ہاتھ آئی

بندر نے کہا "سرزمین یمن میں، ایک بادشاہ تھا، ملک اس کا مالا مال، دولت لازوال، بخشندۂ تاج و تخت، نیک سیرت، فرخندہ بخت، جس دم سائل کی صدا گوشِ حق نیوش میں در آئی، وہیں احتیاج بِلکاری میں بر آئی۔ یہاں تک کہ لقب اس کا نزدیک و دور خدا دوست مشہور ہوا۔

ایک روز کوئی شخص آیا اور سوال کیا کہ "اگر تو خدا دوست ہے تو للّٰہ تین دن، مجھے سلطنت کرنے دے۔"

بادشاہ نے فرمایا "بسم اللہ، جو رکنِ سلطنت مسند نشینِ حکومت حاضر تھے، بتاکید اُنھیں حکم ہوا کہ جو اس کی نافرمانی کرے گا، موردِ عتاب سلطانی ہوگا۔" یہ فرمانروا تخت سے اُٹھا، سائل جا بیٹھا، حکمرانی کرنے لگا۔

چوتھے روز بادشاہ آیا، کہا "اب کیا قصد ہے؟"

سائل بولا۔ "پہلے تو وہ فقط امتحان تھا، اب بادشاہت کا مزا ملا، برائے خدا یہ تاج و تخت یک لخت مجھے بخش دے۔"

بادشاہ نے فرمایا کہ "یہ حکومت آپ کو مبارک ہو۔" بادشاہت دے کہ کچھ نہ ہمراہ لیا، فقط لڑکوں کا ہاتھ میں ہاتھ، بی بی کو ساتھ لیا۔ دل کو سمجھایا کہ اتنے دنوں سلطنت، حکومت کی، چندے فقیری

کی کیفیت، فاقے کی لذّت دیکھئے، گو جاہ و حشم مفقود ہے لیکن شاہی بہر کیف موجود ہے، مگر اس شہر سے کہیں اور چلنا فرض ہے۔ حکمِ خدا قُلْ سِیرُوا فِی الْاَرْضِ ہے۔ دنیا جائے دید ہے، عنایت خالق سے کیا بعید ہے، جو کوئی اور صورت نکلے۔ ایک لڑکا سات برس کا، دوسرا نو برس کا تھا۔

غرض کہ وہ حق پرست، شہر سے تہی دست نکلا، بلکہ تکلف کا لباس بھی نہ لیا۔ جامہ عریانی جسم پر چست کیا اور چل نکلا، دنیا کا زور نقشہ ہے۔ مصرع

ایں عجوزہ عروسِ ہزار داماد است

کل وہ سلطنت، ثروت، کرّوفر، افسر و تاج، آج یہ مصیبت اذیت۔ دربدر پیادہ پا سفر، محتاج، کبھی دو کوس، اگاہ چار کوس، بے نقارہ و کوس، بہزار رنج و تعب چلتا، جو کچھ میسر آیا تو روزی، نہیں تو روزہ۔ یونہی ہر روز راہ طے کرتا، جب یہ نوبت پہنچی۔ چند روز میں ایک شہر ملا۔ مسافر خانے میں بادشاہ اترا۔ اتفاقاً ایک سوداگر بھی کسی سمت سے وارد ہوا، قافلہ باہر اترا، تنہا گھوڑے پہ سوار ہو، سیر کرتا، مہمان سرا میں وارد ہوا، شہزادی کہ گرد راہ صعوبت سفر کی مبتلا تھی، لیکن اچھی صورت کبھی چھپی نہیں رہتی۔ سعدی ؎

حاجت مشاطہ نیست روئے دلآرام را

سوداگر کی آنکھ جو پڑی، بیک نگاہ از خود رفتہ ہوا۔ بادشاہ کے قریب آ سلام کیا۔ یہ بیچارے اللہ کے ولی، وہ ولدالزنا، شقی، بادشاہ نے سلام کا جواب دیا۔ اس عرصے میں وہ غدّار، حیلہ سوچا، بہت افسردہ خاطر ہو کر کہا "اے عزیز! میں تاجر ہوں، قافلہ باہر اترا ہے۔ میری عورت کو دردِ زہ ہو رہا ہے، دائی کی تلاش میں دیر سے گدائی کر رہا ہوں، ملتی نہیں، تو مردِ بزرگ ہے، کج ادائی نہ کر، اس نیک بخت کو للہ میرے ساتھ کر دے تا اس کی شراکت سے اس کو رنج سے نجات ملے۔ وگرنہ بندۂ خدا کا مفت خون ہوتا ہے۔"

یہ اللہ کا نام سن کر گھبرائے۔ بی بی سے کہا: "زہے نصیب جو محتاجی میں کسی کی حاجت رفع ہو، کام نکلے بسم اللہ دیر نہ کر۔"

اس نے دم نہ مارا۔ سوداگر کے ساتھ روانہ ہوئی۔ دروازے سے باہر نکل۔ اس غریب سے کہا "قافلہ دور ہے، مجھے آتے ہوئے عرصہ گزرا ہے۔ آپ گھوڑے پہ چڑھ لیں، تو جلد پہنچیں۔"

وہ فلک ستائی فریب نہ جانتی تھی، سوار ہوئی۔ سوداگر نے گھوڑے پہ بٹھا۔ قافلے پاس آ کوچ کا حکم دیا۔ آپ ایک سمت گھوڑا پھینکا۔ اس وقت اس نیک بخت نے داد بیداد فریاد مچائی، تڑپی،

روئی، پیٹی، چلائی، آہ و زاری اس بے رحم سنگدل کی خاطر میں نہ آئی۔ بادشاہ پہر بھر منتظر رہا، پھر خیال میں آیا، خود چلئے، دیکھئے وہاں کیا ماجرا ہوا۔ بیٹوں کا ہاتھ پکڑے سرا سے نکلے۔ ہر چند ڈھونڈا نشان کے سوا قافلے کا سراغ نہ ملا، دور گرد اڑتی دیکھی، جرس کی صدا سُنی، نہ پاؤں میں دوڑنے کی طاقت، نہ بی بی کے چھوڑنے کی دل کو تاب۔ سب طرح عذاب، نہ کوئی یار نہ غمگسار، نہ خدا ترس، نہ فریاد رس، بحسرت و یاس قافلے کی سمت دیکھ کر یہ کہا۔ مصحفی ؎

ایسے ہی گر قدم ہیں تمھارے تو ہم رہے　　　تو ہمرہانِ قافلہ سے کہیو اے صبا

لاچار لڑکوں کو لے کر اسی طرف چلا، چند گام چل کر راہ بھول گیا۔ ایک ندی ملی، مگر نہ کشتی نہ ڈونگی، نہ ملاح۔ راہ سے یہ نا آشنا نہ وہاں سیاح کا گذارا، ایک نعرہ مارا اور ہر طرف ماہی بے آب سا واہی تباہی پھرا۔ رہبر کامل کو پکارا، ساحلِ مطلب سے ہمکنار نہ ہوا مگر کچھ ڈھب ڈھبا نیکا ڈھب تھا۔ ایک لڑکے کو کنارے پر بٹھا، چھوٹے کو کاندھے پر اُٹھا دریا میں دَر آیا، نصف پانی بصد گرانی طے کیا تھا، کنارے کا لڑکا بھیڑیا اُٹھائے چلا۔ وہ چلّایا۔ بادشاہ آواز سُن کر گھبرایا۔ پھر کر دیکھنے جو لگا، کندھے کا لڑکا پانی میں گر پڑا، زیادہ مضطرب جو ہوا، خود غوطے کھانے لگا، لیکن زندگی باقی تھی، بہر کیف کنارے پر پہونچا۔ دل میں سمجھا بڑے بیٹے کو بھیڑیا لے گیا، چھوٹا ڈوب مرا۔ نیرنگیٔ فلک سے عالم حیرت، بی بی کے چھٹنے کی غیرت، بیٹوں کے الم سے دلِ کباب، سلطنت کے دینے سے خستہ و خراب، اسی پریشانی میں شکر کرتا، پھر چلا۔ سہ پہر کو ایک شہر کے قریب پہونچا، درِ شہر پناہ پر خلقت کی کثرت دیکھی، اُدھر آیا۔ اس ملک کا یہ دستور تھا کہ جب بادشاہ عازمِ اقلیم عدم ہوتا، ارکانِ سلطنت، روسائے شہر وہاں آکر باز اُڑاتے تھے، جس کے سر پر بیٹھ جاتا، اُسے بادشاہ بناتے تھے۔ چنانچہ یہ روز وہی تھا۔ باز چھوڑ چکے تھے۔ ابھی کسی کے سر پر نہ بیٹھا تھا۔ اس بادشاہ گدا صورت کا پہنچنا تھا، باز اس کے سر پر آ بیٹھا۔ لوگ معمول کے موافق حاضر ہوئے، تخت روبرو آیا۔ ہر چند یہ تخت پر بیٹھنے سے باز رہا، کہا "میں گم کردہ آشیاں، سلطنت کے شایاں نہیں ہوں۔ میں نے اسی علت سے اپنے مرز بوم شوم کو چھوڑا ہے، حکومت سے منھ موڑا ہے۔ مگر وہ لوگ اس کے سر پر باز کا بیٹھنا، عنقا سمجھ نہ باز رہے۔ جو شاہین تھے، تاڑ گئے پر میں پہچان گئے کہ یہ مقرر ہُمائے اوجِ سلطنت ہے۔

قصہ مختصر، رگڑ جھگڑ تخت طاؤس پر بٹھا، نذریں دیں، توپخانے میں شلک ہوئی، بڑے تزک حشمت سے آشیانۂ سلطنت، کاشانۂ دولت میں داخل کیا۔ تمام قلمرو نقد و جنس، اشیائے بحری و بری، ان کے تحتِ حکومت، قبضۂ تصرف میں آیا۔ گر، سکّے پہ نام جاری ہوا، منادی نے

ندا دی، دہائی پھر گئی۔ کہ جو ظلم و جور کا بانی ہوگا، وہ لٹیرا گردن مارا جائے گا۔ سوز

پل میں چاہے تو گدا کو وہ کرے تخت نشیں　　کچھ اچنبھا نہیں اس کا کہ خدا قادر ہے

کارخانۂ قدرت عجیب و غریب ہیں، نہ اعتمادِ سلطنت، نہ قیامِ عزت و عشرت۔ مرزا رفیع

سودا سے

عجب نادان ہیں جن کو عجب ہے تاج سلطانی　　فلک بالِ ہما کو پل میں سونپے ہے مگس رانی

یہ سلطنت تو کرنے لگا، مگر افسردہ خاطر، پژمردہ دل، بہ سبب شرم و حیا مفصل حال کسی سے نہ کہتا تھا۔ شب و روز غمگین اور اندوہناک پڑا رہتا تھا۔ جب وہ بلبلِ ہزار داستان، یعنی فرزند شمعِ دودمان یاد آتے تھے۔ نخل سبحانی آہ کو لب پر لاتے تھے۔

اب اُن لڑکوں کا حال سنئے، جس کو بھیڑیا اُٹھائے لئے جاتا تھا، اودھر سے کوئی تیر انداز سبک دست آتا تھا، اُس نے چھڑایا۔ دوسرا جو غوطے کھاتا تھا اس کو ماہی گیر نے دامِ محبت میں اُلجھایا، وہ دونوں لاولد تھے۔ اسی شہر کے رہنے والے جہاں ان لڑکوں کا باپ بادشاہ ہوا تھا، وہ اپنے اپنے گھر میں لا بقدر مقدور، لڑکوں کو پرورش کرنے لگا۔ جلّ جلالہ، کیا سنگ تفرقہ فلک نے پھینکا، کہ ایک دوسرے سے جدا ہوگیا۔ چند عرصے تک بیٹوں کی مفارقت نے بادشاہ کو بے چین کیا، وزیر سے فرمایا کہ "دو لڑکے قوم شریف سے ہماری صحبت کے قابل ڈھونڈ کے لا۔"

وزیر نے تمام شہر کے لڑکے طلب کئے، حکم حاکم مرگِ مفاجات، وہ دونوں بھی آئے۔ سبحان اللہ! جامع المتفرقین بھی اسی کا نام ہے۔ بچھڑے ملانا اس کے روبرو کتنا کام ہے! وہی وزیر کو پسند آئے، روبرو لایا۔ بہ سبب طولِ زمانِ مفارقت اور تکلیف و عسرت نقشے بدل گئے تھے، قطع اور ہوگئی۔ نہ بادشاہ نے پہچانا، نہ تقاضائے سن سے لڑکوں نے باپ جانا، اور نہ یہ سمجھ آئی کہ ہم دونوں بھائی ہیں۔ یہ بھی قدرت نمائی ہے۔ بہم ہوئے، مگر جدا رہے، لیکن بادشاہ بہ محبت تمام مصروف عنایت علی الدوام تھا۔ سب نے سُنا کامل کا یہ نکتہ ہے، كُلُّ اَمْرٍ مَرْهُونٌ بِاَوْقَاتِهٖ ــــ تھوڑے دن میں معتمد و مقرب ہوئے اور وہ سوداگر جو فروش گندم نما، دغا کا پتلا، یہاں کے پہلے بادشاہ سے رسائی علیے سے شناسائی رکھتا تھا، اس نظر سے وہ بھی اُس عورتِ ناراض کو لے کر، وہاں وارد ہوا۔ خبرِ مرگِ بادشاہ سن کر ملول ہوا کہ مطلب نہ حصول ہوا۔ لوگوں نے کہا "بادشاہِ تازہ، اس سے زیادہ خلیق و غریب پرور ہے" بوساطتِ وزیرِ اعظم تحفہ تحائف حضور میں نذر کر، شرف اندوزِ ملازمت ہوا، اس کو بھی بادشاہ

نے نہ پہچانا، نہ سوداگر نے حریف جانا، مگر بادشاہ نے اس کو ذی اعتبار سیاحِ دیار دیار سمجھ، بیشتر اطراف و جوانب کا مذکور سنتا تھا۔

ایک دن قریب شام حضور میں حاضر تھا، بادشاہ نے فرمایا "آج کی شب گھر نہ جا، کچھ پوچھنا ہے۔"

وہ بیٹھا تو مگر مکدّر و پریشان۔ بادشاہ نے تردّد کا سبب پوچھا۔ یہ باعث عنایت فی الجملہ ہو چلا تھا، دست بستہ عرض کی۔ "خانہ زاد کے پاس ایک عورتِ ناراض ہے، اس کو فدوی سے اغماض ہے، اس کی نگہبانی بذات خود کرتا ہوں۔ ہر تبہ ڈرتا ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ نکل کے رازِ نہاں فاش کرے، حمایتی تلاش کرے۔"

حکم ہوا کہ یہ مقدمہ آج ہمارے ذمّہ ہے۔ وہی لڑکے بسکہ معتمد تھے، خاص دستہ ان کے ہمراہ کر پاسبانی کی تاکید اکید کی، لڑکے آداب بجا کر سوداگر کے مکان پر گئے۔ باغ پر خیمہ برپا تھے۔ درِ خیمہ پر کرسی بچھا دونوں بیٹھے۔ پاسبان آس پاس پھرنے لگے۔ جب آدھی رات گذری، ایک کو نیند آنے لگی۔

دوسرے نے کہا "سونا مناسب نہیں، ایسا نہ ہو کہ کوئی فتنۂ خوابیدہ جاگے، خیمہ سے چونک بھاگے۔"

وہ بولا "تو ایسا قصہ کہو جو نیند اچٹنے کا بہانا ہو۔"

اس نے کہا "خیر آج ہم اپنی سرگذشت کہتے ہیں، اگر غور سے سنو گے تو نیند کیا کئی روز بھوک پیاس پاس نہ آئیگی ——— 'اے عزیز با تمیز! میں بادشاہِ یمن کا بیٹا ہوں، میرا باپ للّٰہ سلطنت سائل کو دے، مجھے اور ایک میرا چھوٹا بھائی کہ وہ تم سے بہت مشابہ تھا، اس کو اور اپنی بی بی کو ہمراہ لے کر غریب الوطن ہوا تھا۔ راہ میں ایک سوداگر فریب سے شہزادی کو لے گیا۔ ہم دونوں بھائی ساتھ رہے۔ آگے چل کر دریا ملا، ناؤ بیڑہ کچھ نہ تھا، بادشاہ مجھ کو کنارے پر بٹھا، چھوٹے کو کندھے پر چڑھا، پار چلا، مجھے بھیڑئیے نے پکڑا، میرے چلانے سے بادشاہ جو بدحواس ہوا، بھائی دوش سے آغوشِ دریا میں کھسک پڑا، خود غوطے کھانے لگا، پھر نہیں معلوم کیا ہوا، مجھے تیرانداز نے دہنِ گرگ سے چھڑایا۔ اب فلک اس بادشاہ پاس لایا۔"

وہ رو کر لپٹ گیا کہا "بھائی! دریا میں ہم گرے تھے، مچھلی والوں کے باعث ترے تھے" پھر تو دونوں بغلگیر ہو، ایسے چلائے کہ وہ عورت نیند سے چونک پڑی، پردے کے پاس

آکر حال پوچھنے لگی۔ انھوں نے ماجرائے گذشتہ بیان کیا، وہ پردہ اُلٹ لڑکوں سے لپٹ گئی، کہا "ہم اب تک سوداگر کی قید میں مجبور ہیں۔"

اسی دم یہ خبر بادشاہ کو پہونچی، سواری بھیج طلب کیا۔ اس وقت سب نے پہچانا، فوراً سوداگر کو قید کیا۔ صبح دم جب جلّادِ سپہر یعنی مہر شمشیرِ شعاع کھینچ کر ہنگامہ پرداز عالم ہوا، سوداگر کو کاروانِ عدم کا ہمسفر کر بارِ ہستی سے سبکدوش کیا۔ یمن میں اخبار نویسوں نے حال لکھا، وہاں عجب ہڑبونگ مچا تھا۔ وہ سائلِ ستم شعار، بدرجہ ظلم پیشہ و جفا کار نکلا، رعیت نالاں، ارکانِ سلطنت ہراساں رہتے تھے۔ ہزاروں رنج رات دن سہتے تھے۔ جب یہ خبر وہاں پہنچی، وزیر نے زہر دے کر اُسے مارا، تلخکامی سے سب کو نجات ملی اور عرضداشت اپنی بادشاہ کو لکھی۔ تمنائے قدمبوس تمام شہر کی تحریر کی۔ بادشاہ کو بھی محبتِ وطن دل میں جوش زن ہوئی۔ سفر کی تیاری ہونے لگی قطعہ ؎

حبُ الوطن از ملکِ سلیماں خوشتر ۔۔۔ خارِ وطن از سنبل و ریحاں خوشتر
یوسف کہ بہ مصر بادشاہی می کرد ۔۔۔ می گفت گدا بودنِ کنعاں خوشتر

القصہ یمن میں آیا، دونوں سلطنتیں قبضہ میں رہیں۔

جب بندر نے یہ فسانہ تمام کیا پھر کہا "اے نیک بخت! مطلب اس کہانی سے یہ تھا کہ جو بادشاہ عاشقِ اللہ خدا پر شاکر تھا، ایک سلطنت دی، دو پائیں۔ یہ دونوں بدبخت جو لالچی تھے، اُنھوں نے جانیں گنوائیں، قیامت تک مطعون خلائق رہیں گے۔ جتنے نیک ہیں، یہ قصہ سن کر بدکہیں گے۔"

رنڈی ان باتوں سے بر سرِ رحم ہوئی، بندر کی تسکین کی کہا "تو خاطر جمع رکھ، جب تک کہ جیتی ہوں، تجھے بادشاہ کو نہ دوں گی، فاقہ قبول کروں گی، پھر اُسے روٹی کھلا، پانی پلا، کھنڈری میں لٹا سو رہی۔ صبح کو چڑیمار اُٹھا، بندر کے لے جانے کا قصد کیا۔ عورت نے کہا "آج اور قسمت آزما، پھر جانور پکڑنے جا، جو روٹی میسر آئے، تو کیوں اس کی جان جائے، تو ہم پر ہتیا لگے، بدنامی آئے نہیں تو کل لے جانا۔"

وہ بولا "تو اس کے دم میں آگئی۔"

بندر نے کہا "ماشاءاللہ! رنڈی تو خدا پر شاکر ہے، تو مرد ہو کر مضطر ہوتا ہے! پاجی تو زن مرید ہوتے ہیں، وہ پھر پٹک جھٹک، جال پھٹکی، اٹھا لاسا کمپا لے ٹٹّی کندھے سے لگا گھر سے نکلا۔ یا تو دن بھر خراب ہو کر دو تین جانور لاتا تھا، اس روز دوپہر میں پچاس ساٹھ ہاتھ

آئے۔ بھٹکی بھر گئی، خوش خوش گھر پھرا، کئی روپے کو جانور بیچے آٹا، دال، نون، تیل، لکڑی، خرید تھوڑی مٹھائی لے۔ بھٹی پر جا، ٹکے کا ٹھراپیا، ہاتھ پاؤں بھول گئے، جھومتے گیت گاتے، گھر کا رستہ لیا، مفلسی کا غم بھول گئے۔ جورو سے آتے ہی کہا "اری! ہنومان جی کے کدم بڑے بھاگوان ہیں۔ بھگوان نے دیا کی، آج روپیا دلوائے، اتنے جانور ہاتھ آئے۔" وہ گھر بسی، بہت ہنسی، پہلے مٹھائی بندر کو کھلائی، پھر روٹی پکا، آپ کھا کچھ اسے کھلا پڑ رہی۔ بندر بچارا ابھاچندے پھر جان بچی۔ جو فلک نہ جل مرے، اور اس کا رشک نہ کرے۔ مؤلف ؎

کیا شاخ گل پہ پھول کے بیٹھی ہے عندلیب
ڈرتا ہوں میں نہ چشم فلک کو بُرا لگے

جب لایا بار یاس ہی لایا یہ اے سرور
گا ہے نہ نخل غم میں ثمر اس سوا لگے

اب روز چڑیمار کی ترقی ہونے لگی، تھوڑے دنوں میں، گھر بار کپڑا لتا گنا پاتا، درست ہو گیا۔ قضارا کوئی بڑا تاجر، سرا میں اُس بھٹیاری کے گھر میں اُترا جس کی دیوار تلے چڑیمار رہتا تھا۔ ایک روز بعد نمازِ عشا سوداگر وظیفہ پڑھتا تھا، ناگاہ آوازِ خوب صدائے مرغوب، جیسے لڑکا پیاری پیاری باتیں کرتا ہے، اس کے کان میں آئی۔ بھٹیاری سے پوچھا "یہاں کون رہتا ہے؟"

وہ بولی "چڑیمار"

سوداگر نے کہا "اس کا لڑکا خوب باتیں کرتا ہے"

بھٹیاری بولی "لڑکا بالا تو کوئی بھی نہیں، فقط جورو خصم رہتے ہیں۔"

سوداگر نے کہا "آسُن، یہ کس کی آواز آتی ہے؟" بھٹیاری جو آئی، لڑکے کی آواز پائی۔

وہ بولا "اس صدا سے بوئے درد پیدا ہے، اس کو میرے پاس لا، باتیں کروں گا، کچھ لڑکے کو دوں گا اور تیرا بھی منہ میٹھا کروں گا۔"

بھٹیاری چڑیمار کے گھر گئی، بندر باتیں کرتا ہے، اسے دیکھ چپ ہو رہا۔ وہ دونوں بھٹیاری کے پاؤں پر گر پڑے۔ منت کرنے لگے، کہا "ہم نے اسے بچوں کی طرح پالا ہے، اپنا دُکھ ٹالا ہے، شہر پُر آشوب ہو رہا ہے، بندر کُش بادشاہ اُترا ہے، ایسا نہ ہو یہ خبر اُڑتے اُڑتے اسے پہونچے، بندر چھن جائے، ہم پر خرابی آئے۔"

وہ بولی "مجھے کیا کام جو ایسا کلام کروں۔" سرا میں آکے سوداگر سے کہا "وہاں کوئی نہ تھا۔"

اس نے کہا "دیوانی ابھی وہ آواز کس کی تھی؟ بغور سنئے کہ کیا معقول جواب وہ نامعقول دیتی ہے۔"

بولی "بلّیاں لوں، بھلا مجھے کیا غرض، جو کہوں بندر بولتا ہے۔"

سوداگر خوب ہنسا، پھر کہا "تو سڑن ہے، ایسا بندر کہیں بولتا ہے!"

پھر بولی "جی غریب پرور! صدقے گئی، اسی سے تو میں بھی نہیں کہتی، بندر بولتا ہے۔"

سوداگر کو سخت خلجان بمرتبۂ خفقان ہوا، کہ یہ کیا ماجرا ہے، مکان قریب تھا، خود چلا گیا۔ دیکھا تو فی الحقیقت ایک عورت دوسرا مرد مچھندر، تیسرا بندر ہے۔ یقین کامل ہوا، یہی بندر بولتا تھا، بھٹیاری سچی ہے، وہ سوداگر کو دیکھ کر بندر کو چھپانے لگی، اس نے کہا "بھید کھل گیا، اب پوشیدہ کرنا لاحاصل ہے، مصلحت یہی ہے، بندر ہمیں دو، جو احتیاج ہو اس کے جلد دیں لو، نہیں تو بادشاہ سے اطلاع کر دوں گا۔ یہ بے چارا مارا جائے گا، تمھارا کیا جائے گا۔"

دونوں رونے پیٹنے لگے، بندر سمجھا، اب جان نہیں بچتی، اتنی ہی زیست تھی۔ چڑیمار کہا "اے شخص! فلکِ کج رفتار گردوں دوّار نے اتنی جفا پر صبر نہ کیا۔ یہاں بھی چین نہ دیا، سب یہی ہے، رضائے الٰہی پر راضی ہو، مجھے حوالے کر دو۔ قضا آئی ٹلتی نہیں، تقدیر کے آگے کسی کی تدبیر چلتی نہیں۔ فردِ بشر کو حکمِ قضا و قدر سے چارہ نہیں، اس کے ٹال دینے کا یارا نہیں، اِذا جَاءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ"۔

چڑیمار نے کہا "دیکھو بندر کی ذات کیا بے وفا ہوتی ہے! ہماری محنت مشقت پر نظر نہ کی، توتے کی طرح آنکھ پھیر لی۔ سوداگر کے ساتھ جانے کو راضی ہو گیا۔ بڑا آدمی جو دیکھا، ہمارے پاس رہنے کا مطلق پاس نہ کیا۔"

بندر نے کہا "اگر نہ جاؤں، اپنی جان کھوؤں، تم پہ خرابی لاؤں۔" آخر کار بہ ہزار گریہ و زاری سوداگر سے دونوں نے قسم لی کہ "بادشاہ کو نہ دینا، اچھی طرح پرورش کرنا" یہ کہہ کر بندر حوالے کیا۔ سوداگر نے اس کے عوض بہت کچھ دیا، بندر کو سرا میں لا، پیار کیا۔ بدلداری اور نرمی حال پوچھا۔ بندر نے یہ چند شعر حسبِ حال سودا کے سوداگر کے روبرو پڑھے۔ مرزا رفیع سودا ؎

نے بلبلِ چمن نہ گلِ نو دمیدہ ہوں   میں موسمِ بہار میں شاخِ بریدہ ہوں
گریاں بہ شکلِ شیشہ و خنداں بشکلِ جام   اس میکدے کے بیچ عبث آفریدہ ہوں
میں کیا کہوں کہ کون ہوں سودا بقولِ درد   جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں

اے عزیز! آتشِ کارواں نقشِ پائے یارانِ رفتگان ظاہر ہوں، مگر پنہاں ہوں، بلبلِ دور از گلزار گم کردۂ آشیاں، صیاد درپئے آزار، گھات میں باغباں، کیونکر نہ سرگرمِ فغاں

ہوں، حضرت عشق کی عنایت ہے، زمانے کی شکایت ہے، حاجت روائے عالم محتاج ہے، تخت ہے نہ افسر ہے، نہ وہ سر ہے، نہ تاج ہے۔ غریب دیار، چرخِ موجدِ آزار، شفیق و مہربان نہیں، حال زار کا کوئی پرسان نہیں، حیرت کا کیوں نہ مبتلا ہوں۔ اپنے ہاتھ سے اسیر دام بلا ہوں، خود گرفتار پنجۂ ستم ہوا، کبھی مجھے جن کا الم تھا، اب انھیں میرا غم ہوا۔ مرنے سے ہم اس لئے جی چھپاتے ہیں، کہ ہمدم میرے فراق میں موئے جاتے ہیں، مجھے دام مکر میں الجھایا، دوستوں کو میرے، دشمن کے پھندے میں پھنسایا، گردشِ چرخ سے عجیب سانحہ پیش آیا۔ میر تقی میر:

سخت مشکل ہے سخت ہے بیداد ۔۔ ایک میں خوں گرفتہ سو جلاد

کوئی مشفق نہیں جو ہووے شفیق ۔۔ بیکسی چھٹ نہیں ہے کوئی رفیق

آہ جو ہم دمی سے کرتی ہے ۔۔ اب تو وہ بھی کمی سی کرتی ہے

اب ٹھہرتا نہیں ہے پائے ثبات ۔۔ ایک میں اور ہزار تصدیعات

مصرع: گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل ـــــ مگر آج خوش قسمتی سے آپ سا قدر داں ہاتھ آیا ہے، انتشار طبیعت برطرف، ہو تو بہ دلجمعی تمام، آغاز سے تا انجام اپنی داستانِ غم، سانحۂ ستم گذارش کروں گا۔

سوداگر کے اس مضمونِ دردناک سے آنسو نکل پڑے۔ سمجھا یہ بندر نہیں، کوئی فصیح و بلیغ، عالی خاندان والا دودمان سحر میں پھنس گیا ہے۔ کہا "اطمینان خاطر رکھ، تیری جان کے ساتھ میری جان ہے، اب زیست کا یہی سامان ہے"۔

بندر کو تسکین کامل حاصل ہوئی، غزلیں پڑھیں، نقل و حکایات میں سرگرم رہا، اپنا حال پھر کچھ نہ کہا، تمام شب سوداگر نہ سویا۔ اس کے بیان جانکاہ پہ خوب رویا۔ اب بہت تعظیم و تکریم سے بندر رہنے لگا۔ مگر امر شدنی بہر کیف ہوا چاہے راز فاش ہو، اگر خدا چاہے۔ سوداگر کا یہ انداز ہوا، جو شخص نیا اس کی ملاقات کو آتا، اسے بندر کی باتیں سنواتا، وہ استعجاب سے غرقِ بحر فکر ہوتا، ہر جگہ ذکر ہوتا۔

آخرش اس کی گویائی کا چرچا، کوچہ و بازار میں مچا اور یہ خبر اس کور نمک، محسن کش کے گوش زد ہوئی۔ سنتے ہی سمجھا یہ وہی ہے۔ بعد مدت فلک نے پتہ لگایا، اب ہاتھ آیا، فوراً چوبدار بندر کے لینے کو سوداگر کے پاس بھیجا، یہ بہت گھبرایا اور تو کچھ بن نہ آیا، بصد عجز و نیاز عرضداشت کی ـــ "غلام، صاحبِ اولاد نہیں، اس اندوہ میں دل مضطر شاد نہیں، طبیعت

بہلانے کو اسے بچہ سا لے کر فرزندوں کی طرح پالا ہے، رات دن دیکھا بھالا ہے، بندر ہے مگر عنقا ہے، مفارقت اس کی خانہ زاد کی جان لے گی، آئندہ جو حضور کی مرضی۔"

یہ چوبدار یہاں سے خالی پھرا، وہ ظالم اظلم غضب میں بھرا، وہاں کے بادشاہ کو لکھا "اگر سلطنت اور آبادی مملکت اپنی منظور ہو، سوداگر سے جلد بندر لے کر یہاں بھیج دو، نہیں تو اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا، نام و نشان مٹا دوں گا۔"

یہ خبر وحشت اثر سن کے غضنفر شاہ متردد ہوا، مشیرانِ خوش تدبیر، امیر وزیر سمجھانے لگے کہ "خداوند نعمت، ایک جانور کی خاطر کشت و خون زبوں ہے۔"

حکم ہوا کہ کچھ لوگ سرکاری وہاں جائیں، جس طرح بنے سوداگر سے پکڑ کر بندر اس کی ڈیوڑھی پر پہونچائیں، جب بادشاہی دستہ سرا میں آیا۔ بندر دست بستہ زبان پہ لایا۔ "اے مونسِ غمگسار، وفا شعار اس اجل رسیدہ کے باب میں کد و کوشش بیکار ہے، سراسر بے جا ہے، قضا کا زمانہ قریب پہونچا، در ناکامی وا ہے۔ مبادا کسی طرح کا رنج میری دوستی میں تمہارے دشمنوں کو پہونچے، تو مجھے حشر تک حجاب و ندامت رہے، خلقِ خدا برا بھلا کہے۔"

سوداگر نے کہا "استغفر اللہ یہ کیا بات ہے، جو کہا وہ سر کے ساتھ ہے۔"

جب بادشاہ کے لوگوں کا تقاضائے شدید ہوا اور دن کم رہا، بعد ردّ و قدح بہ معذرتِ بسیار و منّتِ بیشمار، ہزار دینار دے کر، اس شب مہلت لی اور صبح کے وقت چلنے کی ٹھہری، بموجب مثل — مصرعہ: زر بر سر فولاد نہی نرم شود۔

اس عرصے میں یہ حال تباہ و ماجرائے جانکاہ گلی کوچے میں زبان زد خاص و عام ہوا کہ ایک بندر کسی سوداگر پاس باتیں کرتا تھا، وہ بھی کل مارا جائے گا۔ بعد کہ اس کشتۂ انتظار، مایوس دلفگار، یعنی ملکہ مہر نگار کو بھی معلوم ہوا، وہ شیدائے جانعالم سمجھی کہ یہ بندر نہیں، شہزادہ ہے، افسوس صد افسوس! اب کون سی تدبیر کیجئے، جو اس بیکس کی جان بچے۔ دل کو مسوس وزیر زادے کو کوس لوگوں سے پوچھا — "دمِ سحر کدھر سے وہ سوداگر جائے گا، یہ تماشہ ہمارے دیکھنے میں کیونکر آئیگا؟"

لوگوں نے عرض کی "حضور کے جھروکے تلے، شاہراہ ہے، یہی ہر سمت کی گذرگاہ ہے۔"

یہ سن کر تمام شب تڑپا کی، نیند نہ آئی، دو گھڑی رات سے برآمدے میں برآمد ہوئی اور ایک توتا پنجرے میں پاس رکھ لیا، گجر سے پیشتر بازار میں ہلڑ، تماشائیوں کا میلہ سا ہو گیا۔

جس وقت تاجرِ ماہ نے متاعِ انجم کو نہاں خانۂ مغرب میں چھپایا، اور شحنۂ چرخِ چہارم خونخواری کو مشرق سے نکل آیا، سوداگر نمازِ صبح پڑھ، ہاتھی پر سوار ہو کر، کمر میں پیش قبض رکھ، گود میں بندر کو بٹھا، مرنے پر کمر مضبوط باندھ کر مجبور رچلا۔ بندر سے کہا "پریشان نہ ہو، جب تقریر سے اور اصرافِ کثیر سے کام نہ نکلے گا، جو بن پڑے گا، وہ کروں گا، اپنے جیتے جی تجھے مرنے نہ دوں گا۔ قولِ مرداں جاں دارد۔ مصرع: بعد از سرمن کن فیکون شد، شدہ باشد۔ سوداگر کا سراسیمہ آگے بڑھنا تھا کہ خلقت نے چار طرف سے گھیر لیا۔ بندر لوگوں سے مخاطب ہو کر یہ کہنے لگا میر سوز ؎

برقِ طپیدہ یا شررِ برجہیدہ ہوں
جس رنگ میں ہوں میں غرض از خود رمیدہ ہوں

اے اہلِ بزم میں بھی مرقع میں دہر کے
تصویر ہوں دلے لبِ حسرت گزیدہ ہوں

صیاد اپنا دام اُٹھالے کہ جوں صبا
ہوں تو چمن میں پر گلِ عشرت نہ چیدہ ہوں

اے آہ و نالہ مجھ سے نہ آگے چلو کہ میں
بچھڑا ہوں کارواں سے مسافر جریدہ ہوں

غم ہوں الم ہوں درد ہوں سوز و گداز ہوں
سب اہلِ دل کے واسطے میں آفریدہ ہوں

صاحبو! دنیاے دوں، نیرنگئ زمانۂ سفلہ پرور، بوقلموں عبرت و دید کی جا ہے۔ گرما گرم آیند و روند کا بازار ہے۔ کس و ناکس جنسِ ناپائیدار، لہو لعب کا خریدار ہے، اپنے کام میں معروفِ قضا ہے، جو شے ہے ایک روز فنا ہے، معاملاتِ قضا و قدر سے ہر ایک ناچار ہے، یہی مسئلہ جبر و اختیار ہے۔ کوئی کسی کی عداوت میں ہے، کوئی کسی کا شیدا ہے، جسے دیکھا آزاد نہ پایا، کسی نہ کسی بکھیڑے میں مبتلا ہے۔ ایک کو اتنا سوجھتا نہیں، کیا لین دین ہو رہا ہے۔ سود کی امید میں سراسر زیاں ہے، بڑی ہونے کا سودا ہے، اُس کی قدرت ناطقہ دیکھو! مجھ سے بےزبان ناچیز کو بے تکلف گویائی عنایت کیا، تم سب کا سامعون میں چہرہ لکھ دیا، باتیں سننے کو چلے آتے ہو، جدائی میری شاق ہے، جو ہے مشتاق ہے، حالِ زار پر رحم کھا، آنسو بہاتے ہو، یہ رحیمی کی صفت ہے، شانِ قہاری دیکھو، اسی تقریر کی دھوم ہے۔ ایک ظالم شوم سے مجھ مظلوم کا مقابلہ ہوتا ہے۔ یقین کامل ہے وہ قتل کرے گا، بیگناہ کے خون سے ہاتھ بھرے گا۔ سَوادُ الْوَجْہِ فِي الدَّارَیْنِ ہوگا۔ تب اُسے آرام و چین ہوگا۔ یہ گویائی گویا پیامِ مرگ تھا۔ دنیا جائے آزمائش ہے۔ سفیہ جانتے ہیں یہ مقام قابلِ آرام و آسایش ہے، دو روزہ زیست کی خاطر، کیا کیا ساز و سامان پیدا کرتے ہیں۔ فرعون بے سامان ہو کر زمین پر پاؤں نہیں دھرتے ہیں، جب سر کو اٹھایا

آنکھ بند کر چلتے ہیں۔ خاکساروں کے سر کچلتے ہیں۔ آخر کار پُر حسرت و ارمان فقط لے کر مرتے ہیں۔ جان اس کی جستجو میں کھوتے ہیں، جو شے ہاتھ آئے، لذّت سے جمع ہو، پریشانی و مشقت سے پاس رہے، خرّت سے چھوٹ جائے، یاس و حسرت سے پھر سر پہ ہاتھ دھر روتے ہیں۔ ناسخ ؎

دنیا اک زال بیوا ہے — بے مہر و وفا و بے حیا ہے
مردوں کے لئے یہ زن ہے رہزن — دنیا کی عدو ہے دیں کی دشمن
رہتی نہیں ایک جا پہ جم کر — پھرتی ہے بہ رنگ زن گھر گھر

انجام شاہ و گدا، دو گز کفن اور تختہ تابوت سے سوا نہیں، کسی نے اُدھر سا یا محمودی کا دیا پایا، تحریمہ کربلا، کسی کو گزی، گاڑھا میسر ہوا بصد کرب و بلا، اس نے صندل کا تختہ لگایا، اس نے بیر کے چیلوں میں چھپایا، کسی نے بعد سنگ مرمر کا مقبرہ بنایا، کسی نے مرمر کے گور گڑھا پایا، کسی کا مزار مطلا، منقش، رنگا رنگ ہے۔ کسی کی مانند سینۂ جاہل گور تنگ ہے، حسرتِ دنیا سے کفن چاک ہوا، بستر دونوں کا فرشِ خاک ہوا، نہ امیر سمور و قاقم کا فرش بچھا سکا، نہ فقیر پھٹی شطرنجی اور ٹوٹا سا بوریا لا سکا۔ بعد چندے جب گردشِ چرخ نے گنبد گرایا۔ اینٹ سے اینٹ کو بجایا، تو ایک نے نہ بتایا کہ دونوں میں یہ گورِ شاہ ہے، یہ لحد فقیر ہے۔ اس کو مرگِ جوانی نصیب ہوئی۔ یہ استخوان بوسیدۂ پیر ہے، سو یہ بھی خوش نصیب ہے، نیک کمائی والے گور گڑھا کفن پاتے ہیں، نہیں تو سیکڑوں ہاتھ رکھ کر مر جاتے ہیں۔ لوگ در گور کہہ کر چلے آتے ہیں کتے، بلی، چیل، کوّے، بوٹیاں، نوچ نوچ کر کھاتے ہیں۔ دامنِ دشتِ عریاں کفن، گور بے چراغ صحرا کا صحن ہوتا ہے۔ یاس و حسرت کے سوا کوئی نہ سرہانے روتا ہے، تمنا چھٹ کوئی پائنتی نہ ہوتا ہے۔ سالہا بتردد کی عماراتِ عالی، اور ساز و سامان کی دیکھا بھالی میں سریع السیر رہے۔ ہزاروں رنج گورِ بے چراغ غریباں کی دید میں بیٹھے بٹھائے سہے طرفہ نقل ہے کہ والی وارث ان کے سر پر سلطنت، مسند حکومت پر شب و روز جلوہ افروز رہے، مگر تنبیہ غافلوں کو قدرتِ حق سے گنبدوں میں آشیانۂ زاغ و زغن میناروں پر مسکنِ بومِ شوم قبروں پہ کتے لوٹتے دیکھے۔ میر ؎

مزارِ غریباں تاسف کی جا ہے — وہ سوتے ہیں پھرتے جو کل جا بجا تھے

رنگ چمن، صرفِ خزاں دیکھا، ڈھلا ہوا حُسنِ گلرخاں دیکھا، اگر گل خنداں پہ جوبن ہے بہار ہے۔ غور کیا تو پہلوئے نازنیں میں، نشتر سے زیادہ خلشِ خار ہے، سینہ فگار ہے۔ دنیا میں دن رات زق زق، بق بق ہے، کوئی چھیڑ کرتا ہے، کسی کو قلق ہے، نوش کے ساتھ گزندِ نیش

ہے، ہر رہرو کو کڑی منزل درپیش ہے۔ مولف ؎

بلبل کو خزاں میں جاں کھوتے پایا ‏ ‏ صیاد کو سر پٹک کے روتے پایا
گلچیں کی بھی نیند اڑ گئی لیک سرور ‏ ‏ جو اہل دول تھے ان کو سوتے پایا

مدتوں صدائے مرغِ سحر کے رنج اٹھائے، کبھی دم نہ مارا، شکوہ لب پہ نہ لائے، برسوں ندائے اللہ اکبر کے صدمے سہے، شکر کیا، چپ رہے، مہینوں گجر کی آواز نے دم بند کیا، قلق جی پہ لیا، نالہ نہ بلند کیا سوچے تو وصل مہرویاں خوابِ شب تھا۔ لطف ان کا عین غضب تھا، تمام عالم کی خوب سیر کی، کبھی حرم محترم میں مسکن رہا، گاہ دھونی رمائی، کنشت و دیر کی۔ عالم سے آیۂ حدیث وعظ و پند سنا، ناقوسِ برہمن سن سن سر دھنا، وہ بدکیش مانع ملت صنم لطفِ زیست حظ نفس کا دشمن تھا۔ یہ کوتہ اندیش رخنہ پرداز اہل ایمان و دین کا رہزن تھا۔ تامل کیا تو ان دونوں سے دور حسد بغض بیر ہونا معلوم، اپنے نزدیک اُن کا انجام بخیر ہونا معلوم۔ واللہ اعلم یہ لوگ کیا سمجھے، خود اچھے ٹھہرے اور کو بُرا سمجھے۔ مطلب کی بات ہیہات دونوں کی سمجھ میں نہ آئی، بایں دانائی، اُن سے خدا سمجھے، مولف ؎

اچھے کو بُرا بُرے کو اچھا سمجھے ‏ ‏ کتنی یہ بُری سمجھ ہے اچھا سمجھے

دنیا فقط رہگذر ہے، ہر دم مثالِ تارِ نفس درپیش سفر ہے، تا زیست ہزاروں مفسدے ہیں۔ ڈر ہے مرنے کے بعد باز پُرس کا خطر ہے۔ کسی طرح انسان کو مفر نہیں، کون سا نفع ہے، جس کی تلاش میں ضرر نہیں۔ حاصل کار یہ ہے کہ دنیا میں جینے کی خوشی، نہ مرنے کا غم کرے، تا مقدور کسی کی خاطر نہ برہم کرے و گر نہ شعر ؎

نیم شبے آہ زند پیرِ زال ‏ ‏ دولتِ صد سالہ کند پائمال

دل شکستہ کی دلداری، پافتادہ کی مددگاری کرے۔ ہوا و ہوس جو دل سے دور ہو جائے تو مال سے، یا کمال سے عجب و نخوت نزدیک نہ آئے۔ عنایت ایزدی پہ قانع ہو، شکر ہر نعمت سپاس خدمت کر، منہیات کا مانع ہو، رنج کا حامل رہے۔ سب رنگ میں شامل رہے، زمانے کے مکروہات سے گھبرائے نہیں۔ صحبتِ غیر جنس سے نفرت کرے، تو بدنامی پاس آئے نہیں، دولت کا اعتبار کیا، مفلس سے ننگ و عار کیا، ایک دن مرنا ہے جینا مستعار ہے، اس پہ کس کا اختیار ہے۔ نیک عمل کا خیال رکھے کہ قید ہستی زیست کا نام ہے، رہائی یہاں سے انجام ہے۔ شعر

کسی کے مرگ پہ اے دل نہ کیجئے چشم تر ہرگز ‏ ‏ بہت سا روئیے اُن پہ جو اس جینے پہ مرتے ہیں

عمر خضر کی تمنا اور حشمتِ خسروانہ، خزانہ قاروں کی فکر میں ہر ایک صباح و مسا ذلیل و خوار ہے تحصیل لاحاصل کوشش اس امر میں سراسر بیکار ہے بقول ناسخ؂

ہاتھ آتی ہے کب علم و ہنر سے دولت ملتی ہے قضا اور قدر سے دولت
جو علم و ہنر رکھتے ہیں وہ ہیں محروم مانوس ہے بل احمق و خر سے دولت

روپے کا جمع ہونا، جواہر کی تلاش میں دن کا جاگنا، چاندی سونے کی امید میں رات کا نہ سونا، سیمیں تن لعل لبوں سے بہم ہونا، جنھیں میسر ہر بار ہے، انھیں مفارقت دنیا ناگوار ہے، اور یہ کلام ہے۔ مولف

یاں کے جانے سے جی اُلجھتا ہے کیا ہی دلکش سرائے فانی ہے

سلف سے اہلِ کمال، دنیا کے مال سے محروم رہے، جو سزاوارِ حکومت تھے، وہ محکوم رہے۔ شعر؂

اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالاں طوق زریں ہمہ در گردنِ خری بینم

لیکن کبھی صبحِ عشرت ہے، گاہ الم کی شام ہے، دنیا عجب مقام ہے، نہ امیر ہوتے عرصہ نہ فقیر ہوتے کچھ دیر ہے، اس کارگاہِ بے ثبات میں عجب اندھیر ہے۔ سودا؂

ہے چرخ جب سے ابلقِ ایام پر سوار رکھتا نہیں ہے ہاتھ عناں کا بیک قرار
جن کے طویلے بیچ کئی دن کا ذکر ہے ہرگز عراقی و عربی کا نہ تھا شمار
اب دیکھتا ہوں میں کہ زمانے کے ہاتھ سے موچی سے کفش پا کو گٹھاتے ہیں وہ ادھار

اور جب وعدہ آپہونچا، تو نہ روپیہ کام آتا ہے، نہ فوجِ ظفر موج سے کچھ ہو، نہ تہمتن جرار بچاتا ہے نہ کوئی آشنا دوست آڑے آئے۔ نہ عزیز و اقربا، پنجۂ ملک الموت سے چھڑائے، اگر یہی امر مانع قضا و قدر ہوتے، جمشید وکاوس، دارا و سکندر بصد حسرت و افسوس جان نہ کھوتے۔ نیک عمل کرے تو وہ ساتھ جاتا ہے، احتیاج کسی کی بر لائے۔ یا اللہ کچھ دے یہ البتہ کام آتا ہے، دگرنہ دنیا سراب زندگی، بدتر از حباب ہے، پابند اس کا خراب، ترک کرنے والا نایاب ہے۔

ترک دنیا کا سوچ کیا ناسخ کچھ بڑی ایسی کائنات نہیں
اس گلشنِ ہستی میں عجب سیر ہے لیکن جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم ہے خزاں کا

قطعہ ؎

دنیا خوابیست کش عدم تعبیر است　　صید اجل است از جوان و پیر است
ہم روئے زمیں پُر است وہم زیرِ زمیں　　ایں صفحہ خاک ہر دو رو تصویر است

الا مقتضائے عقل یہ ہے کہ عالم اسباب میں کسی اسباب کا پابند نہ ہو، تعلقِ خاطر نہ رکھے، ہمیشہ اپنے بھلے سے برائی کی ہے۔ جو گیا یہاں سے یعنی جہانِ گذراں سے۔ اس کا شاکی تھا بادشاہ سے فقیر تک، جوان سے پیر تک حقیقت میں نفس امّارہ سخت ناکارہ ہے، اسے پچھاڑے۔ گرد ہوا و ہوس سے دامن جھاڑے ؎

دیوانہ باش تا غمِ تو دیگراں خورند　　آں را کہ عقل بیش غمِ روزگار بیش

آدمی کو لازم ہے وہ بات پیدا کرے، تا صفحہ دنیا پر چندے بہ نیکی نام یاد رہے۔

اس طرح جی کہ بعد مرنے کے　　یاد کوئی تو گاہ گاہ کرے

دنیا میں کسی سے دل نہ لگائے کہ یہ کارخانہ بہت بے ثبات ہے۔ وصل سے فرحت، ہجر کی مصیبت اپنے سر پہ نہ لائے کہ مرجانے کی بات ہے۔ معشوقِ باوفا عنقا کی طرح ناپیدا ہے اور پُر دغا ہرجائی ہر جا مہیّا ہے، خواہش کا انجام کاہش ہے، تمنّا دل سے دور کرنے میں جان کی آسائش ہے۔ مولف ؎

کبھی نہ چین سے رہنے دیا تمنا نے　　خراب وخستہ میں اس دل کی آرزو سے ہوا

مگر وائے غفلت، ہائے نادانی، کہ جب نشہ جوانی کا موسم پیری میں خمار اترتا ہے۔ اس وقت آدمی سر پہ ہاتھ دھر کر روتا ہے۔ وقت از دست رفتہ و تیر از شست جستہ کب ہاتھ آتا ہے۔ ناچار ہو کفِ افسوس مل کر پچھتاتا ہے، گذشتہ را صلوات کہہ کر دل کو سمجھاتا ہے۔"

آدمیوں کو بندر کی تقریرِ دلخراش پُر اثر سے عبرت وحیرت حاصل تھی۔ کبھی نصیحت و پند گاہ کلام، رنگین و دلچسپ بادل دردمند، کبھی سخنان وحشت افزا سناتا چلا جاتا تھا۔ اہلِ دل طبیعت کے گداز سے روتے ساتھ آتے تھے، ہر فقرۂ پُر درد پہ ضبط نہ ہو سکتا تھا، چلّاتے تھے، خلقِ خدا جنازے کی طرح ہاتھی کے ہمراہ تھی، ایک عالم کے لب پہ نالے تھے، فغان و آہ تھی۔ اسی سامان سے ملکہ کے جھروکے تلے پہونچے۔ وہ منتظر تمام شب، نالہ بلب سوداگر سے بولی ——

"ایک دم ٹھہر جا، میں اس کی تقریر کی مشتاق ہوں۔"

سوداگر نے ہاتھی روکا، ملکہ نے کہا۔ "اے مقررِ بے زبان، گم کردہ خانمان! اگرچہ اب

ہم کس لائق ہیں، مگر تیری داستانِ ظلم و جور کے شائق ہیں۔"

بندر نے آواز پہچانی، پہلے تو خوب رویا، پھر جی ٹھہرا کر کہنے لگا۔ شعر

ہر کس از دست غیر نالہ کند　　　سعدی از دست خویشتن فریاد

میر

کیونکہ کہیے کوئی نہیں آگاہ　　　اک قیامت بپا ہے یاں ہر راہ

کچھ چھپا، اب نہیں رہا یہ راز　　　ہے جہاں اس سے سب سخن پرداز

بس تغافل نہ کر ترحم کر　　　گوشِ دل جانب تکلم کر

شعر

قسمت تو دیکھنا کہ کہاں ٹوٹی ہے کمند　　　دو تین ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

افسوس یار نے عیاری کی، دغا سے یہ نوبت ہماری کی، جس کا رونا ہمیں ناگوار تھا، وہ ہمارے لہو کا پیاسا، قتل کا روادار تھا۔ یہ مثل سچ ہے، تیرھویں صدی ہے، نیکی کا بدلہ بدی ہے۔ مجبوریوں کی تمنا، دل میں رہی، وطن جانے کی حسرت آب و گل میں رہی، دوستوں کا کہا نہ مانا، وہ آگے آیا، پچھتانا پڑا، بے اجل جلاد کے فریب سے ذبح ہوئے، طالب و مطلوب جان جوکھوں میں پھنسے، زندہ درگور ہوئے، الحق دنیا دم مارنے کی جا نہیں۔ راز کسی سے کہنا اچھا نہیں۔ منصور حلاج نے کلمہ حق کہا تھا، ناحق لوگوں نے دار پر کھینچا، غرض جو بولا، وہ مارا گیا، جان سے بچارا گیا، کہتے تو کہا پر سوچ کر بات بنائی، جی میں دہشت آئی کہ مبادا یہ خبر اس اکفر کو پہونچے تو یقین کامل ہو، جان دشنۂ ظالم سے نہ بچے، کہا "اے ملکہ! کوئی کسی کمال سے دنیا میں نہال ہوتا ہے یہ بیگناہ، گویائی کے سبب ناحق حرامزادے کی بدولت حلال ہوتا ہے"۔ مولف

کمال شے زوال شے ہے اس پہ لاکھ حاسد ہوں　　　بھلا نازاں نہ ہوں کیونکر میں اپنی بے کمالی کا

خدا جانے ہے، دیکھا دیکھ کر یہ چاند منہ کس کا　　　ہوئی ہے عید غیروں کو ہمیں ہے چاند خالی کا

میں نے اپنے ہاتھ سے پاؤں میں کلہاڑی ماری، فلک نے بنا کر بات بگاڑی۔ مصرعہ

اے روشنیٔ طبع تو برمن بلا شدی۔ شعر

گل و گلچیں کا گلہ، بلبل خوش لہجہ نہ کر　　　تو گرفتار ہوئی، اپنی صدا کے باعث

اب سر دست کچھ تدبیر بن نہیں آتی ہے، صورتِ مرگ آئینۂ چشم میں مد نظر ہے، ہماری ہمیں کو خبر ہے، کوئی گھڑی میں مفت جان جاتی ہے، جو جاتا ہے، وہ دیکھتا ہے، جسے خبر

نہیں، اس سے کہہ دو، تمھارے واسطے غریبِ دیار ہوئے، اور تمھارے سبب سے قتل کے سزاوار ہوئے۔ شعر ؎

بجرمِ عشق توام می کشند و غوغائیست — تو نیز بر سرِ بام آکہ خوش تماشائیست

ان باتوں سے رہے سہے شک ملکہ کے برطرف ہوئے، سمجھی جانِ عالم یہی ہے، جواب دیا جو جانتے تھے، ان سے کیا ہو سکا، انجان کو تکلیف دینے سے کیا فائدہ، اور توتے کی گردن مروڑ پنجرا باہر نکالا، بندر کی نگاہ جو پنجرے پر پڑی، سمجھا ملکہ پہچان گئی، یہی فرصت کا وقت ہے، ہنگامہ و تلاطم تو مچا تھا کسی نے دیکھا نہ بھالا، بندر، سوداگر کی گود میں لیٹ کر توتے کے قالب میں پرواز کر آیا، توتا پھڑکا، ملکہ کا خوشی سے دل دھڑکا، پنجرا اندر کھینچ لیا۔

سوداگر نے دیکھا، بندر مرگیا، چاہا ہلاک ہو جائے، بدنامی کا قصہ پاک ہو جائے۔ جو شخص خواصی میں بیٹھا تھا، سمجھانے لگا۔ "بندہ پرور! شکر کرنے کی جا ہے، شکایت کا موقع کیا ہے، حرمت رہی، جان بچی، مرگِ فرزند سے ماں باپ کو چارہ نہیں، مرجانا بجز حمقا، عقلمند کو گوارا نہیں۔ اگر بادشاہ جبر سے چھین کر مار ڈالتا، جان کھونے کی جگہ تھی صبر کیجئے، جو خدا کی مرضی اسکی رضا میں مجبوری ہے، جائے صبوری ہے، صابروں کا مرتبہ بڑا ہے۔ ان کے حق میں اللہ فرماتا ہے، تم نے سنا ہے کہ نہیں، اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ۔"

تماشائیوں پر جو یہ حال کھلا، رونے پیٹنے کا دونا، شور و غل مچا۔ سب نے متفق یہی کہا، بسکہ بندر عقیل تھا، یہ پیامِ طلب کوسِ رحیل تھا، سامنے جانے کی نوبت نہ آئی۔ سوداگر کی گود میں جان گنوائی، اپنا قتل جو ثابت ہوا، خوف سے مرگیا، داغ تقریر ہمارے صفحۂ دل پر دھر گیا، یہ خبر اس کافر اکفر کو پہنچی۔ اس پر بھی چین نہ آیا، لاش منگا جلا کر دل ٹھنڈا کیا، خاک تک برباد کی، جب تسکین ہوئی۔

وہاں ملکہ مہرنگار پنجرہ لے بیٹھی۔ لوگوں کو پاس سے سرکا دیا۔ میاں مٹھو نے ہو بہو ابتدا سے انتہا تک مفصل سب حال سنا دیا کہ "اس طرح نشہ کی حالت میں اس کے رونے پر عمل بتایا، وہ ہمیں پر عمل میں لایا، بندر بنایا، پھر چڑیمار کے جال میں پھنسے، دوست روئے، دشمن ہنسے۔ وہاں سے سوداگر، متاعِ خوبی سمجھ کر اپنے پاس لایا۔ فلک نے بعد خرابیٔ بسیار، آج تم سے ملایا۔"

ملکہ نے کہا "خاطر پریشان جمع رکھئے، انشاءاللہ تعالیٰ جلد کوئی صورت ہوئی جاتی ہے۔"

یہاں یہ گفتگو تھی کہ اس نطفۂ شیطان کی آمد ہوئی، ملکہ باہر نکل آئی، تعظیم کی، ہمیشہ یہ معمول تھا، جب وہ آتا، ملکہ بات نہ کرتی، خفیف ہو کر اُٹھ جاتا۔ اس روز جو گفتگو ہوئی، وہ مردک سمجھا، بندر کا مرنا بچشم ملکہ نے دیکھا، اس سے دب گئی، ہم کلام ہوئی۔ اب جلدی نہ کرو، امروز و فردا مقدمہ درست ہو جائے گا، لیکن پہلے اس سے فیصلہ شرط ہے۔ ملکہ کے باپ کا بہت ڈر تھا، اس باعث ملکہ سے ہراس کرتا تھا نہایت پاس کرتا تھا، جب رخصت ہونے لگا۔ ملکہ نے کہا "ایک بکری کا بچہ خوبصورت سا ہمیں بھیج دو پالیں گے، رنج کو ٹالیں گے۔"

یا تو چپ رہتی تھی یا آج بچہ مانگا۔ یہ بچّابت خوش ہوئے۔ اسی وقت ایک بربری کا بچہ تحفہ بھجوا دیا، دوسرے روز جو آیا ملکہ کو زیادہ متوجہ پایا۔ اس کے روبرو بچّے سے کھیلا کی۔ دو تین روز یہی صحبت رہی، ایک روز ملکہ نے بچّے کو دبا کر ادھ موا کر دیا اور چوبدار دوڑایا۔ شہزادے کو جلد بلا لا، عرض کرنا "اگر دیر لگاؤ گے جیتا نہ پاؤ گے۔"

یہ خبر سن کر وہ محل سرا کا عازم ہوا، ملکہ نے پنجرا اس ہمائے اوجِ سلطنت کا پلنگ کے پاس رکھ لیا۔ جب وہ نابکار روبرو آیا، ملکہ نے بچّے کو گود میں اُٹھا اس زور سے دبایا کہ وہ مر گیا، اس کا مرنا، اس کا نالہ فریاد کرنا، گریبان چاک کرنے کی، بکھیڑا پاک کرنے کی تدبیر کی، وہ بیقرار ہو کر بہت بولا، "ملکہ! ہزار بچہ اس سے اچھا ابھی موجود ہوتا ہے، تم کیوں روتی ہو؟"

ملکہ نے اُسی حالت میں کہا "میں کچھ نہیں جانتی، تم اسے ابھی جلا دو، جو میری خوشی چاہتے ہو۔"

وہ بولا "بھلا مردہ کہیں جیا ہے، کبھی کسی نے سوائے مسیح ایسا کیا ہے!"

ملکہ نے رو کر کہا "واہ تم نے میری مینا جو جلائی تھی، جب میں بلبلائی تھی،" یہ دل میں سمجھا کہ شاید شہزادے نے یہ حرکت کی ہوگی۔ کارخانے مسبب الاسباب کے معروف و مشہور ہیں۔ دنیا میں مثل ہے "کہ کرد کہ نیافت"۔ جس نے جیسا کیا ویسا پایا، ہر فرعونے را موسیٰ۔ قطعہ

اے یار جو کوئی کسی کو کلپاوے گا — یہ یاد رہے وہ بھی نہ کل پاوے گا

اس دارِ مکافات میں سُن اے غافل — بیداد کرے گا آج کل پاوے گا

وہ بدحواس پوچھنے لگا۔ "ہم نے مینا کیونکر جلائی تھی۔" ملکہ بولی۔ "تم پلنگ پر لیٹ رہے تھے، وہ جی اُٹھی تھی، یہ پتہ بھی درست پایا، اور قضا کا زمانہ قریب آیا۔ کہا "بچّہ گود سے رکھ دو۔"

ملکہ نے پھینک دیا، وہ پلنگ پر لیٹا، اپنی روح بکری کے بچے کے قالب میں لایا، وہ کودنے لگا، ملکہ مہر نگار نے گود میں لیا، پیار کیا وہ سوچا، دو گھڑی ملکہ کی طبیعت بہل جائے، پھر روح قالب میں لے جاؤں گا، مطلب تو نکل آئے۔ یہ نہ سمجھا فلک کی گھات ہے، فریب کی بات ہے، چرخ کو کچھ اور منظور ہے اب اس جسم میں جانا، بہت دور ہے۔

شہزادہ جانعالم یہ سب معاملہ پنجرے سے دیکھ سن رہا تھا، فوراً اپنی روح اپنے جسم میں لا اٹھ کھڑا ہوا، یہاں وہ بزدلا، جانعالم کو دیکھ کر تھرا گیا، خوف چھا گیا، سمجھا قسمت اب بری ہے، کوئی دم کو گلا اور چھری ہے۔ ملکہ نے جلد دو انچھر وہ پڑھ کر پھونک دیئے کہ وہ اور کے قالب میں روح لے جانا بھول گیا۔ پھر انجمن آرا کو بلایا، کہا "لو صاحب! مبارک ہو، اللہ تعالیٰ نے تمہاری ہماری حرمت و آبرو کو بچایا، بچھڑے سے ملایا، یہ آپ کا احق الذی شہزادہ ہے، وہ بکری کا بچہ بے دین، وزیر زادہ ہے"۔۔۔ یہ کہہ کر تینوں عاشق و معشوق گلے مل مل، خوب روئے جو جو محرم راز تھیں دوڑیں، مبارک سلامت ہوئی۔ جانعالم نے اسی وقت سوداگر کو طلب کیا، حال مفصل کہہ دیا۔ بعد ادائے شکر نعمت خلعت و انعام ہر اقسام کا عنایت کیا، وطن آنے کا وعدہ حتمی لیا، پھر چڑیمار اور اس کی جورو کو بلایا، بہت زر و جواہر دیا، اور بہ مشورہ غضنفر شاہ اس مملکت کے چڑیماروں کا چودھری کر دیا، پھر لشکر ظفر پیکر کو حکم تیاری سامان سفر فرمایا۔ آپ رخصت ہونے غضنفر شاہ کے پاس آیا۔ آخر کار بہ دقت تمام طول کلام درازی ایام مفارقت والدین کہہ کر اسے راضی کیا۔ پیش خیمہ اسی دن لد گیا۔ دو چار دن رخصت کی دعوتوں میں اور لگے۔ آخر جلسے خوب دھوم دھڑکے کے ہوئے۔ اپنے عمل تک وہ ساتھ آیا۔ تمام لشکر نے پکا پکایا پایا، پھر رخصت ہوئے۔ وہی دو چار کوچ ایک دو مقام کرتے بہ راحت و آرام چلے۔

ورودِ لشکرِ نصرت اثر دشتِ پُرخوف وخطر

میں لبِ حوض خیامِ شاہی ہونا، ساحرہ کا آنا، تمام لشکر کو نصف پتھر بنانا پھر ملکہ کے باپ کا آنا اور جادوگرنیوں کی لڑائی، شہپال کا قتل، فوج کی رہائی

نگارندۂ داستانِ عجیب — یہ لکھتا ہے پھر ماجرائے غریب
طلسم جہاں دید کا ہے مکاں — پھنسے اس میں رہتے ہیں پیر و جواں
ولیکن ہنسا جو کوئی غنچہ ساں — ہوا مثلِ گل دستبردِ خزاں
جسے ہم نے دیکھا وہ تھا دل حزیں — خوشی کی جگہ سچ ہے دنیا نہیں

محرّرانِ جادو نگار و سحر ساز راقمانِ فسانۂ ہوشربا، حیرت پرداز نے لکھا ہے کہ جانعالم ہر صبح مثلِ مہرِ درخشاں، قطع منازل و مراحل، یعنی کوچ ہر شام، مانند ماہ تاباں، مقام کرتا، چند عرصے میں پھر اسی دشتِ ادبار صحرائے خار خار، جہاں حوض میں کود پڑا تھا، وارد ہوا۔ حوض کے متصل سرا پردۂ خاص نصب ہوئے، گردِ لشکرِ نصرت اترا اترا۔ انجمن آرا اور ملکہ مہر نگار کو وہ چشمہ دکھایا۔

جب دن تمام ہوا، نمازِ شام کے واسطے جدا خیمہ میں تشریف لایا، نماز پڑھ کر کسلِ راہ سے پلنگڑی جو مہر نگار بچھی تھی، اس پر لیٹ رہا، سستی کے باعث غنودگی سی تھی کہ دفعتہً ایک خواص، خاص انجمن آرا کی، بدحواس دوڑی آئی، کہا شہزادہ جانعالم کی عمر دراز ہو، نصیبِ دشمناں

شہزادی کی طبیعت ناساز ہے، شدت سے کلیجے میں درد ہوتا ہے، وہ نقشِ سلیمانی اور لوح دیجیے، دھو کر پلا دیں۔" عارضۂ مزاجِ مطلوب و بدمزگی طبیعتِ محبوب سُن کر بیقرار ہوا، کچھ نیند کا خمار، کچھ طبیعت کا انتشار، دیکھا نہ بھالا، لوح و نقش حوالہ کیا۔ نقش دیتے ہی نقشہ بگڑ گیا، ایک آواز مہیب پیدا ہوئی کہ "اے جان عالم! بہت دنوں اڑتا پھرا، مدّت کے بعد پھنسا، خبردار ہو جا۔" ایسی آواز ہولناک تھی کہ سب لشکر ڈر گیا، شجاعوں کے دِل تھرّا گئے، محل میں رنڈیوں کو غش آ گئے، گھبرا کر شہزادے نے اٹھنے کا قصد کیا، جگہ سے ہلا نہ گیا، غور جو کیا تو آدھا جسم پتھر کا ہو گیا تھا، پھر تو جو جہاں بیٹھا تھا، بیٹھا رہ گیا، جو کھڑا تھا اینٹھا رہ گیا۔ ہر طرف غل اور شور تھا جو پڑا تھا مردۂ گور تھا، کچھ دکھ کچھ ہنسی، تمام فوج آفتِ ناگہانی میں پھنسی، عجب کھلبلی مچی، نامردوں کی بائی پچی۔ کل لشکر، انسان سے حیوان تک، نیچے کا دھڑ پتھر کا، اور اوپر کا جسم بدستور۔ آہ و نالہ و فریاد و بکا سب لشکر میں بپا تھا اور محلسرا میں بھی یہی ہنگامہ مچا تھا۔ ہر ایک گرفتار بلا تھا۔ وہ رنڈیوں کی زاری، انجمن آرا کی بیقراری۔ علی الخصوص ملکہ کے بیان سے زمین و آسمان کانپتا تھا جب وہ کہتی تھی شعر ؎

ہر دم زمانہ داغ دگر گونہ در دہد یک داغ نیک ناشدہ، داغِ دگر دہد

تمام لشکر میں از شام تا پگاہ، ہر ایک کے لب سے نالۂ جانکاہ، بلند رہا، جس وقت ماہِ دمِ سرد بھرتا، نقاب سیاہ روئے تاباں پر ڈال کر غم کدۂ مغرب کی طرف روانہ ہوا اور آفتاب جگر سوختہ مشرق سے نکل کر، خدنگِ آہ جگیاں کا نشانہ ہوا، ایک ابرِ تیرہ و تار آیا، آدمی سب خوفزدہ دیکھنے لگے۔ اس ابر سے اژدہا خونخوار، شعلہ فشاں، آتش دہاں نکلا، ایک رنڈی اُس پر سوار، آتش بار شہزادے کے خیمے میں اتری۔ جانعالم نے پہچانا کہ وہی جادوگرنی ہے۔ دل سے کہا۔ شہر اپنا دور رہا، موت قریب آئی۔ قسمت نے کس جگہ لا کر نیرنگی دکھائی، وہ بولی۔ "جانعالم! کہو اب کیا قصد ہے؟"

شہزادے نے کہا "وہی جو تھا۔"

اُس نے کہا "اب وہ نقشِ سلیمانی اور لوحِ پیر مرد کی نشانی کہاں ہے، جس کے بھروسے پر کودتے تھے۔ اگر زندگی مع لشکر درکار ہے، تو ملکہ اور انجمن آرا سے انکار کرو، ہماری اطاعت اور محبت مقدم جان کر، ہم سے دار و مدار کرو۔ نہیں تو ایک دم میں سب کو بے گور و کفن طعمۂ زاغ و زغن کر دوں گی۔ دشت لاشوں سے بھر دوں گی۔"

شہزادے نے کہا "ہمارے لوحِ دل پر نقشِ ارادت حافظِ حقیقی، کلکِ قدرت سے منقش ہے۔ عادت سے مجبور ہوں، بیوفائی سے دور ہوں، جو کہا سو کہا، جو کیا سو کیا، اگر قضا آئی ہے، مرنے سے کیا چارہ ہے، مگر جیتے جی بات جانی کب گوارا ہے۔"

یہ سُن کر جل گئی، غصے سے رنگت بدل گئی، کچھ بڑبڑا کر جانِ عالم پر پھونکا، یا نصف پتھر تھا اب حلق تک پتھر ہوگیا۔ حسرت و یاس سینہ میں بھری تھی۔ تصویر آذری سی پلنگڑی پر بے حس و حرکت دھری تھی۔ وہ تو اژدہے پر چڑھ کر اُڑی اور پکاری "اے اجل رسیدہ آج کے دن اور رات کی مہلت ہے، اگر صبح کو بھی انکار کیا تو یاد رکھنا، لشکر کا خون اپنی گردن پر لیا۔"

یہ سُنا وہ تو ہوا ہوئی۔ جب تک شہزادہ آدھا پتھر تھا تو ملکہ اور انجمن آرا اپنے اپنے خیموں سے گھبرا کر پکارتی تھیں، جانِعالم جواب دیتا تھا۔ یہی آواز کا سہارا، اُن کی زیست کا سبب تھا، اب تک حلق پتھر ہونے سے وہ جرس قافلۂ گم کردہ راہِ دشتِ غربت بے صدا ہوگیا۔ وہاں صبر کا راہبر جدا ہوگیا ہر چند دونوں چلائیں، شہزادے نے مطلق جواب نہ دیا، بولا ہی نہ گیا۔ پھر تو ملکہ مہرنگار بادل فگار سر پیٹ کر کہنے لگی۔ میر حسنؔ ؎

فلک نے تو اتنا ہنسایا نہ تھا کہ جس کے عوض یوں رلانے لگا

مژدہ اے مرگِ غریب الوطنی! خوب حیلہ ہاتھ آیا، تو بدنامی سے بچی، ہم نے ناکامی میں جان دی، چرخِ ستم شعار زور رنگ لایا۔ انجمن آرا بے چاری مصیبت کی ماری، سب کا منھ حیرت سے تکتی تھی اور روتی تھی۔ نہ بین کر آتے تھے، نہ غل مچایا جاتا تھا، گھٹ گھٹ کر جان کھوتی تھی۔ خواصیں سر کھول کر کہتی تھیں "ہے ہے! ہم اس جنگل ویران میں لٹ گئے، وارث سے چھُٹ گئے۔ شعر ؎

تو وہ کریم ہے ناشاد کو جو شاد کرے مراد مند کو ہر طرح بامراد کرے

لوگو! ہم کدھر جائیں، کیونکر اس بلا سے نجات پائیں۔"

کوئی کہتی تھی "شیطان کے کان بہرے۔ خدانخواستہ اگر جانِ عالم کے دشمنوں کا رونگٹا میلا ہوا، شہزادیاں خاک میں مل جائیں گی، غمِ جدائی سے جانیں گنوائیں گی۔ ہم ان کے ماں باپ کو کیا منھ دکھائیں گے۔ اس دشتِ ادبار میں سر ٹکرا کر مر جائیں گے۔ یہ جادوگرنی قربان کی تھی، یونہی بے گور و کفن رکھے گی۔"

اور آتون محل دار جگر انگار سر سے چادریں پٹک مدینے کی طرف پکار پکار یہ شعر

کہتی تھیں ؎

تصدق اپنے نواسوں کا یا رسول اللہ ۔۔۔ کہو یہ حل کریں مشکل ہماری حضرتِ شاہ

ایک طرف مغلانیاں، غم کی ماریاں، دمِ گرم آہِ سرد بھرتی تھیں۔ ایک سمت انیسیں، جلیسیں، نجف کی طرف بال کھول کر التجا سے، گریہ و بکا سے، یہ عرض کرتی تھیں شعر

تم نے مدد کی نوح کی طوفاں سے کشتی پار کی ۔۔۔ یا مرتضیٰ مشکل کشا کیوں بار میری بار کی

کوئی کہتی تھی" ہمارا لشکر اس بلا سے جو نکلے گا، تو مشکل کشا کا کھڑا دونا دوں گی۔"

کوئی بولی" میں سہ ماہی کے روزے رکھوں گی، کونڈے بھروں گی، صحنک کھلاؤں گی، دودھ کے کوزے بچوں کو پلاؤں گی۔"

کسی نے کہا" میں اگر جیتی بچی، جناب عباسؓ کی درگاہ جاؤں گی، سقائے سکینہ کا علم چڑھاؤں گی، چہل منبری کر کے نذرِ حسین سبیل پلاؤں گی۔"

غرضکہ لشکر سے زیادہ خیموں میں تلاطم پڑا تھا۔ صدائے حزیں نالہ ہر غمگین سے ہنگامۂ محشر بپا تھا۔ اتفاقاً ایک شاگرد ملکہ کے باپ کا رشید فنِ سحر میں دیدہ شنید، اس مرد بزرگ کی ملاقات کو بروئے ہوا اڑا جاتا تھا۔ یہ نالۂ بلند صدائے ہر دردمند اس کے کان میں جو پہنچی، زمین کا متوجہ ہوا دیکھا تو ایک لشکرِ عظیم بہ حالِ سقیم سحر کا مبتلا ہے، شور و غل ہو رہا ہے۔ جب قریب آیا طرفہ ماجرا نظر آیا کہ انسان سے تا جانور سب آدھے پتھر ہیں، سمجھا کہ سحر شہپال میں خراب حال ہیں۔ لوگوں سے پوچھا" یہ ستم رسیدہ لشکر کس کا ہے، کہاں سے آیا ہے، کس نے یہ حال بنایا ہے؟"

وہ ملکہ مہرنگار کے ملازم تھے، اپنا حال سب نے بیان کیا۔ جب اُسے یہ امر معلوم ہوا کہ استاد زادی کی خانہ بربادی ہے، درِ خیمۂ ملکہ پر آیا، سر پیٹا، چلایا، ملکہ نے آواز پہچانی کہا "بھائی! اس وقت پردہ کہاں کا، یہاں آ کر بالمشافہ ہمارا عذاب اور حالِ خراب دیکھو۔" وہ اندر آیا۔ ملکہ کو بھی اسی عالم میں پایا۔ اس نے فرمایا "عداوتِ ساحرہ سے ہمارا قافلہ تباہ ہے۔"

وہ عرض کرنے لگا" فدوی کو اس کی ہمسری کی طاقت نہیں اور وقفہ کم، بیچ سب کارخانہ درہم برہم ہو جائیگا، بجز آپ کے والدِ بزرگوار کے تشریف لائے، یہ بلا ٹلتی نہیں، تو خدا حافظ و ناصر ہے۔" یہ کہہ کر بحالِ خستہ و تباہ لب پر نالہ و آہ اس تیز قدم سے چلا کہ ادھم صبا کی ڈپٹ ہر قدم نثار تھی، ٹھوکروں میں صرصر بیقرار تھی۔ پہر بھر میں واردِ باغ ہوا، گل سا چاک گریباں غنچے کی طرح خوش، شبنم نمط اشک رواں۔

پیر مرد نے فرمایا "خیر ہے!"

اس نے شمۂ گرفتاریٔ جانعالم، ملکہ کی بیقراری، انجمن آرا کا الم، لشکر کا حال ابتر، کہہ کر عرض کی "جلد چلئے اگر شام تک نہ پہنچے، وہاں صبح ہی دم سحر ملک الموت کا بازار گرم ہو گا۔ ارمان سب دل میں رہے گا، کشتوں کو عالم بے والی وارث کہے گا، کوئی گور و کفن نہ پائے گا، خاتمہ بالخیر ہو جائیگا۔"

پیر مرد نے آہِ سرد بھر کر فرمایا "افسوس! شہزادے کو سب کچھ سمجھایا تھا مگر عمل میں نہ لایا۔"

میر سوز ؎

ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا   پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی

اسی دم شاہینِ تیز پرواز پر سوار ہوا، مغرب کی نماز لشکر میں داخل ہو کر پڑھی۔ پہلے جانعالم کے خیمے میں آیا، حال دیکھ کر سخت گھبرایا۔ پھر انجمن آرا کی جا کر تسکین کی، وہ رونے لگی۔ وہاں سے ملکہ کے پاس آ کے کہا "تمھاری بدبختی نے ہماری وضع میں فرق ڈالا، برسوں کے بعد باغ سے نکالا۔"

ملکہ نے رو کر عرض کی "یہ وقت تدبیر ہے نہ ہنگامِ تعزیر، بعد رہائی اس آفت سماوی کے جو چاہنا فرمانا۔"

القصہ مجبور و ناچار وہ عارف باوقار شہزادے کے خیمے کے نزدیک، دور تک حصار کھینچ کر بیٹھا، یہ مرد بزرگ نیک صفات فنِ سحر کے سوا عاملِ اسمِ ذات کا تھا، کچھ پڑھنے لگا، کبھی مناجات بدرگاہ مجیب الدعوات کرتا کہ "اے یاور زیر دستان و سرفرو کنندۂ گردن کشاں! اس بوڑھے کی شرم تیرے ہاتھ ہے، قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں، اخیر وقت کا تو حافظ و نگہبان ہے، مجھ پر جو مشکل ہے، تیرے روبرو آسان ہے، سفید داڑھی کو بدنامی کے دھبے سے نہ رنگانا، تیرہ بختی کا دھبہ اس ریش سفید پہ نہ لگانا۔ شعر

مشکل ز توجہ تو آساں   آسان ز تغافلِ تو مشکل

جبکہ سجادہ نشینِ چرخ اول یا مجمع مریدان، کواکب حجرۂ مغرب میں روپوش ہوا اور ساحرِ فلکِ چہارم پُر شوکت و باحشم طلسم مشرق سے نمودار، با جوش و خروش ہوا اور وہ عبادت گذار، پیر جواں مرد و شب زندہ دار وظائف صبح سے فرصت پا چکا تھا؛ یکایک وہ نابکار شیطان صفت ناپاک عورت اژدہے پر سوار، بچشم خونخوار، بعزمِ قتلِ جانعالم

لشکر میں تنہا آئی۔ پہلے ملکہ کے باپ پاس گئی۔ آنکھیں لال لال، طیش کمال اور بہ آواز کرخت پکاری "اے مردِ پیرِ سست تدبیر! تیری اجل بھی دامنگیر ہو کر کشاں کشاں اس دشتِ جانفشاں میں لائی ہے، مجھے شرم آتی ہے کہ تو پیرِ نود سالہ ہو چکا ہے، بے مارے مر رہا ہے، تیرے قتل میں بدنامی چھٹ فائدہ کیا ہے، جدھر سے آیا ہے، سیدھا چلا جا، میں بیک نگاہ کج، نشانِ لشکر اس صفحۂ زمین سے مثل حرفِ غلط کا ردِّ سحر سے مٹائے دیتی ہوں۔"

مرد بزرگ نے آشفتہ ہو کر فرمایا "اے ننگِ فرقہ بنی آدم، مردودِ عالم! تجھے جوشِ شہوت ولولۂ مباشرت نے آمادہ قتل ہزار بندہ اللہ بے جرم و گناہ کیا، میں مرگِ عزیزان دیکھوں، مرنے سے ڈروں! بقول تیرے آج نہ موا کل مر جاؤں گا، جیتے جی خلق کو کیا منھ دکھاؤں گا، ہمچشموں سے ناحق آنکھ چھپانی پڑے گی، تو بدبخت مجھ سے کیا لڑے گی۔"

یہ سن کر وہ فاحشہ جھلا، آستین چڑھا، سحر کی نیرنگیاں دکھانے لگی۔ اُن کی بھی دُعا کی تاثیر سپر بن کر اُس کا سحر اس پر ڈھال رنگ مٹانے لگی۔ صبح سے پہر دن باقی رہا، کوئی دقیقہ طرفین سے نہ باقی رہا، طول اس مقام کا بیجا تھا۔ اسی کلمے پر تمام کیا کہ جب وہ عاجز ہوئی تب سحر کی طاقت سے شیرنی کی صورت بنائی۔ پیر مرد بھی اسد اللہ الغالب کو یاد کر وہ مہیب شیر ببر بنا اور اس طرح للکار کر گونجا کہ جنگل کے چارپائے نعرے کے خوف سے دریا میں گرے اور پانی کے جانور خشکی میں چھپتے پھرے۔

کچھ دیر اس ہیئت میں لڑائی زور آزمائی رہی۔ آخر کار وہ روبہ خصال اس ہزبرِ میدانِ شجاعت کی تاب نہ لائی۔ گیدڑ بھبکی دکھائی اور عقاب بن کر اُڑ چلی۔ وہ شاہینِ اوجِ دلیری سوچا بے گرفتاری طائرِ مطلب اس ڈھڈو کے لشکر جنجال سے نہ نکلے گا۔ اسی طرح یہ پھٹکی پھٹکی ٹٹی کے آڑ میں شکار کھیلے گی۔ بلا سے کچھ ہو اسے پھنساؤ، زور میں کم پایا تھا، فوراً باز تیز پرواز ہو کے اس سناٹے سے پنجۂ آہنی میں اسے دبوچا اور ایسا نوچا کہ اس کی جان سنسناگئی۔ بھاگتے وقت رجال الغیب سامنے تھا، موت پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑی۔ بہت تڑپی، پنجۂ قضا سے نہ چھٹ سکی۔ اسی کشمکش اینچا کھینچی میں مرغِ روح اس کا مجروح قفسِ تن سے اُڑ کر آشیانۂ جہنم میں پہونچا۔ غلغلہ حشر و شورِ نشور اس صحرا میں نزدیک و دور مچا۔ ہر طرف سے دار و گیر کی صدا آئی۔ آسمان چکر میں آیا۔ زمین تھرائی، دشت تیرہ و مکدر ہوا، آندھی چلی سحر کا کارخانہ اُڑ گیا، ابتر ہوا۔ قریب شام وہ سیاہی موقوف ہوئی۔ خورشید نے رخِ انور دکھایا، اپنا بیگانہ نظر آیا۔

جانعالم گھبرا کر اُٹھ بیٹھا، اہل لشکر نے رہائی، از سر نو زندگی پائی۔ جانعالم خیمہ سے نکل نادم و خجل پیر مرد کی خدمت میں حاضر ہوا، سب نے دیکھا، دور حصار میں ایک رنڈی، اسّی نوّے برس کا سن، ضعف کا زور و شور، بڑھاپے کے دن، قد کمان مرنے پر لیس، آنکھیں تودۂ طوفان جسم کا ہر پٹھا در پۂ ژولیدگی، گھتی ہوئی رگیں، صاف نظر آتی تھیں۔ ہڈیاں پسلیاں بوسیدہ جلد کے باہر سے گنی جاتی تھیں۔ دُرجِ دہان بے دُرِ دنداں، حقّہ خالی کی طرح وا، داڑھ دانت کے نام سے منہ میں تنکا نہیں، بھاڑ سا کھلا، بایاں ہاتھ ساکھو کا ڈالا اور دہنا برگد کا ٹھنا، قد کا ڈول نرالا، عوج بن عُنق کی خالہ، ٹانگ ہر ایک تاڑ سے بڑی کھڑی ہو، تو سقف بے ستون کی اڑواڑ ہو، گنبد چرخ کی پاڑ ہو، پھیلائے پڑی تھی گویا بھورا کے محل کی کڑی تھی، سینہ پُر کینہ تنگ، چھاتیوں کے تکّے تکّے کی طرح سیدھے لٹکتے، پیٹ کے پیٹ کی انتہا نہیں۔ بے خاک گور کبھی بھرا نہیں، دل پہاڑ کی سل سے سخت تر، گردہ توپ کا، ہمسر ہڈّی سے گوشت، گوشت سے کھال جُدا، پیر زال فرہاد کش بڑھیا چہرے کا یہ رنگ کہ سلطت کی پیر کا اس کے رو برو مُنھ سفید ہو جائے، شبِ فرقت کی سیاہی میں کالی بلا سی نظر آئے۔ کھونبڑ کا وہ ڈھنگ کہ سب کہتے تھے۔ بچا ہے، لڑکوں کو کاٹ نہ کھائے۔ ماتھے پر سیندور کا ٹیکا، دور سے نظر پڑتا اور سفید چونڈا، چنور کی طرح لٹکتا، سیاہی کا دھبّہ بجز تیرہ بختی کہیں نہ دیکھا۔ ایسے سر کی مانگ میں بھی مانگ جا بخ، سیندور بھرا، بالوں میں ناریل کا تیل، پھٹے پھٹے دیدوں میں ندیدوں کی طرح کاجل ریل پیل، گہنے کے عوض سانپ بچھو لپیٹے، کھوپڑی اور ہڈیوں کے ہار گلے میں پڑے، سحر کا سنگار کئے، پشت بہ بہشت رو بہ نحس سوئے جہنم چت پڑی تھی۔

شہزادہ پیر مرد کو ساتھ لے کر ملکہ کے خیمے میں آیا، شہزادیوں نے جان پائی۔ جلیسوں کے منھ پر رونق آئی۔ خواصوں نے شکرِ جناب باری کیا، ماما اصیلوں نے پیر مرد کے قدم پر گر کر عرض کیا۔ مصرعہ۔

اے آمدنت باعث آبادی ما

اس بزرگ نے فرمایا ”ابھی اس معرکے سے نجات نہیں ہوئی، آفت عظیم کا سامنا باقی ہے۔“

جانعالم نے پوچھا۔”قبلہ! وہ کیا ہے؟“

اس نے فرمایا ”اس کا باپ شہنشاہ جادوان ہے، کوئی دم میں ضرور آئے گا، بکھیڑا مچائے گا۔“

ملکہ مہر نگار مضطرب ہوئی، پیر مرد نے فرمایا ”اللہ یار ہے وہ کیا نابکار ہے۔ مصرعہ۔

دشمن اگر قویست نگہباں قوی تراست

یہ کہہ کے دو ماش چپ و راست پھینکے، دو جانور نئی صورت کے پیدا ہوئے، ہرن کے چہرے، طاؤس کا دھڑ، یاقوت کے سینگ، الماس کی آنکھیں، زمرد کے پر، اور دو ٹھیکریوں پر کچھ لکھ کے اُن کے سامنے رکھا، وہ ہر ایک چونچ میں اُٹھا، اُڑ گیا۔ وہ رات بھی بیم و ہراس میں گذری جس وقت ساحرِ شب بیدار عالم، صبح کی آمد، کے دبدبے سے بھاگا، ہوا تند چلی، برق چمکی، رعد کی آواز ہوئی۔ اہلِ لشکر ڈر گئے۔ مثل مشہور ہے۔ مار گزیدہ از ریسمانِ پیچیدہ می ترسد۔

پیر مرد کے گرد سب جمع ہوئے۔ ایک سمت سے غول کے غول، غٹ کے غٹ، جادو گروں کے جھٹ پٹ باز جرے باشے بھیگے پر ننگے دھڑنگے۔ سوار قطار قطار آئے۔ میدان میں مرشدِ کامل نے ان پر پرا جمایا۔ دوسری جانب سے جادوگرنیاں طاؤس اور ناگنوں پر سوار آتشبازی کے حقے اڑاتی، ناریل اُچھالتی، اکتارے چھیڑتے، بادلے کی جھنڈیاں، ہوا سے اڑاتی ہوئیں۔ آپس میں چھیڑ چھاڑ سحر آزمائیاں، ہاتھوں کی صفائیاں ہوتی، لڑائی کے عزم پر ہر ہر کرتی، موجود ہوئیں۔ اسی پرے کے مقابل ٹھہریں، انھیں دیکھ کے جانعالم کا جی کلبلایا، فوج کے سرداروں کو، فرمایا گو آج دغدغہ کامل ہے، مگر یہ جلسہ اور معرکہ دیکھنے کے قابل ہے۔ زندگی ہے تو ایسا روز کبھی کاہے کو نظر سے گذرے گا۔ وگرنہ مرگ انبوہ جشنے دارد۔ ہماری بھی فوج چمک دمک سے صف آرا ہو، اسباب سب نیا نکالو۔

یہ خبر سُن پہلے بیلدار نکلے، پست و بلند زمین ہموار کر کنکر پتھر چُن کر جھاڑی جھنڈی کاٹ ڈالی۔ جھاڑی ہوئی زمین صاف برابر نکالی۔ پلٹنوں کی خاطر مورچے درست کئے، توپوں کے لئے دمدمے باندھے۔ جھائی لگائی۔ کہیں سرنگ کا رنگ جمایا۔ باروت کو بچھایا۔ میدان جنگی بنایا۔ بہشتی سے آبپاشی کر گئے۔ توپخانے والے بالچوں میں پانی بھر گئے، فوج کی آمد ہوئی۔ صفِ کارزار آراستہ ہونے لگی۔ راست و چپ پانچ پانچ سو ہاتھی مست، پٹے سونڈوں میں چڑھے، ایک ایک پہلوان قوی ہیکل زرہ پوش گرز گراں بردوش، ان پر سوار، پھر پلٹنیں اور توپخانہ آیا۔ انھیں قرینے سے جمایا، کیا کیا، توپ فلک شکوہ سورج جھنکار، اور نانک متی کی سی، گردوں گرداں پر چوٹ کرتی۔ مدد کو ہوٹ کوسوں کی چوٹ کی، اور غبارے جس کا گولہ قعر چرخ میں اُتارے، پھر سواروں کے پرے میں میمنہ و میسرہ قلب و جناح ساقہ و کمیں گاہ درست کر دیا۔ آگے ہراول پیچھے سواروں کے پیدل، فوجوں کے دُل۔ نقیب۔ چار سُو سے نکلے، کلے سے کلہ کوتی سے

کنوتی، پٹھے سے پٹھا، دُم سے دُم، سُم سے سُم ملایا۔ نشان برداروں نے علم سبز و سرخ زرافشاں کو جلوہ دیا۔ سرِ ہر علم ماہی پرچم کی چمک، چشمِ دلاوران میں بادۂ جرات کا کام کر گئی۔ نامردوں کو ہول ہوئی۔ بھاگنے کی فکر پڑی۔ پیٹ میں کھل بلی مچی۔ کتنوں کی چلتے چلتے گانڑ چلی۔ دریائے فوجِ ظفر موج موجزن تھا۔ غرشِ کوس حربی صدائے نقارخانۂ جنگی چرخ پر برُج ثور تک زیرِ زمیں گاؤ زمی کو پہونچی، اور صدمہ دمامہ، تندر نہیب، آواز دہلِ گوش فریب، سے کرۂ ارض و سما دہل گیا اور کرنائے چینی نے غریو سے صور کی ہمدمی کا دم بھرا۔ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا کا وقت قریب آیا۔

جانعالم بھی بصد حشم اسپ پری پیکر پہ جلوہ گر ہوا، چتر زرنگار، بالائے سر، تاج شہریاری کج رکھ کر، شمشیر برق دم زیب کمر، فولادی سپر پشت پر، بائیں ہاتھ میں مرکب کی عناں، دہنے میں نیزۂ اژدہا پیکر دو زباں، فتح و نصرت جلو میں، اقبالِ یاور تگ و دو میں۔ ہمت و غیرت دست بستہ بہم۔ جرات زیرِ قدم۔ قربوس زین میں کمانِ کیانی، چہرے پر رعب و جلالِ کشورستانی۔ سمندِ صرصر گام کو گرم عناں کر کے پرے کے برابر باگ لی، چاوش طرار، خبردار باش للکارا۔ مریخ سا خنجر گذار بالائے چرخ، الاماں پکارا، اکڑکیتوں نے کڑکا، شروع کیا، نقیبوں نے نہیب دی۔

"دلاورو! آج عرصۂ جنگ، جگہ نام و ننگ کی ہے۔ دنیا میں زندگی چار دن ہے۔ لڑنے بھڑنے کا، نوجوانو! یہی سن ہے، کسی کو بقا بجز ذات خدا نہیں، ہمیشہ دنیا میں کوئی رہا نہیں۔

شعر

رستم رہا زمیں پہ نہ سام رہ گیا مردوں کا آسماں کے تلے نام رہ گیا"

اس صدا سے جو سدا کے بہادر، صاحبِ جرات تھے۔ ان کا دریائے شجاعت سینے میں موجزن ہوا، مونچھیں کھڑی، آنکھیں سرخ چہرے بشاش ہو گئے۔ بسان شیر وہ دلیر قبضہ ہائے شمشیر دیکھنے لگے اور چست و چالاک ہو کر مستعد کارزار ہوئے۔ جانفشانی کو تیار ہوئے۔ ہر دم باہم یہ اختلاط تھا، دیکھیں آج تلوار کس کو خوب کاٹتی ہے۔ کس کس کا لہو چاٹتی ہے۔ پہلے نیزہ کس کا سینۂ عدو پر چلتا ہے، نیزے کی طعن پر کون چھاتی تانتا ہے، لوہا کون مانتا ہے، کس کے تیر کے نشانے سے خون کا فوارہ اچھلتا ہے۔ آبِ پیکان دشمن کے حلق میں کون اتارتا ہے۔ سرِ پیکان کس کا تا بسوفار سرخرو ہوتا ہے۔ کس کو کون للکار کر، ڈانٹ کر مارتا ہے، دَدا کو کون پکارتا ہے۔ عرصۂ کارزار میں حق نمک آقا کا ادا کیجیے، دشمنوں کا لہو پیجیے۔ جب بگڑے تو وہ کام کیجیے، جس سے رستم

کی گور تھرائے، سام و نریمان کا رنگ فق ہو جائے، کوہ کو پرِ کاہ کی طرح اکھاڑے۔ دیو سامنے آجائے تو پچھاڑے۔ رئیس قدرداں سرِ میدان سرگرم نظارہ ہے دیکھئے کون کام آتا ہے، کون ناکارہ ہے، کس کے ہاتھ کھیت رہتا ہے، کون کون کھیت رہتا ہے، من چلاپن کرلو، زرِ سرخ و سپید سے سپریں بھرلو۔ آج ہی تو آن بان ہے یہ گوٹے یہ میدان ہے دہل گنڈوں کا، لاحول ولا، یہ ڈول ہوا کہ ہول سے چہرے زرد لب پر آہِ سرد، منھ پر ہوائیاں اڑتی تھیں، ہر بار بھاگنے کو باگیں مڑتی تھیں، کھڑے ہوئے اپنے منھ نوچتے تھے، بھاگنے کی راہ سوچتے تھے، پیٹ پکڑے پھرتے تھے۔ دست سرِ دست چلے آتے تھے، ڈر کے مارے بے مارے موئے جاتے تھے۔ کوئی کہتا تھا — "میاں اِجی ہے تو جہان ہے، نوکری نہ ملے گی، بھیک مانگ کھائیں گے، جانیں کہاں پائیں گے۔ حرمت گئی تو گئی، جان تو رہے گی، لہو کی ندی تو بدن سے نہ بہے گی۔ یہی نا کوئی نامرد کہے گا، آبرو جائے گی جی تو رہے گا۔ یہاں کی بگڑی کہیں اور بنالیں گے، تیر تلوار کی گولی، بچا کر گالیاں کھالیں گے، لڑنے کو سپاہیوں نے کمریں باندھی ہیں۔ کوسنے کو ہم موجود ہیں، کوسوں بھاگنے کو آندھی ہیں۔ جونکیں لگانے میں ہمارے ماں باپ بھنگ پلاتے تھے معجون کھلاتے تھے، کسی کی فصد کھلی دیکھ کر ہمیں غش آتے تھے۔ ہم تو دوست ہو یا دشمن، دونوں کی خیر مانگنے والے ہیں۔ سب سے پہلے معرکے سے بھاگنے والے ہیں۔ ہمیشہ گالی گلوچ کو خانہ جنگی، ڈھول دھپے کو میدان داری سمجھے۔ لڑائی بھڑائی سے کبھی بھڑکے نہ نکلے۔ تمام عمر بدن میں سوئی نہ گڑنے دی۔ گالیاں کھا کھا کے زندگی کی۔ بے غیرتی کا بھلا ہو، جس نے آج تک جان سلامت رکھی۔ اس پر بھی قسمت نے یہ دن دکھایا۔ خدا نے ہمیں ہیجڑا کیوں نہ بنایا۔"

فوج میں تو اس طرح کھلبلی مچی تھی۔ ادھر انجمن آرا اور مہرنگار نے ایک اونچا ٹیکرا تجویز کر خیمہ بپا کیا چلمن چھوڑ آبیٹھیں، سیر دیکھنے لگیں۔ اِس عرصے میں لشکرِ غنیم کی آمد ہوئی۔ یعنی شہپال جادوگر سیاہ رو، نولاکھ ساحر ہمراہ رکاب، شکست آفتاب لے کر تخت پر سوار، چالیس اژدر خونخواہ تخت اُٹھائے۔ بڑے کرّ و فر سے آیا۔ فوج بے قیاس، وہ خدا ناشناس لایا، اور سامنے جوانان تہمتن دگرداں صف شکن کے اپنا پرا جمایا، پھر علم کالے آگے نکالے اور پرچم سیاہ ہم صورت بخت اُس گمراہ کے کھلے، دف و نے و جھانجھ بجنے لگے۔ ادھر کوس و کور گرجنے لگے۔

وزیر اس کا پیام پیرمرد پاس لایا۔ دستِ ادب باندھ کر عرض کی "ایلچی کو زوال نہیں، زیادہ گوئی کی مجال نہیں، شہپال نے فرمایا ہے، تمہارا جینا مرنا برابر ہے کہ گرم و سرد زمانہ

دیکھ کر عمر طبعی کو پہنچے، مگر ان نوجوانوں پر رحم نہ کیا، ان کے خون کا حساب اپنی اعمال کی کتاب پر لکھوا، بوجھ اپنے ذمے لیا۔"

پیر مرد نے جواب دیا" اس اجل رسیدہ پیر نابالغ سے کہنا، طرفین سے جس کا خون زمین پر بہے گا، اس کا مظلمہ، مواخذہ تیری بیٹی جو فاحشہ تھی، اس کی گردن پر رہے گا۔ ہم سمجھتے تھے وہی ننگ خاندان تھی، لیکن اب معلوم ہوا، ایسوں کے ویسے ہی ہوتے ہیں۔ تجھے سفید داڑھی کی شرم نہ آئی کہ وہ مری، تیرا کلنک کا ٹیکا مٹا، تو تو اس سے بھی زیادہ بے حیا، سیہ قلب نکلا۔ یہ مقام رزم ہے، جائے نیزہ و شمشیر، یا بزم ہے، جو محل تقریر ہو، گفتگو بے فائدہ ہے۔ لاطائل باتوں سے کیا حاصل، جو منظور ہو، بسم اللہ۔ اس میں دیر نہ کرو۔ دیکھیں آج کس کے حصے میں تخت و تاج ہوتا ہے، اور گور و کفن کو کون محتاج ہوتا ہے۔" وزیر مجوب پھرا۔ شہپال سے سب حال کہا، پھر تو وہ کافر غدار، گیر ناہنجار مثل مارِ دُم بریدہ، برخود پیچیدہ ہو، شعلۂ غضب سے وہ ناری جل گیا۔ چہرے کا رنگ گرگٹ کی طرح بدل گیا۔ پہلے تو آپ حقہ آتشی پیر مرد پر مارا، پھر لشکر کے سرداروں کو للکارا، دوپہر تک عجیب و غریب سحر سازی و ہنگامہ پردازی، جادوگر اور جادوگرنیوں کی لڑائی رہی کہ دیکھی نہ سنی۔ کسی نے کسی کو جلایا، کسی نے بجھایا، کسی سنگدل نے پتھر برسائے، سب کچھ سحر کے نیرنگ دکھائے۔

آخر کار جب جادوگری ختم ہوئی، لڑائی کی نوبت بگرز و شمشیر و نیزہ و تیر آئی۔ پھر تو شہزادہ جانعالم کی بن آئی، باگ اٹھائی، فوج جرار، غازیانِ نامدار خبردار ہوئے۔ سپاہ مانند ابر چہار سمت گھر آئی، برق شمشیر چمکی۔ پہلوانوں کے نعرے نے رعد کا کام کیا۔ خوب لوہا برسا۔ یہ سب تازہ دم، وہ دوپہر کے مثل سیکڑوں ٹاپوں میں کچل گئے۔ گھوڑوں کی جھپٹ میں کھندل گئے، شمشیر صاعقہ خصالِ جانعالم کا یہ حال تھا، جس کے سر پر پڑی، خود و سر اس خود سر کا کاٹا، حلق میں قطرہ سیماب کی طرح اُترا، سینۂ پر کینہ کا لہو چاٹا۔ وہی سر جو پناہ خود میں تھا، پلک جھپکی تو گود میں تھا۔ پھر گھوڑے کے تنگ سے چست گذر۔ زخم کشادہ کر خانۂ زین سے زمین میں قرار لیا، سرِ بالیں اس کی قضا کو روتے دیکھا، اسے خواب مرگ میں پاؤں پھیلائے سوتے دیکھا۔ جس پر لپک کر ایک وار کیا، دو کیا، دو کو چار کیا۔ حواس خمسہ کسی کے درست نہ تھے ششدر ہو گئے۔ ساتویں طبق زمین کے تھرآئے، آسمان کو چکر ہوا، مردے قبروں سے چونک کر باہر نکل آئے، جو اٹکا اسے مار لیا، بھاگے کا پیچھا نہ کیا۔ گھڑی بھر میں خون کا دریا بہ

گیا۔ لاشوں کا انبار رہ گیا۔ کاسہ سر حباب دریا کی طرح بہتے نظر آتے تھے۔ موجِ خون میں دھڑ دھڑا دھڑا غوطے کھاتے تھے۔ دشمنوں کی کشتی، زیست طوفانی تھی، آبِ تیغ کی طغیانی تھی۔ فوجِ عدو کا زندگی سے دل سیراب اور اچاٹ تھا، لہو لہان ہر تلوار کا گھاٹ تھا۔ کوسوں تک لاشے پٹے تھے۔ یہ پاٹ تھا۔

آخر کار فوج کی شکست ہوئی۔ شہپال کو مار سر اس خود سر کا مثلِ خیار تر، اتارا گیا۔ سپاہ باقی ماندہ اس تیرہ بخت نگوں سار کی فرار ہوئی، زندگی دشوار ہوئی۔ پھر تو غازیانِ فتح نصیب و جادواں مہیب لوٹ پر ٹوٹ پڑے۔ سب کچھ لوٹا، ساز و سامان ان کا ذرا نہ چھوٹا۔ ادھر نشان کھلے، شادیانے بجے، وہ سب چادر پھراتے، ماتم کرتے، گریبان چاک سرور و آشفتہ، بخاک دم بھرتے۔ جن کا منھ جدھر اٹھا، بھاگ نکلے۔ میدان کشتوں سے اٹ گیا۔ جنگل لاشوں سے پٹ گیا، آج تک طعمۂ زاغ و زغن اسی بن سے ہے۔ صحرائی درندوں کے خوب پیٹ بھرے، بلکہ جانوروں کی دعوتوں کو گوشت کے پتے قیمے کئے اٹھا رکھے۔ بہت ہیضہ کر کے مرے۔ وہ سرزمینِ قلعہ خزانہ جانعالم کے قبضے میں آیا۔ بڑی جستجو اور تگاپو سے وہ لوح اور نقش پایا۔ پیر مرد رخصت ہوا اور جتنے مدارج پند و نصیحت تھے، مکرر سمجھائے راہ کا خطر، مصیبت سفر ہر منزل و مقام کا نفع و ضرر کہہ کر کہا "میری جان! اب ایسی حرکت اور سامان نہ کرنا جو پھر کوئی روزِ سیاہ دشمنوں کے سامنے آئے۔ دوستوں سے دیکھا نہ جائے ہم سے باغ چھوڑائے، لو اللہ حافظ و ناصر ہے رسول اس کا اور تمھارا مددگار و یاور ہے۔"

نزولِ موکبِ شوکت و جلال بعد فتح جادو شہپال

ساحلِ دریائے شور پر، جہاز کا آنا، شہزادے کی طبیعت کا لہرانا، پھر سوار ہونا، اور جہاز کی تباہی، باہم کی جدائی، انجمن آرا کی بے سروپائی، جوگی کی ملاقات

آشیانِ بحرِ تقریر، دغوّاصانِ محیطِ تحریر، شناورانِ شطِ الفت، غریقِ لجۂ محبت نے گوہرِ آب دار سخن کو سلکِ گفتار میں منسلک کر کے، زیبِ گوشِ سامعانِ ذی ہوش اس طرح کیا ہے، کہ بعد فتحِ جنگِ جادو شہپال اور ہاتھ آنے خزانۂ مالا مال کے دو، مہینے تک عساکرِ نصرت اثر، شب و روز اس دشت میں جلوہ افروز رہا۔

جب پیر مرد باغ کو تشریف فرما ہوا، جانعالم نے کوچ کیا۔ چند مدت کے بعد ایک روز خیمہ لبِ دریائے شور ہوا۔ شہزادہ معشوقوں سے باہم تماشائے بحرِ زخّار و امواجِ بیجدار اور سیر دریائے ناپیدا کنار کی۔ پانی کا زور ہوا سے دریائے شور کا شور کیفیتِ لطمہ و گرداب دیکھتا تھا۔ نظم ؎

آب کیسا کہ بحر تھا زخّار — تند و موّاج و تیرہ و تہ دار
موج کا ہر کنایہ طوفاں پر — مارے چشمک حبابِ عمّاں پر
گذرِ موج جب نہ تب دیکھا — ساحل اس کا نہ خشک لب دیکھا

ناگاہ ایک جہاز پُر تکلف، بانقش و نگارِ بسیار، صبا دار نمودار ہوا۔ شاہزادہ سمجھا کوئی سوداگر کہیں جاتا ہے۔ جب قریب آیا، جہاز کو لنگر کیا اور ناخدا درِ دولت پہ شرف اندوز ہو کر

عرض کرنے لگا۔ "ہم لوگ ملّاح ہیں۔ یہاں جو شاہ و شہر یار رونق افروز ہوتا ہے ہم اسے دریا کی سیر و شکار بحری جانور آبی دکھاتے ہیں۔ موافق قدر جو قسمت میں ہوتا ہے، انعام پاتے ہیں۔"

یہ سُن کر خواہشِ سیر دریا شہزادے کے سفینۂ دل میں موجزن لطمہ پیرا ہوئی۔ ملکہ سے کہا "چلتی ہو؟"

اُس نے عرض کی "ہنوز گرداب غم تلاطمِ اندوہ و الم سے ساحلِ فرحت و طرب کی ہمکناری میسر نہیں ہوئی، آپ کو اور لہر آئی، نیا ڈھکوسلا سوجھا۔

جانعالم نے کہا "دریا کی سیر جی مسرور کرتی ہے، خفقان دور کرتی ہے، طبیعت بہل جاتی ہے۔ تم نے سُنا نہیں قول سعدی مصرع۔ بدریا در منافع بیشمار است ــــ چار گھڑی دل بہلا چلے آئیں گے۔ ملّاح محروم نہ رہ جائیں گے۔"

ملکہ مہرنگار نے متردّد ہو کر کہا۔ "یہ سب سچ ہے جو آپ نے فرمایا۔ خفقان کیسا، تمھارے دشمنوں کو مالیخولیا ہے۔ میں نے بارہا انجمن آرا سے کہا، سو یہ مرض لادوا ہے، پانی سے دونا ہوتا ہے، اس کے سوا میرے دماغ میں بھی کیا خلل ہے، میرا دوسرے مصرعہ پر عمل ہے۔ سعدی ع۔ ــ اگر خواہی سلامت برکنار است ــ

شہزادے نے فرمایا "خیر ہم تو سڑی ہیں، تنہا جائیں گے، تم نہ چلی بیٹھی رہو، آرام کرو، جدائی کی تاب، محبّت کے مبتلا کو کہاں ہے، الفت کا یہی بڑا امتحان ہے۔"

ناچار اسی دم ملکہ مہرنگار اٹھی اور انجمن آرا مع چند خواص ہمراہ ہوئی۔ جہاز پر پہنچے، بادبان کھینچے۔ پالیں چڑھیں، مہرنگار مضطرب وار یہ شعر پڑھنے لگی۔ حافظ ؎

دل افگندیم بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا　　درین دریائے بے پایاں، دریں طوفانِ موج افزا

لوگ مصروف تماشا، ملکہ غریقِ بحرِ تفکّر، غوطہ زنِ گردابِ تحیّر، لطمہ اندوہ و الم کی آشنا، باربار انجمن آرا سے کہتی تھی "خدا خیر کرے۔ دشمن نہ ایسی سیر کرے، بے طور موجِ الم سر سے گذرتی ہے، خود بخود پانی دیکھ کر جان ڈرتی ہے، اللہ حافظ و نگہبان ہے، سراسر سامانِ بد نظر آتے ہیں، کلیجہ خوف سے لرزاں ہے۔"

القصہ چار گھڑی جہاز نے بادِ مراد پائی۔ سیر دکھائی پھر آفت آئی، ناخدا چلایا، ملّاح ہراساں ہوئے۔ شہزادے نے پوچھا "کیا ہے؟"

عرض کی کہ "طوفانِ عظیم الشان اٹھا ہے۔"

ابھی یہ ذکر تھا کہ ہوا عالمگیر ہوئی، جہاز تباہی میں آیا، بادبان ٹوٹ گئے، مستول گرا، ملاحوں کے چھکے چھوٹ گئے، سنبھالنے کا مقدور نہیں رہا۔ آخرش تلاطم آب، صدمہ پیچ و تابِ موج سے ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ کسی کو کسی کی خبر نہ ملی۔ کون ڈوب گیا، کون جیتا رہا۔ ایک سے دوسرا جدا ہوگیا۔ جانعالم تختے کے سہارے سے ڈوبتا ترتا چار پانچ دن میں کنارے لگا۔ جب تکان پانی کی موقوف ہوئی غش سے آنکھ کھلی، دیکھا کنارے کیا ہوں بلکہ گور کے کنارے لگ رہا ہوں۔ بڑی جدّو کد سے اترا۔ آہستہ آہستہ بیٹھتا اٹھتا ایک طرف چلا۔ ایک بستی میں پہونچا، وہاں کے باشندے اس کا چہرہ اور جمال یہ خراب حال دیکھ کر بہت گھبرائے، قریب آئے، کوئی بولا "یہ پریزاد ہے، مثل سروِ آزاد ہے، چمنِ حسن و خوبی کا شمشاد ہے۔"

کسی نے کہا "ابھی تو دن ہے۔ یہ از قسمِ جن ہے۔"

غرض کہ جن جن نے اسے جن کہا تھا، پاس آکچھ خوف سا کھا۔ اس طرح بولے۔ استاد

مصرع: کون ہو کیا ہو سچ کہو، حور ہو یا پری ہو تم

جانعالم نے دمِ سرد دل اندوہگیں سے بھر چشم تر کر ان لوگوں سے کہا۔ لاادری

حالے دارم چناں کہ دشمن خواہد — جانے دارم کہ فرقتِ تن خواہد
ناکامی خویش را اگر شرح دہم — دشمن بخدا زندگی من خواہد

ایہا النّاس میں گم کردہ کاروان جرس کی طرح نالاں ہوں، دل گرفتہ نقشِ پائے یارانِ رفتہ ہوں، حمق میں گرفتار ہوں، بچھڑوں کا طالب دیدار ہوں۔ غریب دیار بیتاب دانہ نصیب ہوا نہ آب۔ مفارقتِ یارانِ چند سے خستہ و خراب حیران ہوں۔ ہوش و حواس یک لخت زائل، ضعف سدِّ راہ۔ ناطاقتی حائل۔ یاروں کی صورت نظر آئی نہیں۔ دیدۂ دیدار طلب میں بینائی نہیں، نہ تابِ رفتار نہ طاقت گفتار۔ مولف

بسانِ نقشِ پا بیٹھے جہاں واں سے نہ پھر سرکے — ٹھکانا پوچھتے ہو کیا بھلا ہم بے ٹھکانوں کا
بیادِ دوستاں پہروں مجھے ہچکی لگ آتی ہے — کہیں مذکور جب ہوتا ہے کچھ گذرے فسانوں کا
علم سے آہ کے ثابت ہوئی غم کی ظفر ہم کو — کہ باعث فتح کا ہوتا ہے کھل جانا نشانوں کا
چھڑائے جبر سے پیر فلک نے دوست سب میرے — مٹے گا داغ کب دل سے مرے ان نوجوانوں کا
شرر منھ سے نکلنے میں سرورِ دل حزیں ہر دم — بھلا دیواں ہو کیونکر جمع ہم آتش بیانوں کا

اس حکایتِ جانسوز، شکایتِ چرخِ بے مہر غم اندوز سے سب رونے لگے کہا "یہ

شہزادہ عالی تبار ہے، الّا دل از دست دادہ، محبوبوں سے دور افتادہ، اس سبب سے دل افگار ہے،" منت و سماجت سے مکان پر لے گئے، ہاتھ منھ دھلوا کھانا پانی حاضر کیا۔ شہزادہ جانعالم آب و طعام دیکھ کر رو دیا۔ یہ کہا۔ استاد ؎

ہو خاک بھوک کی اس فاقہ مست کو بھر جھانجھ   جو اپنا خون جگر روز ناشتہ سمجھے

خدا جانے میرے بچھڑوں کا کیا حال ہوا! کسی کو دانا پانی میسر آیا یا کچھ نہیں پایا۔ میں بھی نہ کھاؤں گا۔ بھوکا پیاسا مر جاؤں گا۔"

وہ بولے "حضرت سلامت کھانے پینے سے انکار نادانی ہے، اسی سے بشر کی زندگانی ہے جو جیتے ہو تو کسی روز بچھڑوں سے مل جاؤ گے، وگرنہ غربت کے مرجانے میں، گور و کفن بھی نہ پاؤ گے۔"

ناچار سب کے سمجھانے سے دو ایک نوالے بجبر حلق سے اُتارے، پانی جو پیا، ہاتھ پاؤں سنسنائے، پیہم غش آئے۔ جب طبیعت ٹھہری۔ سب حال پُر ملال، جہاز کی تباہی، انیسانِ ہمراز کی جدائی، اپنا ڈوبتے اچھلتے، وہاں تک آنا، اوروں کا پتہ نہ پانا بیان کر کے بقول مرزا حسین بیگ صاحب یہ کہا ؎

ہمرہان رفتند و ما ماندیم و دزداں در کمیں   خانہ ملّاح در چین است و کشتی در فرنگ

سب تاسف کرنے لگے۔ ایک شخص نے کہا "یہاں سے دو منزل ایک پہاڑ ہے، کوہ مطلب بر نام ہے اس پر جوگی کا مقام ہے۔ مردِ باکمال، شیریں مقال، ہزاروں کوس سے حاجت مند، اُس کے پاس جاتے ہیں، سب کے مطلب بر آتے ہیں۔ بلکہ اس پر عنایت باری ہے، چشمہ فیض اس سے جاری ہے، مشہور ہے کہ آج تک کوئی شخص محروم ناکام، اس مقام سے نہیں پھرا۔"

یہ مژدہ سُن کر چہرہ پر بشاشت چھا گئی۔ گئی ہوئی جان اسی آن بدن میں آگئی۔ گھبرا کر یہ شعر پڑھا ؎

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند   آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

اسی دم چلنے کا عزم کیا۔ وہ لوگ مانع ہوئے، کہا "ابھی جانے کی طاقت آپ میں آئی نہیں، پاؤں میں راہ چلنے کی تاب و توانائی نہیں۔ دو چار روز یہاں آرام کرو، قوت آجائے تو مختار ہو۔"

غرضکہ جانعالم نے ان لوگوں کے سمجھانے سے وہاں مقام کیا، عجب پریشانی میں

یں صبح کو شام کیا، گردوہ سب حلقہ زن، یہ بہ اندوہ معشوقانِ گرفتار رنج و محن کبھی تو محزون چپ رہتا، گاہ مثلِ مجنوں خود بخود بکنے لگتا، اور جب حواس خمسہ درست ہوتے یہ خمسہ پڑھتا استاد؎

ہر سو خبر الفت کی کیا آپ سے پہونچائی　　آگے بھی مرے لب پر فریاد کبھی آئی
کیوں مجھ سے بگڑتا ہے او کافر ترسائی　　تا داشت دلم طاقت بودم بہ شکیبائی
چو کار بجا آمد زیں پس من و رسوائی

گاہے مرے لب پر ہے فریاد گہے افغاں　　پیارے غم دوری سے میں سخت ہوں اب نالاں
یہ جائے ترحم ہے کر رحم ذرا جاناں　　درِ زاویۂ الفت دور از تو چو مہجوراں
تنہا منم و آہے آہ از غم تنہائی

ہے دن کو تو یہ عالم ظالم ترے مجنوں پر　　ہیں گرد کھڑے لڑکے جھولی میں بھرے پتھر
سونے کی کسے فرصت اے یار اسے باور کر　　شبہا منم و اشکے و زخوں ہمہ بالیں تر
عشق ایں ہنرم فرمود ارعیب لفرمائی

اعضا شکنی گاہے گہ درد جگر دیکھو　　رومال بھگوتا ہوں لاکھوں ہی کبھی رو رو
گردن زدنی ہوں میں شکوہ کروں تیرا گو　　صد رنج ہمی بینم اے راحتِ جاں از تو
از دیدہ تواں دیدن چیزیکہ تو بنمائی

تھا تاب و تحمل میں یکتا جگرِ خسرو　　آگے تو نہ بہتے تھے سلکِ گہرِ خسرو
تم اب تو نوازش لو چل کر خبرِ خسرو　　بس دُر کہ ہمی ریزد از چشم ترِ خسرو
کز دست بروں رفتست سر رشتۂ دانائی

آخرش وہ رات کی رات، بہزار عقوبات تڑپ تڑپ کر سحر کی، نماز صبح کے بعد پہاڑ کی راہ لی۔ چار دن میں ناچار وہ راہ طے کی، پہاڑ پر پہونچا، سنگِ سفید کا پہاڑ بہت آبدار مانند ہمت جوانمردان صاف باطن، سربلند اور مثالِ طبع سخن وران فرح افزا و دل پسند، درہ ہائے فراخ کشادہ، روشن جوشِ نباتات روئیدگی، ریاحین و لالہ زار سے اور خروشِ مرغانِ خوش الحان سے رشک صد گلشن چشمہائے سرد و شیریں جا بجا فرہاد کی روح کا ٹھیکا، ہر قسم کا میوہ دار درخت قدرت حق سے اُگا، پھولا پھلا۔ پتھر ہر ایک معدنِ لال، پرند چرند صاحب حسن و جمال۔

یہ سیر دیکھتا چلا، ایک طرف درخت گنجان، گھنے پختہ مزار بیدار دلوں کے بنے اور

منڈھی کا گنبد بسانِ گنبدِ گردانِ بے ستون کا جواب بنا، ترسول گڑا، کھاروے کی جھنڈی، پھر پھراڑتی۔ کلمہ شہادت بخطِ جلی اس پہ لکھا۔ جب اس کے نزدیک آیا، دور دور تک مکان صاف، صحن شفاف پایا، مٹھ کے روبرو درخت کے تلے، چبوترے کے اوپر ایک جوگی نَو سو۲۵ برس کا سن و سال، مگر ٹانٹھا کمال، داڑھی ناف سے بڑھی، گرہ لگی۔ جٹا ہر ایک راکھ سے بھری، قدمبوس ہو رہی۔ پاؤں پہ پڑی، پلکیں دیدۂ بیں کا اسرار چھپانے کو، چشم حاسد کی گزند بچانے کو، مونچھوں سے ملیں۔ جسم میں موج دریا کی طرح جھریاں پڑیں، کمر میں کردھنی موٹی سی، مہین بان کی، عجب آن بان کی، کھاروے کا لنگوٹ، سترِ عورتیں کی اوٹ، گلے میں محمودی کی کفنی، حقہ چوگانی منھ سے لگائے۔ انیونی کی شکل بنائے، شیر کی کھال بچھائے، بھبھوت رمائے، دید وا دید سے بظاہر آنکھیں بند، مگر دیدۂ دل کھلا، خموشی پسند قلب گویا بولتا، سوتا نہ جاگتا، آسن مارے، دنیا سے کنارے بیٹھا، پیٹ سے پیٹھ لگا۔ تیر سا قدِ راست مثل کمان خمیدہ گویا چلہ کھینچ چکا ہے۔ زنار آسا رگیں عیاں، کھال سے ہڈیوں کے جوڑ، شمع فانوس نمط نمایاں، تسبیح سلیمانی، ایمان کی نشانی، ہاتھ میں ہر بھجو ہر بھجو تکیہ کلام بات بات میں۔ قشقہ ٹیکا، ماتھے پر ہندوں کا سا، سجدے کا گھٹا بدر کامل کی صورت چمکتا، زرد مٹی بدن میں، ذکرِ حق دل و دہن میں، کہیں مصلے پہ سبحہ سجدہ گاہ رکھی۔ کپڑے کی جانماز بچھی، کسی جا پوتھی کھلی، دھونی رمی، دونوں سے راہ رکھی، عجب رنگ کا انسان، خلاصہ یہ کہ ہندو نہ مسلمان۔ بقول مرزا سودا ؎

کس کی ملت میں گنو آپ کو بتلا اے شیخ تو کہے گبر مجھے، گبر مسلماں مجھ کو

ایک طرف تکئے میں دو چار کیاریاں، بیلے چمیلی کی، بہار گلکاریاں، کہیں مرشدوں کے ڈھیر، گرو کی چھتری، بزرگوں کے مزاروں پر، مولسری درخت سایہ دار، قطار قطار، درختوں کی ٹہنیوں میں پنجرے لٹکتے باہم بحث کرتے، اٹکتے، فاختہ کی کوکو، قمری کی حق سرہٗ کوکلہ کے دم، سناٹے کا عالم، کہیں مرگ چھالا بچھا، شیر چہ کی دتیا، دھونی لگی، لکڑ سلگتا، کسی جا ببر کی کھال کا بستر، آہوئے صحرائی اس پہ بیٹھا، اوداسا تو بنا، ہمینتا دھرا۔ ایک سمت بھوانی کا مٹھ، تلسی کا پیڑ، ہرا بھرا گرد چشمہ پانی کا بھرا جائے۔ جائے دلچسپ، مکان رعب دار گل خود رو کی جدا بہار، ایک طرف بھنڈارا جاری کڑھاؤ چڑھا، موہن بھوگ ملتا، کہیں پلاؤ قلیے کی تیاری، چھاندا بٹ رہا تھا۔ کچھ مہنت بالکے، کچھ مرید حال قال کے کوئی چلے میں بیٹھا، کوئی دنیا سے ہاتھ اٹھائے کھڑا کسی کے خرقہ و تاج سر و تن میں کوئی چواگن میں، کہیں کتھا ہوتی کوئی وعظ کہہ رہا۔ ایک طرف

خنجری بجتی، طنبورا چھڑتا، بھجن ہوتے۔ ایک سمت حلقہ مراقبے کا بندھا، نوحہ پڑھ رہے لوگ روتے، عجب وہ گرو، مرشدِ غریب یہ مرید چیلے روز ایک دو کو مونڈتا تیسرے چوتھے دن عرس، ہر ہفتے میں میلے۔

حاصل کلام یہ کہ وہ عجب جلسہ تھا کہ دیکھا نہ سُنا۔ یہ اجتماعِ نقیضین، آرام وچین سے، شہزادے کے پاؤں کی آہٹ جو پائی۔ مردِ آگاہ دِل، روشن ضمیر نے پلک ہاتھ سے اُٹھائی، آنکھ مِلائی، دیدے لال لال، چہرے پر رعب و جلال جانعالم کو بغور دیکھا۔ اُس نے جُھک کر مودب سلام کیا۔ اس خوش تقریر شیریں مقال نے کہا "بھلا ہو بچہ، بڑی مصیبت فلک نے دکھائی جو یہ صورت یہاں تک آئی، آؤ بیٹھو گرو بھلا کرے، مرشد کی دعا سے حق حاجت روا کرے، ہم تمہارے امانت دار ہیں، سواری کھڑی ہے، چلنے کو تیار ہیں۔"

جانعالم تو متحیر ہو رہا تھا، زیادہ حیران ہوا کہ یہ کیا اسرار ہے؟ بائیں جا بیٹھا جوگی اُٹھا۔ چشمہ میں جا کر بیٹھا نہایا۔ گیروا چادر پھینک سفید اوڑھ، عطر لگا، جانعالم کے نزدیک آ، یہ نکتہ زبان پر لایا۔ "بابا! ایک دن ذوق وشوق کے عالم میں، ہمارے مرشد گرو نے تیرے حال سے خبر دی تھی کہ ایک شہزادے کا جہاز تباہ ہو جائیگا۔ وہ بہ سراغِ مطلب یہاں آئے گا، اس کا کام تجھ سے اور تیرا کام اس کے سامنے پورا ہو جائیگا۔"

اس بات کے سننے سے شہزادے کو نہایت مسرت ہوئی۔ کہا "جوگی جی! تمہارے نام سے میری زندگی ہوئی وگرنہ دو چار دن میں گریبانِ صبر چاک ہو جاتا۔ میں سر پٹک کر ہلاک ہو جاتا۔ خوبصورتی کا بھی عجب مزا ہے، جہان اس کا شیدا ہے، عالم کو مرغوب ہے، طرحدار سب کا محبوب ہے، پیر فقیر غریب امیر سب کو عزیز ہے، اس کا خواہشمند ہر باتمیز ہے۔"

جوگی سمجھانے لگا کہ "یہ اضطراب بے جا ہے۔ دیر آید درست آید، بابا! دنیا کا یہ نقشہ ہے، گاہ خوشی کبھی رنج۔ یہ دونوں امر باہم ہیں۔ کبھی وصل کی شام کو دل بشاش ہوتا ہے، کبھی ہجر کی صبح کو کلیجہ پاش پاش ہوتا ہے۔ ایک شب ہمکناری ہے۔ ایک روز پہلوتہی گریہ وزاری ہے، کبھی شبِ وصل کیا کیا اختلاط ہوتے ہیں گاہ فصل کے دن سر پٹکتے ہیں، روتے ہیں۔ آدمی جب رنج سے گھبرائے اور غمِ مفارقتِ دوست جان ہونٹوں پر لائے، دل کو یہ تسکین دے کر سمجھائے

مصرعہ: چناں نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند۔

قطعہ: در پس ہر گریہ آخر خندہ ایست

مصحفیؔ سے

فصلِ گل جیتوں کو پھر اگلے برس آئے گی   زندگی ہے تو خزاں کے بھی گزر جائیں گے دن

جو وصل میں راحت و آرام پاتا ہے، وہی ہجر کے دُکھ قلق اُٹھاتا ہے۔ تو نے ان دونوں بھائی جو توام پیدا ہوئے تھے، اُن کا قصہ سُنا نہیں کہ پہلے اُنھوں نے کیا کیا صعوبت اُٹھائی، پھر ایک نے سلطنت پائی دوسرے کے ہاتھ شہزادی آئی۔"

جانِ عالم نے کہا "ارشاد ہو کیوں کر ہے؟"

قصّہ برادرانِ توام کا، شکار کو جانا
پھر شب کو اندھیرے میں دونوں جانوروں کا پھنس جانا، ان کا کھانا، ایک نے سلطنت پائی، دوسرے پر خرابی آئی، پھر شہزادی پا کر بھائی سے ملا۔

جوگی نے کہا ــــ

ایک شہر میں دو بھائی تھے، توام۔ پرورش یافتہ، نازو نعم روزگار پیشہ، نیک اندیشہ سوائے رشتۂ برادری کے سر رشتۂ دوستی باہم مستحکم، مگر دونوں کی طبیعت متوجہ سیر و شکار، ہمت مصروفِ سیاحی دیار، دیار تھی۔ ایک روز شکار کھیلنے جنگل میں جاتے تھے، ہرن سامنے آیا، چھوٹے بھائی نے تیر لگایا، کاری نہ لگا، ہرن کنوتیاں اٹھا، بھاگا۔ دونوں نے تعاقب کیا، تمام دن رواں دواں افتاں وخیزاں چلے گئے۔ قریب شام بڑے بھائی نے جو تیر مارا ہرن ڈگمگا کر گرا۔ یہ گھوڑوں سے اترے، ذبح کیا۔ دن بھر کی دوڑ سے گھوڑے شل، خود مضمحل ہو گئے تھے۔ تمام روز کے بے دانہ و آب بھوک پیاس سے بیتاب تھے۔ لکڑیاں چُن کر پانی بہم پہنچا، کباب لگائے۔ بخوبی تمام دونوں نے کھائے، مگر اس روز جو کیفیت اور لذّت خشک کباب میں پائی، مرغ کی زیر بریانی تر ترائی، کبھی ایسی نہ کھائی تھی۔ پانی پیتے ہی سستی معلوم ہوئی، رات بھی ہو گئی تھی۔ لیکن شب ماہ پورنماشی کا چاند، اللہ اللہ جنگل کی فضا، سبزہ نو رستہ جا بجا۔ انھوں نے کہا "آج کی شب اس صحرا میں سحر کیجیے، چاندنی کی بہار، صنعتِ پروردگار، دیکھ لیجیے"، پھر دل میں سوچے کہ تنہائی کی چاندنی گور کے اندھیرے سے بد تر ہے۔ سچ ہے

جب ماہرو بر میں نہ ہو تو نورِ نظر میں نہ ہو، اندھیرا اجالا آنکھ میں برابر ہے۔ شیخ ناسخ ؎

دھوپ بہتر پر شبِ فرقت کی بدتر چاندنی ‏ ‏ ‏ صاعقے کے طور سے پڑتی ہے مجھ پر چاندنی

خیر یہ دونوں ایک درخت سایہ دار چشمے کے قریب دیکھ، شطرنجی چاندنی تو ہمراہ نہ تھی، زین پوش چاندنی کی عوض بچھا، چاندنی کی سیر کرنے لگے، باگ ڈور سے گھوڑے اٹکا دیئے۔ چھوٹا بھائی بڑا متین، ذی شعور نکتہ سنج دور بین تھا۔

بڑے بھائی نے کہا "آج ہم تمہاری عقل کا امتحان کرتے ہیں۔ بتاؤ تو اس وقت ہمارے شہر کا ہم سے کتنا فاصلہ ہے اور سمت کون سی ہے؟ تیسرے کباب کی لذت، پانی کا مزا آج بہت ملا، اس کا سبب کیا تھا؟"

اس نے جواب دیا "یہ باتیں سہل ہیں۔ شہر ہمارا یہاں سے سو کوس ہے اور دلیل یہ کہ بارہا تجربہ کیا ہے۔ میرا گھوڑا تمام دن سو کوس اسی چال سے پہونچتا ہے اور سمت ستاروں سے ثابت ہے کہ شمال ہے۔ رہا کھانے، پانی کا لطف، خلافِ وقت سے تھا۔ الآنیا مقدمہ یہ سنیئے یقین کامل ہے کہ صبح کو عنایتِ خالق، اور مددِ طالع سے وہ سامان مہیا ہو، جو کدورتِ سابق دور ہو، آئندہ آسائش رہے، طبیعت مسرور ہو۔"

بڑے بھائی نے اس کی وجہ پوچھی۔ اس نے کہا۔ "آج سو کوس کی مسافت بصد آفت طے کی، بھوکے پیاسے رہے، لیکن دل بشاش ہے۔"

وہ سُن کے چپ ہو رہا۔ یہ قصہ رفت و گذشت۔ پھر مشورہ ہوا کہ "یہ جنگل سنسان، ہو کا مکان ہے۔ یہاں درندہ و گزندہ، سانپ بچھو، شیر، بھیڑیئے کے سوا پرندہ دوندہ نظر نہیں آتا چاہیے ہم تم دونوں سو رہے۔ النَّوم اخوُ الموتِ۔ خدا جانے کیا ہو۔ تین پہر رات باقی ہے۔ ڈیڑھ پہر ہم جاگیں، پھر تم ہوشیار ہو۔"

یہ صلاح پسند خاطر طرفین ہوئی۔ پہلے بڑے بھائی نے آرام کیا۔ چھوٹے نے جاگنے کا سرانجام کیا، تیر کمان ہاتھ میں اٹھا ٹہلنے لگا۔ جب زلفِ لیلائے شب کمر تک آئی۔ اسی درخت پر دو جانور آپس میں اپنی اپنی توصیف و تعریف زبان بے زبانی میں کرنے لگے، اور یہ شخص بہت جانوروں کی بولی سمجھتا تھا، آواز پر کان لگائے ایک بولا "میرے گوشت میں یہ تاثیر ہے، جو کھائے ایک لعل تو پہلے دو پہر کے بعد اگلے، پھر ہر مہینے منہ سے نکلے۔"

دوسرا بولا "جو شخص میرا گوشت کھائے، اسی روز بادشاہ ہو جائے۔"

یہ باتیں سمجھ دل میں نہایت خوش ہوا، تیر و کمان تو موجود تھا۔ "الا اللہ" کہہ کر تیر بے تامل چلّے سے جوڑ کر کھینچا، لبِ سوفار کان کے پاس آ بوعدۂ نشانہ سرگوشی کر کے روانہ ہوا۔ قضا نے ہر چند اُن کے سر پہ خبردار پکارا کمان کڑکڑا کر چلائی کہ وہ مارا، رات کا تیر سراسری اوٹکہ لیس، مگر مرگ جو درپے ہوگئی، جان نہ بچی۔ پیکان سے تا سوفار دوسار ہوا۔ زمین پر چھد کر وہ دونوں ایک تیر میں گر پڑے۔ اس نے تکبیر کہہ کر ذبح کیا، طائر روح ان کا اُڑ گیا۔ دن کی لکڑیاں بچی سلگا، کباب لگائے۔ جس کے گوشت میں سلطنت کا ذائقہ سمجھا تھا، اُسے خود کھایا۔ دوسرا بھائی کے واسطے اٹھا رکھا اور ایسا خوش ہوا کہ تمام شب آپ پاسبانی کی، بڑے بھائی کو تکلیف نہ دی، مگر معاملاتِ قضا و قدر سے مجبور بشر ہے۔ انسان کے قبضۂ قدرت میں نفع ہے نہ ضرر۔ مصرعہ

تقدیر کند بندہ تقدیر زند خندہ

شعر انچہ نصیب است بہم می رسد ورنہ ستانی بستم می رسد

جس وقت زاغِ شب نے بیض ہائے انجم آشیانۂ مغرب میں چھپائے، اور صیادِ ان سحر خیز دام بر دوش آئے اور سیمرغِ زریں جناح طلا، بال غیرتِ لعل قفس، مشرق سے جلوہ افروز ہوا یعنی شب گزری روز ہوا بڑا بھائی اٹھا، چھوٹے نے وہ کباب پس ماندۂ شب یعنی رات کے بچے روبرو رکھے، وہ نوش کر گیا اور حال کچھ نہ کہا۔

دو گھڑی دن چڑھے جب لعل اگلا، تب سمجھا، ہم نے بہت تدبیر کی، مگر سلطنت بڑے بھائی کی قسمت میں تھی۔ پھر وہ لعل بطریقِ نذر روبرو لایا، اور رات کا فسانہ مفصل سب کہہ سنایا، کہا "اللہ کی عنایت سے جلد آپ کو سلطنت حصول ہو، یہ نذر غلام کی قبول ہو۔" اس کو اس کی سعادت مندی سے خرسندی حاصل ہوئی۔ پھر کہا "سامنے آبادی معلوم ہوتی ہے، ہم جا کر اس لعل کو کسی دلال کے ہاتھ بیچ آئیں، تم گھوڑوں کے پاس رہو، اگر اپنے شہر چل کر یہ امر کریں گے، حاکم کا خوف مانع کار ہوگا، کس کو ہمارا اعتبار ہوگا۔"

یہ کہہ کر ادھر چلا۔ جس دم شہر کے دروازے پر پہونچا۔ خلعت کا انبوہ نظر پڑا۔ اس ملک کا یہ معمول تھا، جب وہاں کا بادشاہ دارالسلطنت عدم کا تخت نشین ہوتا، وضیع و شریف، شہر کے، سوم کی رسم کے بعد وزیر اعظم کے ہمراہ، صبحدم تخت لے کے، دروازے پر آتے۔ جو اس روز پہلے مسافر باہر سے آتا، اسے بادشاہ بناتے تھے۔ قضا را وہاں کا بادشاہ قضا کر گیا تھا، لوگ تخت لئے منتظر تھے، یہ داخل ہوا۔ سب نے تخت پر بٹھا نذریں دیں، نوبت و نشان و جلوس کا

سب سامان موجود تھا، دھوم دھڑاکے سے دیوان خاص میں داخل کیا۔ منادی ہوئی۔ بقولِ مشہور ان کی رائی دوہائی نزدیک و دور ہوگئی۔ اس کو سروِر سلطنت اور احکامِ مملکت کے باعث اس دن بھائی کا خیال نہ آیا۔

دوسرے روز جب تخت پہ رونق افروز ہوا اور سامنے لال آیا تب بھائی کا خیال آیا، فوراً جاسوس ہرکارے درخت کا پتہ بتا روانہ کئے، کہا "اس صورت کا جوان اور دو گھوڑے وہاں ہیں، جلد حضور میں حاضر کرو۔"

وہ سب دو پہر تک تمام جنگل کی خاک چھان، حیران و پریشان پھر آئے۔ غرضکہ تمام دشت میں پھر کر پاؤں توڑے۔ نہ آدمی ملا نہ گھوڑے۔ وہ کچھ رنجیدہ ہو، سلطنت کے شغل میں مشغول ہوا۔ بھائی بیچارے کو بھولے سے بھی کبھی یاد نہ کیا۔ مگر وہ لعل جسے بھیجنے کو لایا تھا، جس کے بیچانے میں تخت و تاج میسر آیا تھا، فال مبارک اور بے نشان بھائی کی نشانی سمجھ اور ہر روز سر دربار لاتا، ملازموں کو دکھاتا، وہ سب بہ خاطر شاہ تعریف کرتے، اس کو خوشی حاصل ہوتی۔

مذکور اس گرفتارِ پنجۂ اجل کا، جانور کا اٹھا لے جا کر کنویں میں گرانا، قافلے کا آنا، پھر بہ علّت لعل شہزادی تک پہنچنا، اور بہ حیلہ ایلچی بھائی کی ملاقات

صیادان طائر معانی ذی ہوش، ودام داران بلبل خوش بیانی، خانہ بدوش نے حال اس منتظرِ زیرِ درخت کا یہ لکھا ہے کہ ہمہ تن چشم محوِ انتظارِ برادرِ بزرگ تھا، ناگہاں ایک جانور مہیب بشکل عجیب آیا اور پنجہ میں دبا کر اڑا۔ گھوڑوں نے ڈر سے باگ ڈور تڑا کر جنگل کا رستہ لیا، کود بھاگے۔ اللہ کی قدرت دیکھیے۔ بڑا بھائی سلطنت کا مالک ہوا، چھوٹا بیچارہ موذی کے چنگل میں پھنسا، واللہ اعلم بالصواب۔ وہ جانور وہاں سے کتنی دور اڑا۔ آخرکار تھک کر ایک درخت، کنویں کی جگت پر تھا، اس پر جو بیٹھا، یہ چھٹ کر کنویں میں گرا۔ جامیؔ ؎

فغاں زیں چرخ دولابی کہ ہر روز
بچا ہے انگند ماہے دل افروز

الا رسن حیات مضبوط تھی، نہ گزند پنجے کی پہنچی، نہ چوٹ چپیٹ گرنے کی لگی۔ میر حسنؔ ؎

کنواں وہ جو اندھا تھا روشن ہوا
جواں اس میں وہ سانپ کا من ہوا

وہ جانور تو اڑ گیا۔ یہ بے پر کنویں میں پڑا رہا۔ اتفاقاً اسی روز ایک قافلہ گم گشتۂ راہ وہاں آ نکلا۔ آدمی پانی بھرنے کنویں پر آئے۔ یہ رسّی کے سہارے سے باہر آئے جس نے اس کا جمال دیکھا یا بُشریٰ ھٰذا غُلامٌ کا غل برپا کیا۔ دنیا کے عجب معاملے ہیں۔ شعر ؎

روزے نگر کہ طوطیٔ جانم سوئے لبش ہر بوے پستہ آمد و بر شکر افتاد

جب لوگ حال پوچھنے لگے۔ اس نے جیسا موقع دیکھا، ویسا بیان کیا۔ غرضکہ میر قافلہ کی خدمت میں رہنے لگا۔ چند روز میں قافلہ منزل مقصود کو پہونچا اور مہینہ بھی تمام ہوا، جوان نے دوسرا لعل اُگلا۔ رئیس قافلہ نے لعل جو دیکھا، تمام ملال بھولا۔ با خود سوچا ایسی گراں بہا شے کا سہل لینا مشکل ہے۔ مبادا کچھ فساد اٹھے، تدبیر شرط ہے، جوان کو قید کر کوتوال پاس بھیجا۔ کہا "یہ میرا غلام ہے۔ آج اس نے لعل چُرایا، کچھ ایسا وسوسۂ شیطانی دِل میں آیا۔ میں نے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے، اسے سزا لے، تا لوگ ڈریں، عبرت سے ایسی حرکت نہ کریں۔

کوتوال نے قاضی سے مسئلہ پوچھا، اس نے بے تحقیق ہاتھ کاٹنے کا فتویٰ دیا، مگر اس کا یہ دستور تھا، جب کسی شخص پر گناہ ثابت ہوتا تو مدعی اور مدعا علیہ بادشاہ کی بیٹی کے روبرو حاضر ہوتے۔ اظہار حال کے بعد مرافعۂ ثانی میں، جو اس کی رائے معدلت پیرائی میں آتا، وہ ہوتا۔ اس واسطے کہ بادشاہ مسن تھا، بیٹی کے سوا اور کوئی تخت و سلطنت کا وارث نہ تھا۔ اللہ رے اسکے جمال کا جلوہ، اور حسن کا غوغا، پری کو ہزار جان سے اس کی پروا، حور اس کی شیدا خلق خدا، اس مہر سیما پر نثار، آفت روزگار تھی۔ حسن عالم فریب کے علاوہ طبع حلیم، رائے سلیم نکتہ فہم دقیقہ رس، اپنے عصر کی حکیم، حقیقتاً قابل ریاست و صاحب فراست تھی۔ غنچۂ خاطر اس گل اندام یاسمیں پیکر کا رُونا دیدۂ صبا تھا۔ دہنِ صدف مراد تمنائے قطرۂ نیساں میں بند۔ کوچۂ عصمت و عفت میں اس دُرِ ناسفتہ، درج شہریاری کے وہم و فکر تاجدارانِ دہر کا گذر نہ ہوا تھا۔ اُس دم تک ناکتخدا تھی۔ جس وقت وہ دونوں روبرو ہوئے، پہلے شہزادی نے میر قافلہ سے پوچھا۔ اس نے جو کچھ کوتوال سے کہا تھا، وہی بے کم و کاست پھر عرض کیا۔ شہزادی بولی سعدی سے باطل است انچہ مدعی گوید۔ پھر جوان کی طرف مخاطب ہوئی۔ بلکہ یہ ذلیت سے تنگ آمادۂ مرگ تھا، بے تامل بولا۔

"شہزادی آپ روشن ضمیر ہیں، ہم مصیبت زدوں کی طرح سلسلۂ بے جرمی میں اسیر ہیں۔ یہ شخص سچا ہے۔" وہ تو عقیلہ تھی، زیادہ شک ہوا، دل سے کہا، آج تک کسی چور نے حاکم کے روبرو بجز انکار دست بردی دفعتہً اقرار دزدی کیا نہیں، یہ بے گناہ ہے، تقریر اس شاہد کی شاہد ہے، خدا آگاہ ہے کچھ اس میں بھید ہے قافلہ باشی سے فرمایا "کل تو محکمہ میں حاضر ہونا۔"

جوان کو ڈیوڑھی پر قید کیا۔ یہ تو حسین بلکہ مہر طلعت ماہ جبین تھا، طالع کا ستارہ جو چمکا، شہزادی کا میلان خاطر، جوان کی جانب ہوا۔ شب کو تنہا بلا کے بدلداری و تاسف استفسار حال فرمایا۔ اس وقت جوان ناکردہ گناہ نے دل سے آہ سرد بھر "مشروحاً" از آغاز تا انجام عرض کیا۔ شہزادی کا دل یہ نیا قصہ سن کر بمرتبہ اتم مسرور ہوا۔ چوری کا شک اس دزدِ دل کی جانب سے دور ہوا۔ صبح کو بادشاہ کے حضور میں لا کر دست ادب باندھ کر عرض کی "قبلۂ عالم و عالمیان کی عمر دراز ہو، قیصر و فغفور کی اس در پر جبین بہ نیاز ہو۔ شہر کا قاضی اور کوتوال بے دریافت، حقیقت حال حکم سزا، بندہ ہائے خدا کو کرتا ہے۔ روز جزا کی جواب دہی سے کوئی نہیں ڈرتا ہے۔ غضب کی جا ہے، عجب ماجرا ہے۔ واجب التعزیر صاحب تقصیر کو لال ملے، بیگناہ کا ہاتھ کٹے۔"

بادشاہ نے پھر دونوں کی زبان سے حال سنا، بسبب کثرت سن کے عقل کو زوال ہوتا ہے۔ یہ وہ دن ہیں کہ نسیاں کمال ہوتا ہے، ذہن نہ رہا، تامل کیا۔

شہزادی نے التماس کیا۔ "حضور! یہ امتحان بہت آسان ہے۔ ایک مہینہ اس جوان کو اور قید رکھئے، اگر دوسرا لعل اگلا تو سچا ہے پھر ایسے درِ یتیم صدف راستی کو کیوں بے آب و تاب کیجئے، آبرو دیجئے، دگرنہ بماہ آئندہ یہ بدکردار دار کا سزاوار ہے۔ ہاتھ کاٹنے سے کیا ہاتھ آئیگا۔"

بادشاہ کو سرِدست جواب باصواب بیٹی کا بہت پسند آیا۔ حاضرین نے تحسین و آفریں کی بادشاہ نے جوان کو اپنی آنکھوں کے سامنے نظر بند کیا۔ میر قافلہ کو شہزادی نے محبس بھیجا۔

قصہ کوتاہ وہ مہینہ بھی تمام ہوا اور اتنے دنوں میں شعلۂ محبت مجمر سینے سے بھڑکنے لگا۔ دم شہزادی کا پھڑکنے لگا۔ حال طشت از بام افتادہ ہوا۔ جوان نے عرض کی "کل لعل اگلوں گا۔" پھر صبح کو سر دربار روبروے حضار، لعل بے بہا دُرجِ دہاں سے نکالا۔ سب کو حیرت شہزادی کو فرحت و مسرت حاصل ہوئی، اسی دم مال و اسباب قافلہ باشی کا جوان کو ملا۔ اسے تشہیر کر شہر بدر کیا۔ جوان کی صورت دل پذیر، فصاحت تقریر، پسندِ خاطر صغیر و کبیر تھی۔ بایمائے شہزادی سب نے متفق اللفظ بادشاہ سے عرض کی کہ "یہ شخص حضور کی عنایت کے لائق ہے، تمنائے ملازمت رکھتا ہے، کفش برداری کا شائق ہے۔" بادشاہ بھی اس کی راستبازی سے خوش تھا، راضی ہوا۔ مصحفی نے

راستی موجب رضائے خداست   کس ندیدم کہ گم شد از رہِ راست

چند عرصے میں مقربِ بارگاہِ سلطانی، موردِ عنایاتِ جہانبانی ہوا، ہر مہینہ لعل اُگلا حضور میں لانے لگا۔ روز بروز ہمچشموں میں سرخروئی حاصل کر، آبرو پانے لگا۔

آخرکار بمشورۂ ملازمانِ قدیم و بتحریک حکما و ندیم بادشاہ نے اس گوہرِ مسلّم سلک تاجداری کو بہ رشتۂ عقد، اس لعلِ بے بہا کے منعقد کیا۔ یہ دونوں مشتاق بصد اشتیاق، باہم لطف کے ساتھ بے اندیشہ و غم ایام گذاری، بڑی دھوم اور تیاری سے کرنے لگے، مگر ہر روز بلاناغہ جوان بادشاہ کے حضور میں حاضر رہتا تھا۔ ایک دن ایلچی اس کے بھائی کا، کسی تقریب میں وارد ہوا اور جواہر کا ذکر نکلا۔ ایلچی نے عرض کیا کہ "ہمارے بادشاہ کے پاس ایک لعل اس رنگ ڈھنگ سنگ کا ہے کہ آج تک جوہری چرخ نے باوجودِ عینکِ مہر و ماہ و گردشِ شام و پگاہ، سال و ماہ میں اس کے سنگ کا کیا پاسنگ کے برابر نہیں دیکھا ہے۔"

یہ کلمہ سن کر بادشاہ نے وہی لعل، جو سینہ بے کینہ جوان سے نکلے تھے، دس بارہ ایلچی کو دکھائے وہ بھی جواہر شناس تھا، سخت حیران تادیر سر بہ گریبان رہا، پھر عرض کی "قبلۂ عالم عجب کی جا ہے کہ رنگ و روپ نقشہ ان کا ایک سا ہے، اتنا فرق مقرر ہے کہ وہاں ایک سے ایک بہتر و برتر ہے۔"

بادشاہ نے جوان کی طرف اشارہ کیا کہ "یہ میرا فرزند ہر مہینے ایک لعل تھوکتا ہے۔"

ایلچی نے غور سے جو دیکھا، اپنے بادشاہ سے مشابہ کیا، بعینہ پایا۔ خیر رخصت ہوا، جب اپنے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس کا تو معمول تھا، جب تخت پہ آکر جلوہ گر ہوتا، وہ لعل پیشِ نظر ہوتا۔ ایلچی کو وہ سانحہ یاد آیا، عرض کی "قبلۂ عالم اس لعل کو جدا کرتے نہیں۔ بے اس کے قدمِ مبارک تخت پہ دھرتے نہیں، ان روزوں خانہ زاد جس بادشاہ کے پاس گیا تھا، نیا ماجرا دیکھا، معدنِ جواہر اور لعل کی کان، کہ وہ امکان نہیں، لیکن وہ لعل کا پتلا، زندہ اپنے پاس رکھتا ہے۔"

بادشاہ نے اس کا حال مفصل پوچھا، اس نے سب بیان کیا کہ داماد اس شاہِ خجستہ نہاد کا، ہر مہینے لعل اُگلتا ہے، اور کیا گزارش کروں، جیسی حضور کی صورت ملتی ہے حقیقی بھائی ایسے دکھائی نہیں دیتے۔"

یہ سنتے ہی یقین ہوا کہ اب پتہ ملا، مقرر وہ بھائی میرا ہے۔ اسی وقت نامۂ شوقیہ، اس کانِ گہر کے اشتیاقِ دید میں بادشاہ کو لکھا کہ برائے چندے اگر اس فرزند ارجمند کو ادھر روانہ

کرد، محبت دیرینہ سے بعید نہ ہو، ہمیں شوق دیدار از حد تحریر و اظہار افزوں ہے اور پوشیدہ خطِ تمنا بھائی کو رقم کیا کہ ۔

"آج تک تیری مفارقت سے تخت شاہی بدتر از بوریائے گدائی تھا، اب ایلچی سے یہ خبر فرحت اثر سن کر، دل کو سرور، آنکھوں میں نور آیا" لازم کہ بمجرد ورود رقیمہ و داد ادھر کو روانہ ہو اور کچھ پتے حسب ونسب کے سانچہ شکار تفصیل وار، قلم بند کر دیئے، ایلچی سے فرمایا کہ "نامہ علی رؤس الاشہاد بادشاہ کو، اور یہ خطِ خفیہ ابن غیرت ماہ کو دینا۔"

قاصد صبا دم، صرصر قدم جلد تر اس شہر میں وارد ہوا۔ بادشاہ کو نامہ دیا اور خطِ پوشیدہ جوان کو حوالے کیا۔ وہ مکتوب محبت دیکھ کر ایسا گھبرایا، یہ لہو نے جوش کھایا کہ اسی دن رخصت کا ذکر بادشاہ سے لایا۔

آخر وہ عاشقِ برادر، معشوقہ روح پرور کو لے کر جہاز پر چڑھ روانہ ہوا۔ راہ میں ایلچی سے شہر کا نقشہ، راہ کا پتہ، سب پوچھ لیا۔ فرطِ شوق سے دن رات سرگرم رفتار تھا، ساعت بھر مقام کسی منزل کا ناگوار تھا کہ جلد پہنچیں کہیں نہ ٹھہریں۔ نیرنگِ زمانہ کج سرشت، بوقلموں کہ ہر دم و ہر ساعت دگرگوں ہے، کیا کہوں جب دس بارہ کوس وہ شہر رہا، جہاز تباہ ہو کے بہا۔ جس کی قضا تھی تہ آب و گرداب رہا، جس کی بقا تھی، بہہ نکلا۔

یہ قصہ جانگداز، دور دراز پہونچا۔ اس کے بھائی نے سنا، فوراً ہزار سوار تیز رفتار دوڑائے کہ جس ڈوبتے اچھلتے کا پتہ پاؤ، جلد حضور میں لے آؤ۔"

آخرکار بہزار جستجو و تگاپو شہزادی ہاتھ آئی، اُن کی خبر نہ پائی۔ اسے بادشاہ پاس حاضر کیا جوان کے ڈوبنے کا حال کہہ دیا۔ بادشاہ بحال تباہ گرداب فراق میں پھنسا۔ شہزادی صف نشینِ ماتم لجۂ لطمہ و غم میں اُلجھی، جوان کا حال یہ ہوا کہ تختے کے سہارے سے بہتا بہتا، پیاس کے صدمے، بھوک کی موجیں سہتا سہتا، کئی دن میں کنارے پہ پہونچا۔ فی الجملہ جب تاب و طاقت آئی، پوچھتا پوچھتا اس شہر میں داخل ہوا، بادشاہ کو خبر پہونچی، روبرو لایا، بسبب طولِ ایام مہاجرت درازئ زمانۂ صعوبت نہ پہچانا۔ استاد ؎

اتنی مدت میں بلا مجھ سے وہ دھوکا دے کر   یاد بھی جب مجھے اُس شوخ کی صورت نہ رہی

ہئیت تبدیل خوار و ذلیل تھا، اس اختلاف کو دیکھئے، یہاں صحرا نوردی، بھوک پیاس، مصیبت، وہاں حکمرانی و عیش و آرام و تختِ سلطنت، ناچار شہزادی کو طلب کیا، اسے بھی تامل

ہوا، وہ شخص بولا "پہر بھر کا عرصہ باقی ہے، آج لعل اُگلنے کا دن ہے، پھر تم سب پہچانو گے"۔
بادشاہ کو یقین ہوا کہا "اگر یہ جھوٹا ہوتا، تو ایک پہر کا وعدہ نہ کرتا"۔
شہزادی نے کہا "تیری طبیعت کی جودت مشہور ہے، ایک معمّا پوچھتی ہوں، اگر یہ بھید جواب دیا تو بے شک شک رفع ہوا۔ بھلا وہ کیا شے ہے جسے گبر و مسلمان و یہود و نصاریٰ سب انسان کا فرقہ آشکارا کھاتا ہے، مگر جب اس کا سر کاٹ ڈالو، تو زہر ہو جائے۔ کوئی نہ کھائے اور جو کھائے تو فوراً مر جائے۔
جوان نے ہنس کر کہا "شہزادی! قسم ہے، یہ کیا معمّا پوچھا ہے!"
وہ بھڑک گئی وحشت مٹی، دل کی بھڑک گئی، بیباکانہ چلمن اُٹھا، پروانے کی طرح، اس شمعِ بزمِ زرقت کے گرد پھری۔ بادشاہ متعجب ہوا کہ ہم تو کچھ نہ سمجھے، شہزادی کیا سمجھ کر سامنے ہوئی۔ جوان نے عرض کی کہ "قبلہ! وہ چیز قسم ہے، تمام عالم کھاتا ہے سر اس کا قاف ہے، اسے کاٹو تو سَم صاف ہے، سم، زہر کو کہتے ہیں۔ کون کھاتا ہے، کھانے والا مر جاتا ہے"۔
بادشاہ یہ سُن کر بغلگیر ہوا، اُس نے لعل اُگلا، شادیانے بجے، بچھڑے ملے۔ اسی طرح جامع المتفرقین سب مہجوروں کی دوری کا بکھیڑا مٹائے۔ جو جس کا مشتاق ہو، جس کی جدائی جسے شاق ہو وہ اس سے مل جائے۔
جوگی نے یہ قصّہ تمام کر کے جانِ عالم سے کہا۔ بابا۔ شعر ؎

مشکلے نیست کہ آساں نہ شود ۔۔۔ مرد باید کہ ہراساں نہ شود

جوئندہ یابندہ ہے۔ یہاں سے منزلِ دوست قریب ہے، سب کچھ معلوم ہے۔ اٰنا کنا منع ہے، بُرا ہے، دُنیا مقام چپ رہنے کا ہے۔ آنا اس جگہ وقفہ کر کہ میری زیست کا ساغر، بادۂ اجل سے لبریز ہے، سمندِ جان کو نفسِ سرد مہمیز ہے۔ مجھے زیرِ زمیں سونپ تشریف لے جانا، اور چند وصیتیں کیں۔
جانِ عالم نے کہا "یہ رنج و قلق کس سے دیکھا جائے گا، پتھر کا کلیجہ کہاں سے ہاتھ آئے گا! کہ ایسے دوست غمخوار کو، اپنے جیتے جی، زیرِ خاک کیجیے۔ اس کے ماتم میں گریبانِ صبر چاک کیجیے"۔ یہ کہہ کر رونے لگا۔ گریبان تا دامن بارشِ اشک سے بھگونے لگا۔ جوگی اس کی محبت کا بردگی ہوا کہا "افسوس! دم واپس کا عرصہ بہت کم، دم نہیں مار سکتے ہم۔ وگرنہ تیرے ہمراہ، شریکِ درد و غم ہوتا۔ بھلا آخری فقیری کا ایک ٹکا سیکھ لے۔ سائیں چاہے تو کہیں اٹکا نہ رہے گا۔

قبر میں لے جا کر کیا کروں گا۔"

پھر چند کلمے وہ بتائے کہ جس صورت کا دھیان لائے فوراً ہو جائے۔ یہ مقدمہ بتا، ہر ہر گرو کا نام لیا، پھر کلمہ جو پڑھا، دنیا سے چل بسا، دم نکل گیا۔ جوگی مسافرِ عدم، بکنٹھ باسی دم گیا۔ جانِ عالم کا روتے روتے دم گیا، بیتابانہ نعرہ الفراق مارے۔ مرید چیلے جمع ہو کر گرد گرد یا ہادی کہہ کر بہت پکارے۔ جو تا نکل گیا جوگی نے صدا نہ دی، منزلِ مقصود کی راہ لی۔

شہزادے نے بموجب وصیت غسل دیا، کفنایا، قبر تک اُتارتے اُتارتے کچھ نہ پایا۔ آخرکار برابر کفن پھاڑ دیا۔ آدھا چیلوں نے جلایا، نصف مریدوں نے منڈھی میں گاڑ دیا، ہندوؤں نے راکھ پر چھتری بنائی، مسلمانوں نے قبر بنا کے سبز چادر اُڑھائی۔ وہ تنت مندرا، سبحہ و مصلے، خرقہ و جبہ اس کے منظورِ نظر کو دے کر، جانشین کیا۔ مرید چیلوں کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں سونپا۔ اسے ایک ولولہ آیا۔ از سرِ نو اُن سب کو یہ تلقین کیا کہ " سنو بچا! گو جوگی ظاہر میں آنکھوں سے نہاں ہے، مگر مرشدِ کامل کا جلوہ، سائیں کا ظہورا، ہر برگ و بار، بوٹے پتے، گل و خار، بلکہ در مسجد و دیوارِ کنشت سے دیدۂ دوربیں میں عیاں ہے، عارف کا یہ کلام ہے بعدی ؎

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار　　ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

دیدۂ بینا گوشِ شنوا، اس رمز کو درکار ہے، ہر ذرے میں اسی کا جھگڑا ہے، نورِ قدرت نشانِ وحدت دنیا کا نقش و نگار ہے، بلبل کے پردے میں ترانہ سنجی ہوتی ہے۔ قمری کی کو کو متلاشی کی جان کھوتی ہے۔ اسی کے ذکر میں سرگرم ہے، جس کی زبان دمقار ہے، کسی کو حرمِ محرم میں نامحرم رکھا، بھٹکایا۔ کسی کو بیت الصنم میں بلا کر جلوہ دکھایا۔ کعبے کا دھوکا دیر کا بہانا ہے، دوڑا کر تھکانا ہے اور جسے مَن یَشَاءُ کو رہبر کر کے ڈھونڈھا، اس نے گھر بیٹھے پایا ہے۔ امیر خسرو ؎

جن ڈھونڈا تن پائیاں گہرے پانی پیٹھ　　ہوں بوری ڈوبن ڈری رہی کنارے بیٹھ

دنیا کا معاملہ، مذہب و ملت کا جھگڑا، یہ اچھا وہ برا، پُر زیان و بے سود ہے، حق بیشک داتا، ہر آن موجود ہے۔ رنج میں دل کو خوش، الم میں طبیعت کو شاد رکھو۔ وَحدَہٗ لَا شَرِیکَ لَہٗ نرنکار ہے۔ شرکت کرنے والا مشرک حماقت شعار ہے۔ مرسلوں کو رستگار جانو، مرید، یار سمجھ کر مانو۔ مرشد کی ذات گرد کی صفات ہر جلسے میں یاد رکھو۔ بود و نابود کا غم نہ ہو۔ اور احباب کا دل کہ حباب سے نازک تر ہے خدا کا گھر ہے، آشفتہ و برہم نہ ہو۔ الدلس

باقی ہوس ۔"

یہ کہہ قصّہ مختصر کیا، بے خبروں کو باخبر کیا۔ جب اس صحبت سے جانعالم کو فرصت ملی، چلنے کا عزم کیا۔ اس جانشین منت نے روکا اور دو چار دن خاطر سے مقام کیا۔ پھر جس طرف جوگی نے بتایا تھا، چل نکلا۔ پہاڑ سے جس دم آگے بڑھا دریا ملا، ہر چند ڈھونڈا، ناؤ بیڑے کا تھل بیڑا نہ لگا، مگر ایک لعل درخشاں بر روئے آبِ رواں سامنے آیا۔ قریب اس کے دوسرا نظر پڑا۔ اسی طرح تھوڑے تھوڑے فاصلے سے بہت سے لعل بہتے دیکھے۔ تازہ فکر ہوئی کہ اس حال کو کیوں کر دریافت کیجے۔ کنارے کنارے سیر دیکھتا چلا، دو کوس جب راہ طے کی، عمارت عالیشان دیکھی اور اس چشمے کو اس کے اندر سے رواں پایا، دروازہ اور در کی بہت تلاش کی تا اندر جانے کا باب مفتوح ہو نہ ہوا، سوائے دیوار در نہ تھا۔ اس وقت بلبل بن کر دیوار پر جا بیٹھا، مکان رفیع الشان باغ بھی بہار کا، مگر سنسان، انسان نہ حیوان۔ فقط ایک بنگلہ نہایت نقش و نگار کا، وہ نہر اسی بنگلہ کے اندر سے جاری تھی۔ چمن خالی اور بادِ بہاری تھی، آدمی یا جانور ناطق و مطلق مطلق نہ تھا، باغ میں اُترا، صورت قدیم بدل کر بنگلے میں آیا۔ منقش و مطلا، سجا سجایا پایا۔ لیکن طرفہ حال یہ دیکھا۔ ایک پلنگ، زمرد کے پایوں کا بچھا ہے۔ اس پر کوئی دوشالہ تانے سوتا ہے۔ برابر یاقوت کی تپائی پر پھولوں کا دستہ، آدھا سُرخ، انصف سفید۔ جانعالم نے قدم بڑھا، دوشالہ سرکایا، وہ تن پری پیکر بے سر نظر آیا۔ حسرت سے کہا "کس ظالم ستم شعار، بے رحم جفا کار نے اس سرِ دفترِ خوبی، سراسر دلبری و محبوبی کا سر کاٹا ہے! بحیرت ہر طرف دیکھتا تھا، چھت پہ آنکھ پڑی، چھینکا بندھا، سر بھی دھرا دیکھا۔ سر کے نیچے نہر جاری ہے۔ جو خون کا قطرہ اس حلقِ بریدہ سے پانی میں گرتا ہے، اللہ کی قدرت کاملہ سے" وہ لعل ہو کر تیرتا ہے۔

اس نے کہا سبحان اللہ مقرر یہ سحر کا کارخانہ ہے، قریب جا کر غور سے جو دیکھا۔ انجمن آرا کا چہرہ تھا، پہچانتے ہی سر و تن کا ہوش نہ رہا، چاہا کہ سر سے سر ٹکرا کر ہمسر ہو، کسی کو نہ خبر ہو۔ بسکہ تجربہ کار ہو چکا تھا، سوچا مرنا ہر وقت ممکن ہے۔ پہلے حال مفصل معلوم کرو، کہیں حوض کا سا دھوکا نہ ہو۔ ہر چند غواصِ عقلِ رسا محیطِ فکر میں غوطہ زن و آشنا ہوا، گوہرِ مقصد صدفِ مراد سے ہاتھ نہ لگا، معاملہ سے نا آشنا رہا۔

اس عرصے میں شام نزدیک ہوئی، تند ہوا چلی، شور و غل مچا، یہ سمجھا۔ اب کسی دیو یا

ساحر کی آمد ہے چھپا چاہیے، سرگلدستہ گلبنِ محبت کے روبرو، بھونرا بن کر بیٹھ رہا۔ دفعتہً دیو آپہونچا، قوی ہیکل، زبوں شمائل، مگر وحشی سا ہر سمت بو سونگھنے لگا۔ پھر اسی گلدستے سے سفید پھول توڑا، اس یاسمین پیکر کو سونگھایا، سراچھل کر بدن سے ملا۔ انجمن آرا اٹھ بیٹھی۔ دیو نے میوہ تر وخشک روبرو رکھا، مگر پریشان، ہر سو متحیر نگراں۔

شہزادی نے کہا "خیر ہے؟"۔

اس نے کہا "آج غیر انسان کی بو آتی ہے، خوف سے جان جاتی ہے۔"

وہ کہنے لگی "ہمیں آج تک جانور کی پرچھائیں نہ نظر آئی تو نے آدمی کی بو پائی! طرفہ خبط ہے، یہ جملہ بے ربط ہے۔"

غرضکہ صبح تک مذکور ہر شہر و دیار، عجائبات روزگار کا بیان رہا۔ سحر دم اسی دستے سے سرخ پھول اس خون آشام نے توڑ کر، اس لالہ فام کو سونگھایا۔ سر تو جھٹکے پر سر بلند ہوا، تن نے پلنگ پر آرام فرمایا۔ دیو دوشالہ اوڑھا راہی ہوا۔

جانعالم نے چار گھڑی بجبر صبر کیا۔ پھر اپنی صورت اصلی بن کر وہی سفید پھول توڑ کر سونگھایا۔ انجمن آرا بدستور اول اٹھی۔ شہزادہ چیخ مار کر لپٹ گیا۔ دونوں مہجور اس زور و شور سے روئے کہ تمام باغ ہل گیا۔ زمین و آسمان دہل گیا۔

جانعالم اپنے مصائب، وہاں تک آنے کا حال، فرقت کا درد و ملال، کہنے نہ پایا تھا کہ انجمن آرا نے کہا۔ لاأعلم

تجھ بن مری اوقات جو اکثر گذری	وہ حالتِ نزع سے بھی بدتر گذری
تو تو کہے سرگذشت اپنی ظالم	میں کس سے کہوں جو کچھ کہ مجھ پر گذری

یہ کہہ کر دونوں چلاّ چلاّ، آہ و بکا سے رونے لگے۔ دنیا کے معاملے میں ہمیشہ سے کسی کی عقل نہیں لڑی، شکست ہوئی۔ شعر

بیک لحظہ بیک ساعت بیکدم	دگر گوں می شود احوالِ عالم
مولف ایک وضع پر نہیں ہے زمانے کا طور آہ	معلوم ہوگیا ہمیں لیل و نہار سے

ہر عقدۂ مالا ینحل، ناگزیر کے واسطے، ناخن تدبیر خلق میں خلق کیا ہے اور جہاں میں جہاں تدبیر کا دخل نہ ہو، اسے تقدیر کے حوالے کر دیا ہے، اکثر جس بات میں عقل عاجز آتی ہے، وہی طرفۃ العین میں ہوجاتی ہے، ناگہاں ایک سفید دیو، زبردست، زور کے نشہ سے سرشار، مست بڑا طاقت دار،

رستم کا یادگار، اُدھر سے گذرا، نالۂ حزیں، صدائے غمگیں کان میں آئی۔ بسکہ باپ زور و طاقت، خداداد وہ دیو نیک نہاد رحم دل، غم رسیدوں کے رنج کا شامل تھا، گریہ و زاری سن کر، دل کو بیقراری ہوئی، سمجھا کوئی انسان نالاں ہے، مگر اس صحرائے پُرخار وادی ہمہ تن آزار ہیں، آدمی کا ہونا محال ہے۔ اگر ہے تو حقیقت میں مبتلائے الم، اسیر پنجۂ ستم خراب حال ہے۔ یہ سوچ کر باغ میں آیا، یہاں روتے روتے دونوں کو غش آگیا تھا۔ دیو ڈھونڈھتا ہوا بنگلے میں آیا، دیکھا مہر و ماہ گردش پھر بے مہر سے برج زمردیں میں بے ہوش ہیں۔ چہرے کے رنگ اڑے ہوئے، سکتہ کی حالت میں ہم آغوش ہیں۔ روئے یار آئینہ دار درمیان ہے۔ فلک بر سر امتحان ہے۔ سمجھا مدت کے بعد دونوں کا مقابلہ ہوا ہے۔ اس سے کسوف و خسوف کا رنگ ڈھنگ پیدا ہے۔ سر بالیں بیماران محبت بیٹھ کر نہر سے پانی لیا۔ دونوں کے منھ پر چھڑکا، آنکھیں کھولیں، ہوش و حواس درست ہوئے۔ دیکھا کہ ایک دیو سرہانے موجود ہے۔ دیو سفید نے اٹھ کر سلام کیا۔ تسلی کا کلام کیا، کہا "تشویش نہ فرمائیے، بندہ دوستدار جاں نثار ہے۔"

پہلے جانعالم اٹھا، بغلگیر ہوا۔ وہ حال پوچھنے لگا۔ بسکہ شہزادۂ جانعالم لسان و خوش بیان تھا، اپنی رام کہانی، چرب زبانی سے کہہ سنائی۔

دیو ماجرائے گزشتہ سن کر بیقرار اشکبار ہوا، عرض کی "آپ بدلجمعی تمام آرام کیجئے، اب وہ قرمساق آئے تو عملِ بد کی سزا پائے۔"

جانعالم بشدت لگاوٹ باز تھا، اس سے بھائی چارہ کیا، صیغۂ اخوت پڑھا۔ وہ بیچارہ بندۂ بے دام، حلقہ بگوش غلام ہوا۔ وہاں سے اُٹھ کر باغ کی سیر کرتے تھے کہ وہ جفاکار بھی آ پہنچا۔ یہاں اور رنگ دیکھا کہ شہزادی آدمی زاد کے ہمراہ پھرتی ہے، سفید دیو کا ہاتھ میں ہاتھ ہے، مصاحبت کرتا ساتھ ہے۔ جل کر جانعالم پر جھپٹا، دیو سفید نے بجلدی تمام اس نطفۂ حرام کا ہاتھ پکڑا۔ وہ کافر اسی رحم دل سے لپٹا، باہم کشتی ہونے لگی، یہ کشمکش ہوئی کہ زمین جابجا شق ہوئی، الغرض بمدد مددگار و قوت پروردگار، سفید دیو نے زمین سے لنگر اکھاڑ، سر سے اونچا کیا زمین پر پٹک چھاتی پر چڑھ بیٹھا۔ جانعالم قریب آیا، زور و طاقت کی تعریف کرنے لگا، کہا "کیا جناب باری نے مجھ مددگار بیکساں کی یاری کی، جو ایسے مردود پر ایک دم میں تجھے فتح و ظفر حاصل ہوئی! اگر ناگوار طبع نہ ہو، میں بھی ایک زور کروں۔"

وہ بولا "بسم اللہ۔"

شہزادے نے ایک ہاتھ شانے پر دھر، دوسرے سے گردن، اس سرکش کی مضبوط پکڑ، دھڑ سے کھینچ کر، زمین پر دھڑ سے پھینک دی۔ دیوِ سفید یہ طاقت دیکھ کر، سفید ہوگیا۔ شہزادے کا چہرہ سُرخ ہوا، وہ زرد رو، بے دین اسفل السافلین کو پہونچا۔ اس عرصہ میں سفید دیو کے ملازم حاضر ہوئے۔ دعوت کی تیاری ضیافت کی اضافت لگی۔ ایک ہفتہ اکل و شرب گانا ناچ رہا۔ آٹھویں روز اس ماہ دو ہفتہ یعنی انجمن آرا نے رنجِ جدائی، ملکہ مہرنگار مردانِ لشکر کا لب دریا، انتظار بیان کر کے کہا "بخدا مفارقت ملکہ میں خواب و خور حرام ہے، تمھارے احسان سے دب کر، کبھی ہنسی لب پر آگئی، وگرنہ دورِ شراب و کباب خونِ دل لختِ جگر تھا، ہر گلاس برادۂ الماس تھا، فقط تمھارا پاس تھا۔"

اس نے عرض کی "میرے آدمی جائیں، پتہ لگا آئیں۔"

انجمن آرا نے کہا "اپنے تجسس میں زیادہ مزا ہے، اپنا کام آپ خوب ہوتا ہے۔"

ناچار رخصت ہوکر چلے اور آنے جانے کے باہم، وعدہ ہائے مستحکم ہوگئے، مگر ہر دم ملکہ کا خیال، ہر گام دل پر فرقت کا ملال تھا کہ خدا جانے ڈوب گئی یا ہماری طرح کسی آفت میں پھنسی! کبھی دو کوس کبھی چار کوس بہزار دقت چلے، دو تین دن میں پاؤں سوج گئے، چھالے پڑے، قدم اٹھانے کے لالے پڑے۔ وہ سفرِ سخت یہ نازک مسافر، وہ کالے کوس مالوے کی طرح کافر۔ انجمن آرا جھلا کر بولی۔ میر ؎

کب تھا یہ شور و نوحہ ترا عشق جب نہ تھا — دل تھا ہمارا آگے تو ماتم سرا نہ تھا

آپ کی بدولت، یہ ذلت و رسوائی، پیادہ پائی، صحرا نوردی، عزیزوں کی جدائی نظر آئی، آفت اٹھائی! میر سوز ؎

چھڑا کر مجھ سے میرے خانماں کو — خدا جانے چلا ہے اب کہاں کو

شہزادہ ہنس کر چپ ہو رہا۔ پھر وہ عمل جو جوگی سے سیکھا تھا، انجمن آرا کو بتایا، دونوں نے توتے کی ہیئت بنائی اور توکلتُ علی اللہ کہہ کر نظر بخدا، ایک سمت سرگرم پرواز ہوئے۔ پہر دو پہر اڑنا، پھر کسی درخت پر بسیرا، خیمہ نہ ڈیرا، اس روپ میں قاصدِ سیر ہوئے۔ سابق مصائبِ انسان تھے، اب ہمجنس طیر ہوئے، روز نیا پانی نیا دانہ، نت نیا آشیانہ، کبھی بستی، گاہ ویرانہ، کسی کو اگر ہنستے دیکھ لیا تو رو دیا، یاد کر کے اپنا زمانہ اور اکثر یہ شعر پڑھ دینا۔ لا اعلم

شب عشرت غنیمت داں و داد خوشدلی بستاں — کہ در عالم کسے احوالِ فردا را نہ می داند

مذکور ملکۂ مہر نگار تختے پر بہتے جانا، بادشاہ کا جہاز پر سیر کرتے ہوئے آنا، رحم کھا جہاز پر منگانا، شہر میں داخل ہو کر مکان دینا، پھر توتے کا اڑ کر پہونچنا، اور نامہ لے کر روانہ ہونا

اے جنوں تو دلِ شوریدہ کی امداد کو آ — تا لکھوں حال میں اک اور ستم دیدہ کا
چین دنیا میں نہیں عشق کے بیماروں کو — نت نیا رنج فلک دیتا ہے بے چاروں کو
بارِ فرقت کبھی معشوق جو دھر جاتے ہیں — جیتے جی دب کے یہ اس بوجھ سے مر جاتے ہیں
زیست بے لطف گزر جاتی ہے بیچاروں کی — کیا کہانی میں کہوں تم سے دل افگاروں کی

نگارندۂ حالِ غریقِ شطِ فرقت و کشتی شکستۂ لجۂ محبت، بادبانِ گسستۂ صرصرِ دوری و لنگر بریدہ کارِ دِ مہجوری طوفان رسیدہ کنارِ کامیابی ندیدہ یعنی ملکہ مہر نگار، خامۂ جگر افگار، یوں رقم کرتا ہے کہ جب جہاز تباہ ہوا تھا، یہ بھی ایک تختے کے ٹکڑے پر دل ٹکڑے ٹکڑے ڈوبتی ترتی چلی جاتی تھی۔ ادھر سے کوئی بادشاہ عالیجاہ جہاز پر سوار اس پر دیکھتا آتا تھا، دور سے تختہ بہتا دیکھا۔ جب قریب تر آیا، آدمی اس پر نظر آیا، خوفِ خدا سے جلد پنسوی دوڑا، جہاز پر منگوایا۔ ملکہ کو تلاطمِ آب نے بیتاب کیا تھا اور جانِ عالم و انجمن آرا کے صدمہ جدائی سے جی ڈوب گیا تھا یعنی غش تھا، لیکن صورتِ رعنا چہرۂ زیبا میں فرق نہ ہوا تھا۔ بادشاہ بیک نگاہ والہ و شیدا ہو گیا۔ جلد جلد عطر سونگھایا، بازو باندھا اور تدبیریں کیں۔ دو تین گھڑی میں غش سے آنکھ کھلی، دیکھا کہ نہنگِ اجل کے منہ سے تو بچی، آفتِ لطمہ و لجہ سے برکنار، جہاز پر سوار ہوں۔ مگر شخصِ

غیر سے دو چار ہوں۔ شرم سے سر جھکایا۔ تمام جسم میں پسینہ آیا۔

بادشاہ نے پوچھا "اسم شریف؟"

گو باعث حجاب بولنا گوارا نہ تھا لیکن بے جواب دیے چارہ نہ تھا۔ آہستہ سے کہا۔ "محروم ناکام آفت کی مبتلا، ذلیل و خوار فلک درپے آزار، پُر آلام، جگر خون دل خستہ و مجروح کشتی تباہ، گم کردہ راہ، ناخدا گم فتادۂ تلاطم۔" اس کی فصاحت و بلاغت، چہرے کی شان و شوکت سے ثابت ہوا کہ یہ شہزادی ہے اور کلامِ دردناک نے گریبانِ صبر و طاقت چاک کیا۔ بادشاہ نے رو دیا۔ پھر خاصہ طلب کیا۔ ملکہ نے انکار کیا، نہ کھایا۔ اس نے بہت اصرار کیا، لجاجت سے کہا۔ "آپ کھانا نوش فرمائیں، وطن کا پتہ بتائیں۔ جب تاب و توانائی تم میں آئے گی، وہاں بھجوا دیں گے۔"

ملکہ نے کہا۔ "ہم جن کے دامنِ دولت سے اُلجھے تھے، وہ تو گردِ راہ کی صورت خارِ صحرا کی طرح جھاڑ، اس دریائے ناپیدا کنار میں ڈوبے، خدا جانے کیا ہوئے۔ اگر سوئے عدم ہمیں روانہ کرو، بکھیڑا چھٹے غم و الم سے نجات ملے، بڑا احسان ہو۔" اُس نے کہا۔ مولف۔

تم سلامت رہو زمانے میں ایسی باتیں زبان سے نہ کہو

غرضکہ مجبوراً کچھ کھایا، دو چار دن میں طاقت گونہ آئی اور جہاز دارالسلطنت میں پہونچا ملکہ کے واسطے مکان عالیشان خالی ہوا، لونڈیاں، پیشِ خدمت، آتون محلدار، جو کہ قرینہ شاہ اور شہریاروں کا ہوتا ہے اور جس طرح شہزادیاں رہتی ہیں، سب سامان مہیا کر دیا۔

ایک روز بادشاہ آیا کہنے لگا "تم اپنا حسب و نسب چھپاتی ہو، مگر ہمیں معلوم ہوا کہ تم شہزادی ہو، ہماری تمہاری ملاقات اس حیلے سے ہونی تھی، امیدوار ہوں۔ بہ خوشی مجھے اپنے فرمانبرداروں میں قبول فرماؤ۔"

ملکہ نے کہا: "میں نے تمام عمر سلطنت کا نام نہیں سُنا، اِلّا آپ کو خالق نے بادشاہ کیا ہے۔ انصاف شرط فرمانروائی ہے۔ میں ظلم رسیدہ، آفت کشیدہ، فلک کی ستائی ہوں اور کس طرح یہاں تک آئی ہوں۔ بقول استاد ؎

دیکھتے آنکھوں کے کیا کیا لوگ اٹھے پیشِ چشم ہوں لب حیرت بدنداں رنگِ دنیا دیکھ کر

اگر بیگناہ کا خون گردن پہ لینا گوارا ہے، مختار ہے، مجھے کیا چارہ ہے، اور جو میری خوشی منظور ہے تو برس روز کی مہلت دے۔ اس عرصے میں کوئی ڈوبا ترا، میرے وارثوں کا پتا ملا۔ کوئی مرا جیتا پھرا، تو خیر۔ نہیں میں تیرے قبضۂ اختیار میں ہوں، جبر کرنا کیا مزدد ہے

عدالت سے دور ہے۔ بادشاہ دل میں سوچا آج تک ایسے عزتی اُبھرتے نہیں، وہاں کے گئے پھر ادھر قدم دھرتے نہیں، اتنے دنوں کی فرصت دو۔ حکومت نہ کرو، آنکھ بند کرنے میں سال تمام ہو جائیگا۔ پھر کون سا حیلہ پیش آئے گا، کہا "بہت خوب، لیکن جو تمھیں ناگوار نہ ہو تو جی چاہتا ہے گاہ گاہ آنے کو، تمہارے دیکھ جانے کو۔"

ملکہ نے یہ امر مغتنم جانا کہ حاکم و محکوم کا فرق سب کو معلوم ہے، اب یہ انداز ٹھہرا۔ پانچویں چھٹے روز پہلے خواجہ سرا اطلاع کرتا، پھر بادشاہ قدم دھرتا، دو چار گھڑی نشست ہوتی، ہر شہر و دیار کا تازہ اخبار بیان کر، اٹھ جاتا۔ یہاں سے دو کلمے یہ سنئے، مسبب الاسباب کی کارسازی کے سامان دیکھئے۔ وہ محل جو ملکہ کے رہنے کو ملا تھا، اس میں مختصر سا پائیں باغ بہت کیفیت کا تھا، طرح طرح کے میوہ دار درخت، باغ و بہار کا یہ لخت، نئے نئے ڈھنگ کے وہ گل بوٹے، جو بادِ خزاں سے جھڑے، نہ ٹوٹے، پھل قصد سے منہ میں آجائے، ہاتھ بڑھانے کی بار نہ آئے۔ روشیں مورت کی صورت کی سالم، آبِ رواں میں پری کا عالم، بھدّے نہ بد قوارے سڈول سانچے کے ڈھلے نازک، ایک فوارے، کیاریاں بیچداژان میں آبشار، پختہ ہر ایک کیاری، سراسر گلکاری، چمن بندی قطعدار، جا بجا چبوترے معقول، گل پیادہ و سوار پُر بہار چوکور، عرض و طول باغبانیانِ خوبصورت نوجوان، تکلف کے سامان، طلائی نقرئی کھرپیاں مرصع کار، بیلچے ہاتھوں میں، غمزہ چال میں، ادا دیکھ بھال میں، لگاوٹ باتوں میں۔ کسی طرف کنوئیں کی جگت پہ کیلے والے لال بے رنج و ملال ہو رہا۔ کوئی کچھ اکھاڑتی، کوئی کچھ توڑتی، کوئی پھول چنتی، پھل اُٹھاتی، گھاس کھرپی سے چھیل ڈالتی، کوئی ٹوٹا جھڑا پتا گرا پڑا کانٹا کیاری سے نکالتی، سر شاخ ہر گلِ رعنا، بلبلوں کا غنچہ، سرو شمشاد پہ جوبن، صدائے قمری طوق در گردن، ایک طرف طاؤس کا رقص پُر ناز، ہر ایک خوش آواز۔ باغ کے گرد ملبب جھیل، غنچوں کا چٹکنا، کوس رحیل کہیں لالہ پیالہ در دست، کسی جگہ نرگس شہلا با چشم مست، تاک انگور پر میخواروں کی تاک، عنبر بیز صحنِ گلشن کی خاک، ملکہ گہہ دگاہ، شام دپگاہ رفعِ پریشانی و دفعِ سرگردانی کو وہاں آنظارہ، صحبت گل و بلبل سے رشک کھا، بصد حسرت یہ غزل پڑھتی۔ میر سوز ؎

وہ دن خدا کرے کہ خدا بھی جہاں نہ ہو
میں ہوں صنم ہو اور کوئی درمیاں نہ ہو

گل ہو شگفتہ خاطر و گلزار خندہ رو
باد صبا بھی ہووے ولے باغباں نہ ہو

گلشن ہو اور یار دلآرام اور میں
اپنا ہو قصّہ غیر کی واں داستاں نہ ہو

کبھی پیچ و تاب زلف اور گیسوئے معنبر کی پریشان حالی، جعد سنبل کو دکھاتی۔ گاہ سیاہی داغ جگر لالے کی لالی سے اڑاتی، غنچۂ افسردہ سے جو کچھ دل گرفتگی کی تسکین ہوتی تو گل کی ہنسی پر پھوٹ پھوٹ کر خوب روتی اور اس غزل سے دل کو سمجھاتی۔ مولف

لازم ہے سوزِ عشق کا شعلہ عیاں نہ ہو
جل بجھیے اس طرح سے کہ مطلق دھواں نہ ہو

زخم جگر کا داکسی صورت دہاں نہ ہو
پیکانِ یار اس میں جو شکل زباں نہ ہو

اللہ ری بے حسی کہ جو دریا میں غرق ہوں
تالاب کی طرح کبھی پانی رواں نہ ہو

گل خندہ زن ہے چہچے کرتی ہے عندلیب
پھولی ہوئی چمن میں کہیں زعفراں نہ ہو

بھاگو یہاں سے یہ دلِ نالاں کی ہے صدا
بھگے ہو یارو یہ جرسِ کارواں نہ ہو

ہستی عدم سے ہے مری وحشت کی اک شلنگ
اے زلف یار پانوں کی تو بیڑیاں نہ ہو

لینا بجائے فاتحہ تربت پہ نام یار
مرنے پہ یہ خیال ہے وہ بدگماں نہ ہو

ناقہ چلا ہے نجد میں لیلیٰ کا بے مہار
مجنوں کی بن پڑے گی اگر سارباں نہ ہو

چالوں سے چرخ کی یہ مرا عزم ہے سرورؔ
اس سرزمیں پہ جاؤں جہاں آسماں نہ ہو

گاہ لبِ جو کسی سرو کے پاس یادِ قامتِ جانِ عالم میں مثل فاختہ کوکو کرتی، دلِ بیتاب کو تڑپا کر لہو کرتی، غور کرو دنیا میں کسی چیز کو قرار نہیں، اس کا سب کارخانہ پیدا ہے کہ پائدار نہیں۔ کبھی تو روزِ روشن ہے۔ گاہ اندھیری رات ہے، یہ کائنات کی کائنات بے ثبات ہے، گلشن میں اگر بہار ہے، تو خزاں درپئے آزار ہے۔ بلبل کو ہزار چہچے یاد ہیں، پر باغبان آشیاں اجاڑنے کی فکر میں ہے۔ دام لئے لاکھ صیاد ہیں، نوش کے ساتھ گزندِ نیش ہے، کوئی دلِ شاد، کسی کا سینہ ریش ہے، عاشق ازل سے غم کا مبتلا ہے، مثل مشہور ہے کہ معشوق کی ذات بیوفا ہے اور جو کبھی کسی قسمت کے زبردست کو وفادار ہاتھ آتا ہے تو بدرست کسی نہ کسی پیچ سے فلک تفرقہ پسند رشک کھا کے چھڑاتا ہے۔ اسی سہارے پر لوگ جان دیتے ہیں، جی بیچ کر یہ روگ مول لیتے ہیں، یہ نہیں معلوم اَلْقَلِیْلُ کَالْمَعْدُوْمِ، یہ جملہ تو معترضہ تھا۔ پھر وہی قصہ شروع ہوا۔

ایک روز فرح اندوز ملکہ بدستورِ قدیم بے یار و ندیم باغ میں گئی۔ شاہزادے کی صحبت کا خیال، انجمن آرا کی گرمجوشی کا ملال، تنہائی میں اپنا خراب حال دیکھ کر یہ شعر مولف کا پڑھا۔ مولف ؎

اک انقلاب چرخ سے افسوس دیکھنا   وہ صحبتیں رہیں نہ تو وہ ہمنشیں رہے

پھر ایسا روئی کہ ہچکی لگی، شام کا وقت تھا، جانور درختوں پر بسیرا لیتے تھے۔ جس درخت کے تلے ملکہ کھڑی تھی، اک توتا اس پر آ بیٹھا۔ گریہ و زاری اس غم کی ماری کی دیکھ کر، بےچین ہوا، پوچھا "شہزادی حال کیا ہے، کون سا صدمہ ایسا جانکاہ ہے، جو اس طرح لب پہ نالہ و آہ ہے۔"

ملکہ نے کہا "سبحان اللہ قسمت کی گردش سے یہ حال بہم پہنچا کہ جانور مجھ پر رحم کھاتے ہیں، احوال پوچھنے کو اڑ کر آتے ہیں، زیادہ بیقرار و اشکبار سوگوار ہوئی" یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ جب کسی دل شکستہ کی کوئی دلداری کرتا ہے، بندھی بات ہے دل امنڈ آتا ہے۔ ملکہ نے بے اختیار ہو کر کہا۔ آصف الدولہ ؎

جو دو شخص خنداں بہم دیکھتے ہیں   فلک کی طرف رو کے ہم دیکھتے ہیں

"اے جانورِ خوش بیاں، سخن سنج، مہرباں! کیا بتاؤں، گھر بار سے جدا بیکسی میں مبتلا ہوں۔ بسانِ آئینہ حیراں مثل زلف سیہ بخت پریشاں، نے کی طرح نالاں موردِ صد اندوہ بلا ہوں! شعر ؎

بے کسی سوخت کسے می خواہم   نفسے ہم نفسے می خواہم

شام تیرہ بختی کی سیاہی میں بیقرار، صبح قیامت کی صورت، دامن چاک گریباں تار تار، شعر ؎

کس کو اب زیر فلک طاقت رسوائی ہے   کاش شق ہووے زمیں اور سما جاؤں میں

دل میں الم سے خار خار، غیر جنسوں کے دام میں گرفتار، سخت مجبور و ناچار ہوں۔ طائر رنگ پریدہ، ہزاروں جور و ستم میں جریدہ، اڑ دے راحت کوئے آشیاں ندیدہ، شب فرقت کے اندھیرے میں سوجھتا نہیں، خونبار ہوں۔ ناسخ ؎

صبح سے کرتے ہیں معمار مرے گھر کو سفید   شام سے کرتی ہے فرقت کی شب تار سیاہ

توتے نے کہا "مجھے تم سے بوئے محبت آتی ہے، تمہاری باتوں سے چھاتی پھٹی جاتی ہے، برائے خدا اپنے رازِ سربستہ سے مجھے آگاہ کرو، للہ جلد مفصل حال کہو۔"

ملکہ نے قصۂ عشق جانعالم، انجمن آرا کا آنا، وزیر زادے کی برائی، جادوگری کی کج ادائی، جہاز کی تباہی، اپنا وہاں آنا، اوروں کا پتہ نہ پانا، جانعالم کا چھٹ جانا، سب بیان کر کے

کہا "وہ شاہ گردون بارگاہ ہمیں منجدھار میں ڈوبتا چھوڑ، اپنا بیڑا پار لگا، منھ موڑ خدا جانے کیا ہوا! ہم ہیں اور رنج تنہائی میں بیتابی، انیس ہے، پریشانی میں ہمدم، خانہ ویرانی جلیس ہے، جو دم ہے دمِ شمشیر ہے، سانس ناوک کا تیر ہے"، توتا یہ باتیں سن کر زمین پر گر پڑا۔ پر نوچنے لگا۔ ملکہ مہرنگار گھبرائی کہ یہ کیا ماجرا ہوا۔ افسوس ؎

دیکھ کر مجھ کو وہ حاضر ہوا مرجانے کو　　وہی غمخوار جو یاں بیٹھا تھا سمجھانے کو

گھڑی بھر میں جب توتا سنبھلا، بولا کہ "اے ملکہ مہرنگار! میں وہی توتا کم بخت، جفا شعار ہوں، جس نے اُس رشکِ قمر کو دربدر کیا۔ مجھ سے انجمن آرا کا ذکر سن کر آوارہ ہوا تھا۔ باقی حال تو آپ نے سب سنا ہوگا"۔ پھر تو ملکہ اسے گود میں اٹھا، یہاں تک روئی کہ بیہوش ہوگئی۔ شہزادے کے بیان کئے، باغیانیاں دوڑیں، خدمت گزار جھپٹیں کہ آج ملکہ پر کیا حادثہ پڑا۔ جب دونوں کے ہوش و حواس درست ہوئے توتے نے کہا — "آپ دل کو تسکین دیں، خاطرِ مبارک جمع رکھیں، جانعالم اور انجمن آرا دونوں خیریت سے زندہ ہیں۔ میں نے یہ مقدمہ منجّموں سے دریافت کیا تھا۔ بالاتفاق اس پر ہیں کہ رنجِ مفارقت کے سوا جان کی خیر ہے، سب آملیں گے۔ اب مجھے رخصت کرو۔ صبح کو خدا جانے کس وقت بیدار ہو"۔

ملکہ نے کہا "واہ! بعد مدت محرمِ راز ملا، وہ بھی اتنا جلد چلا، فلک بر سرِ کج ہے، بے لطف زندگی ہے، دیکھیں یہ بُرے دن کب جاتے ہیں اور اچھے کیونکر آتے ہیں"۔ استاد ؎

ایک عالم کو آزما دیکھا　　جس کو دیکھا سو بے وفا دیکھا
حالِ بد کا شریک دنیا میں　　نہ برادر نہ آشنا دیکھا
کیوں دلا ہم نہ تجھ سے کہتے تھے　　جی لگانے کا کچھ مزا دیکھا
سچ ہے دنیا مریض خانہ ہے　　رنج میں سب کو مبتلا دیکھا
کیف میں کم بہت نوازش ہے　　عشق خوباں میں جو نشہ دیکھا

آخرش رات کی رات توتا رہا، صبح کو رخصت ہوا، چلتے وقت ملکہ نے تھوڑا حال اپنا پرچہ پر تحریر کر دیا، کہا "جہاں شہزادے سے ملاقات ہو، یہ خط نشانی دے کہ جو کچھ دیکھا ہے، زبانی بیان کرنا"۔ وہ رقیمۂ شوق لے کر راہی ہوا۔ شہر بہ شہر خستہ جگر ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ ایک روز قریبِ شام، بادلِ ناکام تھک کر، لبِ چشمہ کچھ درخت تھے ان پر بیٹھ کر سیلِ سرشکِ چشمِ پُرنم سے بہاتا تھا، اسی دن جانعالم اور انجمن آرا توتے کی صورت بنائے، اسی درخت پر آ بیٹھے۔

یہ توتا ہمجنس سمجھ دیکھنے لگا۔ وہ دونوں مضطرب الحال ایک ٹہنی پر بیٹھ رہے۔ توتا سمجھا کہ یہ منقاربہ میری طرح سے دل خستہ ہیں، پھر رونے لگا۔

انجمن آرا نے کہا "جانعالم! دیکھنا، یہ توتا روتا ہے۔ شاید ہماری صورت مصیبت دیدہ، مصائب کشیدہ ہے۔"

توتا باتیں تو سمجھتا تھا، پھر بیٹھا اور بولا "خدائے رحیم تمھیں وہ رنج نہ دے، عدو بھی تمھارا یہ ستم نہ دیکھے، مجھے وہ غم ہے اور دل پر ایسا الم ہے کہ ہر دم یہ دعا ہے۔ دشمن کا دشمن، یہ صدمۂ جانکاہ اور ایسے روزِ سیاہ نہ دیکھے۔ میر سوز ؎

جو دم لیتا ہوں تو شعلہ جگر کا جی جلاتا ہے	جو چپ رہتا ہوں تو اندر ہی اندر جان کھاتا ہے
جو کچھ احوال کہتا ہوں تو سننے والے روتے ہیں	نہیں کہتا ہوں تو کوہِ الم سینہ دباتا ہے
جو جنگل میں نکل جاتا ہوں تو سب دشت پھنکتا ہے	کبھی جو شہر میں آتا ہوں تو گھر بھول جاتا ہے
پہاڑوں میں اگر پھرتا ہوں ٹکڑے ہوکے اڑتے ہیں	جو دریا پر کبھی جاتا ہوں سر پر خاک اڑاتا ہے

مجمعِ رنج و محن، غریقِ شطِ خفت، ہمہ تن ہوں، محسن میرا خانماں آوارہ ہوا، یہ ندامت ہے، مفارقت اس کی ظلم ہے، قیامت ہے اس کے ورائے تازہ حال یہ دیکھا ہے کہ ایک عاشقِ صادق اپنے معشوق سے جدا ہے، غیر جنسوں میں اسیرِ بلا ہے، اس کے ناوکِ آہ سے چھاتی سوراخ دار ہے، سنانِ نالہ کلیجے کے پار ہے۔ اگر گریہ و زاری یا تڑپ اور بیقراری اس کی بیان کروں، پتھر پانی ہو کر بہہ جائے، سیماب کی چھاتی، خجلت سے پارہ پارہ ہو، راہ چلتے انجان کو رحم آئے۔"

جانعالم یہ سن کر پھر بیٹھا کہا "وہ کون تھا جو سرگشتہ و آوارۂ دشت ادبار ہوا، اور وہ کون ہے جو ناجنسوں میں گرفتار ہوا۔"

توتے نے ان کی داستانِ گذشتہ اور ملکہ کا حال بیان کیا۔ انجمن آرا ملکہ کا نام سن کر شگفتہ خاطر ہوئی، دونوں نے صورت بدلی، توتا پہچان کر پاؤں پر گر پڑا، شہزادہ گلے سے لگا کر خوب رویا۔ کہا "اے ہمدم! تم سے جو ہم جدا ہوئے، کس کس رنج و مصیبت میں مبتلا ہوئے، دشت بدشت کوہ بکوہ خراب و خستہ دربدر محتاج پھرے۔ تم اس دن کے گئے، آج پھرے۔" پھر ملکہ کا حال پوچھا۔ اس نے خط حوالے کیا۔ پہلے انجمن آرا نے آنکھوں سے لگایا، دل نے قرار پایا۔ مضمونِ اضطراب بدحواسی کا مطلب سرنامے سے کھلا کہ جانعالم کی جگہ، ملکہ اور ملکہ مہرنگار کی جا، رقیمہ

شوقِ جانعالم لکھ دیا تھا، اس انشار کو سوچ، شہزادے کے ہوش گم ہوئے، بسکہ نامۂ شوقیہ پیچ و تابِ دل اور اشتیاقِ ملاقات میں تحریر تھا۔ جانعالم جب کھولتا تھا، اثرِ شوق ہم آغوشی سے ہر بار، خط ہاتھ میں لپٹا جاتا تھا، مضمون مکرر سو سو حسنِ طلب دکھاتا تھا۔ مولف ؎

نامہ شوقیہ جب میں نے رقم اس کو کیا
سو جگہ مضمون تب اس میں مکرر ہوگیا

آنسو دمِ تحریر یعنی لکھنے کے وقت، جو خط پر ٹپکے تھے، دھبے اور نشان اس کے، دیدۂ منتظر چشمِ حیرت زدہ کی طرح ہر سطر پر کھلے تھے اور سُرخ ہالہ ہر حرف نے نکالا تھا، ایک جدولِ خونی ہویدا تھی۔ لہو رونے کی کیفیت پیدا تھی، لکھا تھا۔ حافظ

ازخون دل نوشتم نزدیک دوست نامہ
اِنّی رَاَیتُ دَھْراً مِنْ ھِجْرِکَ القِیَامَہ

سوادِ دیدہ حل کردم نوشتم نامہ سوئے تو
کہ تا ہنگام خواندن چشم من افتد بروئے تو

اے یارِ وفادار، صادق الاقرار، اللہ تجھے سلامت رکھے، شرحِ اشتیاق داستانِ فراق، قصۂ طول وطویل ہے، زندگی کا بکھیڑا قلیل ہے۔ اگر ہماری زیست منظور ہے، جلد آؤ صورت دکھاؤ، نہیں تو تاسف کروگے، پچھتاؤ گے، تم نے آنے میں اگر دیر کی تو ہم نے صدمۂ ہجر سے تڑپ کر جان دی، مٹی کے ڈھیر پر رو رو خاک اڑاؤ گے۔ مولف

شکل اپنی ہم کو دکھلاؤ خدا کے واسطے
جان جاتی ہے اجی آؤ خدا کے واسطے

کوئی دم کا سینے میں دم مہمان ہے، نام کو جسم میں جان ہے، فلک نے ہماری صحبت کا رشک کھایا۔ بے تفرقہ پردازی ظالم کو چین نہ آیا۔ روز و شب رنجِ جدائی سے جان کھوتے ہیں، اتنا کبھی کاہے کو کسی دن ہنسے تھے، جیسا بلک بلک کر فرقت کی راتوں میں روتے ہیں میر ؎

بیتابی دل کسے سنائیں
یہ دیدۂ تر کسے دکھائیں

تمہاری تقریر دلپذیر ہر دم برزبان ہے، بے تصور سے باتیں کٹے، چین کہاں ہے۔ استاد ؎

یہ جانتے تو نہ باتوں کی تجھ سے خو کرتے
ترے خیال سے پہروں ہی گفتگو کرتے

ہمارے تڑپنے سے ہمسایہ سخت تنگ ہے، دولتسرا زنداں سے، تیرہ و تنگ ہے، میر ؎

گر یونہی رہے گی بیقراری
تو ہوچکی زندگی ہماری

وحشت پیرامونِ حال ہے، ہر گھڑی فرقت کی ماہ ہے، جو پہر ہے دہ سال ہے۔ میر ؎

دل کوئی دم میں خون ہووے گا ‏ ‏ ‏ ‏ آج کل میں جنون ہووے گا

تمہاری صورت ہر پل روبرو ہے، جس طرف دیکھا تو ہی تو ہے، چشم فرقت دیدۂ دریا بار ہے۔ آنکھ نہیں چشمۂ آبشار ہے، جن آنکھوں کو تم پرنم نہ دیکھ سکتے تھے، ان سے خون کے دریا بہہ گئے۔ مولف

تم نے نہ ہماری پہ خبر لی ‏ ‏ ‏ ‏ چھاتی پتھر کی کیوں جی کر لی

دن رات کی صحبت، تمھارے ساتھ کی، جب یاد آتی ہے، نیند اچٹتی ہے، بےچینی کی رات پہاڑ ہو جاتی ہے۔ کاٹے نہیں کٹتی ہے۔ چارپائی تنہائی میں پلنگ بن کر کاٹے کھاتی ہے۔ خواب میں نیند کا خیال نہیں۔ کھانا پانی ہجر میں حرام ہے، حلال نہیں۔ وہ سر جو اکثر آپ کے زانو پر رہا ہے۔ اس کو سو سو بار بالش و بالیں پر دے پٹکا ہے۔ مولف ؎

جس میں باہیں تری حمائل تھیں ‏ ‏ ‏ ‏ طوقِ حسرت میں اب وہ گردن ہے

میرے جاگنے کے، اے پیارے! ستارے شاہد ہیں، گواہِ شرعی زاہد ہیں، مرغِ سحر کو بیقراری سے چونکاتی ہوں۔ موذن کی نیند آہ و زاری سے اڑاتی ہوں۔ شبِ وصل یہ ہمیں جگاتے تھے، ستاتے تھے۔ اب ہجر کی رات ہم انھیں سونے نہیں دیتے ہیں۔ من مانتے بدلے لیتے ہیں۔ دل ہر ساعت، گھڑی سے زیادہ نالاں ہے۔ ہر پہر گجر سے فزوں شور و فغاں ہے۔ چشم ہر اختر معائنہ حال زار سے بحیرت وا ہے۔ چرخِ گرداں میری گردش دیکھ کر چکر کر رہا ہے۔ استاد ؎

کھا لیجئے تھوڑا زہر منگا ہم اور کہیں تم اور کہیں ‏ ‏ ‏ ‏ کیا لطف ہے ایسے جینے کا ہم اور کہیں تم اور کہیں

افشائے حال باعثِ ندامت، موجب دشمنوں کی خوشی کا، سبب دوستوں کے ملال کا ہے لا اعلم مصرعہ

دلِ من داند و من دانم و داند دلِ من

اگر جیتے جی کبھی مل جائیں گے، رنجِ فرقت کے دکھڑے مفصل زبانی کہہ سنائیں گے اور جو فلک کو یہی منظور ہے تو انسان مجبور ہے۔ اس حسرت کو بھی در گور لے جائیں گے۔ سعدی ؒ

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

بخدا نمازِ پنجگانہ میں یہ دعا ہے۔ جامع المتفرقین سے یہی التجا ہے، کہ تم سے جلد ملاقات ہو جائے۔ جانِ زار دلِ بیقرار کو چین آئے۔ زیادہ ملاقات کا اشتیاق ہے، اشتیاق اور جدائی کا صدمۂ جانکاہ سخت شاق ہے، شاق خو گر وصل ہجر کے الم کا مبتدی ہے نہ مشاق۔"

یہ خط کا مضمون جو پڑھا، دونوں نے رو دیا اور سر نو مع سرنامہ سراسر وہ نامہ بھگو دیا۔
اس رات کو تو چار و ناچار وہاں مقام کیا، صبح ہوتے ہی صورت بدلی، کوچ کا سرانجام کیا، آگے آگے تو تا رہبر، پیچھے پیچھے وہ دونوں تیز پر —

پہنچنا جان عالم اور انجمن آرا کا مع توتے ملکہ مہر نگار کے پاس

پھر ملاقات ہم دگر فوج بھیجنا، وہاں کے بادشاہ کا لوگوں کا مِل جانا، بادشاہ کا آنا

پھر اس کی گرفتاری اور جانعالم کی سیر چشمی

پِلا دے تو ساقی مے لالہ فام — ہوا چاہتا ہے یہ قصہ تمام
وہ مے دے کہ ہوں دور دل سے الم — کہ ہوتے ہیں معشوق و عاشق بہم
جدائی کے ایام طے ہو چکے — شب ہجر میں خوب سا رو چکے
مچا دوں کوئی دم بھلا چہچہے — کہ رنجِ جدائی بہت سے سہے
مثل ہے یہ مشہور اے ذی شعور — کہ ہے رنج کے بعد راحت ضرور

محرّرانِ حال، طالب و مطلوب، و حاکیانِ حکایاتِ خوب و مرغوب لکھتے ہیں کہ وہ پرندۂ ہوائے شوق یعنی جانعالم مع انجمن آرا، توتے کے ساتھ، آٹھویں روز ملکہ کے پاس پہونچا۔ یہاں جس دن سے توتا رخصت ہوا تھا، ملکہ مہر نگار دونوں وقت بِلا ناغہ، اس درخت کے تلے، جہاں توتا ملا تھا، آ کر یہ کہتی تھی بہ سوز سے

مانندِ جرس پھٹ گئی چھاتی تو فغاں سے — فریاد کو پہونچا نہ کوئی راہ رواں سے

اس طرح اُس روز موافقِ معمول، وہ دلِ ملول، قریبِ شام درخت کے نیچے حزیں و زار توتے کے انتظار میں کھڑی تھی اور آنکھ ٹہنی سے لڑی تھی اور دیدۂ خونبار سے تا دامن یاقوت اور موتیوں کی لڑی تھی، جب دلِ سوختہ گھبراتا تو آہ سوزِ دروں، مثلِ دخان لب پر آتا،

جی بہلانے کو یہ غزل پڑھتی۔ مولف ؎

آتشِ فرقت سے سینہ جب سے مجمر ہوگیا
بھُن کے لختِ دل مرا ہر ایک اخگر ہوگیا

باعثِ افشائے ذلت دم نہ مارا میں نے گاہ
ورنہ زیرِ آسماں کیا کیا نہ مجھ پر ہوگیا

نزع تک تو آمدِ جاناں کا کھینچا انتظار
وہ نہ آیا وعدہ اپنا یاں برابر ہوگیا

کیا ڈراتا ہے ہمیں واعظ سنا شورِ نشور
شامِ فرقت یاں عذابِ روزِ محشر ہوگیا

اب جو ہنستا ہوں تو ہنستے ہنستے بھی گرتے ہیں اشک
روتے روتے آخرش رونے کا خوگر ہوگیا

فکر پھر کس کو ہے دیواں جمع کرنے کی سرور
جب کہ مجموعۂ خاطر ہی ابتر ہوگیا

دفعتہً توتے نے سلام کیا۔ وہ خوش ہوکر بولی "اے قاصدِ نیک صدا و ہُدہُدِ شہرِ سبا! میرے سلیمانِ حسن و خوبی کا پتہ پایا، اس بلقیسِ محبوبی کا سراغ ہاتھ آیا؟"

توتے نے کہا "اے ملکۂ عالم! قدرداں، خبرداروں کو خلعت و انعام دیتے ہیں، جب دوست کا پیغام پوچھتے ہیں، علی الخصوص یہ خبرِ فرحت اثر، پہلے یہ ارشاد ہو کہ اگر پتہ بتاؤں گا، اس کی اجرت کیا پاؤں گا؟"

یہ سن کے ملکہ کی جانِ رفتہ بدن میں آئی یقین ہوا اس نے خبر پائی۔ یہ کہا۔ استاد ؎

پیغامِ دوست جلد تو پیغامبر سنا
گھبرا کے دم ہی جائے نہ میرا کہیں اکھٹ

توتا عرض کرنے لگا، "حضور کا فرمانا بجا ہے، مگر ایسی خبر کا جلد کہنا حمق کا مقتضا ہے۔ استاد ؎

دفعتہً خوگرِ فرقت کو نہ دے مژدہ وصل
خبرِ خوش نہیں اچھی جو یکایک ہووے

توتا بات کو طول دیتا تھا کبھی خوش گاہ ملول کر دیتا تھا، ملکہ بے چین ہوئی جاتی تھی۔ اِدھر شہزادے سے زیادہ انجمن آرا گھبراتی تھی۔ غرض نہ رہ سکی۔ صورت بدلی۔ جانِ عالم مجسم ہوا۔ آپس میں عاشق و معشوق و معشوق و عاشق خوب گلے مل مل کر روئے، غبارِ کلفتِ پارینہ، داغِ مہاجرتِ دیرینہ دل کھول کر، صفحۂ سینہ سے دھوئے۔ رونے کی آواز سے مغلانیاں، خواصیں جمع ہوئیں، جس کی آنکھ ان دونوں پر پڑی، دوڑ کر صدقے ہوئی اور پاؤں پر گر پڑی۔ جَلّ جَلالہٗ، حسنِ خوب سے کوئی چیز زیادہ دلکش اور محبوب نہیں، دوست تو دوست ہے دشمن عشق کر جاتا ہے، لڑکا ہو یا بوڑھا، شیدا نظر آتا ہے۔ مال کو کیا مال ہے، موت کی اَنی بھی اگر پاس ہو تو اَنی ماری سے خرید ار بن جاتا ہے۔ جان عزیز نہیں، حرمت کچھ چیز نہیں، غلام کی

غلامی پر آقا فخر کرتا ہے، جانِ تازہ پاتا ہے، جو کوئی کہتا ہے کہ یہ اس پر مرتا ہے، عیاذاً باللہ یہ امر محمود نہیں، اس میں غیر ضرر کچھ سود نہیں۔ غرضکہ خُرّم وخنداں بارہ دری میں آئے۔ انجمن آرا سے ملکہ نے حال پوچھا۔ اُس نے دیو کا اُٹھالے جانا، باغ کی بے سروپائی، پھر جانعالم کی رسائی اور سفید دیو کا آنا، باہم کی لڑائی، آفت سے چھڑانا، اپنی پیادہ پائی، صحرانوردی، ہوا گرم، پانوں کا ورم، پھر وہ عمل جوگی کا بتایا ہوا، شہزادے کا سکھانا، توتے سے درخت پر مل جانا، سنا دیا۔

پھر اُس نے جانعالم سے گذشت پوچھی، اپنی صعوبت کہی، گزشتہ کا حال میں ذکر کرکے جو کچھ دھیان بندھا، پھر سب رونے لگے۔ توتا بدمزہ ہوا کہا "صاحبو! اب یہ قصہ بکھیڑا دور کرو، ہنسی خوشی کا مذکور کرو۔ یاد رکھو یہ بات گذشتہ را صلوات۔" مصحفی ؎

ایامِ گزشتہ کو کبھی یاد نہ کیجے ۔۔۔ جز حسرت و افسوس نہیں ہاتھ کچھ آتا

ملکہ بولی "اے شیریں مقال، مبارک قدم خجستہ فال! شہزادہ سا عقل کا دشمن دیکھا نہ سنا۔ سوز ؎

نادان ہے جو دوست وہ دشمن ہے جان کا ۔۔۔ معلوم ہم کو دل کے سلوکوں سے یہ ہوا

اس نے جتنی محنت و مشقت اٹھائی، اپنی بدعقلی کی سزا پائی، بھلا عالمِ تنہائی میں جو کچھ کیا، سو کیا، دو تین بار اپنے ساتھ ہم دونوں کو خراب آفت کا مبتلا کر چکا ہے، آگے دیکھیے کیا ہوتا ہے۔" یہ کہہ کر دربروئے دشمناں بند، دوست بادلِ خرسند باہم بیٹھے اور دورِ ساغر، بے دغدغۂ فلک تفرقہ پسند و سفلہ پرور شروع ہوا، مطرب نے ساز کی ناسازی پر گوشمالی دی، صدائے عیش و طرب بلند ہوئی۔ یہ خبر بارہ دری میں مشتہر ہوئی، اور وہاں کے بادشاہ کو پہونچی کہ ایک مرد صاحب جمال، دوسری عورت پری تمثال، ملکہ کے پاس تازہ وارد ہوئے۔ کہنے لگا "الحمد للہ ایک موجود تھی دو اور آئے۔" پھر دو ہزار سوار جرّار اور دو سپہ سالار تجربہ کار نگہبانی کو بھیجے۔ جانعالم نے یہ ماجرا سنا کہا "فضلِ الٰہی چاہیے، بعد مدت یہ صحبت ہمدگر میسر ہے، صبح سمجھ لیں گے۔"

سوار تو باغ گھیرے رہے۔ یہ تمام شب جلسے کیے گئے، جس وقت خسروِ خاور، آرام گاہِ مشرق سے برآمد ہو جلوہ گرِ تخت زنگاری ہوا اور سپہ سالارِ انجم، معہ سوارانِ سیارہ کوہ مغرب کی طرف فراری ہوا، جانعالم حمام سے غسل کر کے نکلا، اس لوح سے اسمِ تسخیر پڑھتا، باغ کے دروازے پر آیا، جس کی نگاہ پڑی، اسم کی برکت سے آداب بجالایا، دست بستہ رو برو آیا۔ وہ دو ہزار سوار

معہ سپہ سالار فرمانبردار ہوئے، پھر تو دروازہ بہ کشادہ پیشانی کھولا۔ یہ خبر وحشت اثر اس بادشاہ کو پہونچی اور سوار پیادے لڑائی کے آمادے بھیجے، وہ بھی جب سامنے آئے، حلقۂ غلامی کان میں ڈالا، جنگ کا خیال نہ رہا، پھر تو مشہور ہوا کہ ساحر ہے۔ المختصر تمام فوج آکر شریک ہوئی۔ اس وقت وہاں کا تاجدار، طیش کھاکر سوار ہوا، کہاں یکہ سوار، کجا انبوہِ بے شمار، تلوار چلی، دس پانچ زخمی ہوئے، کچھ جان سے گئے اور فوج نے نرغہ کر جان سے تو نہ مارا، کمندوں میں پھنسا لیا اور جانعالم کے حوالے کیا۔

شہزادہ عالی حوصلہ خوف خدا سے اور نحوست طالع نارسا، کج ادا سے، مثلِ بید کانپا اور فرمایا "اللہ وہ وقت کسی کو نہ دکھائے، جو دوست دشمن ہوجائے"۔ یہ ارشاد کر اس سے بغلگیر ہوا، برابر بٹھایا، قتل سے ہاتھ اٹھایا۔ وہ بیچارا نادم و پشیمان، سر در گریبان، گھٹنے پہ گردن جھکا، منفعل خاموش بیٹھا۔

شہزادے نے کہا: "مسافرکشی صفتِ شاہی سے بعید ہے، ہم تمہارے مہمان تھے، تم نے دعوت کے بدلے، عداوت کی، اللہ کو یہ بات پسند نہ ہوئی، عبرت کا تماشہ دکھایا، یہ سلطنت آپ کو مبارک رہے۔ بندہ غریب دیار کمر باندھے چلنے کو تیار ہے۔ اس لڑائی کا قصہ فسانہ ہوجائے گا، امروز یا فردا یہ مسافر روانہ ہوجائے گا"۔

وہ اس کی فصاحت و بلاغت اور یہ سیر چشمی دیکھ کر حیران ہوا کہ دشمن کو گرفتار کیا، پھر ملک بخش دیا، سر جھکا کر بولا "بخدائے عزّ و جل لائقِ حکومت قابلِ سلطنت آپ کی ذات فرخندہ صفات ہے"۔

جانعالم نے کہا "آپ یہ اپنی تعریف کرتے ہیں ورگرنہ من آنم کہ خوب می دانم"

القصہ وہ محجوب ہوکر رخصت ہوا، فوج کو صلح جو ثابت ہوئی اپنے بادشاہ کے ہمراہ چلی۔ جب یہ جنگ زرگری ہوگئی، مکان پہ آکر بہت تیاری سے دعوت کی اور عذرِ تقصیر کر عفو کا امیدوار ہوا۔ شہر میں یہ چرچا ہوا، اہل شہر مشتاق ہو، غول کے غول آنے لگے، روز باغ کے روبرو میلا ہوتا تھا، کسی وقت شہزادہ نہ اکیلا ہوتا تھا، پھر جاسوس، شتر سوار، ہرکارے، فوج کے تجسس میں بھیجے۔ چالیس منزل پہ لشکر ملا۔ جانعالم کی مفارقت سے کسی میں جان نہ تھی، فرمان مُہری دیکھ کر جانِ تازہ پائی، مہر آنکھوں سے لگائی، رات دن کوچ کرتی، بیس پچیس دن میں برسمِ یلغار فوج داخل ہوئی۔ شاہزادہ لشکر کو ملاحظہ کرکے مسرور ہوا، ملال بھولا، ارکان دولت نے ملازمت حاصل کی، سب نے نذر دی، موافق قدر و منزلت خلعت اور انعام خاص و عام کو

مرحمت ہوا اور رعایا برایا بازاری اہلِ حرفہ کو بھی کچھ دیا۔ فوج کے سرداروں کو خلعت جواہر نگار سپر و شمشیر مرصّع کار عنایت کر، دو ماہہ تمام فوج کو انعام میں دیا، از سرِ نو لشکر چمکا دیا۔ پھر وہاں سے کوچ ہوا۔ وہی راہ میں چلتے اختلاط فسانے حکایات عیش و نشاط؛ توتا ہنساتا، رمز و کنایہ کرتا، لطیفے سنا دل بہلاتا، ہر صبح باخاطرِ شگفتہ مثلِ نکہتِ گل کوچ، ہر شام بسانِ فصلِ بہار بہ آسائش مقام، روز و شب براحت و آرام رو بہ راہ ہوئے۔

ورودِ لشکرِ نصرت آمود پُر بہار جنگل میں جاڑے کی شدت صحبتِ شراب کے نشے کی ترنگ میں خیالاتِ فاسد کا آنا، کج بحثی باہم کی، پھر توتے کا سمجھانا ۔ شہزادے کا پچھتانا۔

ناگاہ ایک روز گذرِ موکبِ حشمت و جلال، با فرّ و شوکتِ کمال، ایک صحرائے باغ و بہار، دشت لالہ زار، میں ہوا۔ فضائے صحرا قابلِ تحریر کیفیتِ دشت گلشن آسا، لائقِ تقریر۔ بو باس ہر برگ و گل کی، رشکِ مشک اذفر صفحہ بیابان، معنبر و معطر، چشموں کا پانی، صفا میں آب گہر سے آبدار تر، ذائقے میں بہ از شیر و شکر، چلّے کے جاڑے، کڑاکے کی سردی تھی، گویا کہ زمین سے آسمان تک یخ بھر دی تھی۔ پرند، چرند اپنے اپنے آشیانوں اور کاشانوں میں جمے ہوئے بیٹھے، بھوک اور پیاس کے صدمے اُٹھاتے تھے، دھوپ کھانے باہر نہ آتے تھے، قصد سے تھر تھراتے تھے، سردی سے سب کا جی جلتا تھا۔ دمِ تقریر ہر شخص کے منھ سے دھواں دھار دھواں نکلتا تھا، آواز کسی کی کان تک کسی کے کم جاتی تھی، منھ سے بات باہر آتی اور جم جاتی تھی، مارِ سیاہ اوس چاٹنے باہر نہ آتا تھا۔ سردی کے باعث دُم دبا کے بانبی میں دبکا جاتا تھا۔ زمانے کے کاروبار میں خلل تھا۔ ہر ایک دست در بغل تھا، عاشق و معشوق بھی اگر ساتھ سوتے تھے گھٹتے تھے مگر گھٹنے پیٹ سے جدا نہ ہوتے تھے، اشکِ شمعِ انجمن لگن تک گرتے گرتے اولا تھا، پروانوں نے گرد پھرتے پھرتے ٹٹولا تھا، شعلہ کانپتا تھا، فانوس کے لحاف میں منھ ڈھانپتا تھا، شمع کا جسم برف تھا، پگھلنے کا کیا حرف تھا، ہر سنگ کے سینے میں آگ تھی، شرر تھا۔ لیکن سردی کو بھی یہ لاگ تھی اور جاڑے کا ایسا اثر تھا کہ سلیں کی سلیں جمی پڑی تھیں، فولاد سے زیادہ کڑی تھیں، تنورِ فلک چہارم کی چھاتی سرد تھی گلخن میں یہ برودت تھی کہ کشمیر

گرد تھی، لنجوں نے بیٹر پکڑے، لوے لوُلوں کے ہاتھ آئے، لنگڑے ہرن باندھ لائے، سرزمینِ ہند میں مردے نہ جلتے تھے، زندوں کے ہاتھ پاؤں گلتے تھے۔ آتشِ رخسارِ گل شبنم نے بجھائی تھی۔ باغ میں بھی جاڑے کی دہائی تھی۔ اس برگ و بار کی، صنعت پروردگار کی دکھائی تھی، مرصع کاری یک لخت نظر آتی تھی۔ دانہ ہائے اشکِ شبنم خواہ بڑے یا ریزے تھے۔ ہر شجر کے پتے اور شاخ میں الماس اور موتیوں کے آویزے تھے۔ عذارِ لالہ حمرا، رشکِ زعفران تھا، طلائی درختوں کی ٹہنیاں کہربائی پتے بہار میں عملِ خزاں تھا، اس سردی کا کہیں ٹھکانہ تھا، حمام تہ خانے کا خسخانہ تھا، آگ پر لوگ جی نثار کرتے تھے، زردشت کا طریق اختیار کرتے تھے۔ اس زمانے میں جاڑے کی یہ ترقی تھی کہ آج تک بتوں کی سرد مہری نہ گئی۔ آفتاب عازمِ برجِ حمل تھا، آتش پرستوں کا عمل تھا۔ زیست سمندر کی عنوان تھی، آگ میں خلقت کی جان تھی، عاشق تو کیا معشوق ٹھنڈی سانس بھرتے تھے، گرمی نہ کرتے تھے، دانت سے دانت بجتا تھا، ہونٹ نیلم کو شرماتے تھے۔ پان کے لاکھے میں مستی کی کیفیت دکھاتے تھے۔ عاشق تن پریوں کو ساتھ سلاتے تھے۔ اس پر بستر کو گرم نہ پاتے تھے، جاڑے میں ہر ایک المست تھا۔ عالم اللہ کا آتش پرست تھا۔ جاڑے سے اس دشت میں ایسا پالا پڑا، تمام اہلِ لشکر کو تپ لرزے کا عالم تھا۔ بانکے ترچھے خود بخود اینٹھے جاتے تھے، ڈھال تلوار کھڑ کھڑانے کے عوض دانت کڑکڑاتے تھے۔ تپنچے چقماق پتھر کلے لاٹھی سے بیکار ہو گئے تھے۔ چانپ کے پتھر آگ نہ دیتے تھے اور توڑے دار کا یہ حال تھا کہ بوجھ کندھا توڑے دیتا تھا۔ قدم اٹھانا محال تھا، توڑا ہر ایک گل تھا، توتے کی جگہ شورِ بلبل تھا، ہوش لوگوں کے کانپتے تھے۔ کیچوے کی مٹی کو الاؤ سمجھ پھونکتے ہانپتے تھے، ملائم لوگوں کے حواس جم گئے تھے، جگنو کو چنگاری کے دھوکے میں اٹھانے کو تھم گئے تھے، سردی بسکہ کارفرما تھی، ایک کو دوسرے کی تمنا تھی، یہانتک جاڑے کا زور و شور عالمگیر ہوا تھا، کہ کرۂ نار زمہریر ہوا تھا۔

جانِ عالم نے فرمایا "آج خیمہ ہمارا یہیں ہو"۔ بعد ورود لشکر خود متوجہ سامانِ عیش و نشاط ہوا اور ملکہ، انجمن آرا سی پیکرِ محبوب، توتا مصاحبِ بے بدل، بہ دلِ مرغوب، دورِ شراب گردش میں آیا۔ الاکشتی شراب کی نہ چلتی تھی اور کباب بھوننے کو آگ نہ جلتی تھی۔ گلاس شراب کا، برف کی قفلیوں کو شرماتا تھا، قطرے اس میں گرتے ہی جم جاتا تھا، مینائے بے زبان کے منہ پر روئی تھی، ایسی سردی ہوئی تھی، گلا بیٹھا تھا۔ جب بہت غل کرتی، تب قلقل کرتی۔ لبِ ساغر خشک، جسم پر پسینہ تھا، پانی کا پیالہ فخرِ آبگینہ تھا، جاڑے کا لشکر میں ہر طرف شور و غل تھا، بازار میں روئی

کالیۃن دین بالکل تھا۔

جب دورِ آفتاب ماہ جبینوں میں چمکا، عالمِ سرور میں جانِ عالم کو خیال نزدیک و دور آیا، دل میں سوچا کہ اتنے عرصۂ دراز، زمانۂ دیر باز تک ملکہ اور انجمن آرا کو ہم سے فرقت، غیروں سے قربت رہی، رنڈی کا اعتبار کیا ہے، یہ قوم قدیم سے بے وفا ہے۔ فردوسی ؎

اگر نیک بودے سرِ انجام زن   زناں را مزن نام بودے نہ زن

یہ نشیب و فراز جو ذہن میں آیا، جلی کٹی باتیں ہونے لگی، کج بحثی صحبت کا لطف کھونے لگی۔ وہ سبز پوش خانہ بدوش، موقع شناس، مزاجداں، دلسوز، ادب آموز، بے زبان، بلبلِ ہزار داستان، دل کا حال جانتا تھا۔ اڑتی چڑیا پہچانتا تھا، سمجھا جانِ عالم کی طبیعت کبیدہ ہوئی، قریب وہ وقت آیا چاہتا ہے کہ ایسی گفتگو آغاز ہو، جس کا انجام یہ صحبت درہم برہم کرے، بات کو کاٹ طبیعت کو اچاٹ کہنے لگا "شہزادہ عالم! نشہ اس کیفیت سے حرام ہے کہ اس کی ترقی میں عقل کو تنزل ہوتا ہے، خیالِ لاطائل آتے ہیں، احسان بھول جاتے ہیں۔ فقط گمانِ بے جا اور خیال وہ بھی نشے کے حال کا، اس پر حقِ خدمت سہو کرنا، روکھی صورت بنانا، فوراً بگڑ جانا، آدمیت سے بعید ہے۔ ایک ساعت ادھر مخاطب ہو جیے، اس مدت مفارقت میں بہت سانحے دیکھے، افسانے اپنے بیگانے کے سنے، اگر بہ گوشِ ہوش انھیں سنیے تو یہ تخیلاتِ فاسد دور ہوں۔"

جانِ عالم نے کہا "ایسی بات اس وقت واجبات سے ہے جلد کہہ۔"

توتے کا بیان کرنا قصہ شاہ قوم بنی اسرائیل

قاضی کا بھاوج پر فریفتہ ہونا، دین و ایمان کھونا، پھر سنگسار کرنا، عورت کی بادیہ گردی پھر اسی شہر میں آنا

توتے نے کہا "جناب امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک بادشاہ تھا متدین نیک طینت، باصفا، سخی و شجاع، عابد پارسا۔ اس کے عہدِ دولت میں دو بھائی تھے۔ ایک تو شہر کا قاضی، دوسرا مفتی، بظاہر مردِ مسلمان، صاحبِ ایمان، مفتی کی بی بی، نہایت شکیلہ، بہت جمیلہ تھی۔ اتفاقاً عندالضرورت مفتی کو بادشاہ نے کہیں دو چار منزل بھیجا۔ وہ اپنی عورت دمِ رخصت، بھائی کو سونپ گیا۔ قاضی گاہ گاہ خبر کو اُس عورت کے پاس جاتا تھا۔ پردہ اسی واسطے خوب ہوتا ہے، جتنا دنیا کا قصہ بکھیڑا ہے، اب آنکھوں سے دیکھا سنا ہے، وہ تو بدرجہ حسین تھی، قاضی کی آنکھ پڑی، فریفتہ ہوا۔ چند روز میں ولولۂ طبیعت حد سے فزوں، قریب جنوں ہوا۔ مگر وہ عورت جیسی خوبصورت تھی، اس سے زیادہ عصمت و عفّت رکھتی تھی۔ ایسا حسن حسنِ اتفاق سے ہوتا ہے۔ قاضی نے ایک روز اس سے سوالِ وصال کیا۔ اس نے اس امرِ بد سے از حد انکار کر، خوشامد کا کچھ نہ خیال کیا۔ قاضی سمجھا یہ راضی نہ ہوئی اور نہ ہو گی۔ خفّت میں دو اندیشے ہوئے۔ ایک تو محرومیِ وصال، دوسرے افشائے راز کا خیال، گھبرا کر بادشاہ سے عرض کی کہ "دمِ رخصت میرا بھائی، اپنی جورو مجھے سونپ گیا تھا، اس فاحشہ نے اس کی غیبت میں زنا کیا۔ مجھے ثبوت کامل ہوا۔"

بادشاہ نے مردِ متشرع سمجھ صاحبِ زہد و ورع جان کر اختیار دیا۔ قاضی نے اس کو

تنہا لے جاکر سمجھایا کہ "اب تک خیر ہے، مجھ سے راضی ہو، نہیں تو بڑا شر ہوگا، تیرا ضرر ہوگا۔ دل پر جبر اختیار کروں گا، تجھے سنگسار کروں گا۔"

وہ عورت شیر صفت اس کی گیدڑ بھبکی سے نہ ڈری۔ مرگ پر راضی ہوئی۔ اس کمبخت شہوت پرست نے شہر کے باہر لے جا اس کو سنگسار کیا، خلق خدا عبرت کناں خائف و لرزاں اپنے اپنے گھر پھری، وہاں حافظِ حقیقی نے شیشۂ حیات اُس نیک صفات کا سنگِ ستم قاضی سے بچا لیا، ٹھیس نہ لگی۔ خواہش بے جا میں ایسا ہی ہو جاتا ہے۔ عقل پر پتھر پڑ جاتے ہیں۔ شب کو عورت پتھر سرکا، ایک سمت پیادہ پا روانہ ہوئی۔ جنگل میں ایک ویرانی تھی، مردِ خدا پرست بستی کو چھوڑ اہل دنیا سے منھ موڑ، دشت بسایا تھا۔ یہ جب وہاں پہونچی اس حق پرست نے اس کی غریب الوطنی پر رحم کھایا۔ لڑکا اس کا خورد سال تھا، اس کی خبر گیری کو اپنے پاس رکھا۔ اس ویرانی کا ایک غلام سخت نطفۂ حرام تھا، بد ذات گیدی۔ مثل مشہور ہے۔ لَاخَیْرَ فِی عَبِیدِیْ۔ زندگی جوان دیکھ کر عاشق ہوا۔ بہت چاپلوسی کی، وہ ڈھب پر نہ چڑھی، اس شقی نے ویرانی کا لڑکا ذبح کر، تہمت اس عورت پر کی، اولاد کی محبت مشہور ہے، امیر ہو یا فقیر اس میں مجبور ہے۔ ویرانی کو بہ شدت رنج ہوا، لیکن وہ صابر و شاکر تھا، عورت سے کچھ نہ کہا مگر کہ رَضِیْنَا بِالْقَضَا۔ اور بیس دینار دے کر رخصت کیا۔

وہ بے چاری مصیبت کی ماری، پھر چل نکلی، ایک شہر میں وارد ہوئی، بازار میں بھیڑ دیکھی۔ شور و غل برپا اور ایک شخص کو زنجیر و طوق میں پھنسا کشاں کشاں لوگ لئے جاتے تھے۔

عورت نے پوچھا "اس سے کون سا جرم قبیح سرزد ہوا، جو ایسی آفت میں مبتلا کیا۔"

لوگوں نے کہا "یہ بیس دینار کا قرضدار ہے، ادا کی طاقت نہیں، اس کے بدلے یہاں کے سردار نے دار کا حکم دیا ہے۔"

عورت کو رحم آیا، وہی ویرانی کے دینار دے کر قید سے چھڑا دیا۔ وہ مکار بد باطن عیار تھا، رنڈی جو خوبصورت دیکھی، جی بھر بھر آیا کہا "تو تو میری محسنہ ہے، میں تیرے ہمراہ رہونگا، خدمت گذاری کروں گا۔" اس حیلے سے ساتھ ہوا، کچھ دور شہر سے نکل تھی، راہ میں دریا ملا، یہ مدت سے نہائی نہ تھی۔ کپڑے بھی کثیف ہو گئے تھے۔ ایک طرف لباس دھو کر نہا رہی تھی، ناگہاں ایک سمت سے دو جہاز وہاں آئے، اہل جہاز نے دیکھا، عورت قمر طلعت ہے اسی حرام زادے سے پوچھا "یہ کون ہے؟"

اس نے اپنی لونڈی بتایا۔ مول تول درمیان آیا۔ غرضکہ مبالغِ خطیر پہ بیچ کر کسی بہانے سے جہاز پہ چڑھا دیا۔ روپیہ لے کر چل نکلا۔ وہ دو سوداگر تھے، دونوں اس پر مائل ہوئے۔ قصے فساد حائل ہوئے۔ پھر یہ صلاح ٹھہری کہ بالفعل مال کے جہاز پہ یہ رہے۔ جب اسباب بک چکے اس وقت عورت جسے قبول کرے وہ لے جھگڑا مٹایا۔ اسے مال کے جہاز پہ بٹھایا۔ ایک روز آندھی چلی، طوفان آیا۔ جس جہاز پہ سوداگر تھے وہ تو ڈوب گیا۔ مال کا جہاز اور یہ جانباز سلامت رہی۔

چند عرصے میں جہاز اس شہر میں آیا۔ جہاں سے یہ سنگسار ہو کر نکلی تھی، دو کلمہ یہ سنو، جس شخص نے اس کو بیچا تھا، کسی تقریب سے وہ یہاں کے بادشاہ کا بخشی ہوا اور دیوانی کا غلام، بہ مدد ایام پایۂ وزارت پا گیا اور مفتی صاحب سفر سے پھر کر مفت جورو کے الم میں مبتلا تھے۔ جس دن جہاز اِس شہر میں پہونچا، وہاں کے پیمبر کو حکمِ الٰہی آیا کہ "ہمارا ایک خاص بندہ جہاز پہ آیا ہے۔ یہاں کا بادشاہ، وزیر، بخشی و قاضی و مفتی کو لے کر اُس کے پاس جائے اور اس سال میں جو جو گناہ اُن سب سے عمداً اور سہواً سرزد ہوئے ہیں، اس کے رو برو بیان کریں۔ جو وہ خطا معاف کرے تو ہم بھی درگزریں۔ وگرنہ بلائے آسمانی، آفتِ ناگہانی، اس زمین پر نازل کروں گا۔"

پیمبر نے بادشاہ سے کہا وہ سب کو ساتھ لے کر جہاز پر آیا۔ عورت پردہ چھوڑ کر آ بیٹھی، تقریر شروع ہوئی۔ پہلے بادشاہ نے کہا: "میں سیہ کار از سرتا پا گناہ گار، معصیت کا مبتلا ہوں، مگر یہ خدشہ تازہ ہوا ہے کہ قاضی کے کہنے سے مفتی کی جورو کو بے تحقیقات رجم کا حکم دیا ہے۔

عورت بولی "غفر اللہ لک یعنی بخشے خدا تجھے۔"

پھر مفتی نے کہا "مجھے جورو کی طرف سے گمانِ بد ہے۔"

اس نے کہا "تو ابھی چپ رہ بیٹھ جا۔"

پھر قاضی نے بیان کیا۔ "مجھ سے بدولتِ نفسِ امارہ، یہ حرکت ناکارہ ہوئی کہ بے جرم و خطا ایک بیگناہ کو سنگسار کیا۔"

اس نے کہا "اللہ تیری مغفرت کرے۔"

بعد اسکے وزیر وہ دیوانی کا غلام آیا، ندامت سے سر جھکایا، پھر کہا "بندے سے تحریکِ شیطان اور جوشِ شہوت جرمِ قبیح ہوا کہ آقا کا لڑکا مار کر صاحبِ عصمت کا قصور ٹھہرایا۔"

وہ بولی "غفور و رحیم تجھ پر رحم کرے۔"

جب بخشی آیا، وہ بیچنے کا ماجرا زبان پر لایا۔ عورت نے کہا "تو محسن کش ہے، خدا مجھے نہ بخشے گا۔"

الغرض بخشی کی جان بخشی نہ ہوئی۔ پھر وہ پردہ اٹھا، باہر آئی۔ مفتی سے کہا "تو نے مجھے پہچانا، یہ سب قصہ میری عفّت کا ہے، آج تک خدا کی حفظ و عنایت سے عزت و آبرو بچی، اب خلع کی امیدوار ہوں۔ یہ مال و متاع اپنے صرف میں لا، میں تنہا گوشۂ عزلت میں عبادت کروں، اسی شغل میں مروں۔"

یہ ماجرا دیکھ کر حاضرینِ صحبت، ناظرین جلسہ تھرائے۔ بادشاہ سلامت منفعل گھبرائے، وہ عورت تو حجرہ بنا، طاعت یزداں میں مشغول ہوئی، دولت کونین حصول ہوئی۔

توتا یہ قصہ تمام کرکے بولا "جانِ عالم جو ثابت قدم ہیں، ان کا ہر وقت اللہ یار ہے، ہر بحر بے کنار سے ان کا بیڑا پار ہے۔ فرد

نہ ہر زن زنست و نہ ہر مرد مرد　　　خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد

یہ نقل سن کر شہزادے کا نشہ ہرن ہوا، دونوں کی مشقت اور اپنا اٹھائی خانہ ویرانی یاد آئی، خوفِ خدا سے مثل بید کانپا، ندامت سے عذر کیا، کہ حالت نشہ میں جھک مارا، قصور ہوا، پھر ہنسی خوشی وہاں سے کوچ ہوا۔

یہ خاتمہ داستان ہے

اور وطن پہنچنا، شہزادہ جانعالم کا زیارت والدین اور نوک جھونک ماہ طلعت کی توتے سے، ملکہ اور انجمن آرا کا دل بہلانا، پھر وزیرزادے کا قتل، سلطنت ترک کرنا فیروز بخت کا

چل اے توسنِ خامہ منزل رساں | کہ اب گھر پہونچتا ہے یہ کارواں
پھرا گھر کو شہزادۂ خوش سیر | جھمکڑے کا عالم بہت کرّوفر
وہ اس طرح پہنچا وطن کی طرف | بہار آئے جیسے چمن کی طرف
بڑی فکر رہتی تھی ہر صبح و شام | ہوئی فضلِ حق سے کہانی تمام
وہ بچھڑے تو سب ہو گئے ایک جا | ہوئے اپنے مطلب سے ہم جُدا
رہی شرح جورِ فلک ناتمام | سرورِ حزیں توسنِ خامہ تھام

غرضکہ شہزادۂ جانعالم، منزل بمنزل، مسافت طے کر، مع الخیر وطن پہونچا، دو کوس شہر سے باہر خیمہ برپا ہوا۔ لشکر ظفر پیکر اترا۔ یہ خبر فسحت آباد میں گھر گھر مشتہر ہوئی کہ کوئی غنیم، فوجِ عظیم لے کر وارد ہوا ہے، دیکھئے ہوتا کیا ہے۔ شہر کا یہ نقشہ تھا، جس روز سے جانعالم مفقود الخبر دربدر ہوا تھا، ویران پڑا تھا اور بادشاہ گریبان چاک سر پہ خاک، نہ تخت کی خبر، نہ سلطنت سے سروکار، نہ ملک سے مطلب، نہ دربار سے غرض، دیوانہ وار بادل بیقرار، محل میں پڑا رہتا تھا اور شاہزادے کی ماں بھی غمگین، اندوہناک، بے چین، دن رات غم کی حکایت، اندوہ کے بین، نصیب کی شکایت،

لب پر شورشین، خلشِ نشترِ غم سے کوئی ساعت قرار نہ پاتی تھی۔ ہر وقت بلبلاتی تھی۔ یہاں تک دوریِ دلبند مہجوریِ فرزند میں دونوں روئے تھے کہ آنکھیں ان عزیزوں کی یوسف گم گشتہ کے فراق میں، دید کے اشتیاق میں ہم چشم دیدۂ یعقوب علیہ السلام ہو گئی تھیں۔ بحکم آیہ وافی ہدایۃ۔ وَابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيمٌ۔ اور سچ ہے فراقِ نورِ چشم میں نورِ چشم کب رہتا ہے، رات دن آنکھوں میں یکساں، ہر وقت سراسیمہ و پریشان، مگر ارکانِ سلطنت، نمک خوارِ قدیم، کوشش عظیم سے در پردہ ریاست کا نام سنبھالے تھے۔

جب ورودِ لشکر بایں کر و فر سنا، وزیر اعظم جان عالم کے پاس آیا۔ بسکہ شہزادہ با امتیاز کی مفارقت کو عرصہ دراز ہوا تھا، اس کے سوا وہ سامانِ جاہ و حشم، لشکر کا چم و خم، فوج ہزار در ہزار، انبوہ بیشمار، خزانہ لاانتہا دیکھ کر وزیر گھبرایا۔ اپنے شہزادے کا وہم و گمان نہ آیا، دست بستہ عرض کی۔ "قبلہ عالم! گردشِ طالع واژوں، نیرنگی گردونِ دوں سے وارثِ تختِ سلطنت یہاں کا دفعتہً گم ہو گیا۔ بادشاہ آسمان جاہ، ہمارا مصیبت کا مارا، جگر گوشے کی مفارقت میں دامانِ صبر و گریبانِ شکیب پارہ پارہ کر کے، نورِ نظر بھی، اس اپنے قرۃ العین طاقتِ بصر کے ہجر میں گریہ کی نذر کر چکا ہے۔ ہنوز اس عین الکمال کے قدم کی خاک، سرمۂ چشم مشتاقاں، کحل الجواہر دیدۂ منتظراں نہیں ہوئی۔ بعد سلام حضور کو یہ پیام دیا ہے کہ اگر خواہشِ تخت یا تمنائے تاج منظورِ خاطر ہے۔ بسم اللہ کل نہیں، آج حاضر ہے، مگر سامانِ جنگ و جدال، گرم بازاری عرصۂ قتال، خونریزی بندہ ہائے خدا، ناحق ناروا ہے۔ مجھے تختِ سلطنت تختہ تابوت سے بدتر ہے۔ الاّ معاملہ قضا و قدر سے مجبور، فرد بشر ہے۔ ہر چند جینے سے سخت جی بیزار ہے، لیکن مرجانے کا کسے اختیار ہے!" شعر ؎

مرنے کو میں تو راضی ہوں موت کو موت آ گئی
زندگی اب گلے پڑی اس کی میں کیا دوا کروں

شرحِ سخت جانی، موجب پریشانی، گوش حق نیوش، جان کر طول کو مختصر کیا، جان عالم نے یہ سن کر رو دیا۔ وزیر کو گلے سے لگایا۔ خلعتِ فاخرہ عنایت کیا، پھر کہا "افسوس! تم نے گود کے پالے، عرصہ قلیل میں بھلا ڈالے۔ بعد آداب و کورنش عرض کرنا، کہ بدولت کششِ الفتِ پدری و تاثیر دعائے سحری سے خانہ زاد بامراد، زندہ و سالم، شرفِ آستان بوس سے مشرف ہوا۔"

اس وقت وزیر نے پہچانا، قدموں پر گرا پھر سر اٹھا کر بے اجازت بھاگا اور بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا، پکارا "مبارک ہو۔" استاد ؎

بوئے یوسف سوئے پیغمبر کنعاں آئی

"اے بادشاہ با اقبال والے صاحبِ جاہ و جلال، بہ عنایت جامع المتفرقین، اور بدولت برکت دعائے مہاجرین وہ نیّرِ اوجِ بختیاری کوکبِ درخشندۂ سپہر شہریاری، بافوج و لشکر اور مجمع حوران پری پیکر یہاں آیا اور اس اجڑے نگر کو آباد کیا۔ مشتاقوں کا دلِ الم رسیدہ شاد کیا، شکر صد شکر، نالۂ شبگیر با تاثیر تھا۔"

بادشاہ کو تو مرتبۂ یاس حاصل تھا، وزیر سے یہ کلمہ فرمایا۔ میر تقی ؎

کوئی اور ہوگی وقت سحر ہو جو مستجاب　　　شرمندۂ اثر تو ہماری دعا نہ تھی

وزیر نے مکرّر عرض کی "بسر حضور شب دیجور، ہماری یمن قدم سے اس شمع انجمن افروز سلطانی کی روشن ہوئی۔" اس گفتگو میں وزیر تھا کہ جانعالم تنہا داخل ہوا۔ محل میں محشر کا قیام ہوا۔ رونا پیٹنا مچا، رنڈیوں کا اژدہام ہوا، ماں باپ نے گلے سے لگایا۔ شہزادہ با لرّاس والعین آداب بجا لایا۔

عین عنایت الٰہی دیکھیے، اسی دم دونوں کی آنکھوں میں بینائی آئی، جسم میں تاب و توانائی آئی۔ بادشاہ جلد سوار ہو، بہوؤں سے لشکر میں جا کر دوچار ہوا۔ شہر والوں نے یہ ماجرا سنا۔ صغیر و کبیر، برنا و پیر، دوڑے، دونوں لشکر جلو میں ہمراہ، آگے آگے جہاں پناہ، روپیہ اشرفی دو رویہ تصدق ہوتا، محلسرا میں لا کر آتارا۔

جانعالم کی ماں نے انجمن آرا اور ملکہ مہرنگار کو دیکھا، جان و دل دونوں پر نثار کیا۔ بہت سا پیار کیا، مبارک سلامت کی صدا در و دیوار سے پیدا ہوئی، جس نے دیکھا وہ شیدا ہوئی۔

دوسرے دن ملکہ اور انجمن آرا نے شاہ فیروز بخت سے عرض کی کہ "اگر حضرت کی اجازت ہو تو شہزادے کے محلسرائے قدیم میں ہم جائیں، ماہ طلعت سے ملاقات کر آئیں۔"

بادشاہ نے فرمایا "وہ عورت بدبخت، سخت منہ پھٹ، بڑھ بولی، فضول ہے، اسے شرمندہ کرنے سے کیا حصول ہے۔"

میاں مٹھو بھی حاضر تھے، بول اٹھے "قبلۂ عالم! یگانگت، مقتضئ ملاقات ہے، خفت و ذلّت کی کیا بات ہے۔"

بادشاہ چپ ہوا۔ شہزادیوں نے سواری طلب کی۔ طائرِ پرّاں نے پیش قدمی کر کے، ماہ طلعت کو سلام کیا، اس نے سر جھکا لیا۔ یکا یک سواریاں آ پہونچیں۔ اس وقت وہ خفت کی ماری اٹھی، استقبال کیا۔ دونوں نے گلے سے لگایا۔ مسند پر جا بیٹھیں۔ ملکہ بڑی مقرر خوش بیان تھی۔ انجمن آرا اتنی طرّار کہاں تھی، سلسلہ کلام بہ دلداری تمام کھولا کہ "ہماری جانب اور گمان نہ لانا،

ہم بہر حال شریکِ بشاشت رفیقِ ملال ہیں۔"

توتا انجمن آرا کے سامنے آیا، ماہ طلعت سے کہا "حضرت سلامت! اتنا زبان مبارک سے فرماؤ کہ آج سچا کون ہے، جھوٹے کے منھ میں کیا ہے، اور تو کیا کہوں۔ آپ کی کج بحثی کے باعث جانعالم کے ہاتھ، یہ لوگ مہر جبیں ماہ سیما آئے، گو اتنا جگر ہوا۔ میرے سبب آپ کو ندامت ہوئی۔ جھوٹے کے منھ میں گھی شکر ہوا۔" انجمن آرا تو سیدھی بھولی تھی۔ توتے سے بدمزہ ہوئی فرمایا "دیوانے کیا بیہودہ بکتا ہے۔" پھر ماہ طلعت سے کہا "سنو میری جان! یہ جانور بے شعور عقل سے دور حیوانیت سے مجبور ہے، دنیا کا کارخانہ فسانہ ہے۔ رہا یہ حسن و خوبی عارض وہ عارضی ہے، اس پر کیا اترانا ہے۔ یہ کیفیت یہ جوبن یہ سن چار دن کا ہے، ناپائدار اس کا کیا اعتبار۔ رنگِ چمن دنیا جاوداں نہیں، کون سی بہار ہے جسے خزاں نہیں، حسن پر غرور بے جا ہے۔ سرور یہ کہتا ہے۔ شعر

بہتا دریا ہے یہ حسن اس میں ارے دھولے ہاتھ
بے خبر اتنا ہے کیوں بر سرِ ساحل بیٹھا

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ۔ نظم

نظر پڑا چمنِ دہر میں جو ہم کو مکاں
ہزار خار ہوئے دیکھی بلبلِ نالاں
ہمارے زعم میں اس سا نہیں کوئی ناداں
جو اپنے حسنِ دو روزہ پہ کچھ ہوا نازاں
شکستہ رنگیِ گل شاہدِ چمن ہے یہاں
کہ اس بہار کا انجام آخرش ہے خزاں
گھمنڈ اس پہ حماقت کی بس نشانی ہے
مقامِ عبرت و حسرت سرائے فانی ہے

آخرکار دونوں نے ماہ طلعت کو شیریں زبانی اور اپنی خوش بیانی سے شگفتہ خاطر کیا۔ دو چار گھڑی ہنسی خوشی اختلاط رہا، مگر توتا نوک جھونک چھیڑ چھاڑ کئے گیا۔ پھر رخصت ہوئیں، اس نے حاضر ہونے کا وعدہ کیا۔ واقعی جنھیں اللہ حسنِ بے مثال مرتبۂ جاہ و جلال دیتا ہے ان لوگوں کا دل صفا، منزلِ غبارِ کلفت اور عجب و نخوت سے صاف، اور مرآتِ سینہ زنگِ حسد و کینہ سے شفاف ہوتا ہے۔

القصہ باہم بے رنج و الم رہنے لگے۔ سب شاد ہر روز خنداں و خرم و فرحاں بسر کرنے لگے۔ نئے سرے سے وہ اجڑا شہر بسا۔ بنائے ظلم و ستم منہدم ہوئی۔ مروج عدل و داد ہوا۔ دونا سابق سے حال میں آباد ہوا۔ خزاں چمن سے دور ہوئی، بلبلِ نالاں مسرور ہوئی۔

ایک روز جانعالم نے تمام خلقت کو درِ شہر پناہ پر طلب کر کے وہ بکری کا بچہ دکھا، نمک حرامیاں، اس کی سنا، جلاد سے حکم کیا۔ "اس کے اعضا اعضا سے جدا بے دست و پا کر زاغ و زغن کو گوشت کی بوٹیاں اڑا کر کھلا دو، شکاری کتوں کو لہو بہا کر چٹا دو۔"

بمجرّد ارشاد سرائس بدنہاد کا تیغ جلّاد سے جدا ہوگیا۔ خلق خدا یہ حال دیکھ ماجرا اس کے تھرا گئی۔ سب نے اس بے دین پر لعنت و نفریں کی۔ جانعالم نے دولت سرا کی راہ لی۔ اسی روز فیروز شاہ نے تاج و تخت بیٹے کو حوالے کیا، خود گوشۂ تنہائی لیا، بادشاہ، شب اپنی عبادت اور بیداری میں سحر کرتا تھا۔ وہ تو قائم اللیل صائم النہار مشہور ہوا۔ جانعالم ہر روز تخت پر جلوہ افروز ہو، عدل کی داد دے۔ شب کو پری پیکروں میں بسر کرتا تھا۔ یہ عادل و سخی و رحیم و شجاع یکتائے روزگار مشہور ہوا، ذکر دونوں کا تا قیام قیامت صفحہ روزگار، ورق لیل و نہار پر اور بر زبان یگانہ و بیگانہ رہا۔ بات باقی رہ گئی نہیں تو دورِ دوراں میں کس کا دور رہا، کس کا زمانہ رہا۔ جس طرح جانعالم کے مطلب ملے، اسی طرح کل عالم کی مراد اور تمنائے دلی اللہ دے۔ علی الخصوص سامعین ناظرین راقم و مولف کی خواہش و آرزو بہ تصدقِ رسولِ عربی بر آئے بحُرمتِ النبی وَ آلہِ الامجاد بالنّون وَ الصّاد و بابابِ ظاہر یہ فسانہ نادرِ زمانہ، مضمون چکیدۂ دل و تحریر خامہ ہے۔ اگر دیدۂ غور و نظرِ تامل سے ملاحظہ کرو تو حقیقت میں کارنامہ ہے، فقط جس دم نظر فیض اثر سے جناب قبلہ و کعبہ مخدوم و مکرم آغا نوازش حسین خاں صاحب، عرف مرزا خانی صاحب کے یہ گذرا، بعد اصلاح شاگرد نوازی فرما قطعۂ تاریخ سے زینت بخشی۔ قطعہ اُستاد ؎

برائے خاطر یاران و احباب	سرور ایں قصہ را چوں کرد ایجاد
بجُستم سال تاریخش نوازش	فلک ایں گلستانِ بے خزاں داد ۱۲۴۰ھ

ایک دوست بندے کے زمانے کے تعلق سے مثلِ سرو آزاد لالہ درگا پرشاد تھے۔ ہنر ہیں عیب پوش تخلص مدہوش، خم محبت سے مئے الفت جوش میں آئی تاریخِ مستانہ زیب فسانہ فرمائی۔

مدہوش

کہا فسانہ جو یہ عجائب سرورِ دل خستہ و حزیں نے	کہ جس کی تاثیر سے بیاں کے، ہر ایک دل بیقرار دیکھا
جہاں یہ کچھ گل کی گفتگو ہے وہاں پہ کچھ اور رنگ بو ہے	جہاں خزاں کی خلش ہے اس میں وہاں نیا کیا نہ خار دیکھا
جہاں کیا غم نے ہے جگر خوں نظر پڑا واں شفق کا عالم	کہیں جو ہے داغ دل کا پھولا تو اس جگہ لالہ زار دیکھا
کہیں جو چشمے کا ماجرا ہے دکھائی وہ آب و تاب اس نے	کہ چشمہ چشم سے ہر اک کے رواں ہوا چشمہ سار دیکھا
کہیں جو دریا کا ذکر آیا تو کشتی دل ہے نذرِ طوفاں	جو کوہ نے سر کہیں اٹھایا تو جان کو سنگسار دیکھا
ہوا ہے جس جس جگہ یہ اس میں بیان سحر و طلسم و جادو	تو قدرت حق سے اس مکاں پہ نئی طرح کا حصار دیکھا
جو قید میں دیو کی پھنسا ہے کسی جگہ پہ کوئی پری زاد	تو کیا نہ سامان چھوٹنے کا وہاں پہ بر روئے کار دیکھا

کسی جگہ یہ جو جوگ آسن کا جوگیوں کے بیاں ہے اس میں
تو خوب چھانا پر اس جگہ کچھ نہ غیر مشتِ غبار دیکھا

کہیں جو آمد کی یار کے کچھ خبر کا چرچا کیا ہے اس نے
تو دیدۂ ہر اہلِ دید کا واں پہ وقفِ صد انتظار دیکھا

جو وصل کی شب کا کچھ بیاں ہے تو جمع ہے خاطرِ پریشاں
جو روزِ ہجراں کا غم لکھا ہے تو دل کو کیا انتشار دیکھا

جو بزم کا کچھ بیاں کیا ہے تو کوئی مجلس نہ دیکھی ایسی
جہاں پہ کچھ رزم کا بیاں ہے ہر اک اسفندیار دیکھا

کہیں کھنچی ہے جو تیغِ ابرو تو ہو گئے دل کے ٹکڑے ٹکڑے
کہیں جو تیرِ نگاہ چھوٹا تو صاف سینے کے پار دیکھا

خرابی حال عاشق ایسی کہ جس پہ رونا فلک کو آئے
کہیں یہ معشوق کی ہے خوبی کہ ملک تک زرنگار دیکھا

نہ پوچھو حال اس فسانے کا تم کہ ڈھنگ کیا کیا بھرے ہیں اس میں
جو حسن دیکھا تو زور دیکھا، جو عشق دیکھا تو زار دیکھا

ہوئی جو مدہوش کو یہ خواہش کہ سال تاریخ اس کا لکھئے
تو کھینچ کر آہ دل سے نکلا، خزاں سے رنگ بہار دیکھا
۱۲۴۰ھ

تاریخ از مصنف

جس نے کہ سنا اس کو جی میں یہ لگا کہنے
یارب یہ فسانہ ہے یا سحر ہے بابل کا

تاریخ سرور اس کی منظور ہوئی جس دم
بے ساختہ جی بولا، نشتر ہے رگِ دل کا
۱۲۴۰ھ

تاریخ نسخہ ہذا از منظور علی فاروقی تمنا بجنوری

سعیٔ مرغوب

۱۳۸۸ھ

کہ از طبع لبیط مشفقی و محبی جناب اطہر پرویز صاحب

۱۳۸۸ھ

صاحبِ قال لیکچرار اردو مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

۱۹۶۸ء

باسلسلۂ مربوط تدوین نو نسخۂ فسانۂ عجائب

۱۹۶۸ء

باحسنِ فہیم بلیغ نمود

۱۳۸۸ھ

و در اہل عالم مقبول زمانہ گشت

۱۳۸۸ھ

گلبن فروغ

۱۳۸۸ھ

از فکرِ بلیغ و جہدِ موزوں پرویز بصد خلوصِ یکسر

تدوینِ فسانۂ عجائب واللہ چہ کرد گوہرے سفت

از ہاتفِ غیب ہم تمنا پرسید چو سالِ طبعش

جذباتِ فسانۂ عجائب، در رنگ علو - بداں گفت

۱۳۸۸ — ۵۸۰ — ۵۷

۱۹۶۸ء

۲۰۲۵ بکرمی — از فکر حقیر تمنا بجنوری

۱۳۸۸ھ

(اس عبارت پر کوئی عنوان نہیں ہے۔ فسانۂ عجائب کا جو ایڈیشن مطبع مصطفائی لکھنؤ میں محرم ۱۲۶۲ھ میں چھپا اس میں سرور کی کہی ہوئی تاریخ کے بعد مندرجہ ذیل عبارت شروع ہوتی ہے جو بعد کے ایڈیشن میں نہیں ہے)

برسوں یہ فسانہ کساد بازاریٔ زمانہ سے تہہ رہا، مشہور نہ ہوا۔ تیسری ربیع الثانی بارہ سے ترپن ہجری کو نصیر الدین حیدر داخلِ فردوس بریں ہوئے اور محمد علی شاہ بادشاہ بعد ہنگامے مناجان کے تخت نشین ہوئے۔ زمانے کا رنگ بدلا، ہر شخص برہر حساب ہوا، مسدود فتنہ و فساد کا باب ہوا۔ اہلِ کمال مالا مال ہوئے۔ غریب و غربا نہال ہوئے۔ بعد انتقال منتظم الدولہ مہدی علی خاں نویں شوال سنہ مذکور ظہیر الدولہ غلام یحییٰ خاں کو نیابت ہوئی۔ فلک نے رشک کھایا۔ حافظِ حقیقی نے چشم بد کے گزند سے نہ بچایا، پیمانۂ بقا بادۂ اجل سے لبریز ہو کر چھلکا، چھبیسویں ذی الحجہ کو دل کی تمنا دل میں رہی، نہ کسی کی سُنی نہ اپنی کہی۔ پھر اس عہدہ سے منور الدولہ احمد علی خاں سرفراز ہوئے۔ بادشاہ کے نزدیک ممتاز ہوئے لیکن یہ خدمت نبھ نہ سکی۔ نیابت سُست رہی۔ آخر کو حق بمرکز قرار گرفت اور شرف الدولہ بہادر کو یہ عہدہ ملا۔ پھر تو نیابت یہ چمکی کہ دیکھی نہ سُنی۔ یحییٰ برمکی کا نام احیا ہوا۔ آصف برخیا دوسرا ہوا۔ اگر کلکِ قدرت دفتر روزگار پر صفت اس کی رقم کرے، نہ ہو سکے۔ بشر کی کیا مجال ہے۔ بہت محال ہے۔ شرف پا بہ وزارت افتخار مسندِ حکومت و امارت ہزبر معرکہ شجاعت ابر گہر بار میدانِ سخاوت دبیر عطارد جاہ وزیر عالم پناہ ماہ کنعاں مہر تاباں، ہمت نے اس کی خوان خلیل صفحہ دوراں پر بچھایا۔ حاتم طائی کو سب کے دل سے بھلایا۔ حوصلۂ طلب اُس کی بخشش کے روبرو کوتاہ ہے۔ کوہ زر بدتر از پرکاہ ہے۔ مطلب سائل ہنوز دل سے زبان پر آنے نہ پایا کہ مدعا بر آیا۔ ادھر محتاج نے لب سوال کھولے، ادھر دامن میں موتی رولے۔ چارہ ساز درماندگان ہے۔ خلق خدا کا حافظ و نگہبان ہے۔ پری شمائل

فرشتۂ خصائل انسان ہے۔ قدرتِ ربِّ دوجہاں ہے، دمِ جود و سخا دست گہربار رشحۂ ابرِ بہار ہے۔ یہ ناموَرِ زمانہ یادگار ہے۔ چرخ مطیع فرمان ہے۔ اس کے دور میں دست بستہ دورۂ دوراں ہے۔ عنایت پروردگار شامل ہے۔ از سرتاپا صاحبِ جمال ہے، حسنِ خداداد کامل ہے۔ کاسۂ سر جس کا ہمسر نہیں، حکمت و عقل سے معمور ہے۔ دماغ میں شوکتِ فرمانروائی ہوائے خیرخواہی شاہی[1] بلند مرتبہ عالی، عجب و نخوت سے خالی، فہم و فراست کا وفور ہے۔ سر میں سِرِّ الٰہی ہے، اس بھید سے کسے آگاہی ہے۔ اللہ نے اپنی رحمت کو مجسم کرکے بھیجا ہے داد رسی سے پریشان نہیں ہوتا، رستم کا دِل اسفندیار کا سا کلیجہ ہے۔ جبینِ انوار[2] مطلع نور ہے۔ حاسد نے چیں[3] مانی ہے۔ مشہور ہے بلند و کشادہ پیشانی ہے، سخاوت کی دلیل، فیاضی کی نشانی ہے۔ مہ نو خم ابرو ہے، سنبلین گیسو ہے، مژہ آبدار ہے سینۂ عدو کے پار ہے۔ یہ چشم وہ کہ جس کا ہم چشم عنقا ہے۔ غزال رعنا بچارہ ہے شرم و حیا کا اس میں سرور ہے، رحمت کا اثر ہے۔ عیب پوشی عالم کی مدنظر ہے۔ ہوا خواہوں کے دل اس آنکھ کے ندیدے ہیں۔ عین الکمالی میں جریدے ہیں۔ الفِ بینی خطِ راست ہے، شمیم صفت بھری ہے۔ خود بینی سے بری ہے۔ عارض تاباں کی ضیا سے مہر سوزاں ہے، ماہ کو فروغ نہیں، سخن راست ہے، دروغ نہیں۔ گوشِ حق نیوش صدائے دردمندان پروا ہے۔ فریاد غربا دل کے کانوں سے سنتا ہے۔ صفت اُن کی امکان بشر سے دور ہے۔ پری کان پکڑتی ہے۔ حلقہ بگوش حور ہے۔ لبوں میں مسیحائی، زبان شیریں بیان میں عقدہ کشائی ہے۔ دہن والا چشمہ حیوان سے میٹھا۔ ہاتھ شجر سرسبز جود و عطا کی شاخہائے پرگل و بار ہیں یا لکۂ ابر گہربار ہیں۔ خزانے دے ڈالے ہیں۔ پھر دستِ طیار ہیں۔ کیا کہوں صفتیں کیا کیا رکھتے ہیں، بخشش میں کفِ دست یدِ بیضا رکھتے ہیں۔ سینۂ بے کینہ گنجینۂ علم و حلم معدنِ اسرار اللہ ہے۔ دل صفا منزل کو منظور رضائے خدا مقصود خرسندی پادشاہ ہے۔ رشک و حسد سے پاک و صاف ہے، آئینہ حلب میں

---

[1] [فرمانروائی کے وزن پر شاہی کے بجائے شائی] نیر
[2] بظاہر کتابت کی غلطی ہے انور ہونا چاہیے۔
[3] ۔ چیں ماننا یا چیں بولنا اظہار عجز اور اعتراف شکست کے لئے آتا ہے۔ نیر

زنگ ہے۔ یہ شفاف ہے، مراتِ جہاں نما ہے۔ بربِ کعبہ خانۂ خدا ہے، حلقہ کر کے روبرو کمربستہ چرخِ اخضر ہے۔ کمترین چاکر ہے۔ پاؤں جوانمردی و ثابت قدمی کے ستون ہیں۔ گردن کشانِ دہر زیرِ قدم سرنگوں ہیں، پشتِ پا پر خلق کی پیشانی ہے، انھیں قدموں کی بدولت آبرو ہاتھ آتی ہے۔ طالع یاور بیدار، بختِ رسا مددگار ہے۔ فلک محکوم قضا و قدر فرماں بردار ہے، خلق و مروت، جرات و ہمت، شجاعت و سخاوت، حسن و صورت، شوکت و ہیبت از سر تا پا قدرتِ خدا ہے۔ اگر دیدۂ و دل بینا، و عقل رسا ہو تو دیکھے اور سمجھے کہ کیا ہے، رفیق جان نثار عزیز[1]، عزیز از جان جانتے ہیں۔ جانفشانی اور اطاعت کو جزوِ ایمان جانتے ہیں۔ رعبِ عدل یہ ہے کہ کبوتر کی ایذا سے باز باز ہے بلکہ سرگرم غمزہ و ناز ہے اور بعض بعض جا دیکھا ہے کہ کبوتر کا بچہ جانبازی کرتا ہے، آشیانۂ شاہین میں بازی کرتا ہے۔ جب چمن میں بے وقت طاؤس جھنکارتا ہے تو تنبیہاً سانپ کفچہ مارتا ہے۔ یہ رواج لطف و کرم ہے کہ پنجۂ گرگ دریدہ دہن شانۂ موئے بزِ غنم[2] ہے اور معدلت کا ایسا رنگ و ڈھنگ ہے کہ سینۂ پلنگ خونخوار بچۂ آہو کا پلنگ ہے۔ آفتاب اگر نگاہِ گرم سے عارضِ گلِ تر کو دیکھے تو خط شعاع بسان نشتر خار سینہ فگار کرے۔ پر پروانہ اگر دھوکے میں شعلۂ شمع سے جل جائے تو سرِ محفل وہ بھی روتے روتے پگھل جائے۔ دزدیدہ نگاہیوں پہ معشوق ایسے گنہگار ہیں کہ سلسلۂ زیب و زینت میں ہر دم گرفتار ہیں۔ ایسا سخی مزاج ہے کہ احتیاج لوگوں کی محتاج ہے اور بخشش عام اسقدر ہے کہ غنچے کی بھی گرہ میں زر ہے۔ تعریفِ جواہر بخشی کی محال ہے۔ زبان تک اس بیان میں لال ہے۔ کیونکہ نہ حاجت روائے بشر ہو جس کے فیض نظر سے شعلۂ شمع طرۂ زر ہو۔ ناوکِ غضب اگر چھوٹے مریخ کے ہاتھ سے خنجر گر پڑے۔ سپر چرخ ٹوٹے، شمشیر عتاب عدو کو دو کرے۔ ایسا کاٹے بلکہ گاؤ زمین کا لہو چاٹے۔ سوختۂ غضب کا اُس کے کبھی نہ بیڑا پار ہوا۔ اگر سمندر میں گرا فی النار ہوا۔ اور بحر رحمت جب اُبلتا ہے، شجر سوختہ پھولتا پھلتا ہے۔ نخلِ تمنائے خلائق برگ و بار لاتا ہے اس گلشن کا سرو ثمر آبدار لاتا ہے۔ سینۂ سنگ میں شرر لال ہوتا ہے، پہاڑ بھی اس کی عنایت سے مالامال ہوتا ہے۔ روشن

---

۱ عزیز کی تکرار بظاہر کتابت کی غلطی ہے۔

۲ غنم بمعنی بھیڑ یا بکری۔

ہے کہ اس انجمن میں جھاڑ جل کے سرسبز ہوتا ہے، کشتِ کار فیض اس کا بھلا چنا بڑے نہال ہوتا ہے۔ آتشِ مطبخ سے لوگ فیض پاتے ہیں، کلیجہ سینکنے پر جی جلاتے ہیں۔ صفت اسپ صرصر خرام، تیز گام میں کیت خامہ لنگ ہے۔ عرصۂ وسعتِ دنیا زیرِ قدم اس کے تنگ ہے۔ کبھی ہر ایک نور کی ہے، بلکہ پتلی دیدۂ حور کی ہے۔ آنکھوں میں جادی ہے۔ ٹپ پردۂ چشم ہے ہودہ نہیں آنکھ لگادی ہے۔ فیلان پر شکوہ کا وہ جاہ و حشم ہے کہ رفعت فلک ان کے رو برو کم ہے۔ اگر سر اٹھائیں ماتھے آسمان سے رگڑ جائیں۔ سبک رو نجھول[1] ایسے کہ مورانِ ضعیف زیر پا آزار نہ پائیں۔ شمشیر برق وش تیغِ قضا ہے۔ دشمن کا دل ہیبت سے دو نیم ہو رہا ہے۔ خم اس کا ہلال، دم دمِ صور ہے، رنگ الماسی ہے بدخواہ کے لہو کی پیاسی ہے۔ عدو کے جگر میں اس کے زخم کا ناسور ہے، عجائب غرائب کا تحفہ ہے کھتّی سے پیلپے تک اجل کا گھاٹ ہے۔ اللہ تعالیٰ صد دسی سال باجاہ و اقبال فرقِ بندگانِ خاص پر سایہ اُن کا رکھے۔ عدو پامال ہو، ترقی خواہ مالا مال ہو۔

بندہ بھی خوش طالعی سے ملازمت کا شرف اندوز ہوا۔ ہر شب شبِ برات ہوئی، روز نو روز ہوا۔ اس کہانی کی بھی آبرو ہوئی، ہر ایک کو خواہش ہوئی، جستجو ہوئی، نوبت یہاں تک پہنچی کہ لکھی نہ گئی، چھپنے کی صلاح ٹھہری فقط

ص ۱۹۴ تا ۱۹۷

مندرجہ بالا عبارت مطبع مصطفائی لکھنؤ سے منقول ہے جو مجھے ڈاکٹر نیر مسعود نے بھجوائی ہے۔ یہ عبارت آزاد لائبریری کے مخطوطے میں بھی ملتی ہے۔ ڈاکٹر نیر مسعود اپنے ایک خط میں اس کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"اس عبارت کے بعد خاتمۃ الطبع ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ 'اب کی بار' یہ کتاب مطبع مصطفائی لکھنؤ میں محمد مصطفےٰ خاں ولد حاجی محمد روشن خان کے اہتمام اور عبدالغنی کی تصحیح کے ساتھ ۲۱ محرم ۱۲۶۲ھ کو چھپی۔ خاتمۃ الطبع کے بعد شیخ کرامت علی اظہر، میر ناصر علی نصیر، شیخ نواز علی سجاد، عبدالرحمن خان عاصی (ناشر کے بھائی) اور عبداللہ خان قہر (ناشر کے بیٹے) کے لکھے ہوئے قطعات

---

[1] نجھول۔ سبک قدم جس کے چلنے میں جھٹکے نہ پڑیں

تاریخ طبع ہیں۔

بیان لکھنؤ میں میر حسن رضوی اور ان کے مطبع کی جو تعریف ہے اس کو عمومی رنگ دے کر لکھنؤ کے مطبعوں کی تعریف میں بدل دیا گیا ہے اور میر حسن کا نام خارج کر دیا گیا ہے۔

کل صفحات ۱۹۸ کتابت و طباعت کے حسن اور صحت متن کے اعتبار سے یہ ایڈیشن بہت اہم ہے۔ میں نے فسانۂ عجائب کی ایڈیشنوں کی بحث میں اس کا جو تعارف کرایا ہے اُسے بھی دیکھ لیں۔"

نیّر مسعود

فسانۂ عجائب کے چند اہم خاتمۃ الطبع

خاتمۃ الطبع فسانہ عجائب طبع اوّل (مطبوعہ مطبع میر حسن ۱۲۵۹ھ)

للّٰہ الحمد و المنۃ کہ نسخہ قصہ جانعالم شاہزادہ بزبان اردو مسمی بہ فسانہ عجائب از مصنّفات مرزا رجب علی بیگ متخلص بہ سرور کہ بیک واسطہ سلسلہ تلمذ را بجرأت می رسانند در ماہ جمادی الثانی روز شنبہ تاریخ ہشتم ۱۲۵۹ ہجری در عہد دولت مہد امجد علی شاہ بادشاہ خلد اللہ ملکہ و سلطانہ در مطبع حسنی میر حسن رضوی ولد میر حسین عرف میر کامل در بیت السلطنت لکھنو بمحلہ محمود نگر طبع نمود۔ قطعہ تاریخ از شیخ کرامت علی اظہر ؎

این کتاب جانعالم چوں حسن فرمود طبع — معنئ نوراً علیٰ نور از وی آمد در ظہور

خامۂ اظہر پئے تاریخ وقتِ انطباع — زد رقم از طبع باشد جان عالم پُر سرور

۱۲۵۹ھ

•

خاتمۃ الطبع فسانہ عجائب طبع ثانی (مطبوعہ مطبع میر حسن ۱۲۶۲ھ)

للّٰہ الحمد و المنۃ کہ یہ فسانہ رنگیں بصد زیب و تزئین بسانِ قند مکرر پسند خاطر سراپا قصور اعنی سرور کے چھپا اور جناب میر حسن نے بفضل رب ذوالمنن کوئی احتیاط کا دقیقہ اٹھا نہ رکھا اور ابتدا سے انتہا تک نظر موقف سے گذرا۔ نسبت فسانہ سابق اکثر جا راقم نے محل اور موقع جو پایا اس کو بڑھایا ملاحظۂ ناظرین پُر تمکین میں جو آئے گا

یقین ہے کہ لطف دکھائے گا۔ یہ نسخہ اور بزرگواروں نے بھی طبع کیا۔ الاّ بطرز زمانہ کہ ایک حال پر نہیں رہتا کم و بیش ہوگیا، جو فقرہ نہ پڑھا گیا وہ اپنے طور پر گڑھا گیا، اس نشیب و فراز کو امتیاز شرط ہے لہذا بپاس خاطر جناب میر صاحب ممدوح کہ بندے کے محسن ہیں اور صفحۂ دہر پر انتخاب ہیں ہر ایک سے میرا سوال ہے کہ لاجواب ہے۔ اس کی صحت و غلطی میں بہت کدّ ہوئی، کوشش از حد ہوئی اور جو بعض جا سہو بشریت سے ہوا۔ اس کا صحیح نامہ لکھا غرضکہ اس شفائی سے اکبر علی خاں نے لکھا کہ گو خط سات ہیں ہفت قلم کاتبوں کو کہتے ہیں مگر اس کا حسنِ خط نو خطوں سے گوئے سبقت لے گیا، دیکھنے والے حیران رہتے ہیں اگر زنگ حسد طبیعت سے دور ہو تو آنکھ پڑتے ہی دل مسرور ہو۔ ہر سطر زلف مسلسل عنبریں مویاں ہے اور بین السطور سے صفائی عارض مہرویاں جلوہ کناں ہے ہر ایک صفحہ آئینہ حلب ہے صاف باطنوں سے داد طلب ہے ورنہ بمجبوری یہ حرف زبان پر آجائے گا کہ جیسا منھ ہوگا وہی نظر آئے گا گواہ اس فقرے کی مہر فقیر ہے۔ خدا شاہد ہے یہ مطبع بے نظیر ہے۔

[مہر مرزا رجب علی]

خاتمۃ الطبع فسانۂ عجائب مطبوعہ مطبع محمدی کانپور۔ (۱۲۶۷ھ)

یہ مثل زبان زد خاص و عام ہے، محقق کا کلام ہے کہ ع قبول خاطر و لطف سخن خدا داد ست۔ چنانچہ یہ فسانۂ عجائب کئی بار چھپا مگر اب تک لوگ اس کی تلاش میں ہیں نظر آتا نہیں، کوئی پاتا نہیں کس قصے کو اس سے ہمسری ہے اس کی تمنا آج تک قدر دانوں کے سینے میں بھری ہے۔ یہ فقط عنایت پروردگار ہے اس کا رشک و حسد بیکار ہے۔ بالفعل اس کے چھاپنے کا خیال دل صفا منزل میں جناب حاجی حرمین مولوی محمد حسین دام اللہ افضالہم کے آیا بسکہ حاجی صاحب موصوف بہ صفات پسندیدہ معروف ہیں تحریر فقیر اس مقدمے میں بیکار ہے۔ کالشمس نصف النہار عالم میں آشکار ہے جو کتاب اس کارخانے کی ہے انتخاب ہے۔ ہر کار پرداز ہوشیار کار فرما لاجواب ہے جو جو سرگرم کاروبار ہیں نادر روزگار ہیں انھوں نے مولّف فسانہ سے کہ تابع فرماں بہ دل و جان ہے ارشاد کیا، کہ پھر بہ نظر غور ابتدا سے انتہا تک اس کو دیکھ جائے خدشہ رہنے نہ پائے۔ حسب ارشاد اس خجستہ نہاد کے نیازمند قدیم نے کوشش عظیم سے ملاحظہ کر کے جہاں

موقع پایا کچھ اور بڑھایا۔ یقین کامل ہے کہ اب جس کی نظر سے یہ گذر جائے گا تازہ لطف نظر آئے گا۔ اکثر جا دل کو جو لگایا ہے تازہ فقرہ ہاتھ آیا ہے۔ اوقات کو بیکار نہیں کھویا ہے، دُرِ شہوار سلکِ تقریر میں پرو دیا ہے، منصفوں سے داد طلب ہوں کہ کیا کیا خونِ دل پیا، لختِ جگر کھایا ہے جب اس طرح کا مضمون ہاتھ آیا ہے، دو فقرے پسندیدہ لکھنا دشوار ہے۔ یہ تو ایک قصہ طویل بڑا طومار ہے خوشنودی طبع کے بعد امیدوار دعا ہوں کہ اب بر سر منزل آ پہنچا ہوں۔ شائق اس کو جب پڑھیں گے، دنیا میں بڑھیں گے، کم نہ ہوں گے، یہ فسانہ رہ جائے گا۔ بعد چندے گرہم نہ ہوں گے جس تکلف سے اب کی بار چھپا ایسا کبھی نہ تھا جس جس طرح سے یہ مشہور ہوا سرور کو سرور ہوا فقط۔

●

خاتمۃ الطبع فسانہ عجائب مطبوعہ افضل المطابع کانپور (۱۲۷۶ھ)

اگر سوسن بصد زبان حمد سرائے ربِ دوجہاں نہ ہو تو چمنِ دہر میں سرسبزی نہ پائے اور غنچہ بے ہوائے نسیم نعتِ سرورِ کائنات کھل کے گل نہ ہو، مد نظر بلبل نہ ہو اور ایسا جوبن نہ دکھائے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس کے منھ میں زبان ہے اور طلاقتِ لسان ہے فقط فیض حمد خالق جن و بشر ہے ذریعۂ نعت شفیع محشر ہے ورنہ گونگے سے بدتر ہے کون سنتا ہے لاکھ سر دھنتا ہے شمع ایک پاؤں سے کھڑے ہو کے ہر محفل اشہد ان لا الہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ نہ کہے تو سحر تک اس چمک اور روشنی سے زیب محفل ارباب کامل نہ رہے اور اشہد انّ محمد الرسول اللہ کا اقرار نہ ہو تو سرِ مجلس گل طرۂ دستار نہ ہو پروانے کو پروا نہ ہو، پاس نہ جائے پاس بے ثباتی اعتبار نہ پائے۔ لہٰذا ہر شے کی ابتدا اور انتہا جو اس پر نہ ہو تو زیبِ دفتر نہ ہو۔ الحاصل فسانہ عجائب کہ اسم بامسمی اور لاجواب ہے کتب خانۂ کائنات میں انتخاب ہے، دوستوں کی تحریک سے باوجودِ مکروہات زمانۂ ناہنجار اور فکرِ معاش کے انتشار میں جناب مولوی محمد یعقوب صاحب نے افضل المطابع شہر کانپور میں چھاپا اور مصنف سے نظر ثانی کو ارشاد فرمایا، وہ ان کا حکم بجا لانا موجبِ مسرت جانتا ہے پھر اس کی دیکھا بھالی ہوئی، صرف نازک خیالی ہوئی یہ فقط کارخانہ قدرت ہے عقل اس میں عاری ہے برسوں سے اس کے چھپنے کا دور تسلسل جاری ہے۔ دوسری بار پھر جناب مولوی صاحب کا

ارادہ ہے اور مصنف بھی بشرطِ زیست نیا کر دینے کا آمادہ ہے، مگر بہ نظرِ انصاف اور رشک و حسد سے جی صاف کر کے دیکھو جو چیز نظر سے گذرے اور وہ نادر ہے مکرر دیکھنے میں بیشتر دیکھا ہے کہ بارِ خاطر ہے مگر اِس فسانہ میں یہ سحر پردازی ہے کہ جب نظر پڑے کیفیت تازی ہے۔ یہ مصنف کے حال پر عنایتِ پروردگار ہے۔ اس کا رشک و حسد بیکار ہے یہ عجب نگار خانہ سحر طراز ہے کہ ہر دم اس کے شوق میں سخن سنج کا دیدہ باز ہے، کسی طرح دل نہیں بھرتا ہے ہر دم شوق اوبھرتا ہے اور جب مصنف کی نظر سے یہ کتاب گذر جاتی ہے زیور بیان تازہ کی چمک سے دونی رونق پاتی ہے، سنگ میں لال، صدف میں دُر شاہوار ہے، نافہ میں مُشک، گل میں رنگ و بو معطر چار سو بے مثل یادگار ہے جب چھپتی ہے نیا نازو انداز پیدا ہوتا ہے دیدۂ دل شیدا ہوتا ہے جن کی ناک خود بینی سے بری ہے ان کے دماغ میں اس کی بو باس بھری ہے اور جو گوشِ شنوا دیدۂ بینا رکھتا ہے، صاحب فہم، ذی ہوش ہے انصاف کی راہ سے حلقہ بگوش ہے اور حاسد کی بات نرالی ہے، لااُبالی ہے، خدا و رسول کو اُن کی زبان سے نجات نہ ملی تو دوسرا کب بچتا ہے، ان لوگوں کو بھونکنے کی عادت ہے کبھی نہیں بچا ہے۔ دو نسخے اور مصنف نے تازہ لکھے ہیں۔ مریضانِ محبت کی دوا ہے، کیا لکھوں کہ کیا لکھا ہے جب وہ دیکھنے میں آئیں گے، آنکھیں کھُل جائیں گی، منصف لطف اٹھائیں گے۔ للہ الحمد کہ یہ صنم رعنا محبوبِ زیبا تاریخ بارھویں ماہ ذی الحجہ ١٢٧٦ھ شہر کانپور محلہ پٹکاپور افضل المطابع محمدی میں چھپ کر منظورِ نظر ہوا، سخن شناسوں سے یہ التماس ہے کہ کثرتِ سِن سے ہوش بجا، نہ ٹھکانے حواس ہے۔ اگر کچھ مزا ملے تو راقم اور چھاپنے والے کو دعائے خیر سے یاد کریں اپنی طبیعت شاد کریں فقط۔

خاتمۃ الطبع، نسخہ ہٰذا

الحمدللہ فسانۂ عجائب موسوم بہ قصہ جانعالم و انجمن آرا، بڑے اہتمام سے سنگم پبلشرز، الہ آباد سے چھپ کر منظر عام پر آرہا ہے۔ اس کی ترتیب وتدوین کے سلسلے میں مرتّب نے بڑی جانفشانی کی، دو سال صرف کئے اور سچ یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوسکا۔ یہ وہ کتاب ہے کہ بقول مصنف "مکرر دیکھنے میں بیشتر دیکھا ہے کہ بارِ خاطر ہے مگر اس فسانے میں یہ سحر پردازی ہے کہ جب نظر پڑے کیفیت تازی ہے۔" مرتب نے اس کی ترتیب میں ہر ممکن احتیاط سے کام لیا، مہینوں اس کی خاطر آرام کا نہ نام لیا۔ کُل کو بہتر بنانے کی خاطر جز پر نظر رکھی۔ ہر چند یہ کتاب بار بار چھپی، مگر اس اہتمام کے ساتھ شاید پہلی بار چھپی یہ بھی مرزا رجب علی بیگ سرورؔ کا اعجاز جلیل ہے کہ یہ داستانِ سرور انگیز ہر لمحہ مائل بہ تکمیل ہے اور جو اسے دیکھتا ہے، خوب سے خوب تر کی جستجو کرتا ہے۔ مرتب نسخہ ہٰذا کو یقین ہے کہ بہت جلد اس کے بہتر اور برتر نسخے شائع ہوکر شائقینِ سرورؔ کو پُر سرور کریں گے۔ فسانہ عجائب بے مثال ہے، اس کی مزید تعریف کے لئے زبان گویا لال ہے۔ لب کا لب سے جدا ہونا محال ہے۔ للہ الحمد کہ یہ افق مشرق سے فسانہ جانعالم، انجمن آرائے ہند، مرزا رجب علی بیگ کی سویں برسی کی شام کو مطلع ابر آلود سے طلوع ہوکر منظر عام پر ماہ ذیقعدہ ۱۳۸۸ھ شہر الہ آباد سے ہویدا ہو رہا ہے کہ دو دریاؤں کا سنگم ہی نہیں، تہذیبوں

کا سنگم بھی ہے اور مرتب کے لئے قابلِ فخر ہے کہ یہ سرزمین وہ ہے کہ جس نے اس دوآبے میں اس کی تعلیم و تربیت کا برسوں خیال رکھا اور آج بھی اپنے دریائے فیض سے مرتب کو سیراب کر رہا ہے۔ اگر پڑھنے والے کو اس میں مصنف کے علاوہ مرتب کا خیال آئے تو دعائے خیر سے یاد فرمائے۔ بسکہ مرتب کو اچانک سمندر کا سفر درپیش ہے، اس لئے مہینوں کا کام ہفتوں میں کرنا پڑا۔ اہلِ نظر پر واضح ہے کہ بشر غلطیوں کا پتلا ہے اگر اس کی ترتیب و تدوین میں خامیاں نظر آئیں تو نکتہ سنجوں سے درخواست ہے کہ مرتب کو مطلع فرمائیں تاکہ اگلے ایڈیشن میں ان کو دور کر دیا جائے۔ فقط

"شادی بیاہ کی رسومات لکھنؤ جن کا ذکر فسانۂ عجائب میں ہے"

رسمیں خوشی کی ہوں یا غم کی، اپنی جڑیں بہت مضبوط رکھتی ہیں اس لئے کہ یہ انسان کی گھٹی میں پڑی ہوتی ہیں۔ بعض رسمیں ایسی بھی ہوتی ہیں جنھیں انسان پسند نہیں کرتا لیکن ان کی پیروی کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے ان میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی ہیں لیکن وہ غیر شعوری طور پر ہوتی ہیں کہ ہمیں ان کا احساس بھی ہوتا ہے۔ چونکہ ان رسومات کی امین عورتیں ہوتی ہیں اس لئے وہ اس کی پابندی بھی سختی سے کراتی ہیں۔

رسموں کا تعلق ملک اور قوم سے گہرا ہوتا ہے۔ وہ اپنے دیس کی آب و ہوا میں پرورش پاتی ہیں۔ اس لئے رسموں کو ان کے دیس سے ہٹا کر دیکھنے کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے جب لوگ اپنا وطن ترک کرکے کسی دوسرے ملک میں چلے جاتے ہیں تو ان کے لئے اپنی تمام تر جد و جہد کے باوجود یہ مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی رسومات کو برقرار رکھ سکیں۔ مجبوراً وہ اس دیس کی زندہ رسموں سے اپنا ناتا جوڑ لیتے ہیں۔ اور پھر ان کو اپنا کر ان پر سختی سے کاربند ہوتے ہیں کہ ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہوتا ہے۔

مولوی سید احمد دہلوی لکھتے ہیں:۔

——— "اہل ہند کی تمام رسموں اور اکثر عقائد نے مسلمانوں میں اپنا سکہ بٹھا دیا۔ اگرچہ علمائے مذہب نے ان رسموں کے اٹھانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت

نہیں کیا۔ مگر چونکہ گھر کے اندر کی بلا اور گھٹ میں بیٹھی ہوئی دوا اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہتی۔ کچھ بھی پیش رفت نہ گئی" یہ رسومات ہماری تہذیب میں سرایت کر جاتی ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا اثر ادب پر بھی پڑتا ہے کیونکہ ادب زندگی سے براہ راست اثر قبول کرتا ہے۔

"فسانۂ عجائب" میں بھی ہمیں رسومات کے پرتو نظر آتے۔ خاص طور پر انجمن آرا سے شادی کے موقع پر جن تقریبات کا ذکر ہے، ان میں ہماری تہذیبی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ تہذیب کی یہ چھاپ اس قدر گہری ہے کہ داستان کے چوکھٹے میں بھی ہمیں ان میں اجنبیت نظر نہیں آتی حالانکہ یہ شک بھی ہوتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان رسموں میں بھی داستان طرازی ہو اور داستان کی طرح یہاں بھی حقیقتوں کی مبالغہ آمیز تصویریں ہوں بلکہ اس کے برعکس ہم کو فسانۂ عجائب میں جو رسمیں نظر آتی ہیں اُن میں رنگ آمیزی تو ہو سکتی ہے، لیکن تصویریں تقریباً ہو بہو ہیں۔

یوں تو رسموں میں چھوٹے بڑے کا امتیاز نہیں ہوتا لیکن ان کی عملی شکل میں غربت اور امارت کی جھلکیاں ضرور نظر آتی ہیں۔ دولت کی فراوانی رسموں کو متاثر کرتی ہیں۔ فسانۂ عجائب کی شادی بادشاہوں کے گھر کی شادیاں ہیں اس لئے یہاں ہر کام اللّے تللّے ہوتا ہے اس کا داستان نہیں، بلکہ سماج کے سب سے اونچے طبقے کا معیار زندگی ہے جس میں ہر شے میں فراوانی کا احساس پایا جاتا ہے جہاں خوشی کے موقع پر سونے اور چاندی کو کوڑیوں کی طرح لٹایا جاتا ہے۔

فسانۂ عجائب چونکہ لکھنؤ کی داستان ہے اس لئے یہاں کی تہذیب میں لکھنؤ کی تہذیب کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ لیکن شادی بیاہ کی رسموں میں ہمیں عام طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ رسمیں وہی ہیں جو دہلی کے قلعے میں رائج تھیں۔

غازی الدین حیدر نے دہلی سے آزاد ہو کر اپنی شہنشاہیت کا اعلان تو کر دیا تھا لیکن دہلی کی رسومات سے آزاد ہونا ان کے بھی بس کی بات نہ تھی۔ یہ رسمیں کم و بیش وہی تھیں جو دہلی میں رائج تھیں۔ لکھنؤ والوں نے ان میں تصنع کی رنگ آمیزی کر کے ان کے اندر چمک دمک پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہ عمل اس لئے بھی ہوا کہ زندگی سے اس کی حقیقتیں چھن چکی تھیں ــــ لکھنؤ میں بادشاہت نام کو تھی، کیونکہ بادشاہ تو ایک

ظاہری شکل کا نام تھا۔ اقتدار اور حکومت کا مرکز تو اور ہی کہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں سارا زور باطن سے ہٹ کر ظاہر پہ آجاتا ہے۔ اندرونی حسن کی کمی کو ظاہری حسن کے مصنوعی پن سے پورا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے لکھنؤ کی تہذیب میں سارا زور بناوٹ اور ظاہری شان و شکوہ پر دیا جانے لگا۔

شادی بیاہ کا ہی ایسا موقع ہوتا ہے کہ جہاں ان ظاہری چیزوں کے اندر مصنوعی حسن پیدا کیا جا سکتا ہے اس لئے لکھنؤ کی رسومات میں یہ تصنع غیر معمولی طور پر بڑھنے لگا۔ فسانۂ عجائب کا دور لکھنؤ کی تہذیب کے عروج کا زمانہ تھا اس لئے ہمیں یہاں جو رسومات نظر آتی ہیں وہ بھی اپنے شباب پر ہیں۔

شادی کی رسومات ایک دن کی نہیں ہوتیں۔ ان کا سلسلہ دنوں پہلے سے شروع ہو جاتا ہے۔ نکاح سے کبھی گیارہ دن پہلے، کبھی نو یا سات دن پہلے نہلا دھلا سر گوندھ کر دولھن کو مانجھے[1] بٹھا دیا جاتا ہے۔ اُس روز اُسے زرد جوڑا پہنایا جاتا ہے اور اُس کا کمرے سے باہر نکلنا بجز خاص ضرورتوں کے موقوف ہو جاتا ہے اور لڑکی مردوں کے سامنے نہیں آتی اور اس روز سے بلا ناغہ ابٹنا[2] ملا جاتا ہے۔ دلھن کے پہلے روز کا چھوٹا ابٹنا، اس کی جھوٹی مہندی، پینڈیوں[3] کے ساتھ دولھا کے یہاں جلوس کی شکل میں بھیجی جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ اور سامان بھی ہوتا ہے جیسے :-

---

[1] مانجھا پنجابی زبان کا لفظ ہے۔ پنجابی میں مانجھا پلنگ یا چارپائی کو کہتے ہیں۔ اسی سے مانجھے بٹھانے کا فقرہ استعمال ہوا۔ اسی رسم کو "مایوں بٹھانا" بھی کہتے ہیں۔

[2] ہلدی اور جو کا بھنا ہوا آٹا، کھلی، چھیل چھبیلا، ناگر موتھا، بچ، بالچھڑ نیز بات اور تیل ڈال کر پانی میں گھولا جاتا ہے اور جسم پر صفائی کے واسطے ملا جاتا ہے۔ اس سے رنگ میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔

[3] پنڈیاں ایک طرح کے لڈو ہوتے ہیں جو میدے کو گھی میں بھون کے اس میں کھانڈ اور میوہ ملا کر بنائے جاتے ہیں۔

"مانجھے کا زرد جوڑا، ایک رنگی ہوئی منقش چوکی اور لوٹا کٹورا بھی ہوتا ہے۔ لوٹا، کٹورا چوکی پر ناڑے سے کس کر باندھ دیئے جاتے ہیں اور باجے والوں اور جلوس میں یہ چیزیں اس ترتیب سے ہوتی ہیں کہ باجے والوں اور جلوس کے بعد سب سے آگے چوکی ہوتی ہے۔ اس کے بعد خوانوں میں عام قسم کی پینڈیاں ہوتی ہیں۔ دولھن کی چھوٹی بہنیں اور ڈومنیاں فینس اور ڈولیوں پر سوار ہو کے جاتی ہیں جو دولھا کے گھر پہنچ کر ایک پینڈی اور مصری کے سات سات ٹکڑے کر کے وہ سب ٹکڑے دولھا کو ڈھکا ڈھکا کے کھلاتی ہیں۔ اس رسم کی نسبت قیاس کیا جاتا ہے کہ خالص ہندی رسم ہے جس کو نہ عرب سے تعلق ہے نہ عجم سے۔ اس لئے کہ مانجھے اور اس کے ساتھ کنگنے کی ابتدا ہندستان کے سوا اور کسی جگہ نہیں ثابت ہوتی"۔[1]

جس روز دلھن مانجھے بیٹھتی ہے، عام طور پر اسی روز دولھا کو بھی بٹھایا جاتا ہے اور دولھن کا جھوٹا ابٹنا اس کے بھی ملا جاتا ہے۔ اور دولھا کی ہم عمر لڑکیاں، بہنیں وغیرہ آپس میں مل کر سہاگ گاتی ہیں۔

مانجھے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دونوں (دولھا اور دولھن) کے دل ایک دوسرے کے خیال میں لگ جائیں اور اس طرح تصور میں اجنبیت کا فاصلہ کچھ کم ہو جائے۔ اس زمانے میں دولھن کے یہاں بھی خوب گانا بجانا ہوتا ہے اور ان گانوں میں دولھا کا ذکر بڑے جذبے کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد دوسری قابلِ ذکر رسم ساچق[2] ہوتی ہے۔

کہتے ہیں[3] یہ رسم ترک و مغل اپنے ساتھ ہندستان لے کر آئے تھے۔ اس میں

---

[1] گذشتہ لکھنؤ۔ عبد الحلیم شرر۔ ص ۴۵۶

[2] ساچق ترکی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے مختلف املا ہیں یعنی ساچاق، سچق، ساچق، لیکن ساچق زیادہ صحیح ہے۔ جدید ترکیہ میں اسی لفظ کا تلفظ ساچی اور ساچیغ بھی کیا جاتا ہے۔ اس کا مصدر ساچاق ہے جس کے لغوی معنی بکھیرنا، پھیلانا، نچھاور کرنا اور نثار کرنا ہیں۔

[3] گذشتہ لکھنؤ۔ عبد العلیم شرر ص ۴۷۵

دولھا کے یہاں سے دولھن کے لئے چڑھاوے کا جوڑا ہوتا ہے جو عموماً بہت بھاری اور کارچوبی ہوتا ہے اس کے ساتھ دولھن کے لئے سنہری مقیش کا سہرا، چاندی کا چھلّا سونے کی انگوٹھی، دو ایک چیزیں اور ہوا کرتی ہیں اور وہ زیور ہوتا ہے جو پہنا کر وہ رخصت کی جائے گی اور پھولوں کا گہنا ہوتا ہے۔ جوڑے کے ساتھ شکر کے نقل، شکر کے قرص اور میوہ جاتا ہے۔ سانچق کے لئے خاص اہتمام سے منقش اور رنگین گھڑے تیار کرائے جاتے ہیں۔ پھر بانس اور کاغذ کے رنگارنگ تختوں میں چار چار گھڑے لگا کے چوگھڑے بنا دئیے جاتے ہیں اور دولتمندی اور امارت کی شان کے مناسب ان چوگھڑوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے اور اکثر سو سو دو دو سو کے شمار کو پہونچ جاتے ہیں ـــــ

جلوس میں اُن سب گھڑوں کے آگے چاندی کی ایک دہی کی مٹکی رہتی ہے جس میں دہی بھرا ہوتا ہے اور اُس کے منھ پر بھی سوہا ناڑے سے باندھ دیا جاتا ہے اور اس کے گلے میں مبارک فالی کے لئے دو ایک مچھلیاں[۱] بھی بندھی ہوتی ہیں۔ یہ چیزیں جب دولھن کے گھر پہنچتی ہیں تو اعزا و اقارب میں تقسیم ہوتی ہیں"

ساچق کے اگلے دن دلھن والے بڑے جلوس کے ساتھ دولھا کے لئے مہندی بھیجتے[۲] ہیں۔ جو یسی ہوئی ہوتی ہے گویا یہ ساچق کا بدلہ ہوا۔ اس میں مندرجہ ذیل سامان ہوتا ہے :ـ

دولھا کے لئے جوڑا جو وہ پہن کر نکاح کے لئے آتا ہے۔ اس میں درباری قسم کا خلعت، شملہ، جیغہ، سرپیچ اور مرصع کلغی ہوتی ہے، موتیوں کا ہار، ریشمی پاجامہ، جوتا، طلائی انگوٹھی اور سونے کا سہرہ ـــــ

مہندی کو طباق میں بھیجتے ہیں اور اس میں ہری اور لال موم بتیاں جلا کر رکھتے ہیں۔ مہندی کے طباق کے ساتھ ملیدے کے طباق ہوتے ہیں جن کی تعداد حسب حیثیت ہوتی ہے۔

مہندی کے اگلے دن برات کی روانگی کا دن ہوتا ہے۔ برات بڑی شان و شوکت سے روانہ ہوتی ہے۔ اس کا جلوس بڑے اہتمام سے چلتا ہے۔

---

[۱] مچھلی اودھ میں اچھا شگون سمجھا جاتا ہے۔

[۲] یہ رسم عربوں سے آئی۔

مولوی عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں[1] کہ :-

"برات جانے کا اگلا ضروری وقت پہر رات رہے یعنی تین بجے شب کا تھا لیکن اب یہ وقت اکثر چھوٹتا جاتا ہے اور بجائے پہر رات رہے کے، پہروں چڑھتے یعنی نو دس بجے صبح کو براتیں جانے لگی ہیں۔ اس تاخیر کی ابتدا واجد علی شاہ آخری بادشاہ اودھ کے زمانے سے ہوئی۔ ان کی برات جانے میں اتفاقاً دیر ہوگئی اور دن نکل آیا تھا۔ لوگوں نے آسانی اور روشنی کے سامان کی تخفیف کے خیال سے اسی وقت کو اختیار کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ اب عموماً ابتدائے روز میں برات جاتی ہے اور دوپہر کو عقد ہوجاتا ہے۔"

برات کا جلوس باجے گاجے کے ساتھ روانہ ہوتا ہے ــــ باجوں میں ڈھول، تاشے، جھانجھیں، روشن چوکی اور آرگن باجا ہوتا ہے۔

دولھا حسب حیثیت گھوڑے یا ہاتھی پر جاتا ہے ــــ اس وقت دولھا کی حیثیت بادشاہ کی ہوتی ہے اور یہ جلوس شاہانہ انداز سے نکلتا ہے اس لئے اسے "نوشہ" کہنے لگے۔

نوشہ بنانے کی بعض خصوصیتیں مسلمانوں میں ہندوؤں سے کسی حد تک مختلف تھیں۔ مولوی عبدالحلیم شرر اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں[2]:

"مگر غور طلب یہ امر ہے کہ جب دولھا کو بادشاہ بناتے ہیں تو اس کے سر پر شملہ کیوں ہوتا ہے، تاج کیوں نہیں پہناتے ہیں؟ اس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمان سر پہ آڑا تاج نہیں پہنتے تھے بلکہ سب کے سروں پہ کلغی دار شملے ہوتے تھے۔ انگریزوں نے غازی الدین حیدر کے زمانے سے شاہان اودھ کو تاج پہنا دیا مگر وطنی سوسائٹی نے اس تاج کو قبول نہیں کیا اور اپنے بادشاہوں کی وضع وہی رکھی، جو پرانی تھی۔"

غرض اس طرح دولھا کی برات چلتی ہے۔ جب یہ برات دولھن کے یہاں پہنچتی ہے تو وہاں پہلے سے استقبال کی تیاری رہتی ہے۔ وہاں دولھن کو سات دن کے باسی پانی سے نہلا کر اس کا نہانے کا پانی محفوظ رکھا جاتا تھا اور جب یہ بارات پہنچتی تو یہ

---

[1] گذشتہ لکھنؤ عبدالحلیم شرر۔ ص ۲۵۹

[2] گذشتہ لکھنؤ۔ عبدالحلیم شرر ص ۲۶۰

پانی دولھا کی سواری کے گھوڑے یا ہاتھی کے پیروں کے نیچے ڈال دیا جاتا ہے۔

یہاں دولھا کو زنانخانے میں لے جاتے ہیں وہاں کچھ رسمیں ادا کی جاتی ہیں جو مختلف خاندانوں میں مختلف ہوتی ہیں اور بقول شرر "یہ وقت علی العموم وہ ہوتا ہے جب دولہن نہا چکتی ہے مگر ابھی کپڑے نہیں پہنائے گئے ہوتے اور وہ ایک چادر میں لپٹی ہوتی ہے اور اس کے ہاتھ پر مصری رکھ کر دولھا کو کھلائی جاتی ہے جس میں سالیاں، زندہ دل عورتیں اور ڈومنیاں قیدیں بڑھا بڑھا کے دولھا کے لئے ہر کام مشکل کر دیتی ہیں۔"

یہ طریقہ مخصوص لکھنوی تھا۔ دلی میں دولھا نکاح سے پہلے زنانخانے میں قدم نہیں رکھتا۔ جیسا کہ مولوی سید احمد دہلوی لکھتے ہیں :-

"اب زنانی سواریاں زنان خانے میں اُترنی شروع ہوجاتی ہیں۔ دولھا اور سب براتی مردانے میں چلے جاتے ہیں۔ دولھا کو صدر میں مسند پر بٹھاتے ہیں۔ اس کے ہم عمر بھائی بند اس کے پہلو میں اِدھر اُدھر بیٹھ جاتے ہیں"۔[1]

لکھنؤ میں دولھا، زنانخانے سے نکل کر مردانے میں آتا ہے اور پھر مذکورہ بالا طریقے پر نکاح کے لئے بٹھایا جاتا ہے۔ جہاں وہ سر جھکائے شرمایا ہوا منھ پر رومال لگائے بیٹھا رہتا ہے۔ اس کا منھ پھولوں سے اتنا چھپا ہوتا ہے کہ بمشکل تمام اس کا چہرہ نظر آتا ہے۔

ذرا سی دیر کے بعد نکاح ہوتا ہے۔ سنی اور شیعہ نکاحوں میں تھوڑا بہت فرق ہے۔ شیعوں کی شادی میں دو مجتہد آتے ہیں ایک لڑکی کے وکیل بن کر اور دوسرے لڑکے کے وکیل کی حیثیت سے بیٹھتے ہیں۔ لڑکی والے مجتہد لڑکی سے شرعی اجازت حاصل کر لیتے ہیں اور پھر دونوں دولھا کے سامنے بیٹھ کے دولھا دولھن کی جانب سے قرأت و صحتِ خارج سے ایجاب و قبول کے صیغے ادا کرتے ہیں۔

سنیوں میں لڑکی کے قریبی عزیزوں میں کوئی شخص دو گواہوں کی شہادت پر اس کا وکیل بن جاتا ہے اور قاضی ان گواہوں پر بھروسہ کر کے مہر معلوم کر کے دولھا کو کلمۂ شہادت میں اور جزو ایمان معاملات پر اقرار کروا کے تین بار تصدیق کر کے نکاح پڑھواتے ہیں اور ایک دعائیہ خطبہ پڑھتے ہیں اور نکاح کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ اس خوشی میں

---

[1] رسوم دہلی۔ مولوی سید احمد دہلوی۔ صفحہ ۱۱۴

سنتِ رسول کے طور پر چھوہارے بانٹے جاتے ہیں۔

اس کے بعد دولھا کو زنانخانے میں لے جاتے ہیں جہاں پر بہت سی رسمیں ہوتی ہیں۔ دولھا کو اس کی سالیاں اور نوجوان لڑکیاں طرح طرح سے چھیڑتی اور تنگ کرتی ہیں۔ پھر دولھن کو آرسی مصحف کی رسم کے لئے لاکر بٹھایا جاتا ہے۔

اس موقع کا بیان مولوی عبدالحلیم شرر کے الفاظ میں سنئے :-

"دولھن اوڑھ لپیٹ کے ایک غیر متحرک گٹھری کی طرح اس کے سامنے لاکر رکھ دی جاتی ہے۔ابھی تک اسے رخصتی کا جوڑا نہیں پہنایا گیا ہوتا۔ لاتے وقت کوشش کی جاتی ہے کہ پہلی آمد میں دولھن کی ایک لات دولھا کے پڑ جائے۔ پھر ٹونے گائے جاتے ہیں۔ دولھا سے بیوی کی غلامی، ذلیل ترین غلامی اور خدا جانے کیسی کیسی خدمتیں بجا لانے کا اقرار لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد آرسی مصحف کی رسم ادا ہوتی ہے۔ جس کے لئے دولھا دولھن کے درمیان رحل پر قرآن شریف اور اس پر آئینہ رکھا جاتا ہے اور اس آئینہ میں دولھا کو دولھن کا پہلا جلوہ دکھایا جاتا ہے۔ مگر لازم ہے کہ چہرہ دیکھنے سے پہلے دولھا سورۂ اخلاص پڑھ لے۔ اس جلوے میں دولھن آنکھیں بند کئے رہتی ہے۔ عورتیں دولھا سے آنکھیں کھولنے کے لئے طرح طرح کی التجائیں کرتی ہیں اور اسی سلسلے میں ہر قسم کی اطاعت و غلامی کا اس سے اقرار کرالیتی ہیں۔ بڑی مشکلوں اور خوشامدوں کے بعد دولھن آنکھیں کھول کے ایک نظر دیکھتی اور پھر آنکھیں بند کرلیتی ہے اور اسی پر رسوم کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔"[۱]

یہاں پر دہلی والے اور خاص قلعہ دہلی کے طور طریقے میں کچھ فرق ہوتے ہیں۔ آرسی مصحف کے وقت قلعہ میں یہ دستور تھا کہ "ڈومنی[۲] نے دولھا کے کان میں بسوا[۳] کا ٹکا ہلایا۔ سالی نے کان میں سہاگا[۴] چھوایا اور کان پکڑے کھڑی رہی۔ رٹ جھگڑ کر اپنا نیگ

---

۱ گذشتہ لکھنؤ ص ۲۶۲ - ۲۶۳

۲ رسوم دہلی از سید احمد دہلوی ص ۱۲۴

۳ یہ خاص قلعہ دہلی کا دستور تھا جس سے غرض یہ ہے کہ جس طرح پانی غیر کو اپنا کرلیتی ہے۔ اسی طرح اس کے نام کا ٹکا نکالنے سے دولھن دولھا کو اپنا کرلے گی۔

۴ سہاگہ بھی قلعہ ہی کے دستور میں ہے۔ چونکہ اس میں سہاگ کا لفظ آیا اس خیال سے کہ میاں بیوی میں سہاگ یعنی اخلاص رہے یہ ٹوٹکا کیا جاتا ہے۔

لیا۔ جب جاکر دولھا کا کان چھوڑا۔"

اب دولھن کو سجا بنا کر رخصت کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ اس وقت ڈومنیاں بابل یعنی رخصتی کا گیت گاتی ہیں۔ اس درمیان میں جہیز کا سامان باہر لگا دیا جاتا ہے اور رخصت سے پہلے دولھا کو سلامی دی جاتی ہے۔

اس کے بعد برات بڑے شان کے ساتھ دولھا کے گھر کی طرف روانہ ہوتی ہے۔ جب برات دولھا کے یہاں پہنچتی ہے تو مبارک سلامت کے گیتوں کے شور میں دولھن اتاری جاتی ہے اسے اندر لے جاکر بٹھایا جاتا ہے اور یہاں اس کے دامن پر دولھا شکرانے کی نماز پڑھتا ہے۔

دہلی والے دولھن کے سسرال پہنچنے پر ایک مرغا یا بکرا حلال کرکے اس کا خون دولھن کے دائیں پاؤں کے انگوٹھے میں مل کر اسے دودھ سے دھو دیتے ہیں۔

جب دولھن کی رونمائی ہوتی ہے تو عزیز و قریب جی کھول کھول کر روپیہ یا زیور دیتے ہیں اور منھ کھول کھول کے اس کی صورت دیکھتے ہیں۔

اس نئے گھر میں دولھن کی پہلی رات اس کی زندگی کی سب سے اہم رات ہوتی ہے۔ دولھا دولھن علیحدہ کمرے میں سلا دیئے جاتے ہیں۔ اس رات کا نام سہاگ کی رات یا تخت کی رات ہوتا ہے۔

اگلے دن دولھن کے بھائی مٹھائی لے کر بہن کو لینے آتے ہیں اور پھر دولھن اپنے میکے دولھا کے ساتھ جاتی ہے۔ اس کے ساتھ سات قسم کی ترکاریاں اور سات قسم کی مٹھائیاں ہوتی ہیں۔

اسی[1] رات کو دولھن کے گھر میں چوتھی کھیلی جاتی ہے۔ دولھن کو وہ بری کا جوڑا اتار کے چڑھاوے کا جوڑا پہنایا جاتا ہے جو سب جوڑوں سے زیادہ بھاری اور نہایت ہی پر تکلف ہوتا ہے۔ یہ جوڑا پہنا کے اس کا خوب بناؤ چناؤ کیا جاتا ہے دولھا کی طرف سے اس کی بہنیں اور رشتہ دار عورتیں بھی آجاتی ہیں اور اس مجمع میں دولھا دولھن مٹھائی سے اور دولھا کی ساتھ والیاں اور دولھن والیاں ترکاریوں اور پھولوں کی چھڑیوں سے باہم لڑتی ہیں یعنی مٹھائی اور ترکاریاں ایک دوسرے کے

---

[1] گذشتہ لکھنؤ ص ۲۶۸

کھینچ کھینچ مارتی اور چھڑیوں کے ہاتھ رسید کرتی ہیں کبھی دلگی دلگی میں لڑائی تیز ہوجاتی ہے اور بعض عورتیں خفیف سی چوٹ بھی کھا جاتی ہیں۔

چوتھی کے دو چار روز بعد پھر دولہا دولھن کے گھر میں آتا ہے اور اس کے بعد بالعموم چار چالے ہوا کرتے ہیں۔ چالے کا لفظ چال اور چلنے سے نکلا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دولھن اپنی سسرال سے بلائی جاتی ہے۔ مگر یہ بلانا خود اُس کے میکے میں نہیں، بلکہ میکے والیوں میں ہوتا ہے یعنی اس کی خالائیں پھوپھیاں موہانیاں ہمت کرکے باری باری اسے اپنے یہاں بُلاتی ہیں جہاں وہ مع دولھا کے جاتی ہے اور اس نئے جوڑے کے رکھ رکھاؤ کے لئے خاص اہتمام اور انتظام کیا جاتا ہے فقط ایک رات دن دولھا دولھن مہمان رہتے ہیں اور رخصت کرتے وقت انھیں جوڑا اسلام کرائی اور زیور وغیرہ بقدر ہمت و استطاعت دیئے جاتے ہیں۔"

ہنرمندوں اور فن کاروں کا تذکرہ جن کا ذکر بیانِ لکھنؤ میں ہے

حافظ ابراہیم

حافظ ابراہیم نام، حافظ نور اللہ کے بیٹے اور شاگرد رشید تھے۔ حافظ ابراہیم عہد آصفی سے عہد نصیری تک زندہ رہے۔ نستعلیق لکھنے میں لاجواب تھے "انھوں[1] نے خط نستعلیق کے دائروں میں ترمیم بھی کی ہے یعنی بیضوی دائروں کو کچھ گول کر کے آفتابی دوائر کے قریب پہنچا دیا مگر آفتابی نہیں ہونے دیا۔ یہ ترمیم عام طور پر بہت پسند کی گئی اور بیشتر خوشنویسانِ عصر نے اس کا اتباع کیا۔ ان کے شاگردوں میں منشی ہادی علی باکمال خوش نویس گزرے ہیں۔"

حافظ ابراہیم نے محتشم کاشی کا مشہور مرثیہ بڑے اہتمام سے لکھ کر آغا میر وزیر اعظم کی خدمت میں نذر کیا تھا جو خطاطی کا ایک اعلیٰ درجے کا نمونہ ہے۔ حافظ ابراہیم صاحب کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ حافظ نور اللہ نے نواب یمین الدولہ کی فرمائش سے

[1] گذشتہ لکھنؤ — بحوالہ صحیفہ خوشنویسان مصنفہ احترام الدین شاغل ص۷۶

ایک گلستاں لکھی تھی جس کا ایک باب لکھنے سے رہ گیا تھا کہ حافظ نور اللہ کا انتقال ہوگیا۔ نواب یمین الدولہ نے یہ باب اُن کے بیٹے حافظ ابراہیم کو لکھنے کے لئے دیا۔ انھوں نے اپنے باپ کے شانِ خط میں لکھ کر ایسا ملا دیا کہ بڑے بڑے ماہرین نہ پہچان سکے۔

سید میر علی

سید میر علی سڑی حیدری خاں کے سوز خوانی میں شاگرد تھے اور انھوں نے سوزخوانی کو بہت ترقی دی۔ یہ اپنے گھرہی میں مجلس پڑھتے تھے۔ نواب یمین الدولہ متوفی ۱۲۲۹ھ نے ان کے شہرۂ کمال سے مشتاق ہوکر ان کو طلب کیا انھوں نے جانے سے انکار کیا اور لکھنؤ سے چلے جانے کا ارادہ کیا۔ اس واقعہ کا ذکر محمد حسین آزاد اس طرح بیان کرتے ہیں کہ:—

"نوابؒ نے ان کے شہرہ کمال سے مشتاق ہوکر طلب کیا، انھوں نے انکار کیا اور کئی بار پیغام سلام کے بعد یہ بھی کہا کہ اگر وہ حاکم وقت ہیں تو میں بھی سیادت کے اعتبار سے شہزادہ ہوں"۔۔۔ نواب نے کہا کہ سید میرے ہاں ہزاروں سے زیادہ ہیں۔ میر صاحب نے اگر فخر پیدا کیا تو یہی کہ سید تھے اب ڈوم بھی ہوگئے، اب انھیں اختیار ہے۔ میر علی نے یہ سُن کر خیالات چند درچند سے فوراً دکن کا ارادہ کیا۔ سید انشا جو شام کو گھر آئے تو دیکھا کہ کچھ سامان سفر ہورہا ہے۔ سبب پوچھا تو معلوم ہوا کہ میر علی صاحب لکھنؤ سے جاتے ہیں۔ چونکہ آپ کے بھتیجے بھانجے بھی اُن کے شاگرد ہیں وہ بھی استاد کی رفاقت کرتے ہیں۔ میر علی صاحب کے جانے کا سبب پوچھا تو یہ معلوم ہوا۔ اسی وقت کمر باندھ کر پہنچے۔ سعادت علی خاں نے متحیر ہوکر پوچھا کہ "خیر باشد پھر کیوں آئے؟" انھوں نے ایک غزل پڑھی جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

یارب بنا بنی میں ہمیشہ بنی رہے
دولت بنی ہے اور سعادت علی بنا

پھر کہا "حضور! غلام اس وقت رخصت ہوکر چلا تو دل نے کہا کہ اپنے دولھا کی دولھن (عروس سلطنت) کو ذرا دیکھوں۔ حضور واقعی کہ بارہ ابھرن اور سولہ سنگار سے سجی تھی۔ سر پر جھومر۔ وہ کون۔ مولوی دلدار علی صاحب۔ کانوں میں جھمکے، وہ کون؟

۱؎ آب حیات۔ مطبوعہ سرفراز پریس لکھنو۔ ص ۳۵۵/۳۵۷

دونوں صاحبزادے۔ گلے میں نولکھا ہار، وہ کون ؟ خان علامہ۔ غرض اس طرح چند زیوروں کے نام لے کر کہا کہ حضور غور جو کرتا ہوں تو ناک میں نتھ نہیں، دل دھک سے ہوگیا کہ اللہ سہاگ کو قائم رکھے" یہ کیا "۔۔ نواب نے پوچھا "پھر وہ کون ؟"۔

کہا حضور نتھ ! میر علی صاحب ! بعد اس کے کیفیت مفصل بیان کی۔ نواب نے ہنس کر کہا کہ ان کی دور اندیشیاں بے جا ہیں۔ میں ایسے صاحبِ کمال کو فخر لکھنو سمجھتا ہوں۔ غرض اس شہرت بے اصل کے لئے ترقی کا پروانہ اور ۵۰۰ روپیہ کا خلعت لے کر وہاں سے پھرے۔

رشک نے اس کی تاریخ کہی ع میر علی مرثیہ خواں حیف واے (۱۸۴۱ء)

میرک جان

میرک جان شنادری میں کامل تھے۔ مہاراجہ درگیجے کے اُستاد تھے۔ میرک جان خواجہ باقی کے شاگرد تھے۔ شاہ دوم اودھ (نصیرالدین حیدر) کو اس فن میں کمال حاصل تھا۔ آپ کے اُستاد میر احمد علی صاحب عرف میر مچھلی تھے۔ میر مچھلی اس زمانے میں پیراکی کے ماہر سمجھے جاتے تھے اور شاہ اودھ (نصیرالدین حیدر) بھی ان کے شاگرد تھے۔ ایک مرتبہ بادشاہ نے میرک جان کو اپنے استاد سے مقابلہ کا حکم دے دیا۔ حکم حاکم مرگ مفاجات سمجھ کر میرک جان نے میر مچھلی کو زیر کرکے انھیں اپنے پیروں میں باندھ لیا۔ بادشاہ اپنے دودکش بجرے میں سوار تھے۔ دریا کے کنارے دونوں استادِ فن میرک جان اور میر مچھلی اور ان کے شاگردوں کا ہجوم تھا۔ بادشاہ نے بجرے کے اندر سے جو نہایت تیز رفتاری سے چلا جارہا تھا روپئوں کا ایک توڑا ہاتھ میں لے کر بلند کیا اور میرک جان اور میر مچھلی کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ "جو ہمارے بجرے کو پیر کر پکڑلے، اُسے یہ توڑا دیدیا جائیگا" چنانچہ میرک جان نے انتہائی سرعت رفتار کے ساتھ پیر کر بجرے کو پکڑ لیا اور موعودہ انعام حاصل کیا (اکبری یعنی رسالہ پیراکی ص۲تا۵)

میر علی (خوشنویس)

اس نام کے دو خوشنویس ہیں (۱) میر علی نقی (۲) علی نقی امامی جو ۱۱۱۹ھ میں زندہ

تھے۔ میر علی نقی کا حال مندرجہ ذیل ہے :-

"میر غلام علیؒ کے برادر زادے اور شاگرد تھے کثرت مشق و ذہانت سے خط میں وہ شان پیدا کر لی تھی کہ استاد کے خط سے اپنا خط بڑھا دیا تھا۔ نستعلیق اور شکستہ دونوں خط پاکیزہ تھے مگر شکستہ کو نستعلیق پر فوقیت حاصل تھی اور اس کی طرز میں انھوں نے کچھ ایجادات بھی کی تھیں۔"

آغا (خوشنویس)

آغا[۲] مرزا نام، دہلی وطن، کرمنی النسل تھے اور میر پنجہ کش کے شاگرد رشید تھے۔ لچھمن سنگھ بقال خوشنویس شفیعہ انھیں کا شاگرد تھا۔ نستعلیق میں منشی رحیم اللہ، میر مدد علی الوری جیسے استاد ان کے شاگرد تھے۔ دہلی سے قبل از غدر الور آگئے تھے مہاراجہ بنے سنگھ والی الور نے ان سے گلستاں لکھوائی جو پندرہ سال میں مکمل ہوئی۔ یہ نسخہ بخط نستعلیق اور مصور ہے۔ اس پر سوا لاکھ روپیہ خرچ ہوا۔ آغا نے ۱۲۷۴ھ/۵۸-۱۸۵۷ء میں وفات پائی۔ "آغا مر گیا" مادۂ تاریخ ہے۔

حیدر علی خاں اور چھجو خاں

یہ دونوں بھائی بھائی تھے۔ ان کا نام دھرپد اور خیال کے گانے کے سلسلے میں مشہور ہے۔ 'پری خانہ' میں مذکور ہے کہ ایک چھوٹا سا مکان فن موسیقی کی تعلیم کے لئے واجد علی شاہ نے مخصوص کر دیا تھا۔ جس کی آرائش و زیبائش میں تکلف سے کام لیا گیا اور اس خانہ رشک ارم کو پری خانہ کا نام دیا گیا۔ پری خانہ میں گویے موجود رہتے تھے۔ چھجو خاں بھی دو تین پہر تک موجود رہتے۔

شوری

پٹہ گانے میں بے مثل تھے۔

---

[۱] تذکرہ خوشنویسان مولفہ مولوی غلام محمد ہفت قلمی بحوالہ صحیفہ خوشنویسان ص۱۳۸

[۲] تذکرہ خوشنویسان ص۷۵

بخشو اور سلاری

یہ دونوں نصیرالدین حیدر کے عہد میں گزرے انھوں نے ایسا طبلہ بجایا کہ پکھاوج کا دم بند کر دیا۔ اور ان دونوں کے مقابلے میں کسی کو طبلہ چھونے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

غلام رسول

نصیرالدین حیدر کے عہد میں گزرے ہیں قوال تھے اور اس فن میں استاد کامل کا درجہ رکھتے تھے۔

مکّا خیاط

مکّا خیاط نصیرالدین حیدر کے عہد میں گزرا ہے۔ اس کے بارے میں خود رجب علی بیگ سرور "فسانہ عبرت" میں لکھتے ہیں کہ:۔

"مکّا خیاط کی قطع سب سے نرالی رہی، ہر دم عیش و عشرت لاابالی رہی۔ ہزار روپیہ روز گرمی کی پوشاک کے مقرر تھے۔ صبح نواب کی خدمت میں آیا۔ صورت دیکھ کے توڑا منگانا اور جاڑے کی پوشاک کے سوا لاکھ ملا کئے۔ اس نے کئی لاکھ روپے کی عمارت اپنی ویران بستی میں بنائی اور لکھنؤ میں گنج، سرا، مسجد، تعمیر کی۔

خیراتی اور چھنگا

نصیرالدین حیدر کے عہد میں یکتائے روزگار تپنگ ساز تھے۔

مروان بیگ

نصیرالدین حیدر کے عہد میں مانجھا بنانے یا سوتنے کے استاد تھے۔

مولوی عمدو (کنکوا باز)

نصیرالدین حیدر کے عہد میں گزرے ہیں۔ ستر بہتر تار ڈور پر لمڈورا لڑاتے تھے۔ مولوی عمدو بہت منحنی اور دُبلے پتلے تھے۔

ببر علی لکھنوی

نصیرالدین حیدر کے عہد میں گزرے ہیں۔ خورد نوک کا گھیلا جوتا اس نوک جھونک کا بناتے تھے کہ دنیا میں اس کا جواب نہ تھا۔ اس قدر پُرتکلف بناتے تھے کہ دھنیا مہری افضل النسا خانم نے پانچ اشرفیوں پر بنوایا۔

خیر اللہ

نصیرالدین حیدر کے عہد میں خصوصیت سے ادرک کا لچھا کاٹنے کے استاد تھے۔

حسینی

عہد نصیرالدین حیدر میں حلوہ سوہن پپڑی حبشی دودھیا کا مشہور قنّاد تھے۔

نورا

نصیرالدین حیدر کے عہد میں مثل بلور کے صاف بالائی بناتا تھا اور نہایت شیریں۔

ملا احمد انوار الحق فرنگی محلی

ملا احمد انوار الحق ابن ملا احمد عبد الحق ابن ملا محمد سعید بن ملا قطب الدین سہالوی۔ آپ شہر لکھنؤ میں ۱۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے آپ نے شریعت اور طریقت دونوں کی تعلیم حاصل کی۔ صاحب کرامات اور مکاشفات ہوئے۔ آپ کی بہت شہرت ہوئی۔ آپ نے درسی کتابیں مولوی احمد حسین اور ملا محمد حسن سے پڑھیں، علوم ظاہری کی تکمیل مولوی عبد العلی بحر العلوم کی خدمت میں کی۔ سترہ سال کی عمر میں اپنے والد سے بیعت ہوئے۔ ان کی طبیعت معقولات کی طرف راغب نہ تھی۔ کتب منقولات کی طرف البتہ توجہ کرتے تھے۔ غرض اپنے اوقات عزیز عبادت الٰہی میں بسر کرتے تھے، ایک سانس بھی ذکر و شغل کے بغیر نہیں گزارتے تھے۔ آپ نے ۲۶ شعبان ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء بروز منگل ایک پہر دن باقی تھا کہ ان کی روح مبارک حجرۂ قالب سے نکل کر رفیق اعلیٰ سے جا ملی۔ اپنے باغ واقع لکھنؤ میں دفن ہوئے۔ کسی شاعر نے ان کے انتقال کا مادہ تاریخ اس مصرع سے نکالا ہے۔ ؏ رحمت حق بر روح انور باد۔

مولوی ظہور اللہ فرنگی محلی

مولوی ظہور اللہ ابن مولوی محمد ولی بن مفتی غلام مصطفیٰ ۱۱۷۴ھ/۶۱-۱۷۶۰ء میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد ماجد اور اپنے تایا ملا حسن سے تحصیل علم کی۔ آپ کے بہت کثرت سے شاگرد تھے۔ اہل محلہ میں سے بھی بہت سے شاگرد ہوئے۔ آپ کو اپنے معاصرین میں

باعتبار فقہ دانی اور اصول کے امتیاز حاصل تھی اسی وجہ سے لکھنو کی عدالت میں مفتی مقرر ہوئے۔ صاحب تذکرۂ فرنگی نے ارباب فرنگی محل کے علاوہ ان کے تلامذہ میں اکسٹھ بیرونی علمائے کرام کے نام لکھے ہیں۔

مولوی محمد مبین لکھنوی

مولوی محمد مبین لکھنوی بن ملا محب اللہ بن ملا عبد الحق بن محمد سعید بن ملا قطب الدین شہید ملاحسن، شارح سلم العلوم کے شاگردِ رشید تھے۔ علوم عقلی و نقلی کے عالم، رموز خفی وجلی سے واقف اور جودتِ ذہن وذکاء وطلاقت میں مشہور تھے۔ ان کی تصنیفات میں شرح سلم، شرح مسلم الثبوت، حاشیہ میر زاہد ملا جلال، حاشیہ میر زاہد شرح مواقف، وسیلۃ النجاۃ، حالات اہلِ بیت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ترجمہ حکایات الصالحین، شرح اسماء وحسنیٰ، شرح تبصرہ (تصوف) زبدۃ الفوائد، (بیانِ سحر رمضان) کنز الحسنات فی احیاء الذکوٰۃ، وغیرہ ہیں۔ ۲۲۔ ربیع الثانی ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء میں انتقال ہوا۔ ان کے انتقال کا مادۂ تاریخ مصرعہ "ماہِ بُرجِ علوم پنہاں گشت" ہے۔

مولوی سیّد عبد الرحمٰن لکھنوی

مولوی سیّد عبد الرحمٰن صوفی عالم تھے۔ چشتیہ سلسلہ میں بیعت وخلافت سے سرفراز تھے۔ کوٹ مخدوم عبد الحکیم تعلقہ مبارکپور شکارپور سندھ کے رہنے والے تھے۔ لکھنؤ کی مسجد پنڈائن میں رہتے تھے۔ انیس سال کی عمر تک اپنے والد سے تحصیل علم کی۔ چار سال تک متوسطات کی تعلیم مولوی محمد فاضل سے خیر پور میں حاصل کی، اس کے بعد قصبہ مہاوون میں مولوی اسد اللہ مرحوم سے تحصیل علم کی پھر دہلی پہنچے اور وہاں سے رام پور آئے، وہاں کچھ پڑھا پھر رام پور سے مولوی بحر العلوم عبد العلی لکھنوی کی خدمت میں ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۴ء میں ایک سال قیام کر کے تمام علوم کی تکمیل کی۔ ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۰ء میں حج ادا کیا۔ ۱۲۱۴ھ/۱۷۹۹ء میں لکھنؤ پہنچے۔ ۱۲۴۵ھ/۱۸۲۹ء میں انتقال ہوا۔ وہ عالم، سادات کے خادم، قانع متوکل اور عزلت نشین (صوفی عالم) تھے۔ رسالہ کلمۃ الحق اور سرۃ الانسان، توحید کے بیان میں ان کی تصنیفات میں سرود وغنا کی طرف بہت رغبت تھی۔

پیر محمد شاہ

نقشبندی سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔ گومتی کے کنارے آصفی امام باڑے کے نزدیک

شاہ پیر محمد کا ٹیلہ واقع ہے جہاں عالمگیر کی بنوائی ہوئی مسجد بھی ہے جو عرفِ عام میں ٹیلے والی مسجد کہلاتی ہے۔

خواجہ حسین و حسن

مودودی خاندان سے تعلق رکھتے تھے ان کا مزار درگاہ عباس کے قریب ہے۔

قدسیہ محل

قوم کی ترک، وفا بیگ خاں کی نواسی تھی۔ وفا بیگ کی لڑکی اسی خاندان کے ایک شخص امان اللہ بیگ کو منسوب تھی۔ اس سے دو لڑکیاں ہوئیں۔ بڑی بسم اللہ خانم، چھوٹی نازک ادا۔ بسم اللہ خانم کے دو لڑکے ہوئے۔ بسم اللہ خانم نے پہلے بادشاہ خانم کے یہاں ملازمت کر لی پھر تاج محل اور نواب ملکہ زمانیہ کی خدمت میں رہیں، بادشاہ کا میلان دیکھ کر منتظم الدولہ نے ایسا انتظام کیا کہ بسم اللہ خانم کا شوہر ان کو طلاق دے کر کانپور بھاگ گیا۔ بادشاہ نے میعادِ عدت میں ہی ۱۷۔ دسمبر ۱۸۲۱ء کو عقد کر کے محدرۂ زماں مہد عظمیٰ بلقیس دوراں ملکہ آفاق قدسیہ سلطان مریم بانو بیگم کا خطاب دیا۔ مرزا حسین بیگ جو سواروں میں نوکر تھے قدسیہ محل کے باپ مشہور ہوئے۔ نواب مظفر الدولہ خطاب پایا۔

قدسیہ بیگم کی سخاوت نزدیک و دور مشہور ہو گئی۔

خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی لکھتے ہیں:—

"ایک مرتبہ بادشاہ نے قدسیہ بیگم کو ایک کروڑ روپیہ دیا۔ انھوں نے مشائخوں، آزاد دل مجذوبوں اور صوفیانِ باصفا کو خوب دھوم دھام سے مدعو کیا —— چودہ دن میں ایک کروڑ روپیہ خرچ کر ڈالا۔"

شیخ تصدق حسین لکھتے ہیں:—

"جاڑے کے موسم میں لاکھ سوا لاکھ روپے مہینے کی رضائیاں بنتی تھیں گرمیوں میں ان کی ہوا نظر نہ آتی تھی کہ کدھر اُڑ گئیں۔

قدسیہ محل نے کہا "اشرفیوں کا ڈھیر نہیں دیکھا محل میں فوراً انبار ہو گیا۔ بادشاہ نے کہا اگر لطف دیکھنا چاہو تو لٹا دو اور وہ سب لٹا دی گئیں۔

ایک روز ایک نوشاہ اپنی نوعروس کو رخصت کرائے لئے جا رہا تھا۔ برات دولت سرائے سلطانی کے پاس سے ہو کر گزری جس میں روشن چوکی اور دوسرے باجے بج رہے تھے۔

لہ بیگمات اودھ۔ ص ۱۵۳-۱۵۴

مگر دلھن کے ساتھ جہیز کا سامان نہ تھا۔ بیگم نے باجے کی آواز سن کر دریافت کیا۔ "یہ باجا کیسا بج رہا ہے"۔ معلوم ہوا دولھا، اپنی دولھن کو رخصت کرا کے لئے جاتا ہے۔ حکم ہوا دولھن کو ابھی حاضر کرو۔ چوبدار و ملازمین شاہی دوڑے گئے اور دولھن کی پینس ڈیوڑھی میں لے آئے وہاں سے خادمائیں دولھن کو گود میں اٹھا کر بیگم کے روبرو لے گئیں۔ بیگم نے دولھن کا منہ دیکھا۔ صورت شکل پسند آئی اور فوراً اپنے زیورات کا صندوقچہ منگا کر دولھن کو جڑاؤ زیوروں سے لاد دیا اور محل کی خادماؤں کو حکم دیا۔ "خبردار بے رونمائی دیئے کوئی دولھن کا منھ نہ دیکھے۔ محل میں کئی سو عورتیں ملازم تھیں سبھوں نے حسب حیثیت کوئی نہ کوئی چیز سونے یا چاندی کی دے کر دولھن کا منھ دیکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آن کی آن میں زیورات کا ایک انبار لگ گیا۔ اس کے بعد دولھن رخصت کر دی گئی اور وہ سب زیورات بھی اس کے ساتھ کر دیئے گئے۔ بیگم کی ایک ادنیٰ نظر عنایت سے تھوڑی ہی دیر میں دولھن مالا مال ہو گئی۔

قدسیہ محل کی موت کا ذکر شیخ تصدق حسین صاحب مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتے ہیں۔

"باوجود[1] اس قدر الفت و محبت کے بادشاہ اور قدسیہ محل میں بعض اوقات شکر رنجی بھی ہو جاتی تھی مگر ۲۱ اگست ۱۸۳۴ء کو بقول سلمن بادشاہ پر ایسا غصہ سوار ہوا کہ وہ جامہ ہی سے باہر ہو گئے اور اسی حالت میں فرطِ غیظ سے فرمایا کہ میں نے تجھ کو خاک سے پاک کیا اور ادنیٰ حالت سے ملکہ کے رتبے کو پہنچا دیا۔ مگر اب انشاءاللہ پھر انھیں دھاڑوں کو پہنچا دوں گا۔ قدسیہ محل کی طبع نازک اس تلخ کلامی کے بار گراں کی متحمل نہ ہو سکی اور اپنے نقشِ حیات کو مٹانے کی غرض سے سنکھیا کھا لی۔ زہر اپنا کام کر گیا۔ بادشاہ بہت متأسف ہوئے اور ہر قسم کا علاج معالجہ بھی کیا مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ پہلے تو وہ اُن کے کرب و بےچینی کو ملاحظہ کرتے رہے مگر جب دم لبوں پر آ گیا اور جان بچنے کی کوئی امید نہ رہی تو بدحواس

---

[1] سفرنامہ سلمن صاحب ریزیڈنٹ اودھ بزبان انگریزی بحوالہ بیگمات اودھ صـ ۱۵۴۔

ہو کے گھوڑ دوڑ کے میدان والی چکر والی کوٹھی کی عمارت میں چلے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ بیگم کو یہ فکر دامنگیر تھی کہ وارث تاج وتخت انھیں کے بطن کا ہو اسی دُھن میں انھوں نے اپنے پہلے شوہر کو جس نے طلاق دی تھی زنانی پوشاک پہنوا کر کئی بار محل میں بلوایا تھا جس کی اطلاع بادشاہ کو ہو گئی تھی اور یہی واقعہ اس قضیہ کا اصلی سبب تھا۔"

مولوی خیر اللہ

فرنگی محل کے مشہور علما میں شمار ہوتے تھے۔ مولوی انوار الحق صاحب (جن کا باغ لکھنؤ میں مشہور ہے) آپ کے دادا تھے۔ مولوی خیر اللہ لاولد تھے۔ چودھویں صدی ہجری کے اوائل میں انتقال کیا۔

فرہنگ فسانۂ عجائب

(ا)

آب پاشی - پانی چھڑکنا۔ چھڑکاؤ۔
آبداری - خوبی۔ چمک
ابلق - گھوڑا جت کبرا جسکے ہاتھ پاؤں سفید ہوں۔
ابنائے روزگار - زمانے کے بیٹے دنیا والے
آپی - خود ہی۔ آپ ہی۔
آتش بار - آگ برسانے والی۔
آتو جی - استانی۔
اتھک - نہ تھکنے والا۔
اجابت - قبولیت۔
اجل رسیدہ - موت کو پہنچا ہوا۔ قریب الموت، کوسنے کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔
اچنبھا - حیرت
اچھال چھکا - اوباش عورت
احتمال - اندیشہ، ڈر، شک
احسن - سب سے زیادہ نیک۔ بہت اچھا۔
احمق الذی - بیوقوف
احیاناً - کبھی کبھی۔ گاہے گاہے۔ اتفاقاً
اختر شماری - تارے گننا
اختلاط - میل جول۔ ربط
آخر الامر - آخر کار

اخفا - پوشیدہ رکھنا۔ چھپانا
اخگر - انگارہ
اخوان الشیاطین۔ شیطان کے بھائی بند۔ خراب لوگ
آخوند - اُستاد
ادراک - سمجھ۔ شعور
آدم - ابوالبشر جناب آدم علیہ السلام
ادّھی - آدھا پیسہ۔ ایک باریک کپڑا۔
ادہم - کالا گھوڑا
اُدھیڑ بن - فکر، کسی کام کو کر ڈالنے کی کوشش
ادوائے - جوگیوں کا سامان
اذفر - تیز بو
آرام پائی - عمدہ جوتے جو مرد اور عورت دونوں پہن سکیں، تحفہ
اربعین - چہلم، چالیسواں
ارادت - عقیدت، اعتقاد
آرسی مصحف - شادی کی ایک رسم جس میں دولہا دلہن کو پلنگ پر بٹھا کر اور ان پر ایک کپڑا ڈال کر پہلے قرآن مجید کھول کر رکھتے ہیں تاکہ دونوں سورۂ اخلاص کی تلاوت

کریں پھر آئینہ درمیان میں رکھ کر
دونوں کو ایک دوسرے کی صورت
دکھاتے ہیں۔

ارجل ۔ گھوڑے کا ایک عیب ہے جس کا
ایک پچھلا پاؤں سفید ہو

اردوئے معلیٰ۔ لشکر شاہی

ارگجہ ۔ ایک خوشبو کا نام جو صندل،
گلاب، کافور، مشک، عنبر اور
چنبیلی کے تیل سے مرکب کی جاتی ہے

ارم ۔ جنت

اریکہ نشیں ۔ تخت پر بیٹھنے والا

آزر ۔ حضرت ابراہیم کے چچا کا نام، جو
(آذر) اپنے زمانے کے مشہور بُت تراش
تھے بقول بعض حضرت ابراہیم کے
والد کا نام۔

ازلی ۔ ہمیشہ کا، شروع سے

ازدہام ۔ بھیڑ

اساس ۔ جڑ۔ بنیاد

استراحت ۔ آرام

استعجاب ۔ تعجب

استغنا ۔ امیری، بے نیازی

استغفر اللہ ۔ میں اللہ سے بخشش چاہتا
ہوں، میں توبہ کرتا ہوں

استفسار ۔ دریافت کرنا، پوچھنا

اسد اللہ الغالب ۔ اللہ کا زبردست شیر یعنی
امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہ

اسرار ۔ بھید (جمع سِر کی)

اسفل السافلین ۔ سب سے نیچے کا حصہ، جہنم کا
سب سے نیچے کا طبقہ

اسمائے الٰہی ۔ خدا کے نام

اسم ذات ۔ ذات کا نام یعنی اللہ

اشرف المخلوقات ۔ پیدا کی ہوئی چیزوں میں سب سے
زیادہ پاک، سب سے بہتر مخلوق

اشہب ۔ سبز گھوڑا

اصحاب فیل ۔ ہاتھی والے ۔ یہ لوگ کعبہ ڈھانے
آئے تھے ان کا واقعہ قرآن پاک
کی سورۂ فیل میں مذکور ہے

اصیلوں ۔ جمع ہے اصیل کی ۔ بمعنی زن طباخ و
خدمت گزار

اعجاز نما ۔ معجزہ دکھانے والا

آغشتہ ۔ اٹا ہوا

اغماض ۔ چشم پوشی، درگزر کرنا،
پرہیز کرنا، گریز کرنا

افتاں وخیزاں ۔ گرتا پڑتا

افترا پردازی ۔ الزام واتہام دھرنا

افعی ۔ چھوٹا سانپ مگر بہت زہریلا۔
ناگ سیاہ رنگ کا

افگار ۔ زخمی ۔ چھدا ہوا

اک تارا ۔ ایک قسم کا ساز ہے کہ اسے ہندو فقیر اکثر بجاتے ہیں ۔ یہ ایک قسم کا کپڑا بھی ۔
اک پیچھے ۔ ایک قسم کی پگڑی
اکتفا ۔ کفایت کرنا ۔ کافی ہونا ۔
اکل و شرب ۔ کھانا پینا
اکمل ۔ سب سے کامل
اکید ۔ سخت
الا ۔ بجز، سوا
البیلے ۔ بے پروا
التفات ۔ توجہ
التہاب قلب ۔ گھبرانا، اختلاج
التیام ۔ مندمل ہونا، (زخم کا) بھرنا
الحق مُر ۔ سچی بات کڑوی ہوتی ہے
الڑھ ۔ شخص ناتجربہ کار، سادہ
الڑھ پنے کے دن ۔ بے فکری اور بے پروائی کا زمانہ
اکش ۔ جھوٹا کھانا
القلیل کالمعدوم ۔ کمیاب مثل معدوم کے ہے
الماس ۔ ہیرا
المست ۔ مست، جوانی کے نشہ میں چور
آلے پڑے ہیں ۔ زخم ہرے ہو گئے ہیں
امرتی مسلسل ۔ مٹھائی جلیبی کی قسم کی پیدا ہوتی ہے
امنڈ آنا ۔ بھر آنا
امرائیت ۔ ریاست ۔ امارت

امرد ۔ بے داڑھی مونچھ کا لڑکا
انا ۔ دودھ پلانے والی
انبار ۔ ڈھیر
انبساط ۔ خوشی
انبوہ ۔ بھیڑ
انٹی ماری ۔ زبردستی، خواہ مخواہ
اندام ۔ جسم
اندر ۔ (راجا) ہندو دیو مالا میں دیوتاؤں کا بادشاہ ہے ۔ اس کے دربار میں بہت سی پریاں موجود رہتی تھیں
اندوہ ۔ غم
اندوہ گیں ۔ غم گیں
اُنس ۔ محبت
انشا کروں ۔ لکھوں
انیس ۔ ساتھ بیٹھنے والیاں
اوبھی ۔ وہ بھی
اوچھہ ۔ امرا کے سونے کے پلنگ کی آرائش کی ایک چیز کا نام ہے ۔ یہ پلنگ کے برابر ایک سفید چادر ہوتی ہے اور اس کے چاروں طرف ایک رنگین کپڑا اس طور پر سلا ہوتا ہے کہ اس کے پھیلانے سے پلنگ کے پائے نہیں چھپتے ۔ اس رنگین کپڑے پر کلابتوں کے

نقش ونگار بنے ہوتے ہیں جب
اسے پلنگ پر پھیلا کر اس کے اوپر
توشک اور چادر پھیلاتے ہیں
تو وہ منقش کپڑا چاروں طرف سے
پلنگ کے چاروں پایوں کے درمیان
فرش کے قریب لٹکتا رہتا ہے۔

اوگی - کارچوبی کے کام کا سلیم شاہی جوتا
اہتزاز - حرکت میں آنا
ایذا - تکلیف
ایفا - پورا کرنا۔ نباہنا
ایّہا النّاس - (عربی) اے لوگو
آیہ وافی ہدایہ - آیت جو ہدایت کیلئے کافی ہے

ب

باب - دروازہ
بابل - نام شہر، کوفے کے نزدیک بعض
لوگوں کا خیال ہے کہ یہ شہر
عراق میں تھا اور وہاں ایک
کنواں ہے جہاں ہاروت و ماروت
نام کے دو فرشتے قید ہیں
بار - دیر، موقع، رسائی
باشی - جمع باشہ کی۔ یہ ایک شکاری پرندہ ہے
بال بھونری سے صاف - ان عیوب سے جو گھوڑوں میں
پائے جاتے ہیں معرا

بالک - بچہ
بالک ہٹ - بچہ کی ضد
باخود - اپنے آپ سے
بادلے - چاندی سونے کے تار سے بنا ہوا کپڑا
بادیہ پیمائی - جنگل ناپنا۔
بادیہ گردی - جنگل میں گھومنا
بار نہ پائے - آنے نہ پائے
باریدار - چنور ہلانے والی جیسی کرنے والی
باغ ارم - ارم نام ہے شہر عناد کا۔ کچھ لوگ
اسے بہشت شداد کہتے ہیں اور
کچھ اسے آٹھواں بہشت مانتے ہیں
باللہ - خدا کی قسم
بالچوی - پانی کا بڑا برتن
بالراس والعین - بسر و چشم
بالش - تکیہ
بالفعل - اس وقت
بالمشافہ - دو بدو۔ آمنے سامنے۔
بانا - وہ چیز جو مردانِ دلاور پاؤں
میں پہنتے ہیں۔ برق سے
کس شان سے آتا ہے بانکوں میں یگانہ ہے
اک پاؤں میں بانا اک پاؤں میں بالا ہے
بانا باندھنا - یکتائی کا دعوی کرنا
بانے - اسلحہ
باہر بندو - پردیسی
بال ہما - ہما کے بازو یا پنکھ۔ ہما کی

خاصیت کے بارے میں روایت
بیان کی جاتی ہے کہ جس کے سر پہ
بیٹھ جائے وہ بادشاہ ہو جائے۔

بالیں - تکیہ، سرہانا
باہم - ساتھ ساتھ
بائی پچی - ہوا جاتی رہی
بجرے - کشتی
بجن - باتیں
بحدّے کہ - اس حد تک کہ، یہاں تک کہ
بحر زخّار - بھاری سمندر، موجیں مارتا ہوا
سمندر، ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر۔
مشتق ہے زخر سے جس کے معنی ہیں
دریا کا لبالب ہونا پانی سے۔

بختی - ایک قسم کا قوی، بڑا اور سرخ
رنگ کا اونٹ، جس کو خراسان
سے لاتے ہیں۔ اس کو بخت نصّر
سے منسوب کرتے ہیں جس نے
عربی اونٹنی اور عجمی اونٹ سے
بچا لیا اس بچے کو شتر بختی کہا گیا
تھا۔ عام طور پر سانڈنی بھی کہتے ہیں۔
(بخت نصّر۔ نام ایک بادشاہ۔
کا ذکا بخت بمعنی پسر اور نصّر نام
بت کا۔ چونکہ اس کو حالت طفلی
میں اس بت کے آگے پڑا پایا تھا
اور اس کے باپ کا نام معلوم نہ
تھا اس لئے اس کا یہ نام رکھا گیا)

بخشندہ - بخشنے والا
بدرُجی - بے مجبتی
بدقوارے - بدشکل، بدقطع
بدنا - شرط لگانا
بدی تھی - جو بات مقدر میں لکھی تھی
بذلہ سنج - نکتہ سنج، باریکیاں سمجھنے والا، لطیفہ گو
بَر - جسم
برادۂ الماس - زہر
برآنا - سونے میں بولنا
براّق - سواری جس پر مسلمانوں کے
عقیدے کے مطابق رسول اکرمؐ
شب معراج میں سوار ہوئے تھے۔
بہت سفید رنگ
برایا - مخلوق
برچھک - برج عقرب
برخاستہ خاطر - پریشان خاطر
برسم یلغار - دھاوے کے طریقے سے
برشتہ - بھنا ہوا
برگزیدہ - بزرگ اور برتر
برن - شکل، بھیس
برنا - جوان
برودت - سردی
بروگی - مہجور
بزدلا - ڈرپوک

بسان - طرح

بست دربست - بیس حصہ لمبائی میں اور بیس ہی حصہ چوڑائی میں = ۲۰×۲۰

بشر - انسان

بطمے - شراب کی بوتل ، بط کی شکل کی

بعُد - دُوری

بعید - دُور

بقراط - یونان کے ایک فلسفی کا نام جو طبیب بھی تھا

بگٹٹ - گھوڑے کو اس طرح دوڑانا گویا لگام نہیں ہے۔

بگٹٹ پھیکے گیا - بہت تیز دوڑاے گیا

بگڑا - مغرور ہوا

بل - بلکہ

بلبل شیراز - شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی کا لقب ہے

بلطائف الحیل - عمدہ پیرائے میں

بلی - زوردار ، طاقتور

بلیا لوں - صدقے جاؤں

بمجرد - فوراً

بنارس کی سحر - بنارس میں صبح کے وقت گنگا پر اشنان کرنے والوں کی بھیڑ رہتی ہے ۔ اس لئے یہ منظر بہت دلکش ہوتا ہے۔

بنا گوش - کان کی لو

بند بند - جوڑ جوڑ

بند ہوئی - خاموش ہوئی ، گفتگو میں قائل ہوکر خاموش ہوجانا

بنے - مصنوعی

بنی اسرائیل - حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد

بُنیاں - بنیاد والا

بو دار - وہ کتے جو بو سونگھ کر شکار تلاش کرلیتے ہیں

بوریا - چٹائی ۔ ٹاٹ

بوسیدہ - پرانی ۔ سڑی گلی

بوقلموں - رنگ بہ رنگ ، طرح طرح

بوم - اُلّو

بولی ٹھولی - مذاق ہی مذاق میں سخن طعن وتشنیع

بھیاس - ایک راگنی کا نام ہے

بھٹکے - راستہ بھولا

بھجنگ - سیاہ چیز ۔ بہت کالے آدمی کو بھی کہتے ہیں

بھجنگے - ایک سیاہ رنگ کا پرندہ ۔ مجازاً کالے آدمی کو کہتے ہیں

بھر بھرا - خستہ

بھر بھرانا - محبت کے قصد سے کسی کی طرف مائل ہونا

بھڑکے - پاس

بہزاد - ایک نقاش کا نام جو عہد شاہ اسمٰعیل صفوی میں نقاشی کرتا تھا

اور اس فن میں اسے کمال
حاصل تھا۔
بھنڈارا - لنگر — ہندوؤں کا ہندو
فقیروں کو کھانا کھلانا۔
لکڑی چلانے والوں کے نزدیک
وہ ضرب جو حریف کے شکم کے
بائیں طرف لگے
بھوانی - ایک دیوی کا نام
بھیر - بھیڑ
بھیر بنگاہ - بازاریاں لشکر
بھیروں یا بھیرویں - ایک راگ کا نام ہے۔
بھیروں ناچنا - دگرگوں ہونا
بیت ابرو - بھووں کا شعر (یہ اس لئے کہا
گیا ہے کہ دونوں آنکھوں کی
بھویں شعر کی طرح ہوتی ہیں)
بیت السلطنت - دار السلطنت
بیت الصنم - بت خانہ
بیچوں و چرا - بغیر حیلہ و حجت کے
بیجپا - کسی ڈراونی چیز کا نام - وہ
صورت جو بچوں کو ڈرانے کیلئے
بناتے ہیں۔
بیڑے - کئی لکڑیوں کو جوڑ کر پانی پر رواں
کرتے ہیں۔ اسے بیڑا کہتے ہیں۔
بے ستون - اس پہاڑ کا نام ہے جسے
فرہاد نے شیریں کی تمنا میں
پرویز کے کہنے سے کھودا تھا
بے کم و کاست - بغیر کسی کمی کے
بیکنٹھ - جنت
بیگانہ وار - غیر کی طرح
بیم - خوف
بے مغز - احمق
بمینتا - جوگیوں کا سامان
بیہڑ - گنجان جنگل غیر مسطح، ناہموار جنگل۔

پ

پا چھے - پوربی لہجہ ہے۔ پیچھے
پا فتادہ - گرے پڑے
پالا پڑا - واسطہ پڑا
پانو ہنی - رخصتی کا گیت
پت - آبرو
پٹکا - وہ کپڑا جو کمر پہ باندھا جاتا ہے
پتھر پڑیں - اولے گریں (بددعا کے طور پہ)
پتھورا - رائے پتھورا یعنی پرتھی راج
پچھل پائیاں - چڑیلیں، جن کے بارے میں
کہا جاتا ہے کہ ان کے پاؤں
پھرے ہوئے ہوتے ہیں یعنی
ایڑیاں آگے اور پنجے پیچھے
ہوتے ہیں۔
پران وارے - جان نچھاور کرنا۔ جان نثار کرنا۔

پراگندہ ۔ منتشر، بکھرے ہوئے
پربین ۔ ذہین، اہل نظر، عاقل
پرتو ۔ روشنی
پرتھمی ۔ زمین، دنیا
پرکاہ ۔ کائی
پرمان ۔ شمار۔ بمعنی فضیلت، ثبوت
(ہندی میں پرمانڑ)
پرواز ۔ اُڑ جانا
پرے ۔ قطار در قطار پرندے
(دور دور)
پرے پرے ۔ علیحدہ، دور دور
پس ماندہ ۔ بچا ہوا
پشم ۔ ناف کے نیچے کے بال
پکھاوج ۔ خاص ہندوستان کا باجا ہے
اور یہاں کے ماہرین موسیقی کی
ایجاد ہے۔ اسی سے کھوخاں،
شتاب خاں دہلی والوں نے
طبلہ نکالا ہے۔
پگ ۔ قدم
پل ۔ اک دم
پلنگ ۔ چیتا
پنبہ دہاں ۔ منہ میں روئی والا یعنی خاموش
پنجتن ۔ پانچ آدمی مراد۔ محمدؐ، علیؑ، فاطمہؓ،
حسن علیہ اور حسین علیہ
پنچھی ۔ پرندہ

پنسوی ۔ چھوٹی کشتی
پنے ۔ سلیم شاہی جوتے کے اوپر کا
حصہ۔ تلا لگنے اور جوتے کی
شکل میں آنے سے پہلے اسے
پنہ کہتے ہیں
پوتھی ۔ کتاب۔ صحیفہ، نجومی کی جنتری
پوچ ۔ ناچیز
پوزی ۔ رسی کا حلقہ جو سرکش گھوڑے
کے منہ پر باندھا جاتا ہے۔
پورنماشی ۔ چودھویں چاند کی رات جب
پورا چاند نکلتا ہے۔
پھٹکی پھٹکی ۔ الگ الگ ۔ دور دور
پھینٹے ۔ صافے، دستار
پیت ۔ محبت
پیٹا ۔ لڑتے ہوئے پتنگ کی ڈور
جو لنگر کھا جاتی ہے، اُسے
پیٹا کہتے ہیں
پیچ پڑا ۔ جھگڑا پڑا۔ بنیاد پڑنا
پیچ واں ۔ وہ نیچہ جو لوہے یا جست کے
تاروں سے بنا ہوتا ہے پیچ
پیراموں ۔ آس پاس، ارد گرد
پیر کنعان ۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کو
کہتے ہیں
پیراہن ۔ لباس
پیر بخارا ۔ ایک بزرگ کا نام۔ ان کا مزار

لکھنؤ میں اسی نام سے مشہور ہے، انھیں بزرگ کے نام سے محلہ آباد ہے۔

پیش خدمت ۔ وہ خادم یا خادمہ جس کا کام منھ ہاتھ دھلانا، پانی پلانا، اور خاصدان اگالدان پیش کرنا ہوتا ہے۔

پیک نگاہ ۔ نگاہ کا قاصد، مراد نظر

پینڈیاں ۔ میوے، شکر اور میوے کی پینڈیاں جو شادی سے پہلے تقسیم ہوتی ہیں۔

ت

تازی ۔ شکاری

تازیانہ ۔ کوڑا

تاسف ۔ افسوس

تاک ۔ انگور کی بیل

تان سین ۔ علم موسیقی کا ایک زبردست ماہر، دربار اکبر کا ایک رتن

تبرداری ۔ کلہاڑی اٹھانا

تجاہل عارفانہ ۔ جان بوجھ کر نادان بننا

تج دیا ۔ چھوڑ دیا

تجسس ۔ تلاش

تحت الثریٰ ۔ سب سے نیچے کا حصہ۔ پاتال

تحریر کربلا ۔ کربلائے معلیٰ سے کفن آتے ہیں، جنھیں خلعت کہتے ہیں اور جن پہ آیات قرآنی ہوتی ہیں۔

ترپولیہ ۔ نوبت بجانے کا پھاٹک۔

تدرو ۔ تیتر

ترترانی ۔ مرغن

ترس ۔ خوف، رحم

ترسا ۔ نصاریٰ و آتش پرست۔ یہ لفظ رومی ہے

ترشح ٹپکنا

ترکنیں ۔ مسلح عورتیں جو ترکی نسل سے ہوں

ترنگ ۔ جوش

تریا ۔ عورت

تریاہٹ ۔ عورت کی ضد

تڑاق پڑاق ۔ تیز طرار

تسطیر ۔ لکھنا

تضرع ۔ زاری، رونا، گڑگڑانا

تفاوت ۔ فاصلہ

تفرقہ پرداز ۔ جدائی ڈالنے والا

تعاقب ۔ پیچھا

تکلم ۔ گفتگو

تکھتی ۔ تختی، لوح

تگاپو ۔ دوڑ دھوپ

تگ و دو ۔ دوڑ دھوپ

تلا ۔ میزان

تلامذہ - تلمیذ کی جمع ہے۔ شاگردوں
تلاطم - طوفان
تلے - نیچے
تمامی - سنہرا کپڑا
تنزّل - زوال
توام - جڑواں
توبہ نصوحا - دل سے سچی توبہ
تو تو میں میں - ایک دوسرے کو برا بھلا کہنا
توڑے دار - ایک پرانی وضع کی بندوق
تودہ - ڈھیر
توسن - گھوڑا
توشہ راہ - راہ کا سامان (جو سفر میں لے جاتے ہیں)
توفیق - صلاحیت
توقیر - عزّت
توکلت علی اللہ - بھروسہ کیا میں نے خدا پر
تیرہ - اندھیرا
تیرہ بختی - بدبختی
تیرہ و تار - اندھیرا
تیکھی - ترچھی، بانکی، دل میں گھر کرنے والی
تیمنا - تبرک کے طور پر

ٹ

ٹانٹھا - مضبوط، توانا آدمی
ٹماسا - مرید، پیرو یا مقلّد
ٹوم - محبوبہ، حسین و جمیل، زیور، سبب
ٹونا - جادو
ٹونا لگا - افسوں کا اثر ہوا
ٹونے - ایک قسم کا گیت، جس میں گالیاں ہوتی ہیں (ٹونا واحد ہو تو معنی افسوں)
ٹھاٹھروں - ٹٹیاں
ٹھاکر - خدا کا سیوک
ٹھٹھا - تمسخر، مذاق
ٹھنڈی گرمیاں - بے جا مذاق۔ بے محل اختلاط، بے تاثیر شوخی

ث

ثروت - امیری
ثور فلک - ستاروں کی شکل سے ایک برج فلکی قرار دیا ہے جس کی صورت بیل کی سی ہے۔

ج

جالینوس ۔ یونان کا ایک حکیم جو طبیب تھا
جامع المتفرقین ۔ الگ الگ لوگوں کو ملانیوالا یعنی خدا
جاں کنی ۔ جان نکلنا
جبلّی ۔ ذاتی، فطری
جبیں ۔ ماتھا
جٹا ۔ بالوں کی لٹ
جٹا دھاری ۔ ہندو جوگی فقیر، ایک قسم کا سانپ کہ اس کے سر پہ بال ہوتے ہیں
جدول ۔ حاشیہ = خط گلزار کے صفحے پر طلائی جدول (سودا)
جدّ و کد ۔ کوشش
جرّار ۔ بہت جرأت والا
جرس ۔ نقارہ، گھنٹہ
جرّے ۔ جمع ہے جرّہ کی یعنی باز کا نر۔ باز اس کی مادہ ہے۔ باز کے مقابلے میں جرّہ چھوٹا، کم شکار اور ضعیف ہوتا ہے۔
جریدہ ۔ تنہا، اکیلا
جزا ۔ اچھا بدلہ
جفرداں ۔ علم جفر کا جاننے والا۔ ایک علم ہے جس میں حروف کے اعداد کے لحاظ سے آئندہ کا حال معلوم کیا جاتا ہے۔
جگت ۔ کنویں کی من، زمانے کو بھی کہتے ہیں
جگر بندان خیر الانام ۔ جگر کے ٹکڑے رسولؐ اللہ کے (مراد امام حسن و حسین علیہم السلام)
جعد ۔ چوٹی
جعد پُر خم ۔ گھونگھر والے بال۔ مڑے ہوئے بال
جفا شعار ۔ ظلم پیشہ۔ ظالم
جفا کیش ۔ ظالم
جُل ۔ دھوکا
جلدو ۔ بدلہ
جلو ۔ سامنے
جلی ۔ موٹا، واضح
جم ۔ جمشید نام ہے، فارس کے ایک بادشاہ کا، جس نے ایک جام جہاں نما تیار کیا تھا۔ روایت ہے کہ اس میں وہ ساری دنیا کا حال دیکھ لیتا تھا۔ اسے جام جم بھی کہتے ہیں۔
جمجاہ ۔ جمشید کا سا مرتبہ والا
جناح ۔ پچھلا حصہ۔ بازو کو بھی کہتے ہیں

(فوج کے سلسلے میں استعمال ہوتا ہے)

جنجال - مصیبت، جھگڑا، جو چیز نہایت ناگوار خاطر ہو۔

جوار جوار - قرب وجوار کے ملک

جوآلہ - بہت بھڑکنے والا

جودت طبع - طبیعت کی پہنچ

جوزی - حلوہ سوہن کی قسم

جوز - قاش

جویا - ڈھونڈنے والا

جھالے - عورتوں کے کان کا زیور۔ اس بارش کو بھی کہتے ہیں جو زور شور سے برس کر جلد تر گذر جائے۔

جہاندیدہ - دنیا دیکھے ہوئے۔

جھانجھ - لوہے کے دو گول ٹکڑے بغیر کنارے کے بنا کر ان کی پشت پر ایک تبہ لگاتے ہیں اور اس کو ہاتھ سے پکڑ کر ایک دوسرے پر مارتے ہیں تاکہ آواز پیدا نہ ہو — جھانجھ، جھلاٹ کو بھی کہتے ہیں۔

جھپٹ - تیز رفتاری

جھٹ - ایک طرف، فوراً

جُھجھ - لڑائی جھگڑا

جھک مارنا - بیہودہ بات کرنا

جھمکڑا - صورت، تجلی، کر و فر، دیدار معشوق شوکت و تجمل

جہندہ - کودنے والا

جھونٹک جھانٹا - سخت لڑائی جھگڑا، ایک دوسرے کے بال پکڑ کر لڑنا

جیب - زبان

جیغہ - زیور مرصع جو پگڑی پر باندھتے ہیں

چ

چاپلوسی - خوشامد

چاٹ - مزیدار چیز

چادر پھراتے - طالب اماں ہوتے

چادر ہلانا - سپاہ مغلوب کا اماں چاہنا

چارقب - امرا کے لباس میں سے ایک قسم کا لباس ہے۔ یہ لفظ تر کی زبان کا ہے۔

چارکنا - ایک قسم کے زرہ کا نام

چال ڈھال - روش، انداز

چاؤش - لشکر اور قافلے کا نقیب

چاہ - عشق

چپیٹ - چوٹ کا تابع مہمل۔ جیسے چوٹ چپیٹ

چت - اُلٹا ہو جانا یعنی کمر کا زمین سے

لگ جاتا ؟

چتر ۔ چھاتا

چٹھی نویس ۔ وہ عورت جو امیروں کے محل میں لکھنے پڑھنے کی نوکری کرے ۔

چرخ زنگاری ۔ نیلا آسمان

چرسا ۔ عمدہ پکا ہوا چمڑہ ، جس کو عربی میں سبت کہتے ہیں ۔ مگر یہاں چمڑے کا بڑا ڈول مراد ہے جس کے ذریعہ کنویں سے پانی نکالا جاتا ہے ۔

چرکٹا ۔ ہاتھی کا چارہ لانے والا ، چارہ کاٹنے والا ، ہاتھی کیلئے مخصوص ہے ۔

چرن ۔ قدم

چسکی ۔ گھونٹ ، جرعہ افیون کا گھونٹ

چشم داشت ۔ امید رکھی

چشمۂ زندگانی ۔ زندگی کا چشمہ مراد

چشمک زن ۔ آنکھ سے اشارہ کرنا ، طعنہ زنی مراد ہے

چشم نیم وا ۔ ادھ کھلی آنکھ

چقماق ۔ یہ لفظ ترکی زبان کا ہے ۔ وہ پتھر جسے لوہے پر مار کر آگ نکالی جاتی ہے ۔ یہاں وہ بندوق مراد ہے جو چقماق کے ذریعہ چلائی جاتی ہے ۔

چلّہ ۔ (چلیہ) چالیس دن کی مدت

چم و خم ۔ خرام و رفتار ، ناز و ادا پیچ و خم

چندرماں ۔ ماہتاب ، چاند

چنڈول ۔ امیرزادیوں کے بیٹھنے کی سواری جسے کہار اٹھاتے ہیں

چواگن ۔ چاروں طرف آگ جلائے ہوئے اور روشن کئے ہوئے ۔

چوچلا ۔ نخرے

چوک لگا رہتا ہے ۔ مجمع رہتا ہے

چوگھڑا ۔ ساچق کے دن چار چار کلھڑ ، مٹی یا چاندی کے نقل اور میوہ سے بھر کر آرائش کے تختوں کے چاروں کونوں میں باندھ کر دولھا دلھن کے گھر لے جاتے ہیں ۔

چوپہلا ۔ پالکی کی قسم کی زنانی سواری جسے کہار اٹھاتے ہیں ۔

چونڈا ۔ سر کے بال ، جن کو ایک جگہ کر کے سر کے اوپر باندھ لیں ۔

چھُٹ ۔ بجز ، سوائے

چھکے ۔ ہوش

چھکے چھوٹ گئے ۔ ہوش اڑ جاتے ہیں

چہل کنجی ۔ ایک پیتل کا کٹورا ہوتا ہے جس میں چالیس چھوٹے چھوٹے

پیتل کے ٹکڑے ایک تار سے
بندھے ہوتے ہیں۔ ان کو کنجیاں
کہتے ہیں۔ اس کٹورے پر ۱۲ اماموں
کے نام اور سورۂ مریم کھدی ہوتی
ہے۔ کہا جاتا ہے یہ اس کٹورے
کی نقل ہے جس میں جناب مریم
نے بہ وقت ولادت حضرت عیسیٰ
علیہ السلام پانی پیا تھا اور
درد زہ کی تکلیف ختم ہو گئی تھی۔
بچے کی پیدائش کے وقت حاملہ
عورت کو چہل کنجی کے کٹورے سے
پانی پلایا جاتا ہے تاکہ اسمائے
متبرک اور سورۂ قرانی کی برکت
سے مشکل آسان ہو۔

چھو چھو ۔ وہ آیا، جو ڈسا کی لڑکیوں (صاحبزادی) کے ساتھ چھوٹے پن سے ہی کھیلتی ہے

چھوٹی اُمت ۔ ادنیٰ درجے کے لوگ، مزدور پیشہ، اہل حرفہ

چیتے ۔ چاہیے، سوچے

چیلوں ۔ لکڑی کے تختے جو قبر میں لگائے جاتے تھے

ح

حاجبان ۔ جمع ہے حاجب کی بمعنی دربان، پہرے دار، نگہبان

حاضری ۔ وہ کھانا جو میت کے گھر میں میت کے دفن کے بعد بھیجتے ہیں۔ شیرمال، کباب، پنیر، پیاز اور حلوہ جس پر حضرت عباسؑ کی نذر دلاتے ہیں۔

حاکیان ۔ حکایت بیان کرنے والے۔

حالی ۔ ظاہر

حامل ۔ اُٹھانے والا

حبشی ۔ حلوہ سوہن کی ایک قسم

حُجرہ ۔ کوٹھا

حدی خواں ۔ حُدی وہ اشعار ہیں جن کو اونٹ ہانکنے والے پڑھتے ہیں۔ ان اشعار کے پڑھنے والوں کو حُدی خواں کہتے ہیں۔

حرف ہے ۔ عیب ہے، لعنت ہے (حرف سے مراد حروف "لعن" سے ہے)

حرم محترم ۔ کعبہ شریف

حشری ۔ گھوڑے کا ایک عیب

حصن ۔ قلعہ

حصین ۔ مضبوط

حضار - حاضرین
حظ - مزا، لطف
حفظ مراتب - مرتبوں کی حفاظت، پاس آداب سے مراد ہے۔
حق سرہٗ - راست ہے بھید اس کا۔ یہ قمری کی آواز ہے۔
حقہ - ڈبیہ
حلیم - برُدبار
حمایتی - مددگار
حمائل - ہار، گردن میں لٹکنے والی چیز اسی بنا پر بعد میں "حمائل شریف" اصطلاح بنی۔
حمد - خدا کی تعریف
حمق - بیوقوفی
حمیدہ - تعریف کی ہوئی
حواس خمسہ - انسان کے پانچ حواس۔ ذائقہ، شامہ، لامسہ، سامعہ، باصرہ
حواصل - ایک سفید چڑیا جو اکثر دریا کے کنارے بیٹھی رہتی ہے۔
حول - حوالہ
حیص بیص - بحث، تامل، کشمکش

خ

خاشاک - کوڑا
خاصہ - کھانا، بادشاہ اور امرا کے کھانوں کو کہتے ہیں۔ امرا کی سواری کے مخصوص گھوڑے کو بھی کہتے ہیں
خام پارہ - ناتجربہ کار، ایک گالی بھی ہے۔
خانماں - گھربار
خاور - سورج
خائف - خوفزدہ، ڈرنے والا
ختن - حدودِ چین میں ایک شہر کا نام ہے
خجستہ - مبارک
خدشہ - اندیشہ
خدنگ - تیر
خدیو - بادشاہ، خداوند، اصطلاح میں مصر کے بادشاہ کو کہتے ہیں
خراد - اس کی اصل خراط ہے۔ اہلِ فارس نے خراد کر لیا۔ ایک آلہ ہے جس کے ذریعہ سے لکڑی کو صاف کیا جاتا ہے اور مختلف چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ مگر یہاں جلائے تربیت مراد ہے۔

خراش - ہلکا زخم - چھل جانا
خرسندی - خوشی، خوشنودی
خرمن - کھلیان
خروارے بہت سا
خروس - مرغِ سحر
خشت - اینٹ
خضر - ہریالی - شاخ سبز کو بھی کہتے ہیں - مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ جناب خضر کو حیاتِ جاوداں بخشی گئی ہے - زمین پر راستہ بھولنے والوں کو راستہ بتاتے ہیں - یہ جہاں بیٹھتے ہیں وہاں سبزہ پیدا ہو جاتا ہے - یہ سبزہ زاروں میں سیر کرتے ہیں اور جہاں کہیں ان کا گذر ہو جاتا ہے ان کے قدم کی برکت سے اس سرزمین پر سبزہ پیدا ہوتا ہے اسی مناسبت سے یہ نام ہے -
خطیر - کثیر
خفتگانِ خاک - خاک میں سوئے ہوئے مراد مردے
خفقان - دل دھڑکنا (ایک بیماری)
خلع - علیحدگی چاہنا عورت کا مرد سے
خنجر - گلا - ہنسلی گلے کی
خنجری - ڈفلی -

خود اسپے - وہ سوار جو خود گھوڑے کا مالک ہو یعنی اس کی طرف سے کوئی دوسرا نوکری نہ بجاتا ہو
خود پیچیدہ - آپ ہی آپ غصہ ہوتا رہا
خودسر - اپنی رائے پر چلنے والا
خوشہ چیں - بالی چننے والے
خوگر - عادی
خوں آشام - خون پینے والا
خوں چکاں - خون ٹپکانے والی
خیارتر - ککڑی
خیام - خیمے
خیل - گروہ
خیلا ہے - بیہودہ ہے، واہی ہے (زنانی گالی)

د

دار - سولی
دارِ مکافات - بدلے کی جگہ، دنیا
دارو گیر - دھر پکڑ
دار و مدار - کسی چیز پہ انحصار
دافع - دور کرنے والا
دافع البلیات - بلاؤں کا دور کرنے والا یعنی خداوند تعالیٰ

دامن گیر - دامن پکڑنے والا

دانتا کلکل - لڑائی جھگڑا بات بات پر

دائی - ملازمہ، خادمہ (میر امن کی باغ و بہار میں حسن بانو نے اپنی ملازمہ کو دائی کہا ہے)، فسانہ عجائب میں دائی اس عورت کے لئے کہا گیا ہے جو بچے کی پیدائش کے وقت مدد کرتی ہے۔ وہ ملازمہ جو بچہ کی پرورش کرے، بوڑھی ملازمہ جو ماں کے مرتبہ کی ہو کھانے پکانے والی ملازمہ۔ دائی بمعنی جنائی بھی آتا ہے۔

دائی جنائی - بچہ جنوانے والی

دخاں - دھواں حقے کو بھی کہتے ہیں۔

دَرب - دولت

دُرِّ یتیم - بڑا اور چمکیلا موتی کہ صدف میں تنہا پیدا ہوتا ہے اور جو بے باپ کے پیدا ہوتا ہے۔ ناں اس کی سیپ ہے۔ یکدانہ

دردِ زہ - پہلو کا درد، جو بچے کی پیدائش سے پہلے ہوتا ہے۔

دروغ - جھوٹ

دزدِ حنا - وہ سفیدی جو مہندی لگانے کے بعد باقی رہ جاتی ہے۔

دستاویز - سند

دست بُردی - چوری، ظلم، اچک لینا

دست پاچہ - پریشان - حیران، مبہوت

دشت نورداں - جنگل طے کرنے والے

دغدغہ - کھٹکا، خطرہ

دقیقہ - باریکی

دُگلے - (جمع) ایک قسم کا روئی کا لمبا کوٹ، مثل ہے:-
دگلا سب سے اگلا، پہنو تو گرم بچھاؤ تو نرم باندھو تو بقچی کا بھرم

دَل - گردہ، موٹائی مثلاً بعض پھلوں کے لئے آتا ہے کہ موٹے دَل کا ہے۔

دلدوزی - دل سینا، تکلیف دینا

دل گرفتہ - رنجیدہ

دمامہ - نقارہ

دمدمے - تودے، ٹیلے، برج

دُمچی - (ترکی لفظ) وہ حلقہ جو گھوڑے کی دُم کے نیچے ہوتا ہے۔

دمساز - عزیز، ہر وقت کا ساتھی

دم واپسیں - موت کا وقت، آخری سانس

داؤ منجے گئے - داؤ ہار گئے۔

دوال - اسباب، تجمل و شان و شوکت، یہاں مراد نمائش سے ہے۔

دو بدو - آمنے سامنے

دوچت - دیکھنا، توجہ کرنا

دودماں - خاندان

دودھیا - حلوہ سوہن کی ایک قسم

دو رویہ - دونوں طرف، دو قطاروں میں
دوسار - نشانے پر لگنا، اثر کرنا
دولاب - چرخی، رہٹ
دو ماہہ - دو مہینے کی تنخواہ
دوں - کمینہ، نیچ
دونا - شاہ نصیر کا مصرعہ ہے ؎
نرگس کے پھول بھیجے ہیں دونے میں ڈال کر
پتوں کو برتن کی شکل میں بنا لینا
تاکہ اس میں پھول یا مٹھائی وغیرہ
رکھی جا سکے
دونا چڑھانا - مٹھائی وغیرہ دونے میں رکھ کر
مزار وغیرہ پر چڑھانا حضرت
مشکل کشا یا حضرت خاتون جنت
یا کسی اور بزرگ کے نام کی
مٹھائی چڑھانا - مراد نذر و نیاز
سے ہے۔
دونا ماننا - کسی کی نذر و نیاز کا عہد کرنا۔
دُود - دھواں
دھج - وضع، روش
دھن - قوس
دھرپد - گانے کی ایک قسم
دھرم مورت - مجسم مذہب
دِیا - عنایت
دید وادید (ملاقات کیلئے) آنا جانا
دیدوں - آنکھوں کے ڈھیلے
دید ہو نہ شنید ہو - دیکھی ہو نہ سنی ہو
دیگ - دیگچہ - مراد فیاضی
دیگ تیگ - سخاوت اور تلوار کا دھنی
دیدے - آنکھیں

ڈ

ڈاب - پرتلا - اس چیز کو کہتے ہیں جسے
کمر میں باندھ کر اس میں تلوار
لٹکاتے ہیں
ڈانوا ڈول - حیران، پریشان، تذبذب،
کسی بات پر دل نہ جمے۔
ڈاہ - حسد، جلن
ڈبرے - گڈھا جس میں برسات کا پانی
جمع ہوتا ہے
ڈول - حال، عالم، انداز، طور
ڈھب - سلیقہ
ڈھب پر نہ چڑھی - رضامند نہ ہوئی، مرضی
کے مطابق نہ ہونا
ڈھب ڈھبانے - تیرنے، پانی میں ہاتھ پاؤں
مارنے
ڈھڈھے - رنگ بہت زرد
ڈھڈو - کوّے کی مادہ کو کہتے ہیں یہاں
مراد بڑھیا سے ہے۔
ڈھکوسلا - فریب، سخن مہمل

ڈھگ ۔ پاس، قریب
ڈھل گنڈوں ۔ بزدلوں
ڈیل ۔ جسم

ذ

ذرہ از خورشیدِ خصائل ۔ عادتوں کے سورج میں سے ایک ذرّہ
ذکی ۔ عقلمند
ذوی الاقتدار ۔ صاحبِ قدرت، اختیار والے
ذی شعور ۔ صاحب عقل

ر

راج ہٹ ۔ بادشاہ کی ضد
رام کہانی ۔ لمبی داستان
راہی ہوا ۔ چلا گیا
راندہ ۔ نکالا ہوا
رت جگا ۔ شب بیداری ۔ وہ رات جب عورتیں گا بجا کر بسر کرتی ہیں اور پکوان پکاتی ہیں
رجال الغیب ۔ غیبی انسان
رحیل ۔ کوچ
رخش ۔ وہ گھوڑا جس کا رنگ سفید و سُرخ ملا ہوا ہو ۔ رستم کے گھوڑے کا نام بھی رخش تھا ۔
رخنہ بندی ۔ سوراخ بند کرنا
رخنہ پرداز ۔ خلل ڈالنے والا
ردّو قدح ۔ بحث مباحثہ، تکرار
ردّی ۔ خراب کاغذ
رزم ۔ لڑائی
رستم ۔ فردوسی کے شاہنامے کا ہیرو جو اپنی قوت اور شجاعت کے لئے ضرب المثل ہے ۔ زال کا بیٹا
رس کا خلل ۔ گھوڑے کی ایک بیماری، جس میں سموں سے پانی رسنے لگتا تھا
رضوان ۔ جنت کا داروغہ
رَضِینا بالقضا (مقولہ) راضی ہوئے ہم مقدر پر
رطب و یابس ۔ تر اور خشک مراد اچھا اور برا
رعد ۔ گرج ۔ بجلی کا فرشتہ
رقیمۂ شوق ۔ شوق کا خط
رکابدار ۔ باورچی، حلوہ بنانے والا
رکن ۔ کھمبا یا ستون
رَم ۔ بھاگنا (آہوے رم خوردہ ۔ بھاگا ہوا ہرن)
رمز و کنایہ ۔ بھید اور اشارے کی بات
رمنا ۔ جہاں سلاطین وحشی جانوروں کو شکار کے لئے چھوڑ دیتے ہیں ۔ وہ جگہ جہاں کسی کی

روزمرہ آمدورفت ہے۔ فارسی
میں چراگاہ کو کہتے ہیں جہاں
ہرن چرتے پھرتے ہیں۔ اس کے
لغوی معنی ہیں جمع ہونے کی جگہ۔

رمیدگی ۔ بھاگنا
رَن ۔ میدانِ کارزار
رنڈی ۔ عورت
روباہ ۔ لومڑی
روزِ جزا ۔ قیامت کا دن
روزمرے ۔ محاورے جو روزمرہ بولے
جاتے ہیں اور بول چال میں
رائج ہوتے ہیں
روند ۔ پہرے داروں کا گروہ
روئیں تن ۔ لوہے کی طرح سخت جسم رکھنے والا
ریاض ۔ باغ
ریختہ ۔ اردو زبان
ریل پیل ۔ کثرت یا زیادتی

ز

زاغ ۔ کوّا
زال ۔ بڑھیا
زائروں ۔ زیارت کرنے والے
زبان زد ہونا ۔ چرچا ہونا
زبون ۔ مکروہ، برا
زردوزی ۔ جس میں چاندی سونے کے
تار اور ریشم کے پھول بنے
ہوتے ہیں۔
زرہ پوش ۔ زرہ پہنے ہوئے
زعم ۔ غرور
زغن ۔ چیل
زمرے ۔ مجمع، جماعت گروہ
زمہریر ۔ برف، بالائی فضا کا وہ طبقہ
جہاں اتنی سردی ہوتی ہے کہ
ہر چیز جم جائے
زنبق ۔ ایک سفید پھول جس کی پنکھڑیاں
بڑی ہوتی ہیں اور اس میں
خوشبو کم ہوتی ہے۔
زنخ ۔ ٹھوڑی
زنداں ۔ قیدخانہ
زنگ ۔ ناقوس
زورق ۔ چھوٹی کشتی
زور رقم ۔ غضب کی چیز، نہایت حسین
زیرک ۔ دانا

ژ

ژولیدہ ۔ اُلجھا ہوا

س

سابقین ۔ اگلے لوگ

ساپن ۔ گھوڑے کا ایک عیب ہے گردن پر ایک بھونری سانپ کی شکل کی ہوتی ہے۔

ساچق ۔ شادی کے روز رات کے وقت مگر عقد سے پہلے کچھ گھوڑے اور ٹھلیاں جو رنگیں اور منقش ہوتے ہیں اور جن میں میوے اور نقل وغیرہ اور بہت سی چیزیں یعنی مہندی وغیرہ ہوتی ہیں۔ دولھا یہاں سے دولھن کے گھر لے جاتے ہیں۔ ان گھوڑوں پر شمعیں روشن ہوتی ہیں۔ اسی وقت بری کا جوڑا بھی جاتا ہے اس کو بَری بھی کہتے ہیں۔

ساری ۔ گھسنے والا، اثر و سرایت کرنے والا۔ یہاں مراد غالب ہے۔

ساقہ ۔ دُنبالۂ لشکر، فوج پس، فوجِ معیّنہ، فوج کا پچھلا حصّہ

سالک ۔ راہ چلنے والا۔ اہل سلوک

سالک و مجذوب ۔ سلوک و جذب، تصوف کی اصطلاح میں مدارج کے نام ہیں

سام ۔ موت۔ جدِّ رستم۔ یہاں پہلوان مراد ہے۔ زال کا باپ، یہ پہلوان یک چشم بھی تھا، کہتے ہیں کہ اس کے ایک ہی وار میں مقابل موت کے گھاٹ اُتر جاتا تھا۔

سامری ۔ ایک مشہور جادوگر جو سامرہ کا باشندہ تھا۔ روایت ہے کہ اس نے جبریل کے گھوڑے کی خاک اُٹھالی تھی۔ یہ بعض آثار سے جبریل کو پہچانتا بھی تھا۔ وہ خاک اس نے گوسالہ کے جوف میں، جو سونے چاندی سے بنائی گئی تھی، ڈال دی، وہ گوسالہ جاندار ہوگئی اور بولنے لگی اور اس کی وجہ سے حضرت موسیٰؑ کی امت کے بہت سے لوگ گمراہ ہوگئے۔

سامع ۔ سننے والا

سامعون ۔ سننے والے

سانحہ ۔ واقعہ

سانٹھ مار ۔ چابک والا

سبز پوشاں ۔ برگزیدہ لوگ۔ حضرت حسنؑ نے غم میں (کہ وہ زہر سے شہید ہوئے تھے)، سبز کپڑے پہنتے ہیں یہ

لوگ بھی سبز پوش ہوتے بچوں
کو بھی محرّم کے زمانے میں اسی
مناسبت سے سبز کپڑے پہناتے ہیں

سبک دوش۔ ہلکا

سبک روی۔ تیز چال

سبیل - ضرورت، حاجت

سپر - ڈھال

سپنج - سہ پنج چند روزہ

سپہر - آسماں

ست - طاقت، قوت، دوا کا جوہر

ستودہ صفات۔ پاکیزہ خصلتیں یا عادتیں
رکھنے والے

سٹھنیاں - عورتوں کی اصطلاح میں گیت
کا نام ہے جو ڈومنیاں آرسی مصحف
کے وقت گاتی ہیں

سج - صورت، وضع قطع، بھیس

سجے - خوبصورتی سے باندھے ہوئے

سحاب - بادل

سحبان وائل۔ عرب کے ایک فصیح و بلیغ شاعر
کا نام ہے۔ سحبان کے باپ کا
نام وائل تھا

سحر - جادو

سخن سنج - کلام تولنے والا، شعر کو سمجھنے والا

سُدھ - ہوش، آگاہی

سُدھ بدھ لینا۔ خبر لینا

سراپا - سر سے پیر تک

سراپردہ - بارگاہ شاہی، وہ پردہ جو
بطور دیوار خیمہ کے آگے
کھینچ دیا جائے

سراج - چراغ

سراسیمہ - پریشان، گھبرایا ہوا

سرایت - اثر کر جانا

سرپیچ - پگڑی۔ ایک قسم کا صافہ

سردست - ابھی

سرعت - تیزی

سرفروکندہ۔ سر نیچا کرنے والا، سر جھکا
دینے والا

سرگرداں - آوارہ و پریشان

سرنوشت - تحریر ادل

سرطانِ فلک - کیکڑا۔ ایک برج فلکی کا
نام ہے جو باعتبار صورت نجوم
اہل نجوم نے قائم کئے ہیں

سرور - سردار

سریر - تخت (ذوق)

بری منزل میں ہے ماہ سریع السیر وہ مہوش
خواص اسکا ہے گھر میں دشمنوں کے قطب تارے کا

سریع السیر - تیزی سے گذرنے والا، وہ
سیارہ جو تیزی سے اپنی منزل کو
پہنچتا ہو

سزاوار - لائق

سعادت - نیک بختی
سفاک - خونریز، خونخوار
سفلہ - نیچے کے (شیطان سے متعلق) کمینہ
سفلہ پرور - کمینہ کا پالنے والا
سفینہ - کشتی
سفیہہ - احمق
سقائے سکینہ - جناب عباس علیہ السلام جو معرکہ کربلا میں جناب سکینہ دختر جناب امام حسین کے لئے مشک لے کر نہر فرات سے پانی لینے کیلئے گئے تھے اسلئے ان کا یہ لقب ہو گیا تھا۔
سقر - جہنم کا ایک طبقہ
سقراط - یونان کے ایک حکیم کا نام، جس کو زہر پلا کر مارا گیا تھا۔
سقف - چھت
سقراتی - یاناتی
سقیم - ابتر، خراب
سکھپال - زنانی سواری کا نام (پردہ نشین عورتوں کے لئے)
سلاسل - زنجیر
سلف - زمانۂ قدیم، عہد گزشتہ
سلک گہر - موتی کی لڑی
سلیم - سیدھا
سلیمان - ایک پیغمبر کا نام ہے۔ حضرت داؤد کے بیٹے۔ ان کی حکومت جن وانس، چرند پرند یعنی جملہ مخلوق پر تھی۔ کہتے ہیں کہ دیو جن دیو پری خود کو انکی امت میں شمار کرتے ہیں اور ان کی قسم دلا دینے کے بعد پھر اس سے نہیں پھرتے۔
سلہٹ - سلیٹ جس کا رنگ سیاہ ہے
سم - زہر
سمند - گھوڑا
سنّاٹے - شدومد سختی، خاموشی، حیرت
سنان - برچھی
سنڈا - فربہ آدمی۔ تندرست مسٹنڈا
سنگ پشت - کچھوا
سُنگرنین - سُنگر (مونث، جمع) میوہ فروش عورت کو کہتے ہیں
سنگ = سنگھ۔ ساتھ کا، مثل، نظیر، جواب
سنگسار - پتھر سے مارنا
سنیچر - نحوست، زحل
سورج جھنکار نانک متی کی۔ توپوں کی قسمیں ہیں
سوفار - تیر کے پر
سُوئے - توتا۔ مشرقی یوپی میں سُگا بھی کہتے ہیں۔
سہل ممتنع - اس طرح کا سہل جو باز رکھنے والا ہو۔ وہ نظم جس کی نثر نہ کی جا سکے،

وہ نثر کہ اس سے آسان الفاظ
میں اس کو نہ کہا جا سکے یعنی اسکی
تقلید ناممکن ہو۔
سیاح ۔ سیر و سفر کرنے والا
سیّد ۔ سردار
سید الشہدا کا شیدا۔ جناب امام حسین
علیہ السلام کا محب دعاشق زار
سیر ۔ پیٹ بھرا، آسودہ
سِیر عادتِ۔ سیرت کی جمع
سیماب وش ۔ پارے کی صورت
سیوک ۔ خدمتگار
سیہ اعمال ۔ بد اعمال

ش

شام اودھ ۔ اپنی دلکشی کے لئے مشہور ہے
کسی زمانے میں لکھنؤ کے چوک
کی شام نہایت دلفریب ہوا
کرتی تھی۔
شافی ۔ شفا دینے والا
شافیٔ مطلق ۔ خداوند تعالیٰ، جس کے اختیار
میں مکمل شفا بخشنا ہے۔
شاق ۔ ناگوار
شاہجہاں آباد۔ دہلی کا پرانا نام جسے شاہجہاں
نے بسایا۔

شایاں ۔ لائق
شبدیز ۔ گھوڑا
شب زندہ دار۔ رات کو جاگنے اور عبادت
کرنے والا
شب کتخدائی۔ شادی کی رات
شب کور ۔ گھوڑے کی بیماری ہے۔ جب
اس کو رتوند (رات کو دکھائی
نہ دینا) آتی ہے۔
شحنہ ۔ کوتوال (مثل ہے: اترا شحنہ
مردک نام)
شدہ شدہ ۔ ہوتے ہوتے
شست ۔ نشانہ
شش جہت ۔ مشرق، مغرب، شمال، جنوب
اوپر نیچے
شط ۔ کنارۂ دریا
شطرنجی ۔ خانے دار دری
شعبدہ بازی ۔ فریب دینا۔ نیرنگیاں دکھانا
شق ۔ پھٹنا
شقی ۔ سخت دل
شقّے ۔ حکم
شکیب ۔ صبر
شل ۔ تھکے ماندے
شلک ۔ ترکی زبان کا لفظ۔ کئی بندوقوں
کے یکبارگی سر ہونے کی آواز
کو کہتے ہیں۔

شلنگ ۔ ایک مقام سے دوسرے مقام تک کودنا۔

شمائل ۔ خصلتیں، عادتیں

شملہ ۔ عمامہ، صافہ

شمہ ۔ ذراسا، تھوڑا

شور و شین ۔ فریاد

شوم ۔ منحوس، خراب

شناور ۔ تیراک

شہدا ۔ بدمعاش، لچا، بازاری آدمی

شہ بالا ۔ چھوٹا دولھا (دولھے کا چھوٹا بھائی جو دولھا کے پیچھے سوار ہوتا ہے)

شیر بچہ ۔ ایک قسم کی چھوٹی بندوق

ص

صاحبِ زہد و ورع ۔ تارک الدنیا، زاہد و متقی

صادق الاقرار ۔ سچا وعدہ کرنے والا

صاعقہ ۔ بجلی، چمک

صائم النہار ۔ دن کو ہمیشہ روزہ رکھنے والا

صباح و مسا ۔ صبح و شام

صحنک ۔ ایک چھوٹا کونڈا یا طباق جس میں شیرینی، چاول یا کھیر وغیرہ بھر کے حضرت فاطمہؓ کی نیاز دی جاتی ہے۔ اس کو صرف سادات عورتیں کھا سکتی ہیں۔ مصغر صحن بمعنی طبق طعام۔

صراطِ مستقیم ۔ سیدھا راستہ

صرصر ۔ آندھی

صریح ۔ صاف، واضح

صعوبت ۔ سختی، تکلیف

صلواتیں ۔ بری باتیں، گالی

صناعی ۔ کاریگری

صنعت ۔ کاریگری

صوابدید ۔ صلاح و تجویز، مشورہ

صور ۔ صور اسرافیل، جس بگل کے ذریعہ قیامت کا اعلان ہوگا۔

صورت ۔ طرح

صولت ۔ دبدبہ

صیغۂ اخوت ۔ بھائی چارگی

ض

ضرر ۔ نقصان

ضعیف ۔ کمزور

ضلالت ۔ گمراہی

ضیا ۔ روشنی

ط

طاق - یکتا، معطّل، بیکار
طالع - نصیب
طائرِ فرزانہ - عاقل پرندہ (یہاں مراد توتے)
طائفہ - گروہ
طبلۂ عطار - عطّار کا منھ بند ڈبّا
طپیدن - تڑپنا
طرحدار - خوبصورت
طرفہ - عجب
طرفتہ العین - پلک جھپکنے میں
طُرّہ - اضافہ، پگڑی کا وہ سرا جو اوپر اٹھا رہتا ہے۔ شاہ نصیرؔ

شب کو تجھ کو کیونکر پھبتا سر پہ طرہ ہار گلے میں
جوں پہ دن ڈھلہ مہ تھا سر پہ طرہ ہار گلے میں

طشت - تھال
طور - حالت
طوطیِ پسِ آئینہ - طوطی کے پڑھانے کا یہ طریقہ ہے کہ پنجرہ آئینہ کے سامنے رکھ کر خود پیچھے بیٹھ جاتے ہیں اور بولتے ہیں۔ طوطی اپنا عکس آئینہ میں دیکھ کر یہ سمجھتی ہے کہ دوسری طوطی بیٹھی ہے اور اس کو دیکھ کر بولتی ہے۔ اس سے مجازاً انسان مراد لی جاتی ہے۔
طلاقت - طاقتِ گویائی
طلبیدہ - طلب کیا ہوا
طیور - پرندے (جمع طائر کی)
طیر - پرندے

ع

عاجر - پسندیدہ
عارف - خداشناس
عاری - ننگا، خالی
عازم - ارادہ کرنے والا
عبّاسؑ - حضرت امام حسین علیہ السلام کے بھائی جو معرکۂ کربلا میں لشکرِ حسین کے علمبردار تھے۔
عبث - بیکار
عجب و نخوت - غرور و خود بینی
عجوز - بوڑھا
عدیل - مانند و مشابہ، نظیر
عُبدہ - حیلہ، بہانا
عرصہ - میدان، مدت
عرصۂ شہود - میدانِ ظہور، جلوہ گاہ
عرصۂ قتال - میدانِ جنگ
عرض بیگیوں - عرض کرنے والوں، وہ لوگ

جو بادشاہ کے حضور میں لوگوں
کی عرضیاں پیش کرتے تھے۔

عریاں - ننگا

عزاداری - ماتم داری

عزلت گزیں - گوشہ تنہائی اختیار کرنے والا

عزم بالجزم - پکا ارادہ

عسرت - تنگی، تنگ دستی، مفلسی

عسکر - لشکر

عسل - شہد

عش عش - حیرت میں آکر تعریف کرنا

عصر - زمانہ

عفت - پاکبازی

عقدہ - گرہ

عقدہ لاینحل - وہ گرہ جو نہ کھل سکے

عقرب - بچھو، بروج آسمانی میں سے
ایک جو بچھو کی شکل کا ہے۔ گھوڑے
کا ایک عیب گردن میں ایک بھوری
سانپ کی شکل کی ہوتی ہے۔

عقوبات - (جمع) عقوبت بمعنی سزا اور سختی۔

عقیل - دانا

علت - وجہ، سبب

علم - جھنڈا

علوی - اوپر کے۔ آسمانی

علی الخصوص - خاص طور پر

علیہ اللعن - اس پر لعنت ہو

عماری - جو ہاتھی کی پشت پر رکھا
جاتا ہے اور جس میں بیٹھتے ہیں

عمداً - جان بوجھ کر

عمل - سرحد جہاں تک اس کا حکم
چلتا ہے۔ دخل، حکومت،
اسی سے عملداری بنا ہے۔

عنان - باگ

عنایت علی الدوام - مستقل عنایت

عندالضرورت - ضرورت کے وقت

عوج بن عنق - ایک طویل القامت انسان
کا نام ہے جو روایت ہے کہ
حضرت آدم کے زمانے میں
پیدا ہوا تھا اور حضرت موسیٰ
کے زمانے تک زندہ رہا۔ اس کی
عمر تین ہزار پانچ سو سال مانی
جاتی ہے۔ روایت ہے کہ طوفانِ
نوح اس کی پنڈلیوں تک آیا
تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنا
عصا اس کے ٹخنے پر مارا تھا،
جس سے وہ گر کر مر گیا تھا۔

عین الکمال - انتہائے کمال

عیاذاً باللہ - خدا کی پناہ

غ

غٹ - گروہ، ہجوم

غربت زدگان۔ مسافرت کے مارے ہوئے۔ پردیسی

غریب الوطنی - مسافرت، بے وطنی

غریق - ڈوبا ہوا، ڈوبنے والا

اَلْغَرِیْقُ یَتَشَبَّثُ بِکُلِّ حَشِیْشٍ

ڈوبنے والا ہر تنکے کا سہارا لیتا ہے

غریو - غرانا، آوازِ تند، شور وغل

غفر اللہ لک۔ خدا تجھے معاف کرے

غلام گردش۔ نیچے کی منزل میں کمرے کے سامنے کا برآمدہ

غواص - غوطہ خور

غول - بھوت

غیبت - عدم موجودگی

غیرت ماہ۔ چاند کو شرمانے والا

غیظ - غصہ

غیور - غیرت والے

ف

فاحشہ - بدکار

فر - دبدبہ، شان وشوکت

فراخور - لائق، مناسب، سزاوار

فراش - فرش بچھانے والا

فراواں - زیادہ

فرحاں - خوش

فرخندہ صفات۔ مبارک صفات

فرشتہ خاں۔ فرشتہ صفت آدمی۔ ناسخ کا مصرع
بن کے آیا فرشتہ خاں قاصد

فرعون - مصر کے بادشاہ کا لقب حضرت موسیٰ کے وقت میں مصر کا بادشاہ تھا جو بہت سرکش اور مغرور تھا اس لئے مجازاً ایسے ہی آدمیوں کے لئے کہتے ہیں۔

فرفر - جلد جلد چلنا

فرق - پیشانی کے اوپر، وہ جگہ جہاں سے سر کے بال شروع ہوتے ہیں

فرمان - لکھا ہوا حکم

فرنگی محل - لکھنؤ کا ایک محلہ ہے جہاں علمائے اہل سنت رہتے ہیں۔

فریدوں - نام ہے فارس کے ایک بادشاہ کا جس نے ضحاک پر فتح پائی۔

فریم - چوکھٹ

فری میسن - (Freemason) خفیہ سوسائٹی کے ایک فرد کو کہتے ہیں۔ اس کا مقصد معلوم

نہیں، بظاہر معاشرتی تعلقات بڑھانا اور دوسروں کی مدد کرنا۔ اس کی ممبری کے سلئے مذہب وملت کی قید نہیں۔ اس کی تنظیمی حیثیت کسی حد تک ایسی ہے جیسی آجکل روٹری کلب کی ہوتی ہے۔

فزوں ۔ زیادہ

فقیہہ ۔ مسائل دینی جاننے والا عالم فقہ

فنس ۔ زنانی سواری جنھیں کہار اٹھاتے ہیں۔

فی زمانا ۔ ہمارے زمانے میں

فہیم ۔ سمجھ دار

فیلسوف ۔ عقلمند، حکیم، مگر یہاں مکار مراد ہے۔

ق

قاری ۔ قرأت کا ماہر، حروف کو صحیح مخارج سے ادا کرنے والا، پڑھنے والا

قاش ۔ زین کا اگلا حصّہ جو لکڑی کا ہوتا ہے اور اُٹھا ہوا ہوتا ہے

قافلہ باشی ۔ قافلہ کا کوتوال

قاقم ۔ ایک جانور کا نام ہے اس کا پوست بہت ملائم اور سفید ہوتا ہے اس کی پوستین بناتے ہیں

قالب ۔ جسم

قائم اللیل ۔ رات کو کھڑا رہنے والا (عبادت کے لئے) رات کو نماز پڑھنے والا

قباد ۔ شاہان کیانی میں سے ایک بادشاہ کا نام ہے جو بادشاہ نوشیرواں اور آل ساسان میں سے تھا

قبح ۔ عیب

قتیل ۔ قتل کیا ہوا

قدر انداز ۔ نشانہ باز

قرار واقعی ۔ خوب خوب، وہ بات جو متعین ہو چکی ہو

قرارمین ۔ یہ لفظ ترکی ہے۔ ایک قسم کا فراخ ذہن تفنگچہ

قران السعدین ۔ دو سعد تاروں کا ایک برج میں اکٹھا ہونا کہ ان کی سعادت دوبالا ہو جائے

قربوس ۔ زین کے ایک حصّے کا نام ہے۔ بلندی پیش زین۔ اس کو حنائے زین بھی کہتے ہیں۔

قرطاس ۔ کاغذ

قرمساق ۔ بھڑوا

قرابت ۔ دامادی
قرۃ العین ۔ آنکھ کی ٹھنڈک
قریبوں ۔ رشتہ دار
قلب ۔ بیچ کا (لشکر)
قلق ۔ تکلیف
قلماقنیں ۔ مسلح عورتیں (ایک خانہ بدوش ترکستانی قبیلہ)
قوس قزح ۔ دھنک
قور ۔ ترکی میں ہتھیار کو کہتے ہیں اور قورچی کے معنی ہیں، دربار کا اہتمام کرنے والا۔ یہاں قورمیں کے معنی ہیں اہتمام کے واسطے
قوم عاد ۔ یہ وہ قوم تھی جس پر حضرت ہود کو پیغمبر کر کے بھیجا گیا تھا۔ ان کی بد دعا سے اس قوم پر طوفانِ باد نازل کیا گیا۔ (عاد و ثمود۔ دو قومیں جن پر عذاب الٰہی آیا اور جو تباہ ہو گئیں)
قہاری ۔ بہت زیادہ قہر کرنا۔
قیافہ شناسی ۔ صورت دیکھ کر انسان کے دل کا حال معلوم کرنا۔

ک

کاربستہ ۔ بگڑا ہوا کام
کارپردازاں ۔ کام کرنے والے
کارگاہِ بے ثبات ۔ وہ کارخانہ جس کا استحکام نہ ہو
کاشانہ ۔ گھر
کاسہ ۔ پیالہ
کاسد ۔ کھوٹا
کام ۔ حلق
کان آلا تھا ۔ کان چھدنے کے بعد اچھا نہ ہوا تھا۔
کاپی ۔ کاپی
کانون ۔ چبھن
کاہ ۔ گھاس
کاوش ۔ چبھن
کاہش ۔ گھنا
کاہیدہ ۔ جھکا ہوا
کبک ۔ چکور
کبیدہ ۔ رنجیدہ
کپٹ ۔ کینہ
کپٹی ۔ دغاباز، کینہ پرور
کٹی جلی ۔ ایک دوسرے کو بری بات کہنا، طنز کرنا
کثیف ۔ میلے
کج رفتار ۔ ٹیڑھی چال والا

کجی - ٹیڑھاپن
کحل الجواہر - جواہر کا سرمہ
کد - ضد
کدم - قدم (دیہات کے لوگ ق
نہ ادا کرسکنے کی وجہ سے کدم
کہتے ہیں)
کر - گونگا۔ بہرا
کرامات - واحد کرامت۔ خلاف عادت
امر جو کسی مسلمان بزرگ سے
واقع ہو۔
کرخت - سخت
کردھنی - ایک زیور ہے جو ہندو عورتیں
کمر پہ پہنتی ہیں۔ یہاں کمر بند
مراد ہے۔
کرّوفر - شان و شوکت
کرک - سرطان
کرنائے چینی - قرنا۔ نائے بزرگ
کرّوبیوں - فرشتگان مقرب۔ شعر
درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کیلئے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں
کریم النفس - شریف طبیعت
کڑکیتوں - جمع کڑکیت کی بمعنی نقیب
کسگر - کاسہ بنانے والا مخفّف ہے
کاسہ گر کا۔ یہاں بازار کے حقّہ
پلانے والے سے مراد ہے۔

کسوں - قسم
کسوف و خسوف - سورج اور چاند کا گہنا۔
(عام طور پر سورج کے گہن
کو کسوف اور چاند کے گہن
کو خسوف کہتے ہیں)
کس و کو - کون ہے تو اور کہاں ہے تو۔
یعنی اصل و حیثیت
کشٹ - (ہندی لفظ) تکلیف۔ زحمت
کشتنی سوختنی - مارنے اور جلانے کے قابل
کفیل - مددگار، کفالت کرنے والا
کلاونت - گویا
کلبہ - کوٹھری
کلپاوے گا - رنج دے گا
کلفتِ دیرینہ - پرانا رنج
کلنکن - بے حیا، بدنام عورت جسے
کلنک لگ چکا ہو
کلیس - دکھ، تکلیف
کم خور - گھوڑے کا ایک عیب ہے جب
وہ بہت کم کھانے لگتا ہے۔
کمری - گھوڑے کی ایک بیماری جس میں
کمر ماؤف ہو جاتی ہے کہ اس کا
چلنا مشکل ہو جاتا ہے۔
کمیت - سیاہی مائل سرخ، گھوڑے کا
رنگ
کمین گاہ - دشمن پر حملہ کرنے کے لئے

چھپ کر بیٹھنے کی جگہ، گھات کا مقام
کنارے ۔ علیحدہ، دور
کنام ۔ آرام گاہ
کنٹھ ۔ گلا
کنجشک ۔ گوریا
کندۂ ناتراش بغیر تراشا ہوا لکڑی یا پتھر کا ٹکڑا۔ غیر مہذب شخص، ناتربیت یافتہ
کنشت ۔ بت خانہ
کنوتی ۔ گھوڑے کی کان
کواکب ۔ کوکب کی جمع، ستارے، اجرام فلکی
کوچہ گردی ۔ گلیوں میں پھرنا
کور باطن ۔ دل کے اندھے، جن کا ضمیر مر چکا ہو
کور نمک ۔ نمک حرام، بے وفا
کُوس ۔ نقارہ
(کوس) لمن الملک (عربی) کس کا ملک۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ پوچھے گا کہ "آج ملک کس کا ہے؟" پھر خود ہی جواب دیگا۔ لِلّٰہ الواحد القہار۔ یعنی اُس خدائے واحد کا جو قہار ہے۔ یہاں اسی طرف اشارہ ہے۔
کوس لمن الملکی ۔ خود مختار بادشاہت کا اعلان۔
کوردہ ۔ اندھا گاؤں۔ مراد پچھڑے ہوئے گاؤں سے ہے۔
کوس و کور ۔ نوبت و نقارے
کورہ آہنگران ۔ لوہاروں کی بھٹی
کونڈے ۔ وہ نیاز کا کھانا جس پر جناب فاطمہؑ کی فاتحہ دی جاتی ہے۔ اس کو صرف عورتیں کھا سکتی ہیں بعض اوقات ائمہ کی نذر کو کھانا بھی ہوتا ہے۔ اسے مومنین ہی کھاتے ہیں۔
کونین ۔ دونوں عالم
کوہِ طور ۔ ملک شام میں ایک پہاڑ ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس پر خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تجلی دکھائی تھی۔
کوُ ۔ کوچہ
کوئے آشیاں ۔ گھونسلے کی طرف
کھاجا ۔ ایک قسم کی مٹھائی
کھڑکھڑیا ۔ ایک قسم کی زنانی سواری جسے کہار اُٹھاتے ہیں۔
کھلاڑن ۔ تجربہ کار
کھندل ڈالے ۔ پامال کردے
کہنہ لنگ ۔ ایک بیماری ہے۔ جب پیر میں لنگڑاپن پرانا ہو جائے گا۔

کھوٹا - غیر خالص - بُرا آدمی

کھوج - تلاش

کھونٹا اکھاڑ - گھوڑے کا ایک نقص ہے۔ شریر - تھان کا ٹرا۔

کھونٹی - داڑھی کے سخت بال جو مونڈنے پر باقی رہ جاتے ہیں۔

کھیر - خیر (گاؤں کے لوگ خ نہ بول سکنے کی وجہ سے کھیر کہتے ہیں۔)

کہ و مہ - چھوٹے بڑے

کھیلی کھائی - تجربہ کار عورت (برے معنوں میں کہتے ہیں)

کید - دشمنی

کیواں - نام ہے زحل سیارے کا، جو فلک ہفتم پر مانا جاتا ہے اور مجازاً آسمان کو بھی کہتے ہیں۔

گ

گات - عورت کے پستان بقول جرأت ؎

مجھ میں جرأت ہے بھلا دست درازی کی کہاں
دیکھ کر مجھ کو چھپا لیتے ہو تم گات عبث

گاڑھ - دشواری، مشکل

گام - قدم

گاؤ ثراے / گاؤ زمیں } ہندو دیومالا کے مطابق، وہ گائے جو زمین کو اپنی سینگ پر اٹھائے ہوئے ہے اور خود پشت ماہی پر قائم ہے۔

گاہ - کبھی، جگہ

گبر - آتش پرست

گجر دم - صبح سویرے جب گجر بجتا ہے۔

گزک - وہ نمکین چیز جو شراب کے ساتھ کھائی جائے۔ گزک آجکل تو میٹھی ہوتی ہے لیکن شراب کے ساتھ نمکین ہی کا جوڑ ہے چنانچہ کباب و گزک دونوں ایسی ہی ہونی چاہئیں۔

گذشتہ را صلوٰۃ - گزرے پر فاتحہ پڑھنا یعنی گزرے ہوئے کو بھول جاؤ۔

گریب پرور - غریب پرور

گرد ہو جانا - بے رونق ہو جانا۔ ماند پڑ جانا

گرہ - ستارہ

گسیّاں - خدا، پرماتما

گلخن - بھٹی، انگیٹھی

گلڈانگ - یہ انگریزی لفظ بل ڈاگ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ شکاری کتا۔

گل رعنا - خوشنما پھول

گلعذار - گلاب کی طرح گالوں والا، نہایت خوبصورت

گلنار - سرخ جیسے انار کا پھول

گن - ہنر

گنجینہ - خزانہ
گوشالہ - وہ جگہ جہاں گائیں رکھی جائیں۔
گو - گیند
گوسالہ - گائے کا بچہ۔ حضرت موسیٰ کے عہد میں سامری نے جادو سے گائے کا بچہ بنایا تھا۔
گوش - کان
گوشہ نشین - کونے میں بیٹھنے والا، کنارہ کش
گوگرد - گندھک
گون - لائق یا پسند
گونگے کا خواب یا سپنا - مبہم بات جس کا سمجھنا نہایت دشوار ہے۔
گہربار - موتی برسانے والا۔
گھر بسی - گھر میں بیٹھنے والی۔ مراد عورت
گھامڑ - بدسلیقہ اور احمق
گھٹائی - کمینہ پن
گھنے - گیشیر
گیّاں - عورتیں اپنی ہم نشین عورت کو یہ کلمہ کہہ کر پکارتی ہیں۔
گیانی - عارف
گیدی - کم اصل، چھچھورا
گیہاں - روزگار، جہاں

ل

لاأبالی - بیکار، عبث
لا اعلم - نامعلوم
لابیان - جو بیان نہ ہو سکے
لابہ - منافع
لات ومنات - نام ہیں ان بتوں میں سے دو کے جو خانہ کعبہ میں نصب تھے اور جنھیں حضرت علیؓ نے اکھاڑ کر پھینک دیا۔
لچر - ذلیل
لاخیر فی عبیدی - میرے غلام میں کوئی بھلائی نہیں
لاریب - بلاشک
لاطائل - بیہودہ، بیکار
لاف وگزاف - شیخی، ڈینگ
لال - گونگی
لاولد - بے اولاد
لپیٹ - بل، جھرّیاں، فریب لئے ہوئے جاتے تھے۔ پھٹے جاتے تھے۔
لٹورہ - ایک ابلق پرندہ جو فاختہ سے بڑا ہوتا ہے اور جو گوریا کا شکار کرتا ہے
لٹھ - بدتمیز، گنوار
لجہ - بھنور
لجاجت - خوشامد

لحد - قبر

لخلخہ - چند خوشبو دار چیزیں، جنہیں
آپس میں ملا کر سونگھا جاتا ہے
تاکہ بیہوش کو ہوش آجائے۔ شعر
کرتی ہے صبا اُسے کبھی لخلخہ سائی (ذوق)

لسّان - تیز زبان والا، چرب زبان

لطمہ - تمانچہ، تھپیڑا

لعبتان - جمع لعبت کی، بہ معنی معشوق

لن ترانی - حضرت موسیٰ نے کوہ طور پر خدا کا
جلوہ دیکھنے کے لئے کہا جواب ملا
کہ تم مجھے نہیں دیکھ سکتے ہو۔ یہ فقرہ
بطور تلمیح بھی آتا ہے اور شیخی
یا ڈینگ مارنے کے معنی میں بھی
رائج ہے۔ تو مجھے نہیں دیکھ
سکتا۔ (شیخی کے طور پر استعمال
ہوتا ہے)

لوحِ جبیں - پیشانی کی تختی مراد پیشانی

لوبی - معشوق

لوبیِ چرخ - آسمان کی معشوقہ یعنی زہرہ

لوبھی - لالچی

لیس - تیار

لیل و نہار - رات اور دن

م

مآل کار - انجام کار، بالآخر

مادر بخطا - حرام زادہ

مانی - روم کا ایک نقاش، جس نے
نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور نقاشی
کو اپنا معجزہ بتاتا تھا۔ کتاب
ارژنگ اس کی تصنیف ہے۔

مانجھا - ساچق

مانجھے کا جوڑا - وہ جوڑا جو شادی کے دن
دولھا کے یہاں سے دلھن کے
یہاں جاتا ہے اس کو بعض
جگہوں پر بری کا جوڑا بھی کہتے ہیں۔

مانع - روکنے والا

ماہ دو ہفتہ - چودھویں کا چاند

ماہی مراتب - سلطنت کا نشان۔ اودھ میں
"مچھلی" سلطنت کا نشان تھی۔
چنانچہ مچھلی بھون بھی اسی
نشان کی یادگار ہے۔

مبالغ - جمع ہے مبلغ کی۔ یعنی روپیہ

مبدء - ابتدا کی جگہ، آغاز

مبدل - بدلنے والے

مبتدی - ابتدا یعنی شروع کرنے والا

متاع - پونجی، سرمایہ

متشرّع ۔ شریعت پر چلنے والا

متصل ۔ ملا ہوا۔ اتصال کی مناسبت سے لگاتار بھی ہو سکتا ہے ۔

مسلسل ۔ لگاتار

متفق اللفظ۔ ایک زبان ہو کر

متّقی ۔ پرہیزگار

مٹھ ۔ مندر

مٹھّا ۔ گھوڑے کا ایک عیب سُست رفتار (سُست آدمی کو بھی کہتے ہیں)

مجتہد ۔ صاحبِ اجتہاد و سند، اہلِ تشیع کے سند یافتہ بڑے علماءؔ

مجرا ۔ سلام

مجرّد ۔ سادھ

مجمر ۔ انگیٹھی

مجوّز ۔ تجویز کرنے والا

مجیب الدّعوات ۔ دعاؤں کا قبول کرنے والا یعنی خدا

مچّے ۔ جمع ہے مُچّا۔ گوشت کا بڑا ٹکڑا (جس میں ہڈّی نہ ہو)

مچھندر ۔ جو شخص بندر نچاکر اپنی معاش پیدا کرتا ہے ۔ مردِ بیہودہ، دیوث، مسخرہ، بڑی بڑی مونچھوں والا ۔

محافہ ۔ امیرزادیوں کے بیٹھنے کی سواری ہے ۔ اس میں مرد بھی سوار ہوتے ہیں اسے کہار اُٹھاتے ہیں ۔

محبس ۔ قیدخانہ

محجوب ۔ شرمندہ

محرّر ۔ لکھنے والا، منشی

محرمِ راز ۔ بھید کے جاننے والے

محزون ۔ غمگین

محلداریں ۔ (جمع) ڈیوڑھی تک کام کرنیوالی عورت

محمل ۔ کجاوہ

محمودی ۔ ایک کپڑے کا نام ہے، نہایت لطیف ہے ۔

محن ۔ محنت

محیط ۔ (سمندر) احاطہ کئے ہوئے، گھیرے ہوئے

مخبرِ صادق ۔ سچی خبر دینے والے ۔ یہاں مراد حضرت محمد صلعم ۔

مدارج ۔ درجے

مداری ۔ تماشہ دکھانے والا

مدارئیے ۔ مٹّی کے فرشی حقّے ۔ فقیروں کا ایک گروہ جس کا سلسلہ حضرت شاہ مدار تک پہنچتا ہے ۔

مدام ۔ ہمیشہ

مدِ نظر ۔ نظر کے سامنے

مدة العمر ۔ عمر کا زمانہ

مرات ۔ آئینے
مراجعت ۔ واپسی
مرافعہ ثانی ۔ دوسری عرضداشت ۔ اپیل
مربھکی ۔ پیٹو ۔ جو کھانے سے سیر نہ ہوتی ہو۔
مُردار ۔ زنانی گالی ۔ نہایت حقیر و ذلیل عورت مثلاً کنیز
مردود ۔ رد کیا ہوا، نکالا ہوا۔
مرزبوم ۔ جائے پیدائش
مرسلوں ۔ بھیجے ہوئے پیغمبر
مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ ۔ خدا کی مرضی سب سے بہتر ہے۔
مُرغ ریز ۔ مُرغ کی بریانی
مرغوب ۔ پسندیدہ
مرفہ ۔ خوشحال
مرقع ۔ کاغذ یا حریر کے ٹکڑوں کا مجموعہ جس پر تصویریں ہوتی ہیں۔
مرگ مفاجات ۔ موت جو نہ ٹل سکتی ہو۔
مزرعہ ۔ کھیت
مژدہ ۔ خوشخبری
مساعدہ ۔ مبارکی
مسافت ۔ دوری بیان کی ۔ فاصلہ منزلوں کا۔
مسبب الاسباب ۔ اسباب فراہم کرنے والا۔ مراد خداوند تعالیٰ۔

مستجاب ۔ قبول
مستعار ۔ مانگا ہوا ۔ جو چیز اُدھاری جائے۔
مستولی ۔ چھایا ہوا ۔ غالب، زور آور، کسی پر غلبہ پانے والے۔
مستولی ۔ جہاز کے پردے
مسدود ۔ بند
مسکن ۔ رہنے کی جگہ
مُسِن ۔ سن رسیدہ
مشاطہ ۔ کنگھی کرنے والی عورت، نائن
مشائخ ۔ شیخ کی جمع ۔ بزرگ لوگ
مُشت پر ۔ مٹھی بھر پر
مشتے ۔ تھوڑا
مشروحاً ۔ مفصل ۔ شرح کے ساتھ
مشکل کشا ۔ مشکل کو کھولنے (حل کرنے) والے ۔ حضرت علی کو کہتے ہیں۔
مصلےٰ ۔ جانماز
مطعون ۔ (طعنہ دیئے ہوئے) جسے طعنہ دیا گیا ہو
مظفر ۔ فتح مند
مع الخیر ۔ ساتھ بھلائی کے، خیریت کے ساتھ
معاذ اللہ ۔ خدا کی پناہ
معانقہ ۔ بغل گیر ہونا
معدلت ۔ انصاف کرنے والی۔
معصیت ۔ گناہ

معقول ۔ عقل سے متعلق، منطقی
معیوب ۔ عیب کا کام
مغتنم ۔ غنیمت
مغرق ۔ ڈوبا ہوا، ڈبویا ہوا، جڑاؤ
مفسدے ۔ فساد
مفقود ۔ ناپید
مفقودالخبر ۔ لاپتہ
مفتوح ۔ کھلے، ظاہر ہو، جن کو فتح کیا جا چکا ہو
مفتی ۔ فتویٰ دینے والا
مقدمہ ۔ کام، معاملہ
مقرّر ۔ ضرور بالضرور
مقرّر ۔ تقریر کرنے والا
مقنع ۔ نقاب
مکرّر ۔ دوبارہ
مکلّف ۔ تکلیف دینے والا
مگس رانی ۔ مکھی ہانکنا ۔
ملبوس ۔ پوشاک
ملچھ ۔ گندا
منادی ۔ ندا کرنے والا، اوزار لگانے والا
منصور ۔ فتح مندہ
منغّض ۔ کڑوا، بدمزاج
منفعل ۔ شرمندہ
منقار ۔ چونچ
منصور وحلاج ۔ ایک فقیر کامل کا نام ہے۔ ان کا نام حسین تھا۔ باپ کا نام منصور۔ باپ کے نام سے مشہور ہوئے۔ حلاج اس لئے کہتے ہیں کہ ایک روز دھنئے کی دوکان پر بیٹھے ہوئے تھے اس نے کسی کام کے لئے کہا۔ اس نے انکار کیا اور کہا "میں اپنے کام میں مشغول ہوں"۔ منصور نے کہا: "تو میرا کام کر دے میں تیرا کام کر دوں گا"۔ دھنیا کام کرنے چلا گیا۔ جب تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو اس نے اپنی ساری روئی دھنی ہوئی پائی۔ بہت متعجب ہوا۔
منقل ۔ انگیٹھی، آتشدان
منقول ۔ نقل کی ہوئی باتیں
من مانتے ۔ حسب دلخواہ، جیسا دل چاہے۔
منکشف ۔ ظاہر
منہ زور ۔ گھوڑے کا ایک عیب جب وہ لگام لگی ہونے کی حالت میں زور کرے اور بھاگ جاتا چاہے اور لگام کی پرواہ نہ کرے۔
مَن یشا ۔ جو وہ چاہے۔
منہیات ۔ جو باتیں منع کی گئی ہیں۔

موا ۔ مرا۔ عورتیں کسی سے بیزاری کے وقت یہ کلمہ اس کے حق میں بولتی ہیں۔

موجد ۔ ایجاد کرنے والا

مودب ۔ ادب قاعدے سے

مہ پیر کنعاں ۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو کہتے ہیں۔ پیر کنعاں حضرت یعقوب علیہ السلام کو کہتے ہیں۔

مہک پری ۔ ایک عطر کا نام ہے جسے نصیر الدین حیدر بادشاہ نے ایجاد کیا۔

مہندی ۔ شادی کی ایک رسم ہے جس میں دلھن کے مہندی لگاتے ہیں۔

موکب ۔ دبدبہ، فوج یا لشکر

میانہ ۔ زنانی سواری جسے کہار اٹھاتے ہیں۔

میل ۔ خواہش

میمنہ ۔ دائیں جانب کی فوج۔

میسرہ ۔ بائیں جانب کی فوج۔

ن

نادر الزماں ۔ زمانے میں کمیاب

نادِ علی ۔ پکار علی کو

نادوں ۔ ناندوں

ناڑے ۔ کلاوے

ناز و نیاز ۔ لاڈ اور عاجزی

نافرجام ۔ بداصل ۔ نامبارک

ناقوس ۔ سنکھ

ناقہ ۔ اونٹ

ناکتخدا = ناکدخدا = کنواری

ناگزیر ۔ ضروری۔ جسے چھوڑا نہ جا سکتا ہو۔

ناگن ۔ گھوڑے کا ایک عیب ہے۔ گردن پر ایک بھونری سانپ کی شکل کی۔ اگر اس بھونری کا رخ سوار کی طرف ہوتا ہے تو اسے نامبارک سمجھا جاتا ہے۔

ناگوری ۔ دلی کا ایک قسم کا جوتا

نالکی ۔ امیرزادیوں کے بیٹھنے کی سواری

نامحرم ۔ ناشناس، غیر

نان نہاری ۔ صبح کے وقت کی روٹی

ناوک ۔ تیر

ناہنجار ۔ بدذات ۔ بداصل

نائرہ ۔ آگ، شعلہ

نایک ۔ علم موسیقی کا ماہر استاد

نبرد ۔ جنگ

نجبا ۔ جمع ہے نجیب کی بمعنی شریف یا عمدہ نسل کا۔

نجد ۔ مجنوں کی محبوبہ لیلی کا وطن

نچاکھچا ۔ خراب حال، ابتر

ندیم ۔ ہم نشیں، مصاحب، صلاح کار

ندیدہ ۔ نہ دیکھے ہوئے، اشتاق، لالچی

نرالیاں ۔ نئی قسم کی ۔ جمع ہے نرالی کی
نرد ۔ بہ چوسر کی گوٹ یا مہرہ، سیڑھی بانس کی
لڑنے کو پھر کھڑا روش نرد ہو گیا
(ذوقؔ)

نرسنگا ۔ ایک باجا
نرغہ ۔ ہجوم، گھراؤ، (مخالفوں کے ہجوم میں گھر جانا۔
نرک ۔ آگ ۔ جہنم ۔
نرناری ۔ مرد عورت
نرنکار ۔ واحد، بے علامت شکل
نروٹھا ۔ موٹا مسٹنڈا
نزول ۔ نازل ہونا یا اترنا
نژاد ۔ نسل ۔ اصل ونسب
نستعلیق ۔ خوشخط
نسکٹا ۔ جس کی نس کاٹ دی گئی ہو
نسیاں ۔ بھول
نشور ۔ قیامت
نصاریٰ ۔ عیسائی
نصرت آموز ۔ فتح سے بھرا ہوا
نطفۂ حرام ۔ حرامزادہ
نظریٰ ۔ رد کر دی گئی
نظر بند کرنا ۔ دیکھنا، نظر کے سامنے رکھنا
نعت ۔ رسول اللہ صلعم کی تعریف
نفس امارہ ۔ حکم دینے والا نفس
نقل ۔ ایک مٹھائی کا نام، چکھنے کی چیز، بوندی

نگارندہ ۔ لکھنے والا
نگر ۔ شہر
نمط ۔ طرح، مثل
نمش ۔ نمشک ۔ بروزن سرشک یعنی ملائی اور مکھن ۔
نمود ۔ نمائش
ننگ وناموس ۔ شرم اور غیرت
نوح ۔ ایک پیغمبر کا نام، جن کے زمانے میں ایک زبردست طوفان آیا تھا۔
نوش ۔ شہد، پینا
نہنگاں ۔ نہنگ کی جمع ۔ گھڑیال
نیستاں ۔ شیر کے رہنے کا جنگل ۔ شعر
اپنوں کے نہ مل اپنے ہیں سب اپنوں کے دشمن
ہر نے میں بھری آگ نیستاں کیلئے ہے
(ذوقؔ)
نیستاں وہ جنگل جہاں نے (نرکل یا نرکٹ) ہوئے جس سے بانسری بنتی ہے
نیش ۔ ڈنک

ہ

ہادی ۔ راستہ بتانے والا، ہدایت کرنے والا
ہاروت ماروت ۔ دو فرشتوں کے نام ہیں جو چاہ بابل میں لٹکے ہوئے ہیں اور جو کوئی ان سے جادو سیکھنے جاتا ہے، اُسے سکھاتے ہیں ۔ زہرہ

اور مشتری سے ان کے عشق کا قصہ
بہت دلچسپ ہے۔

ہالہ - وہ حلقہ جو چودھویں کے چاند
کے گرد جب ہلکے ہلکے بادل ہوں
تو اس کی روشنی کے انعکاس سے
بن جاتا ہے۔ شاہ نصیرؔ
جوں پروین و ہالۂ مہ تھا سر پر طرّہ ہار گلے میں

ہاموں - میدان، جنگل

ہِتّی - دوست

ہتھے مارے - کھانا کھایا، خوب کھایا

ہٹا کٹا - تندرست

ہٹ دھرم - ضدی

ہدایہ - ہدیہ کی جمع، تحفہ

ہدف - نشانہ

ہڑا - گھوڑے کی ایک بیماری

ہراول - (ترکی) فوج کا وہ،
سب سے آگے ہوتا۔

ہراساں - ڈرنے والا

ہر بھجو - خدا کا نام لو

ہرکارہ - اردلی۔ ہر کام کرنے والا
ڈاک والا

ہر ہر - اللہ اللہ

ہزارے کا فوارہ - فوارہ جس میں ہزار دھاریں
نکلتی ہیں

ہزبر - شیر

ہڑبونگ - ابتری۔ ہلڑ

ہمدمی - ساتھ

ہمسر - برابر

ہم سنگ - ہم مرتبہ

ہمقراں - یکجا ہونا ستاروں کا، مراد
شادی ہونے سے

ہمہ داں - سب کچھ جاننے والا

ہندی کی چندی - بال کی کھال نکالنا

ہنوز - ابھی

ہوا - خواہش

ہوائی - ایک آتش بازی، پستہ بادام
کے باریک ورق، کترے ہوئے۔

ہودج - کجاوہ، جس میں لوگ سوار
ہوتے ہیں۔ یہ ہاتھی پر رکھا جاتا ہے۔

ہوش ربا - ہوش اڑانے والا۔

ہوکا - زیادہ کھانا، لیکن سیری نہ ہو۔
(ایک بیماری)

ہو کا مقام - خوفناک، سنسان جگہ

ہول - وحشت، ڈر، خوف

ہیجا - لڑائی

ہیچ میرز - بے حقیقت، بے مایہ، جس کی
قدر و قیمت نہ ہو۔ ناچیز

ہیزم - لکڑی سوکھی، جلانے کی

ہیکلیں - جمع ہے ہیکل کی، یعنی طوق

ہین - (ہندی لفظ) کمزور، چھوٹا اور حقیر

ہیئت کذائی - صورتِ موجودہ (خراب معنوں)
ہیہات - افسوس

ی

یابشریٰ ہذا غلام - خوشخبری ہو یہ غلام ہے - یہ بات اُس شخص نے کہی تھی جس کے ڈول میں حضرت یوسف علیہ السلام چاہ کنعاں سے باہر آئے تھے -
یارِ شاطر - رفیق، ہمیشہ ساتھ دینے والا - شطرنج کا ساتھی -
یارا - طاقت، ہمت
یارائے مقام - ٹھہرنے کی طاقت
یاقوتی - ایک مقوی، بیش قیمت دوا، جواہرات ڈالے جاتے ہیں -
یخ - برف، جو سردی کے سبب پانی کے جم جانے سے بنتی ہے
ید سحر - جادو کا ہاتھ
ید قدرت - قدرت کا ہاتھ
یراق - سامان
یزداں - خدا
یساولاں - جمع ہے یساول کی نقیب، چوبدار
یشب - ایک پتھر کا نام -
یعقوب علیہ السلام - پیر کنعاں - حضرت یوسف علیہ السلام کے باپ -
یک لخت - بالکل، اکدم، اچانک
یلغار - کوچ پر کوچ، دھاوا، حملہ
یمن - برکت
یہود - یہودی، یہودا کی اولاد -

فرہنگ محاورات و امثال

فسانۂ عجائب

فرہنگِ محاورات و امثالِ فسانۂ عجائب

آسمان پر پہنچانا ۔ رتبہ اور عزت دینا۔

آسمان کو زمین کر دیا ۔ ناچیز ٹھہرایا۔

آنسو پینا ۔ غم کو ضبط کرنا۔

آنکھیں چار ہونا ۔ بالمقابل ہونا۔

آنکھیں دکھانا ۔ غصّے میں گھورنا، دھمکانا، ڈرانا، خوف دلانا۔

آنکھیں سینکنا ۔ آنکھوں سے دیکھ کر تسکین حاصل کرنا۔

اپنے سایے سے بھڑکنا ۔ بلاوجہ خوفزدہ ہونا۔

اپنے لکھے کو رونا ۔ قسمت کو رونا۔

اپنے منہ سے دھنّا بائی ۔ (مثل) خودستائی کرنا، اپنی تعریف کرنا ۔ اپنے منہ میاں مٹھو بننا بھی کہتے ہیں۔

اچھال چھکا ۔ فاحشہ، بدکار۔

از ماست کہ بر ماست ۔ جو کچھ کہ ہم پر پڑتی ہے ہمارے ہی سبب سے ہے ۔ اپنے کیے کا نتیجہ۔

آہ سرد کھینچنا ۔ ٹھنڈی سانس بھرنا۔

باطل است آنچہ مدعی گوید ۔ مدعی جو کچھ کہتا ہے جھوٹ ہے۔

بدوزد طمع دیدۂ ہوش مند ۔ لالچ سمجھدار آدمی کی آنکھ بند کر دیتی ہے۔

بڑے بول کا سر نیچا ۔ گھمنڈ کرنے والا پشیمان ہوتا ہے۔

بے جھونٹک جھانٹا ۔ بغیر لڑائی۔

بعد از سرِ من کن فیکون شد، شدہ باشد ۔ میرے سر کے بعد کن فیکون ہو جایں ہو جانا یعنی دنیا پیدا ہو جائے تو ہو جائے۔

بے چون و چرا ۔ کوئی بات منہ سے نہ نکالنا ۔ بغیر حجت اور دلیل کے۔

پاس نہ پھٹکنا ۔ قریب نہ آنا۔

پاؤں ہر ایک کئی من کا ہو گیا ۔ چلنا مشکل ہو گیا۔

پگ آگے پت رہے اور پگ پاچھے پت جائے ۔ (مقابلے کے وقت) آگے قدم رکھنے سے غیرت رہتی ہے اور پیچھے ہٹانے سے جاتی رہتی ہے۔

پاؤں میں آپ کلہاڑی مارنا ۔ اپنا نقصان اپنے ہاتھوں سے کرنا۔

تمام عمر دانت رہے ۔ ہمیشہ رغبت رہے
تلوؤں سے آنکھیں ملنا ۔ دشمن سے
آنکھیں نکلوا کر پیروں سے
روندنا ۔
ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلنا ۔ (کنایہ)
کوئی پوشیدہ کام کرنا ۔
ٹھنڈی گرمیاں کرنا ۔ ظاہری محبت، جھوٹی
گرمجوشی ۔ بغیر محبت عشق
ظاہری ۔
ٹیڑھی کھیر ۔ مشکل کام ۔
جان کے لالے پڑنا ۔ زندگی دشوار ہونا ۔
جس طرح پیٹھ دکھاتے ہو اسی صورت
اللہ تمہارا منہ دکھائے ۔ جس طرح جاتے
ہو ویسے ہی خیریت سے
واپس آؤ ۔
جلی کٹی سنانا ۔ رشک و حسد کی باتیں کرنا ۔
جی بیکل ہونا ۔ طبیعت کا پریشان ہونا ۔
جی چھوٹ جانا ۔ ہمت ہارنا ۔ بے دل
ہو جانا ۔
جی کا بیٹھ جانا ۔ مایوس ہو جانا ۔
جھونپڑوں میں رہ کر محلوں کے خواب
دیکھنا ۔ غریبی میں امیری کی باتیں کرنا ۔
چبا چبا کے گفتگو کرنا ۔ در پردہ طنز کرنا
چور کی داڑھی میں تنکا ۔ (مثل) ایسے
موقع پر کہتے ہیں جب کوئی

عیب کر کے چھپا نہ سکے اور
خود ہی اقبال کی صورت
پیدا کرے ۔
چھکے چھوٹنا ۔ ہوش اڑ جانا ۔ اکدم
گھبرا جانا ۔
چھلے کے پھنسے ۔ کیچڑ کے پھنسے ۔
چھوٹا منہ بڑی بات ۔ بڑوں کی عیب گیری
کرنا ۔
چھاتی بھر آنا ۔ آنسو بھرنا ۔ درد یا غم
کی وجہ سے رونا آ جانا ۔
چیل کا انڈا چھوڑنا ۔ اس قدر سخت گری
کا ہونا کہ چیل انڈا سیتے
سیتے گرمی کی تاب نہ لا کر
انڈا چھوڑ دیتی ہے ۔
حاجت مشاطہ نیست روئے دلآرام را ۔
خوبصورت چہرے کو سنوارنے
کی ضرورت نہیں ہوتی ۔
خود کردہ را علاجے نیست ۔ اپنے کئے
کا علاج نہیں ہوتا ۔
خار کھانا ۔ حسد کرنا، رشک کرنا،
جلنا، دشمنی کرنا ۔
خون دل پینا ۔ رنج اٹھانا ۔ غصہ
برداشت کرنا ۔
دامن و گریباں آنسوؤں سے بھگونا ۔
زار و قطار رونا ۔

دِل ٹھنڈا کرنا۔ (کلیجہ ٹھنڈا کرنا) دل کو خوش کرنا۔

دل کا پاش پاش ہونا بے حد غمگین ہونا۔

دن کا پھرنا۔ نصیبا جاگنا۔ مصیبت کے دن کٹ جانا۔

دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک پیتا ہے۔ (مثل) ایک چیز سے ڈرا ہو، دوسری ہمشکل چیز سے ڈرتا ہے اور احتیاط کرتا ہے۔

دنیا سے ہاتھ اٹھانا۔ دنیا کو چھوڑ دینا۔

دھوکے کی ٹٹی۔ ایک چیز ہوتی ہے کہ صیاد اس کے حجاب میں طائروں کا شکار کرتے ہیں۔ اور کنایہ ہے اس چیز اور صورت سے بھی جو کسی کو مغالطے اور شک میں ڈالتے ہیں۔

داہنی آنکھ پھڑکنا۔ ضعیف الاعتقاد عورتوں کا عقیدہ ہے کہ مرد کی داہنی آنکھ پھڑکنے سے خوشی اور بائیں سے رنج۔ عورت کی داہنی آنکھ سے غم اور بائیں سے خوشی ہوتی ہے۔

دشمن اگر قوی ست مہرباں قوی تر است۔ دشمن اگر مضبوط ہے تو مہرباں اس سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔

در پس ہر گریہ آخر خندہ ایست۔ ہر غم کے بعد خوشی آتی ہے۔

دم سرد بھرنا۔ ٹھنڈی آہیں بھرنا۔

دقیقہ باقی نہ رہنا۔ کوئی کسر نہ چھوڑنا۔

دم بھرنے لگا۔ (محبت کا) دعویٰ کرنے لگا۔

دل ٹھنڈا کرنا۔ کلیجہ ٹھنڈا کرنا۔

دل خون ہونا۔ دل ٹوٹ جانا۔ غمگین ہونا۔

دروازہ نہ چھوٹنا۔ ہر وقت موجود رہنا۔

دل سرد ہونا۔ بیزار ہونا، اکتا جانا۔

دہن دریدہ۔ منہ پھٹ۔ جو جی میں آئے کہنے والا۔

دیکھ کر سکتا ہونا۔ دیکھ کر حیرت کی باعث سناٹے میں آجائے اور بول بھی نہ سکے۔

رنگ فق ہونا۔ خوف یا شرم سے چہرے کا رنگ بدل جانا۔

زخم آلے ہونا۔ زخم کا ہرا ہونا۔

زبان زد خاص و عام ہونا۔ مشہور معروف ہونا۔ بات کا پھیلنا۔

زر بر سر فولاد نہی نرم شود۔ اگر فولاد پر سونا رکھ دیں تو وہ بھی نرم ہو جائے گا یعنی روپیہ سے ہر کام ہو سکتا ہے۔

زندہ در گور ہونا - جیتے جی موت کی سی تکلیف اٹھانا، انتہائی تکلیف کا پانا۔
جل جانا - رشک وحسد کرنا۔
سینۂ جاہل گور تنگ - جاہل کا سینہ قبر کی طرح تنگ ہوتا ہے۔
سہاگ کا عطر گرد ہوا - ناچیز ٹھہرا۔
سر دھننا - افسوس سے سر گھمانا۔
سوکھ کے کانٹا ہونا - بہت دُبلا ہونا۔
سر سے کھیلنا - زندگی سے بیزار ہونا۔ مرنے پر کمر باندھ لینا۔ جان سے گزرنا سے ذوق

ڈسا ہو کالے نے جس کو کا ذوق وہ فسوں کے اثر سے کھیلے
دہان وگیسو کا تیرے مارا نہ منھ سے بولے نہ سر سے کھیلے

ساحل را از خس و خاشاک گذار و گل را
از خار تنگ و عارنمی باشد - ساحل کو راہ کے جھاڑ جھنکاڑ اور پھول کو کانٹے سے ننگ و عار نہیں ہوا کرتا۔

شمع کا چور سرِ محفل لرزاں - فیروز بخت بادشاہ کی حکومت میں اتنا رعب، دبدبہ اور انصاف تھا کہ عام چور تو کیا شمع کا چور (شمع کی لو کی بیچ میں جو چھپا ہوا سایہ) بھی محفل میں کانپتا تھا۔

شیشے میں اُتار لینا - (کنایہ) کسی کو مسخر کر لینا قابو میں کر لینا۔
شیطان کے کان بہرے ہونا - (عورتوں کا محاورہ) کسی بُری خبر کو سُنتے وقت کہتے ہیں۔ مفہوم یہ ہے کہ خدا اس خبر کو جھوٹ کرے۔
صحنک کھلانا - کھانے اور میووں کا طباق، جس کو جنابِ فاطمۃ الزہرا کے نذر کرتے ہیں اور سادات کی عورتیں اسے کھاتی ہیں۔
صلواتیں سنانا - بُرا بھلا کہنا۔
طشت از بام ہونا - راز فاش ہونا۔ بھید کھلنا۔
عقل کے دشمن ہونا - بے وقوفی اور ناسمجھی کی حرکت کرنا۔
غصے کی جھانجھ نکالنا - غصّے کی جلاہٹ نکالنا۔
قتل سے ہاتھ اُٹھانا - قتل سے باز آنا۔
قولِ مرداں جان دارد - مرد جو کہتے ہیں وہ کرتے ہیں۔
قدم آنکھوں پہ رکھنا - بے حد عزت اور احترام کرنا۔
کان پکڑنا - معافی مانگنا، پناہ مانگنا،

کسی کام کے نہ کرنے کا عہد کرنا۔

کانٹا سا کھٹکنا۔ نہایت ناگوار گزرنا۔

بُرا لگنا ۔ ذوق

فرقت میں تری تارِ نفس سینے میں میرے

کانٹا سا کھٹکتا ہے نکل جائے تو اچھا

کیا منہ دکھائیں گے۔ کس طرح سامنے

جائیں گے۔

کونڈے بھرنا۔ ائمہ علیہم السلام و دیگر

بزرگانِ دین کی نذر و نیاز

کی شیرینی کو کونڈے میں

رکھ کر مومنین کو کھلاتے ہیں۔

کس کس کا (تلوار) لہو چاٹتی ہے۔ کون

کون مارا جاتا ہے۔

کھیت رہنا۔ قتل ہونا۔ بہت سے لوگوں کا

مارا جانا۔

کاسہ سوال۔ بھیک کا پیالہ۔

کنوئیں جھنکوانا۔ دربدر پھرانا، خاک چھنوانا،

حیران کرنا۔

کفِ افسوس ملنا۔ نہایت افسوس کرنا۔

کھیلی کھائی۔ (جنسی زندگی میں) تجربہ کار۔

کُندن کی طرح دمکنا۔ چمکنے لگنا۔

کام تمام ہونا۔ جان دینا، ختم ہو جانا،

قتل ہونا۔

کہ کرد کہ نیافت۔ (مثل) جس نے جیسا کیا

ویسا پایا۔

کلیجہ منہ کو آنا۔ (کنایہ) دل کے قلق

اور بیتابی کا بڑھنا۔

گھر بسی ۔ گھر میں بیٹھنے والی۔

گو ٹم مشکل وگرنہ گو ٹم مشکل۔ کہیں تو مشکل

اور نہ کہیں تو مشکل۔

گونگے کا سپنا۔ (کنایہ) پوشیدہ حال

اور مبہم بات کہ اس کا سمجھنا

مشکل ہو۔

گر یہ کردن راہم دل خوش می باید دنے کیلئے

بھی دل خوش چاہئے۔

لینے کے دینے پڑ جانا۔ فائدے کے

بدلے نقصان ہونا۔ نیکی

کے بدلے بدی۔

لہو کا پیاسا ہونا۔ جانی دشمن ہونا۔

لہر آنا ۔ ترنگ آنا۔

لہو کے گھونٹ پینا۔ (کنایہ) غصے کو

ضبط کرنا۔ یا۔ جبراً کوئی

کام کرنا۔

لوہا ماننا۔ (کنایہ) کسی کی بہادری اور

شجاعت کا قائل ہونا۔

ماہی بے آب ہونا۔ بے قرار اور

بے چین ہونا۔

محبت کے پینگ بڑھنا۔ دونوں طرف

سے محبت کا بڑھنا۔

مار گزیدہ از ریسمان پیچیدہ می ترسد سانپ

کاکاٹا ہوا الجھی ڈور سے ڈر جاتا ہے۔

مرگ انبوہ جشنے دارد۔ بھیڑ کی موت میں بھی
جشن کی کیفیت ہوتی ہے۔

مر مر کے جینا۔ بڑی مصیبتوں میں زندگی بسر کرنا۔
(فانی) ع زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

مشکل کشا کا کھڑا دونا دینا۔ حضرت علیؑ کی نذر
دلانا۔ یہ نذر کھڑے ہو کر دی
اور کھائی جاتی ہے۔

مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید۔ مشک وہ ہے جو
کہ اپنے آپ خوشبو دیتا ہے،
نہ کہ وہ جسے عطار مشک کہتا ہے۔

من آنم کہ من دانم۔ میں جیسا بھی ہوں،
جانتا ہوں۔

منہ پر ہوائیاں اڑنا۔ دہشت یا کسی سبب سے
چہرے کا رنگ بدلنا منہ زرد
ہو جانا۔ گھبرانا۔

منہ موڑنا۔ کنارہ کشی اور پہلو تہی
اختیار کرنا۔ ساتھ چھوڑنا۔

منہ نوچنا۔ چہرے کو ناخنوں سے زخمی کرنا۔
(علامتِ غصہ) رنج میں بھی
منہ نوچتے ہیں۔

منہ نہ کھلوائیے۔ بدزبانی یا عیب کھولنے پر
آمادہ نہ کیجیے۔

منہ کالا کرنا۔ فعل بد کرنا، بدنامی مول لینا

مشتے نمونہ از خروارے۔ گدھے بھر بوجھ
کی بانگی مٹھی بھر۔

مٹی کو چھوتا سونا ہاتھ آتا۔ مٹی ایسی معمولی چیز کو
چھونے سے سونا ہو جائے
یعنی جس کام میں ہاتھ لگانا
کامیاب ہونا۔

میرا دل کھٹکا۔ مجھے شک ہوا تھا۔

منہ پھٹ۔ بدزبان۔ بے لگام۔ ایسے شخص
کو کہتے ہیں جو منہ میں آئے بکے۔

میدان مار لینا۔ معرکے میں کامیابی حاصل
کر لینا۔ جیت لینا۔

موم کی ناک ہونا۔ (کنایہ) ایسے موقع پر کہتے
ہیں کہ کوئی اس سے جو کچھ
کہہ دے اس پر عمل کرے
اور اپنے قول اول سے
پھر جائے۔

نام و نشان مٹا دینا۔ ناپید کر دینا۔
؎ گھر بار تک کھدوا
دینا۔

نشہ کرکرا ہونا۔ عیش و عشرت میں
خلل پڑنا۔

نظر بند کرنا۔ دیکھنا۔ نگاہیں باندھ دینا۔
جادو کی ایک قسم۔ قید کرنا۔

نگاہ کا پاؤں پھسلنا۔ نگاہ نہ ٹھہرنا
کسی چیز کا نہایت صاف و
شفاف ہونا

نہ چولھے آگ نہ گھڑے میں پانی۔ گھر میں کوئی چیز نہ ہونا۔

نشہ ہرن ہونا۔ کسی خوف یا صدمے کے باعث نشے کا غائب ہونا۔ نشہ نہ رہنا۔

ہاتھ پاؤں پھولنا۔ حواس باختہ۔ گھبرا جانا۔

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ جو پودا درخت ہونے والا ہوتا ہے اس کے پتے چکنے ہوتے ہیں۔ ایسے لڑکے کے لئے کہتے ہیں جس میں شروع سے ایسے آثار دکھائی دیں کہ وہ آگے چل کر اقبال مند ثابت ہو۔

ہر روز عید نیست کہ حلوہ خورد کسے ہر روز عید نہیں ہوتی کہ کوئی روزانہ حلوہ کھائے۔ زمانہ کی حالت یکساں نہیں رہتی۔

ہونٹ چاٹتے رہنا۔ کسی خوش ذائقہ چیز کا مزا لینا۔

ہاتھ کاٹ کاٹ کر کھائے۔ اپنی کم ہنری پر خشمگیں ہونا اور غصہ کسی پر نہ اتار سکنا۔ مثل ہے کھسیانی بلی کھمبا نوچے۔

ہنڈی کی چنڈی کرنا۔ کھود کھود کر پوچھنا۔

نکتہ چینی کرنا چھان بین کرنا۔

ہیرا کھانا۔ خودکشی کرنا

فرہنگ آیات و فقرے عربی

فسانہ عجائب

آیات و فقرے عربی۔ فسانۂ عجائب

صفحہ	عبارت	معنی
۱۰۳	اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا وَّ فَجَعَلَہٗ نَسَبًا وَّ صِھْرًا وَّ کَانَ رَبُّکَ قَدِیْرًا۔	سب تعریف اللہ ہی کے لئے ہیں جس نے آدمی کو پانی سے پیدا کیا پھر اُس کو ذات بنایا اور گھر والا بنایا اور تیرا پروردگار قدرت والا ہے
	جَلَّ وَ عَلٰی	بزرگ ہے اور بلند ہے
	مَا عَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ	ہم نے تجھ کو نہیں پہچانا جیسا کہ پہچاننے کا حق ہے
۱۰۴	لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ	اگر تو نہ ہوتا تو نہ پیدا کرتا میں آسمانوں کو
	صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ اٰلِہِ الطَّاھِرِیْنَ وَ اَصْحَابِہِ الْمُکَرَّمِیْنَ	اللہ کا درود اور رحمت ہو آپ پر اور آپکی پاک اولاد پر اور آپکے مکرم اصحاب پر۔
	لَا فَتٰی	اختصار ہے لَا فَتٰی اِلَّا عَلِیٌ لَا سَیْفَ اِلَّا ذو الفقار کا (معنی) نہیں ہیں جوان مگر علی کے اور نہیں ہے کوئی تلوار مگر ذو الفقار کے
	ھَلْ اَتٰی	اختصار ہے سورۃ ہَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّھْرِ لَمْ یَکُنْ شَیْئًا مَّذْکُوْرًا کا۔ (معنی) بیشک انسان پر زمانہ میں ایک ایسا بھی وقت آچکا ہے جس میں کوئی چیز قابل تذکرہ نہ تھی
	لَحْمُکَ لَحْمِیْ وَ دَمُکَ دَمِیْ عَلِیٌّ مِنِّیْ وَ اَنَا مِنْہُ۔	تیرا گوشت میرا گوشت اور تیرا خون میرا خون۔ علی مجھ سے ہے اور میں اُس سے ہوں۔

صفحہ	عبارت	معنی
۱۰۴	مَثَلُ اَهْلِ بَیْتِیْ کَمَثَلِ سَفِیْنَۃِ نُوْحٍ مَنْ رَکِبَهَا نَجٰی وَمَنْ تَخَلَّفَ عَنْهَا غَرِقَ وَهَوٰی	میرے اہل بیت کی مثال حضرت نوح کی کشتی کی طرح ہے جو اس پر چڑھ گیا وہ بچ گیا اور جو اس سے خلاف ہوا ڈوبا۔
	اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ	تم اللہ کی اور اُس کے رسول کی اور اُنکی جو تم میں صاحب امر ہیں اطاعت کرو۔
۱۰۵	خَلَّدَ اللّٰهُ مُلْکَهٗ وَسَلْطَنَتَهٗ وَاَیَّدَ اللّٰهُ بِالنَّصْرِ وَالظَّفَرِ جَلَّ جَلَالُهٗ	اللہ اُن کے ملک اور سلطنت کو ہمیشگی دے اور ان کو کامیابی اور فتح سے تائید عطا کرے اُس کی شان بڑی ہے۔
۱۰۶	سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ	خدا کی تعریف اُسکے ثنا اور حمد کے ساتھ ہے
۱۰۸	نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ	انتہائی روشن
۱۱۷	قُمْ بِاِذْنِیْ	میرے حکم سے زندہ ہوجا (کھڑا ہوجا)
	مَعَاذَ اللّٰهِ	خدا کی پناہ
۱۲۰	اَلْحَقُّ مُرٌّ	سچ بات کڑوی ہوتی ہے
۱۲۲	اَلْعَاقِلُ تَکْفِیْهِ الْاِشَارَۃُ	عقل مند کو اشارہ کافی ہے۔
	عِیَاذًا بِاللّٰهِ	اللہ پناہ دے
۱۲۳	اَرِنِیْ	اے خدا تو مجھکو اپنا جلوہ دکھا
	لَنْ تَرَانِیْ	تو ہرگز نہیں دیکھ سکتا
۱۲۴	تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ	جس کو چاہے تو عزت دے جس کو چاہے تو ذلت دے
۱۲۵	لِمَنِ الْمُلْکُ	آج کس کی بادشاہت ہے

صفحہ	عبارت	معنی
۱۲۵	تَبَرُّکًا وَّ تَیَمُّنًا	برکت اور بھلائی کے طور پر
۱۲۹	اِنَّہُ الْمَبْدَاءُ وَ اِلَیْہِ الْمَآبُ	حقیقت اُسی سے شروع اور اُسی کیطرف لوٹنے کا مقام ہے۔
۱۳۲	رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّ اَنْتَ خَیْرُ الْوَارِثِیْنَ	اے خدا مجھ کو اکیلا مت چھوڑ اور تو سب سے اچھا وارث ہے۔
	رَبِّ ھَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْکَ وَلِیًّا	اے خدا مجھ کو اپنے پاس سے دوست بخش
۱۳۴	فِعْلُ الْحَکِیْمِ لَا یَخْلُوْ عَنِ الْحِکْمَۃِ	حکیم کا کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔
۱۳۸	فَضَّلْنَا بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ	ہم نے تم میں سے بعضوں کو بعضوں پر بڑائی دی۔
۱۴۳	اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ	میں اللہ سے مغفرت چاہتا ہوں
۱۴۴	اِنْ شَاءَ اللّٰہُ	خدا نے اگر چاہا۔
۱۷۴	اَللّٰہُ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ	خدا تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں تم رہو۔
۱۷۹	اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ	بلاشبہ خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔
۱۹۰	اَلَا یَا اَیُّھَا السَّاقِیْ اَدِرْ کَاْسًا وَّ نَاوِلْھَا	خبردار ہو اے ساقی دور میں ساغر کو لا اور دے دے۔
۲۱۵	اَلْخَیْرُ بِمَا وَقَعَ	جو کچھ ہو گیا وہی بہتر تھا۔
۲۳۱	اَلْکَرِیْمُ اِذَا وَعَدَ وَفَا	سخی جب وعدہ کرتا ہے تو پورا کرتا ہے
۲۳۹	اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ	بے شک ہم خدا کے لئے ہیں اور بلاشبہ ہم اُسی کی طرف واپس جانے والے ہیں
۲۴۰	رَضِیْنَا بِہٖ قَضَا	خدا کے حکم پر ہم راضی ہوئے۔

صفحہ	عبارت	معنی
۲۴۳	قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ	اُن سے کہدو کہ زمین (دنیا) کی سیر کریں
۲۴۵	كُلُّ اَمْرٍ مَّرْهُوْنٌ بِاَوْقَاتِهٖ	تمام کام اپنے وقت پر موقوف ہیں۔
۲۴۷	مَاشَاءَ اللّٰهُ	جو کچھ خدا چاہے۔
۲۴۹	اِذَا جَاءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ	جب اُن کی موت پہنچتی ہے تو ایک گھڑی کی دیر سویر نہیں ہوتی۔
۲۵۲	سَوَادُ الْوَجْهِ فِي الدَّارَيْنِ	دونوں جہاں میں روسیاہی ہوگی۔
۲۵۸	اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِيْنَ	بے شک خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے
۲۶۹	اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا	جس وقت زمین اپنی کپکپی کانپے گی۔
۲۷۴	بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖهَا وَمُرْسٰهَا	خدا کے نام سے اُس کا چلنا اور ٹھہرنا ہے
۲۷۵	اَيُّهَا النَّاسُ	اے لوگو
۲۸۲	اَلنَّوْمُ اَخُو الْمَوْتِ	نیند موت کا بھائی ہے۔
۲۸۵	وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ۔	خدا بہتر جانتا ہے۔
	يَا بُشْرٰى هٰذَا غُلَامٌ	اے بشریٰ! یہ تو ایک لڑکا ہے۔
۲۹۱	مَنْ يَّشَاءُ	جو کچھ وہ چاہے۔
	وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ	وہ اکیلا ہے اور اُس کا کوئی شریک نہیں
۲۹۵	تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ	میں نے خدا پر بھروسہ کیا۔
۲۹۹	اَلْقَلِيْلُ كَالْمَعْدُوْمِ	تھوڑی چیز نہ ہونے کے برابر ہے۔
۳۰۳	اِنِّيْ رَاَيْتُ دَهْرًا مِّنْ هِجْرِكَ الْقِيَامَةَ	میں نے تیری جدائی میں ایک مدت سے قیامت دیکھی۔

صفحہ	عبارت	معنی
۳۰۷	جَلَّ جَلَالُہٗ	اُس کی شان یا عظمت بڑی ہے
۳۱۵	لَاخَیْرَ فِی عَبِیْدِی	غلاموں سے کوئی بھلائی نہیں
	رَضِیْنَا بِالْقَضَاء	خدا کے حکم پر ہم راضی ہیں
۳۱۶	غَفَرَ اللّٰہُ لَکَ	اللہ تمہاری مغفرت کرے۔
۳۱۹	وَابْیَضَّتْ عَیْنَاہُ مِنَ الْحُزْنِ فَھُوَ کَظِیْمٌ	اور اُس کی آنکھیں غم سے سفید ہوگئیں اور وہ غم سے گھٹا ہوا ہوگیا۔
۳۲۲	کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ وَّیَبْقٰی رَبُّکَ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِکْرَام	سب مٹنے والے ہیں اور باقی رہنے والا تیرا رب ہے جو بخشش اور کرامت والا ہے۔
۳۲۳	قَائِمُ اللَّیْلِ وَصَائِمُ النَّھَارِ	رات کو عبادت کرنے والا اور دن کو روزہ رکھنے والا۔
	بِحُرْمَۃِ النَّبِیِّ وَاٰلِہِ الْاَمْجَادِ بِالنُّوْنِ وَالصَّادِ۔	نبی اور اُس کی اولاد کے بزرگ جو صاحب تلوار ہیں (مراد حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے) اور وہ جو پھر لوٹ کر آنے والے ہیں (مراد حضرت امام مہدی علیہ السلام سے) ان سب کے طفیل میں۔

فسانۂ عجائب کے مندرجہ ذیل نسخے میری نظر سے گذرے اور زیرِ نظر نسخے کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں اِن سے مدد ملی۔

۱ ۔ فسانۂ عجائب ۔ مطبع حسنی لکھنؤ، ناشر میر حسن رضوی ۔ طبع دوم ۔ ۱۲۶۲ھ

۲ ۔ فسانۂ عجائب ۔ مطبع مصطفائی لکھنؤ ۱۲۶۲ھ

۳ ۔ فسانۂ عجائب ۔ مطبع مراۃ الاخبار ۔ کلکتہ ۱۲۶۲ھ

۴ ۔ فسانۂ عجائب ۔ مطبع محمدی، حاجی حرمین شریفین محمد حسین ۱۲۶۷ھ

۵ ۔ فسانۂ عجائب ۔ لالہ جمنا داس بلدیو سہائے ۱۲۷۱ھ

۶ ۔ فسانۂ عجائب ۔ افضل المطابع، کانپور ۱۲۷۶ھ

۷ ۔ فسانۂ عجائب ۔ مطبع احمدی شاہ درہ ضلع میرٹھ ۱۲۷۹ھ

۸ ۔ فسانۂ عجائب ۔ نولکشور ۔ بارھواں اڈیشن ۱۸۹۹ء

۹ ۔ فسانۂ عجائب ۔ نولکشور ۔ ۳۹ واں اڈیشن ۱۹۵۴ء

۱۰ ۔ فسانۂ عجائب ۔ رام نرائن لال بینی مادھو ۱۹۶۲ء

۱۱ ۔ فسانۂ عجائب مع حاشیہ خزانۂ غرائب مطبع انوار احمدی الہ آباد (سن اشاعت مندرج نہیں ہے)

۱۲ ۔ فسانۂ عجائب ۔ دارالاشاعت ۔ لاہور ۱۹۲۸ء

۱۳ ۔ فسانۂ عجائب ۔ کالج پریس ۔ کلکتہ ۱۲۸۶ھ

۱۴ ۔ اس کے علاوہ فسانۂ عجائب کے چند قلمی نسخے دیکھے جو آزاد لائبریری علی گڑھ اور انجمن ترقی اردو علی گڑھ میں موجود ہیں ۔